خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی
پوائنٹ
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

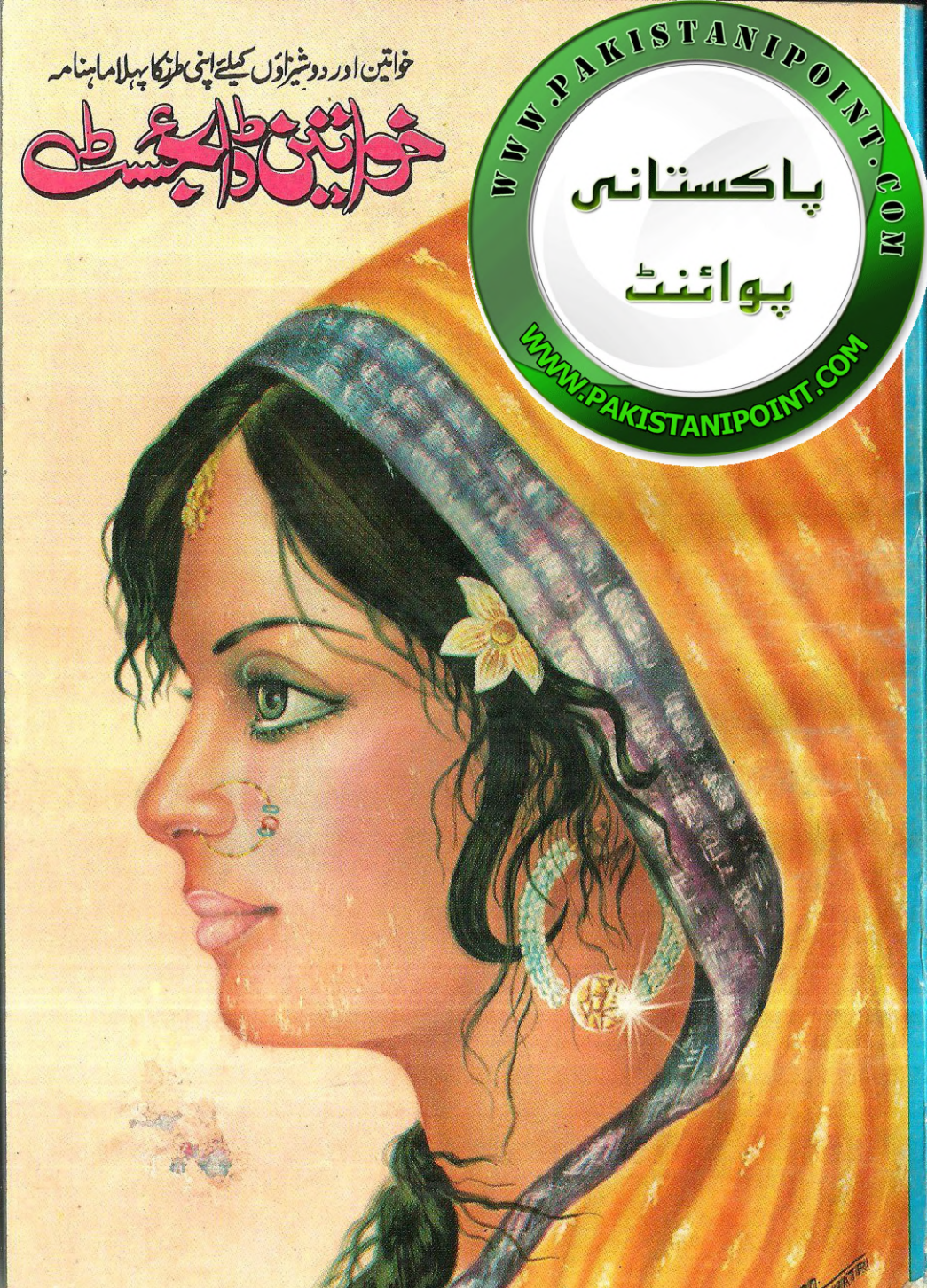

- کہنی سُنی — حمیدہ بانو — ۱۲
- ہمارے نام — نادرہ خاتون — ۱۳

آپ نے کیا پڑھا

- کراچی کا پہلا نمبر — ابنِ انشاء — ۱۵

خاتون کی ڈائری

- میری ڈائری سے — امت الصبور — ۱۷

ناول

- گرفتارِ وفا — پروین شریف — ۲۰۸

افسانے

- آؤ سنخواب دیکھیں — ریحانہ زیدی — ۱۹
- گلوں میں رنگ بھرے — عمرآفتاب قریشی — ۳۵
- اپنے ہی رُوبرو تھے — اقبال بانو — ۵۳
- ساحلوں کے خواب — لبنیٰ عروج — ۶۶
- لوحِ وفا — نویدہ فضل تارڑ — ۷۲
- زخم بہاروں کے — طاہرہ سعید — ۸۲
- یہ کس انداز سے بہار آئی — مہناز عرفان — ۱۰۰
- بدل گئے رُتوں کے چہرے — ناہید نذر — ۱۰۵
- درد کا سُورج — سیما یاسین مجتبیٰ — ۱۲۳
- خوشبو رنگ سُہانے موسم — شکیلہ سنبل فردوس — ۱۴۳
- خوشبو کا سحر — خالدہ ملک — ۱۶۱
- تن داغ داغ لٹا دیا — نسرین قریشی — ۱۶۸
- دشتِ جاں کا سنّاٹا — بشریٰ نسیم — ۱۸۴
- عکس اور آئینے — مہناز فاطمہ — ۱۹۵

سچی کہانیاں

- ایک سایہ دار شجر — قدسیہ ہما — ۲۰۲

Azeem Pakistanipoint.Com

میں کبھی نہ بھولوں گی

- لاپرواہی — ثمرہ نفیس — ۲۲۵
- بدحواسی میں — فریدہ گوہر — ۲۲۵
- ہنسے اور پھنسے — ساجدہ جبیں درانی — ۲۲۶
- مجرم کون — شاہدہ شبنم — ۲۲۶

رنگا رنگ پھول

- ایک رنگا رنگ سلسلہ — شگفتہ محمود — ۲۲۷

میری بیاض سے

- آپ کی بیاض سے — بلقیس بھٹی — ۲۳۲

خاتون کا دسترخوان

- پکوان — بلقیس بھٹی — ۲۳۰

خواتین کی محفل

- آپ کے سوال — ذوالقرنین — ۲۳۶

نظمیں غزلیں

- سنو — ادا جعفری — ۲۳۱
- غزل — ساحر لدھیانوی — ۲۳۱

نفسیات

- نفسیاتی اور ازدواجی الجھنیں — عدنان — ۲۳۸

بیوٹی بکس

- بیوٹی بکس کے مشورے — قیصر لودھی — ۲۴۱

حمیدہ بانو نے جاوید پریس سے چھپوا کر شائع کیا

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کہنی سُننی

مارچ کا شمارہ پیش خدمت ہے اس یقین کے ساتھ کہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ تحریروں اور رنگارنگ سلسلوں سے سجا یہ خوبصورت پرچہ آپ کو پسند آئے گا۔ خواتین ڈائجسٹ آج کامیابی کی جس منزل پر ہے یہ آپ کے تعاون اور توجہ کی وجہ سے ہے۔ آپ ہمیں اپنے قیمتی مشوروں اور تجاویز سے نوازتی رہتی ہیں اور اس پرچہ کو اپنا پرچہ سمجھتی ہیں جس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ لیکن ہمیں بہنوں سے ایک بات کہنی ہے کہ وہ خطوط میں صرف تعریف ہی نہ لکھا کریں ہم چاہتے ہیں کہ آپ تعریف کے ساتھ تنقید بھی کریں تاکہ آپ کی آرار کی روشنی میں ہم پرچہ کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

سالگرہ نمبر

اپریل کا شمارہ حسب روایت سالگرہ نمبر ہو گا اور اس کے ساتھ خواتین ڈائجسٹ اپنی عمر عزیز کے نو سال مکمل کرے گا۔
اس ضخیم نمبر میں پرانی مشہور و معروف ادیب بہنوں کے افسانے شامل ہوں گے اس کے علاوہ نئی لکھنے والیوں کی تحریریں بھی شائع کی جائیں گی۔ اگر آپ کے ذہن میں سالگرہ نمبر کے لئے تجاویز ہوں تو ہمیں لکھیں۔

اس شمارے میں

۱۴ افسانے سچی کہانیاں
پروین شریف کا ناول "گرفتار وفا"
میں کبھی نہیں بھولوں گی، رنگارنگ پھول، میری بیاض سے
خواتین کی محفل، خاتون کی ڈائری، خاتون کا دستر خوان
آپ سے کیا پردہ
اور
نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے، بیوٹی بکس۔
اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

ماہنامہ کرن کا سالگرہ نمبر

کرن کا مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہے جو خواتین کے اس شمارے کے ساتھ بازار میں دستیاب ہے اس شمارے میں ایک نیا سلسلہ "ٹی وی پوائنٹ" ہے جس میں آپ مشہور ٹی وی فنکاروں کے انٹرویو اور ٹی وی پروگراموں پر تبصرے اور نئی نئی معلومات اور خبریں۔

ماہنامہ حنا لاہور

لاہور سے بہنوں کا پسندیدہ ادبی ماہنامہ حنا شائع ہو گیا ہے ہمیں یقین ہے کہ حنا آپ کی لائبریری میں قابل قدر اضافہ ہو گا۔

حمیدہ بانو

Pakistanipoint
Waqar Azeem
Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

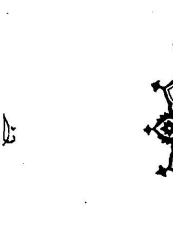

ہمارے نام

نادرہ خاتون

عظمیٰ عزیز خان — لاہور چھاؤنی

ڈیئر نادرہ آپی!
تسلیمات!
فروری کا شمارہ ہاتھ میں آیا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ رسالے کے تمام افسانے اچھے تھے۔ زنگار رنگ پھول بھی اچھے تھے میری بیاض میں بھی اشعار بہت خوبصورت تھے خواتین کی محفل میں بھی سوال و جواب کا سلسلہ بہت اچھا تھا بیوٹی بکس میں بھی مشورے اچھے دیئے ہوئے تھے تمام اسٹاف کو اتنا اچھا رسالہ ترتیب دینے پر مبارک باد۔

بشریٰ صدیقی — کراچی

پیاری باجی! السلام علیکم!
فروری کا خوبصورت خواتین ڈائجسٹ آیا فہرست میں اپنی پسند کی لکھنے والی بہنوں کے نام دیکھ کر بہت خوشی محسوس ہوئی انٹرویو کا سلسلہ دوبارہ شروع کر کے آپ نے خواتین ڈائجسٹ کی خوبیوں میں مزید اضافہ کر دیا شہناز احمد کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ ابنِ انشا کا کالم اچھا تھا افسانوں میں انا کی دیوار، درد کا سورج بہ نشتے درد کے، اور عذاب خوابوں کے بہت پسند آئے بہاروں کے زخم کی چوتھی قسط اچھی تھی۔ ناول گرفتارِ وفا بھی اچھا جا رہا ہے اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

جبیں — بہاول پور

پیاری نادرہ آپی آداب!
آپی اس ماہ کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے معلوم کتنی مرتبہ پڑھ چکی ہوں لیکن دل چاہتا ہے کہ پڑھتی ہی رہوں اس مرتبہ شہناز احمد، پروین یوسف، لبنیٰ عروج، خالدہ اسد، اقبال بانو، فخر النساء چشتی اور ناظمہ انور کے افسانے بہت پسند آئے۔

بیلا شبنم — خیر پور میرس

اچھی نادرہ باجی!
آداب قبول کریں۔
امید ہے ہمیشہ کی طرح بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گی نیا خواتین میرے ہاتھ میں ہمیشہ کی طرح مہینہ شروع ہوتے ہی آ گیا میری پسندیدہ قلمکار کا انٹرویو رسالے کی جان تھا۔ جب صحرائے زندگی میں" "درد کا سورج" "غروب ہوا تو خوابوں کا بھرم ٹوٹ گیا، "دیارِ دل کی رات میں" "نشتر سا رگ جاں میں" پیوست ہو گیا۔ تو "یقین کے ساحل پر" "انا کی دیوار" بہہ گئی "خوابوں کے عذاب" سہتے سہتے یوں لگا جیسے رات ڈھلتی ہی نہیں "لیکن اب" "درد کے ستارے ڈھلے تو" اب دل کا وہ عالم بھی نہیں۔

مسرت جبیں قادری — جلال پور پیر والہ

ڈیئر بجیا نادرہ جی ڈھیروں تسلیمات!
خواتین ڈائجسٹ کی خوبصورتیوں کا اعتراف بار ہا کرنا چاہا ایسے الفاظ تلاش کرنا چاہیئے کہ جو اس کے شایانِ شان ہوں مگر پھر بھی خوبصورت لفظوں کا فقدان ہی رہا۔ محترمہ پروین یوسف شاقی صاحبہ نے مسلسل دو تین ناولٹ لکھ کر ہمیں اپنا گرویدہ کر لیا ان کی تحریر کے ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں اس بار فروری کا جھلملاتا ہوا شمارہ سابقہ شماروں کی طرح دل و روح کو طمانیت دے گیا۔ گرفتارِ وفا زخم بہاروں کے یہ دونوں انتہائی دلچسپ موڑ پہ گامزن ہیں، شہناز احمد، خالدہ اسد، لبنیٰ عروج، اقبال بانو، دلشاد نسیم، نوید فضل تارڑ کی تحریریں پسند آئیں۔

ثمینہ خلیل شفق — بہاولپور

ڈیئرسٹ نادرہ باجی
تسلیمات!
فروری کا خواتین ڈائجسٹ ملا۔ خوبصورت افسانوں کی خالق محترمہ شہناز احمد سے ملاقات تو بے حد ہی پسند آئی۔ "گرفتارِ وفا" اک خوبصورت سی تحریر ہے۔ محترمہ ادا جعفری کا کلام بے حد پسند آیا۔ محترمہ خالدہ اسد، گو نئی مصنفہ ہیں، مگر اندازِ تحریر بہت خوبصورت ہے۔ محترمہ "ریحانہ زیدی" کی کمی بہت محسوس ہوئی مجھے یہ کہنے میں فخر ہے کہ خواتین ڈائجسٹ واقعی ایک منفرد ڈائجسٹ ہے۔

فوزیہ روبی۔ — ڈیرہ اسماعیل خاں

سویٹ نادرہ آپی!
آداب!
حسب معمول فروری کا خواتین ڈائجسٹ خریدا تو بہت خوشی ہوئی۔ افسانوں کے بہترین انتخاب کے ساتھ ساتھ ہمارا پسندیدہ سلسلہ شروع کر دیا آپ نے یعنی انٹرویو۔ شہناز احمد ہماری پسندیدہ مصنفہ ہیں ان کا ولنٹیس افسانہ اور انٹرویو بہت پسند آیا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے، گرفتارِ وفا، بہت اچھا ناول ہے مستقل سلسلے بھی خوب رہے ہماری دعا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ ہر گام پہ ترقی حاصل کرتا بامِ عروج تک پہنچے" آمین۔

غزالہ شہناز ہاشمی — فیصل آباد

سوہنی تے من موہنی باجیئے
تسلیمات!
میرا خط لگتا ہے جیسے آپ کو پندرہ سال بعد ملے گا تب وہ بچارا آپ

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

کے رسالے میں تھوڑی سی جگہ پا سکے گا، ہمیں یہ رسالہ اتنا پسند ہے اتنا پسند ہے کہ ہمیں لکھنا آتا تو اس کے لئے صفحے بھر دیتے مگر اُف مجبور ہیں کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ اس ڈائجسٹ کی سب سے بڑی یہ خوبی ہے کہ اس کے افسانے معیاری اور معاشرتی مسائل پر مبنی ہوتے ہیں جو افسانہ کم اور حقیقت زیادہ معلوم ہوتے ہیں لگتا ہے جیسے یہ ہماری ہی کہانی چل رہی ہے خدا سے دعا ہے کہ ہمارا پسندیدہ رسالہ خوب سے خوب تر ہو اور ترقی پر ترقی کرے۔

شہناز فیضی **کراچی**

سوئٹ بجیا رانی نادرہ جی!

آداب!

ہر بار کی طرح اس بار بھی اپنے پسندیدہ کالم یعنی ابن انشاء جی کے کالم کو پڑھا آپ سے کیا پردہ، "میں فون کا بل الاسکا کے ریٹ پر آرہا ہے" پڑھا سچ جانئیں اس بار تو انشاء جی بہت ہی زیادہ یاد آئے کیونکہ یہی ماہ تھا جس میں انشاء جی ہم سے جدا ہوئے تھے، اس ماہ شہناز احمد سے ملاقات بہت پسند آئی ناول گرفتار وفا پروین شریف کا بہت اچھا لگا۔

افسانوں میں، "رات ڈھلتی ہی نہیں" شہناز احمد کا، لوا عتبار آیا خالدہ اسد کا اقبال بانو کا نشتر سارگ جاں میں اور نائلہ انور کا انا کی دیوار بہت پسند آئے۔ ادا جعفری کی نظم اور غزل نے متاثر کیا باقی تمام ہی سلسلے شاندار لگے آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں کو بار آور کرے" آمین"

نسرین سحر **جڑانوالہ**

پیاری باجی!

گلہائے عقیدت!

میں تقریباً چار سال سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں لیکن شرکت پہلی مرتبہ کر رہی ہوں اُمید ہے کہ حوصلہ افزائی کریں گی۔ فروری کا شمارہ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا تمام افسانے قابل تعریف تھے ناول گرفتار وفا بہت اچھا جا رہا ہے محترمہ پروین شریف کو اتنا اچھا ناول تحریر کرنے پر مبارک باد آپ سے کیا پردہ بھی اچھا لگا۔ باقی تمام سلسلے بھی خوب رہے خدا کرے آپ کا رسالہ یونہی ترقی کرے آمین، آپ سب کو اچھا رسالہ شائع کرنے پر مبارک باد اور سلام ہوں۔

ابنِ انشاء

آپ سے کیا پردہ

کراچی کا پہلا نمبر

لیجئے صاحب، یہاں کے لوگ تو کہتے ہی تھے.
اب تو انٹرنیشنل ماہرین نے بھی کہہ دیا ہے کہ کراچی دنیا کا سب سے گندہ شہر ہے یہ سچ ہے کہ اندرونِ پاکستان اور بھی کئی مقامات ہیں جن کا حق کراچی پر فائق کہا جاتا ہے. مثلاً لاہور مثلاً پشاور، مثلاً گوجرانوالہ، لیکن یہ شہر نہیں ہیں ہم نے ایک بار لاہور کو پاکستان کا سب سے بڑا گاؤں لکھا تھا دوسرے شہروں کے متعلق ہماری رائے کا اندازہ اس سے کر لیجئے.
لاہور کو گاؤں قرار دینے پر ہمارے دوست احمد ندیم قاسمی ہم سے خفا بھی ہوئے تھے خصوصاً اس لئے کہ اس کے بعد دوسرا کالم ہم نے "لاہور ولا قوۃ" کے عنوان سے لکھ دیا تھا، لیکن یہ پرانی بات ہے، اس دوران وہ کئی بار ہمیں معاف کر چکے ہیں.

ؔ

کراچی کو ہم نے اس لئے گندہ نہیں کہا کہ ہمارے گھر کے پچھواڑے پر کوڑے کے ڈھیر ہمارے بار بار لکھنے کے باوجود جوں کے توں ہیں اس لئے کہ ہم نے خود غرضی سے بالا ہو کر ٹھنڈے دل سے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوڑا پھینکنے کے لئے اس سے بہتر جگہ شہر بھر میں نہیں دوسرے مکھیوں کے دل بادل چھائے رہنے کی وجہ سے علامہ اقبال ٹاؤن کا مطلع ہمیشہ ابر آلود سا رہتا ہے سورج کی کرنیں براہِ راست نہ پہنچنے کی وجہ سے اس محلے میں اتنی گرمی نہیں ہوتی جتنی اور علاقوں میں ہوتی ہے بو کی بات البتہ ہے لیکن وہ بھی محلے سے باہر والوں کے لئے ہے محلے والوں کی ناکیں جمعداروں کی طرح ایسی مشاق ہو گئی ہیں کہ کوئی آدمی بو کا ذکر کرے بھی تو پوچھتے ہیں ع کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے! یہ بات نہ ہوتی تو ہمارے دوسرے پڑوسی جن کے دروازے ان کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کی طرف کھلتے ہیں ضرور احتجاج میں ہمارے ساتھ شامل ہوتے.

ؔ

چلیئے کسی بات پر تو کراچی کو اوّلیت حاصل ہوئی بلکہ خبر کے مطابق کلکتہ کا نمبر دوسرا ہے ہندوستان والے اس پر ناراض ہوں گے کیونکہ ہر معاملے میں ان کا نمبر پہلا ہونا چاہیئے. لیکن یہ فیصلہ ہمارا نہیں ہے. تھائی لینڈ کے محکمہ صحت کے ڈاکٹر کا ہے. یہ انہی کی رائے ہے. کہ اول نمبر کراچی دوئم کلکتہ اس کے بعد مینلا. لوگوس، جکارتہ، اور بنکاک ہم نے لاگوس کے علاوہ یہ سبھی شہر دیکھے ہیں ہمارا خیال ہے کراچی کو رعایتی نمبر دیکر اول نمبر قرار دے دیا گیا ہے ورنہ یہ شہر کسی طور اس سے کم نہیں اور بنکاک کو جو سب سے آخر میں رکھا ہے. محض محکمہ صحت کے ڈائریکٹر کی کسر نفسی ہے یہ ایک مشرقی روایت ہے اُدھر یہ جو سنگاپور کے باب میں کہا ہے کہ یہ دنیا کے ترقی یافتہ شہروں کے لئے مثال کا درجہ رکھتا ہے یعنی ایسا صاف شفاف ہے کہ شفاف تحریک والوں کو اپنا ہیڈ کوارٹر وہاں لے جانا چاہیئے. تو سچ یہ ہے کہ ہم نے یہ شہر بھی دیکھا ہے اور بہت دیکھا ہے.

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیئے تونے اسے کس آن میں دیکھا

ؔ

یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال ٹاؤن میں قوتِ شامہ کی تربیت کے باوجود ہم پیڈی اسٹریٹ سے گارڈن روڈ پر اور اسی طرح بندر روڈ سے گاندھی گارڈن جانے والی سڑک پہ نہیں مر سکتے. ناک پہ رومال اور جیب میں لخلخہ رکھ کر بھی نہیں کیونکہ وہاں پیشاب کرنا سخت منع ہے، اور پیشاب کرنے والا حوالہ پولیس کیا جائے گا، اور یہ بھی سچ ہے کہ یہ صدر اور بندر روڈ کے POSH علاقے ہیں اور لیاری اور دوسرے علاقے کا احوال بھی ہمیں معلوم ہے. لیکن خبر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ جائزہ لینے والوں کے سامنے گندگی کا کیا معیار تھا آیا صرف کوڑے کے ڈھیروں کو گندگی، بدروؤں اور "یہاں پیشاب کرنا منع ہے" کے مرکزوں

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

ہی کو کہا جاتا ہے یا ہذب قسم کی گندگی یا آلودگی کا بھی حساب رکھا گیا ہے بنکاک اور سنگاپور میں ہر دوسرا مکان یا تو ہوٹل ہے یا نائٹ کلب ہے یا حمام ہے۔ اور حمام بھی ایسا جس میں سب ننگے ہوں کراچی بھی اس سلسلے میں کوشش کر رہا ہے۔ لیکن بنکاک یا سنگاپور یا ہانگ کانگ کے ابھی پاسنگ بھی نہیں، اور گندگی کی تعریف کو ذرا اور وسیع کر لیا جائے تو واشنگٹن بھی اس میں آجائے گا۔ کہ آپ سرِ شام عین وہائٹ ہاؤس کے سامنے اپنی جیب کٹوا سکتے ہیں جبراً تڑوا سکتے ہیں۔ اور کپڑے اتروا سکتے ہیں ان ملکوں میں صفائی بے تنک بہت ہے لیکن بعض اوقات اس کے لئے صفایا کا لفظ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

دوسری خبر۔۔۔۔ یہ ہے کہ اٹلی میں پیسا کا مشہور مینار جو صدیوں سے ٹیڑھا کھڑا ہے اور دن بدن ٹیڑھا ہوتا جا رہا ہے اس کی مرمت کے لئے پاکستان سے آدمی منگوائے جائیں گے یہ سچ ہے کہ ہم لوگوں کو ٹیڑھی چیزوں کا بہت تجربہ ہے ٹیڑھی بات کرتے ہیں ٹیڑھی چال چلتے ہیں ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ٹیڑھی کھیر کھاتے ہیں خواہ حلق ہی میں پھنس جائے اور یہ بھی تسلیم کہ سیدھی چیزوں کو ٹیڑھی کرنے کی صلاحیت بھی ہم میں ہے لیکن ٹیڑھی چیز کو سیدھا کرنا کچھ اور علم ہے چنانچہ اٹلی والوں کی اس نکتہ شناسی پر ہمیں تعجب ہوا تھا کہ پی ڈبلیو ڈی کے ایک صاحب مل گئے بولے "میاں سامنے کی عمارت دیکھ رہے ہو صرف ریت سے بنائی تھی دو سال ہو گئے ہیں ابھی تک نہیں گری جب ریت کی دیوار اتنے دن کھڑی رہ سکتی ہے تو پیسا کا مینار لوہا لاٹ کر دینا ہمارے لئے کیا مشکل ہے۔ یہ غیر ملکی کام ہے ریت میں تھوڑا سیمنٹ بھی ملا دیں گے۔ ان صاحب کی یہ بات ہمارے جی کو لگی تاہم ہماری کوشش ہے کہ مرمت شروع ہونے سے پہلے اس تاریخی مینار کو اپنی آنکھوں سے ایک بار دیکھ لیں۔ کیونکہ ہماری زبان میں مرمت کے بھی ایک سے زیادہ معنی ہیں اور سیدھا کرنے کے بھی۔

ع۔ مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی۔

بہنوں کے اپنے ماہنامے

کرن کا

سالگرہ نمبر

سالگرہ نمبر کی ایک جھلک

شائع ہو گیا ہے

انٹرویو — کرنیں

دوقسط وار ناول — ناولٹ

مشہور و معروف و نئی لکھنے والی

بہنوں کے بے شمار طویل و مختصر افسانے

سچی کہانیاں — مستقل نت نئے سلسلے

اور

ایک نیا دلچسپ سلسلہ، ایک نئی تبدیلی

ریڈیو۔ ٹی وی پوائنٹ

ریڈیو ٹی وی کے نامور فنکاروں کے

انٹرویوز — مختلف شعبوں کے بارے

میں تفصیلی رپورٹ — تاک جھانک

تبصرہ برائے تبصرہ — ٹی وی پوائنٹ

ہر ماہ ان گنت صفحوں پر پھیلے ہوئے مضامین و انٹرویوز پڑھ سکیں گی۔

سالگرہ نمبر آج ہی خرید فرمائیں

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

خاتون کی ڈائری

امت الصبور

مہناز فاطمہ
کی ڈائری سے

جس وقت میں یہ ڈائری لکھ رہی ہوں میرا ذہن سمندر کی سفّاک لہروں کی طرح ہچکولے کھا رہا ہے غیر قانونی طور پر ڈوب جانے والی لانچ کے کئی مسافر بھوک و پیاس کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد چل بسے اور اُن کے احباب اُن کا آخری دیدار بھی ترکئے کہ اُن کے خاکی جسموں کو سمندر کی گود میں اچھال دیا گیا۔ حادثہ تھا جو گزر گیا۔

میں اپنی سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکی ہوں آخر یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا؟ یہ ایک ایسی گتھی ہے جو میرا ذہن سلجھانے سے عاری ہے ایک بات لیں ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے کہ شاید وہ اپنی گم گشتہ جنت کی تلاش میں نکلے تھے لیکن خواب اس طرح ٹوٹتے ہیں تعبیریں اتنی ظالم اور ہیبت ناک بھی ہوتی ہیں یہ انہیں معلوم نہ تھا وہ تو انجام کو پہنچ گئے لیکن آخر ان کے احباب کیا کریں؟ آنسو خشک بھی ہو گئے تو پچھتاوے انہیں کیا زندگی بھر نہ ڈستے رہیں گے کہ وہ ملازمت کی تلاش میں سمندر میں اترے تھے لیکن یہ کیسی ملازمت ملی کہ جان سے بھی گئے مال سے بھی اور ساحل بھی نہ ملا میرا قلم ان کی جوان زندگیوں کو آخر کونسا خراج پیش کرے۔ دھرتی کو اس کے جوان بیٹوں کا پرسہ آخر کس طرح دے میں یہ سوچتی چلی جا رہی ہوں اور اپنے احساسات کو ڈائری کے سپرد کر رہی ہوں۔

رفعت سراج
کی ڈائری سے

۵ مئی ۱۹۸۰ء کو پنجاب کے ایک گاؤں میں دادا جان محترم کے پاس جانے کا اتفاق ہوا اسی وقت ہی گاؤں کی لڑکیاں میرے اردگرد جمع ہو گئیں خلوص کی مسکان لبوں پہ سجائے سب میرے سراپے کو اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔ بیٹھیں باتیں کیں.... آج سے آٹھ سال قبل جن لڑکیوں کو چھوڑ کر گئی تھی۔ ایک دو بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔

شاہدہ ان میں سے ایک لڑکی... اپنی بیٹی کو میرے پاس ہی لے کر بیٹھی رہتی جانے اس کی آنکھیں کتنی کہانیاں سناتی رہتیں۔

ایک رات میرے پاس آ بیٹھی حسب معمول۔

"آپا شہر کی لڑکیاں بہت خوش نصیب ہوتی ہیں ہے ناں!"

"کیوں بھئی؟"

"آپا وہ لوگ اپنی پسند سے شادیاں جو کرتی ہیں"

میں سُن رہ گئی اس کی طرف دیکھا۔ ایک کہانی خاموشی سے میرے کانوں میں میرے احساس میں اتر گئی۔ میں نے اس کی خاموش کہانی اس کی آنکھوں سے پڑھ لی تھی۔

"شاہدہ میں تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتی تم کبھی شہر آ کر شہریوں میں بیٹھو۔ شاہدہ پھر حقیقتاً دکھ ہوگا تمہیں کیونکہ تمہیں تو کوئی ایسا نظر نہ آئے شاید جس پر تم رشک کر سکو تمہاری سوچ محدود ہے مجھے اپنی بلند پرواز سوچوں پہ ناز ہے... لیکن اگر تم میں بن جاؤ اور میں تم، پھر یہی سوال دہراؤ تو تمہیں بہت اندھیرا نظر آئے گا۔ اپنی بصیرت کھو بیٹھو گی۔

"آپا تم چپ ہو گئیں؟"

"نہیں شاہدہ" میرے تو رونگٹے تک بولنا چاہ رہے ہیں تم سادہ سی لڑکیاں بھی احساس کا ادراک پا گئیں ہیں کیوں اپنی مسرتیں کھونے کے درپے ہو؟"

"ہاں تو باجی کیا بولوں یہی کہ دور کے ڈھول سہانے.."

کوثر پروین
کی ڈائری سے

میری ڈائری کا ورق فیض احمد فیض کی نظم سے سجایا خاتون کی ڈائری کے لئے۔

"ستارے زخم ہیں"

مری تیری نگاہ میں
جو لاکھ انتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

لاکھ دِل فگار ہیں
جو میری تیری انگلیوں کی بے حسی سے
سب قلم تزار ہیں.
جو میرے تیرے شہر کی
ہر اک گلی.
ہیں میرے تیرے نقشِ پا کے بے نشاں مزار ہیں
جو میری تیری رات کے.
ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے
گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو
کسی پہ راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں
بتا
یہ سب ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوت وہم کا بنا ہوا
یہ ہے تو اِس کا کیا کریں.
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا بتا
بتا بتا.

فائقہ اسلم
کی ڈائری سے

اپنی ڈائری میں لکھی فیض احمد فیض کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے.
نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
اُدھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
"فیض"!

زاہدہ صدف
کی ڈائری سے

مجھے اپنی ڈائری میں لکھی ہوئی یہ تحریر بہت پسند ہے.
وقت کی گرد میں نہ جانے کتنے چہرے ڈوب جاتے ہیں اگر مٹتے نہیں تو دھندلا ضرور جاتے ہیں پھر لوگ نہ جانے کیوں اِس طرح ایک دوسرے کو یاد رکھنے کا ڈھونگ رچاتے ہیں

یاسمین کنول
کی ڈائری سے

میری ڈائری میں نامعلوم یہ کب کی تحریر ہے جو مجھے یاد نہیں کہاں سے لکھی تھی!!! بہر حال مجھے بے حد پسند ہے.
دنیا بھی کس قدر عجیب ہے ہم بھی تو اِس دنیا کے باسی ہیں جب دلہنوں کی بات کرتے ہیں... تو ان کی خوبصورتی اور پیارے ہونے کی بات پوچھتے ہیں... کیا ہم سب صرف چیزوں کے متلاشی ہیں... کیا ہماری آنکھیں صرف خوبصورت اور پیاری دلہنوں کی متلاشی ہیں... اگر یہ سچ ہے تو یہ بدصورت اور قبول صورت لڑکیاں کہاں جائیں کیا انہیں دلہن بننے کا حق نہیں ہے اگر ان کی شکلیں پیاری نہ ہوں تو کیا انہیں ناپسند کر دیں... کیا شکلیں ہی دیکھی جاتی ہیں!!!

ناصرہ طیبہ بٹ
کی ڈائری سے

کبھی کوئی غم اسطرح نقش بناتا چلا جاتا ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اِس کے زخم گہرے ہوتے جاتے ہیں اور اِس دُکھ کا احساس ہر دم جلائے دیتا ہے پھری بہار ہو کہ خزاں کی رُت بس اشکوں کے اندھیرے میں پتہ ہے زخم جلتے ہیں تو زیست گھلتی جاتی ہے اور بس ہر دم خیالوں میں اداسی میں ہر سو کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ جی خود کو بھلا جاتا ہے.
اداس رات کے آنگن میں رات کی رانی
مہک رہی ہے دلِ بے قرار بات تو سن
فلک پہ نکلا ہے پیلا دھلا دھلا یا چاند
کہاں سے چل کے کہاں تک ہے دیکھ آیا چاند
کوئی مثال کوئی یاد... آرزو کوئی!
بڑے بہانے تھے جی کے گداز کرنے کو

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

آؤ خواب دیکھیں

ریحانہ زیدی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

جب حقیقتیں چاروں سمت آگ برسانے لگیں
جب سچ کا زہر قطرہ قطرہ ٹپک کر وجود کو جھلسانے لگے۔
تو اس لمحے جی چاہتا ہے کہ کچھ ساعتیں زندگی سے چرا کر آنکھیں بند کریں اور خوابوں کی دنیا میں کھو جائیں۔

اُن چھوٹے لمحوں کے خواب
کبھی نہ پورے ہونے والے خواب
حقیقتوں سے سہمے ہوئے لرزیدہ خواب
چند لمحوں کے لئے ہی سہی مگر دل کو خوش کرنے والے خواب۔
تو آؤ....

میرے پیارو۔ میرے ساتھیو! میرے عزیزازجان لوگو!
میری بند آنکھوں کے جلتے پپوٹوں میں جمع ہو جاؤ۔
کیونکہ میں تم سب کو ساتھ لیکر خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔
ایسے خواب جو آنکھیں کھلنے پر ناگاساکی اور ہیروشیما کی طرح بھک سے اڑ جاتے ہیں۔
آنِ واحد میں جلتے ہوئے ارمانوں کا ملبہ بن جاتے ہیں۔
زندگی انہیں ڈھونڈتی رہ جاتی ہے اور وہ اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم اپنا آپ کھو بیٹھتے ہیں اور ہمارے چہرے مسخ ہو جاتے ہیں۔
ہاں آج بہت دنوں بعد میرا دل پھر خواب دیکھنے کو چاہ رہا ہے
سنو مانوس فضاؤ۔ کیا تم میرا ساتھ نہیں دوگی؟
اے ہواؤ کیا تم اڑتے لمحوں کو میری آنکھوں تک نہیں لے آؤگی؟
اور اے میرے ذہن نارسا۔ آ چل ان حدود کو پار کر جائیں جن کے تصوّر سے ...... دل کی دنیا اب تک آباد رہی
آج دیکھ ہی ڈالیں اُن چھوٹے لمحوں کے خواب
جو نزدیک آئے بھی تو اجنبی بن کر گزر گئے۔
صرف دو سالوں میں
دو سال جو انتظار کے ہوں تو صدیاں بن جاتے ہیں
وصل کے ہوں تو لمحوں کی طرح پلک جھپکتے بیت جاتے ہیں

ٹرن.... ٹرن۔
فون کی گھنٹی نے سارے خواب بکھیر دیئے۔
وہ جھنجلا گئے۔
ہاتھ بڑھا کر فون کا پلگ نکال دیا
بکھرے ہوئے خوابوں کو پھر آنکھیں بند کر کے جمع کرنے لگے۔ مگر جو سلسلہ ایک بار منقطع ہو جائے اسے دوبارہ جوڑ لینا بڑا محال ہوتا ہے۔
وہ دل کا درد دبائے دبائے بالکونی میں آ گئے۔
کبھی یہاں چاندنی تھی۔ خوشبو تھی۔ زندگی تھی۔
آج بھی ابتدائی تاریخوں کے قوس نما چاند کی عمودی کرنیں ان کی بالکونی میں اتری ہوئی تھیں مگر آج زندگی نہ تھی اس لیے مہک بھی نہ تھی۔
پچھلے چار سال سے یوں ہی بے جان لمحے زہر بن کر قطرہ قطرہ گر رہے تھے۔
اور انھیں زندگی کے بوجھ کو گھسیٹنے کے لیئے زہر کے ان قطروں کو امرت سمجھ کر پینا پڑ رہا تھا۔ برابر والے فلیٹ میں شاید فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ اپنا فون سمجھ کر اندر آئے تو یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے پلگ وہ اپنے ہاتھ سے نکال کر گئے تھے۔
نہ جانے کس کا فون آیا ہوگا۔ وہ آپ ہی آپ پشیمان ہو گئے اور ہاتھ بڑھا کر پلگ دوبارہ لگا دیا۔
لگتا تھا جیسے دوسری طرف کوئی فون کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔
پلگ لگاتے ہی گھنٹی بجنے لگی۔
"ہیلو!" انھوں نے فون اٹھایا۔
"کہاں مر گئے تھے؟" دوسری طرف فیروز تھا۔
"کہیں نہیں۔ ہاں البتہ فون ڈیڈ ہو گیا تھا۔" انھوں نے جھوٹ بولا۔
"فون ڈیڈ تھا یا حسب عادت پلگ نکال دیا تھا۔ تم آخر کب سُدھرو گے؟" اس نے جل کر پوچھا۔
ضیاء بے جان ہنسی ہنس دیئے۔
"اچھا ایسا کرو فٹافٹ آجاؤ۔ سب دوست جمع ہیں اور میرے سامنے میز پر تاش بھی رکھے ہوئے ہیں۔" فیروز نے رسان سے کہا۔
"نہیں یار میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔" ضیا کاہلی سے بیڈ پر لیٹ گئے۔
"عجیب گھامڑ آدمی ہو۔ مرد کسی بات کا غم زیادہ سے زیادہ چار دن کرتا ہے اور تم ہو کہ پورے چار سال سے ماتم کناں ہو۔" فیروز کو غصہ آ گیا۔
"کیوں دوست کیا سارے مرد ایک ہی جسامت اور ایک ہی صورت کے ہوتے ہیں۔" ضیاء نے بڑا عجیب سا سوال پوچھا۔
"نہیں تو۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" فیروز نے الجھ کر کہا۔
"اس لیے کہ جب جسم اور صورتیں ایک جیسی نہیں ہو سکتیں تو بھلا دل کیسے ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے دل کے معاملے ہوتے ہیں۔ فیروز جی۔ مجھے تو اس فلیٹ کا ذرہ ذرہ اس کی خوشبو میں بسا ہوا لگتا ہے۔" وہ جذب کے عالم میں بولے۔
"بیچ دو اس سالے فلیٹ کو۔" فیروز جلبلا کر بولا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"فلیٹ کو بیچ دوں۔ کیا شاہجہاں نے تاج محل کا سودا کیا تھا؟" ضیاء تڑپ سے گئے۔

"اچھا پھر بھاڑ میں جاؤ۔" فیروز نے جل کر فون بند کر دیا۔

ضیاء سر پٹخ کر رہ گئے۔ یہ کیا کہہ دیا دوست۔ یہ کیا بات نکالی زباں سے۔

کیا ہر لمحہ بوند بوند ٹپکتی آرزوؤں کو سمیٹ کر اسی لئے سمندر بنایا تھا۔

کیا جسم میں دوڑتے خون کے اندر جذبوں کو اسی دن کے لئے ہوا دی تھی۔

پھر دوست اس میں نور کا قصور بھی کیا تھا۔

وہ لڑکی تھی۔ ہر لڑکی کی طرح مکمل عورت بننے کے خواب اس نے بچپن ہی سے دیکھے ہوں گے۔

اسے کیا پتہ تھا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکیں گے۔

مگر مجھے بھی کیا پتہ تھا میرا بھی کیا قصور ہے۔ مجھے بھی کیوں سزا ملی....

دل بے چین ہو کر تڑپ اٹھا۔

وہ ضبط نہ کر سکے تو تکیہ منہ پر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔ وہ چھ فٹ کے اونچے پورے مرد بچوں کی طرح تکیئے کی گود میں منہ چھپائے رو رہے تھے۔

نور.... نور.... تمہاری خوشبوؤں کی توں اس میں موجود ہے۔

وہ دیوانوں کی طرح تکیئے میں سمائے جا رہے تھے یا اسکو اپنے اندر سما لینے کی کوشش میں تھے۔ بے چینی پھر بھی کم نہ ہوئی تو اٹھ کر انھوں نے الماری کھولی۔

ساڑھیاں، میکسیز، ٹراؤزرز سب کے سب دونوں بازوؤں میں بڑی احتیاط سے اٹھا کر لے آئے اور سینے اوپر ڈال کر بڑے پرسکون ہو گئے۔

پگلے جب اتنی ہی محبت تھی تو جب پچھلے دنوں وہ سہارا مانگنے آئی تھی تو اس کا ہاتھ تھام کیوں نہ لیا۔ دل نے کچوکا۔

"نہیں.... نہیں۔ محبت بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ اس میں دوسراہٹ بھلا کب برداشت ہوتی ہے۔ وجود تو در کنار آہٹوں کے گمان پر بھی دل بدظن ہونے لگتا ہے۔ میں اسے کیسے اپنا لیتا۔ وہ میری اپنی کب رہی۔ پورے تین سال کسی اور مرد کی باہنوں میں اس کا وہ جسم مسلتا رہا ہو گا جسے میں نے کلیوں سے بھی نازک جانا تھا۔ اس کے عورت پن کی نشانی اس کا بیٹا اور بیٹی اس کے ساتھ تھے جو ہر لمحے مجھے کسی اور مرد کی یاد دلاتے رہتے جو پچھلے دنوں تک اس کا شوہر رہا تھا۔ اس کے مکمل وجود کا مالک۔

"شوہر تو تم بھی رہے تھے نا؟" کسی نے چپکے سے پوچھا۔

"ہاں جاناں۔ جانِ جاناں۔ میری روح، میری آرزو، میری نور العین۔ میں تمہارا شوہر تھا۔ تمہارے دھنک رنگ وجود کا مالک۔ تم میرے لئے کیا تھیں۔ خوشبو تھیں، ساون کا پہلا چھینٹا تھیں یا بہار کی نرم رو ہوا کا کوئی جھونکا۔ نہیں۔ میں نے غلط سوچا۔ تم تو سراپا عشق تھیں۔ محبت کی انتہا تھیں۔ انسیت کی آخری حد تھیں۔ تمہارے خواب تو میں نے جب ہی سے دیکھنے شروع کر دیئے تھے جب عقیقہ کے بعد چچی جان نے تمہیں میری گود میں ڈال کر کہا تھا۔

"لو بھئی ضیا، اپنی دلہن کو سنبھالو۔" اور میں نے بہت حیران ہو کر دیکھا تھا۔ آٹھ دس دن کی گل گوتھنا سی گلابی رنگت اور بولتی آنکھوں والی دلہن۔ سرخ فراک اور ستاروں جڑی سرخ ٹوپی پہنے مجھے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ امی بتاتی ہیں۔ میں نے بیساختہ تمہاری آنکھوں کو دیکھ کر چوم کر کہا تھا۔

"چچی جان۔ اس کی آنکھیں کتنی پیاری ہیں۔" سنا ہے سب ہنس پڑے تھے۔ وہ بہاروں کی ابتدا تھی اور اب جاناں لگتا ہے جیسے میرے کھوکھلے جسم میں روح اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ بوکھلائی پھر رہی ہو۔ اور باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی ہو۔ دیکھا جاناں۔ میں کوئی غلط کہتا تھا۔ تم بِن زندگی گرم ہوا کا بگولا بن کر رہ گئی ہے جو آپ بھی جھلس رہا ہو اور دوسروں کو بھی آن جانے میں جھلسائے دے رہا ہو مگر پھر بھی سکون حاصل کرنے میں ناکام رہا ہو۔

"تم گئی تھیں تو کم از کم یادوں کے سارے دریچے بند کر جاتیں۔ یہ کیا کہ ہر دروازے ہر جھری سے نکل خوابوں میں اتر آتی تھیں۔ پھر میں نے تو ان خوابوں سے بھی اپنے کو بہلا لیا تھا۔ تم حقیقت بن کر کیوں چلی آئیں۔ سارے ٹانکے ایک ساتھ ہی ادھیڑ دیئے۔ سارے زخم آنِ واحد میں ہرے کر دیئے۔ دبی دبائی چنگاریوں کو ایسی ہوا دی کہ شعلے اب تک وجود کو جھلسائے دے رہے ہیں۔ کہاں جاؤں کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ کونسی سمت اختیار کروں کہ عقل تو خبط ہو کر رہ گئی ہے۔

اے اللہ.... اے اللہ.... وہ کپڑوں کے انبار کو ہٹا کر ایک دم کھڑے ہو گئے۔ مارے وحشت کے چہرہ تپ رہا تھا۔ باتھ روم جا کر منہ دھویا پھر بھی چین نہ ملا تو فلیٹ لاک کر کے نیچے اتر آئے۔ ان کی گاڑی رات گئے تک روشنیوں کے شہر کی سڑکیں ناپتی رہی۔ وحشت اور بڑھی تو ساحل کی طرف نکل آئے۔

یہاں ہُو کا عالم تھا۔ ان ہی جیسے سکون کی تلاش میں آئے ہوئے اکّا دکّا لوگ یا تو واپس جا رہے تھے یا پھر دور دور گاڑیاں کھڑی کر کے اُداس نغمے تیز آوازوں میں سُن رہے تھے انھوں نے جوتے گاڑی میں چھوڑے اور گاڑی لاک کرنے کے بعد پتلون کے پائنچے الٹ کر وہ سمندر میں اتر آئے۔

ایسی ہی ٹھنڈک تو تم میں بھی تھی نور.....

ہاں ایسی ہی قدرتی ٹھنڈک۔ جسم کے ریشے ریشے میں اتر جانے والی۔ روح کو سرشار کر دینے والی۔ بہار کے ابتدائی دنوں جیسی۔

اوہ۔ میں غلط کہہ گیا شاید۔ تم تو مجسّم بہار تھیں۔ تازگی کی لذّت تھیں۔ سرشاری کی انتہا تھیں۔

پتہ نہیں میں نے جس انداز میں تمھارے لئے سوچا تمہارے موجودہ شوہر نے بھی سوچا ہوگا کہ نہیں۔

اس دن تم آئیں تو بہت اُجڑی اجڑی لگ رہی تھیں جاتی ہوئی بہار کا اداس نغمہ یا پھر ویرانیوں میں بازگشت کرتی ہوئی کراہ کی طرح۔ یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب لگا کیونکہ تم میرے پاس تو ایسی نہ تھیں۔ میں نے تو تمہیں پھولوں کی طرح رکھا تھا۔ ہر گرم و سرد ہوا کے شدّت پسند جھونکوں سے بچا کر تمہاری خوشی کی خاطر ہر کام کیا۔

ہاں واقعی ہر کام کیا۔ کسی انجانے درد نے بے چین کیا تو وہ اپنی تپتی کنپٹیاں سہلانے لگے۔

اے اللہ میں کدھر نکل آیا ہوں۔ کیسے ناآشنا پتھریلے راستے ہیں۔ آبلہ پا کے ساتھ چلنے کی ہمت نہیں اور چلے بغیر چارہ بھی نہیں..... ایسا کب مانگا تھا تجھ سے۔ کس دن ایسی آرزو کی تھی.. میں نے تو بڑے ارمانوں سے اپنی ملکہ کے لئے تاج محل بنایا تھا۔ اس میں آرزوؤں کے دیپک جلائے تھے۔

ابّو کے انتقال کے بعد جب انھوں نے اپنے نام والا فیڈرل ایریا کا مکان بیچ کر نور کی پسند کا فلیٹ خریدا تو اس بیچنے اور خریدنے کے درمیانی وقفے میں سب ہی نے ان کی مخالفت کی۔ بھائی بہن تو ایک طرف حتّٰی کہ چچی جان نے بھی انہیں سمجھایا تھا

"کیوں باؤلے ہوئے ہو ضیاء۔ نور تو دیوانی ہے۔ فلیٹ کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ اچھا بھلا ہوادار مکان ہے اسے بیچ کر کیوں کابک میں گھسنے کی تمنا کر رہے ہو۔"

وہ ساری بات سن کر دھیمے دھیمے مسکراتے رہے۔ سب کا سمجھانا بجا سہی مگر یہ نور کی فرمائش تھی۔ اسے فلیٹ کی زندگی بہت اچھی لگتی تھی۔ اور پھر اس نے جو فلیٹ پسند کیا تھا وہ اچھا بھلا اپارٹمنٹ تھا۔ ہر فلیٹ دوسرے فلیٹ سے قطعی الگ تھلگ

ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی وہ اس فلیٹ کو ضرور خرید لیتے۔ یہ ان کی جانِ تمنا کا حکم جو تھا۔ وہ بچپن ہی سے اس کے ناز اٹھاتے چلے آئے تھے۔ کیونکہ وہ واقعی ناز اٹھانے کے لئے ہی بنی تھی۔

جس دن وہ فلیٹ میں شفٹ ہوئے اسکے دوسرے دن ہی وہ چچی جان کو گولی دیکر نہ جانے کیسے آن دھمکی۔

"ہائے ضیاء سچ بڑی آفت جگہ ہے۔"

اس نے مغربی کھڑکی سے سورج کی ڈوبتی کرنوں کے آگے ہاتھ نچا کر کہا۔

"اوہو یہاں تم نے استری کی میز کیوں رکھ دی۔ یہاں تو اپنا بیڈ ہونا چاہیئے۔ شام کو جب تم آفس سے آجایا کرو گے نا تب ہم دونوں ان کرنوں سے نہایا کریں گے۔" وہ اپنی رو میں کہتی چلی گئی اور ضیاء اس تصور ہی سے سرخ ہو گئے۔

"لاؤنج میں تم بالائی کرسیوں کا سیٹ رکھوا دینا۔ وہ بڑے والے آسمانی گلدان اس پیسج میں اچھے لگیں گے "ڈرائینگ روم تم نے بالکل ٹھیک سیٹ کیا ہے۔ کچن کو بس ایسا ہی چھوڑ دو لسے میں خود سجاؤں گی۔ جیسے ہر جسم میں دل ضرور ہوتا ہے بالکل ایسے ہی ہر گھر کا دل اسکا کچن ہوتا ہے۔ کچن جتنا صاف ستھرا اور خوبصورت ہوگا گھر کے چہرے پر اتنی قدر تازگی بکھرے گی۔ اس تازگی کے حصول کے لئے عورت کا وجود لازمی امر ہے بالکل ایسے ہی جیسے دل جو عورت کے تصور سے خالی ہو ویران حویلی کی طرح ہوتا ہے جو بدروحوں کا مسکن ہو۔ عورت ہر روپ میں تازگی بخشتی ہے چاہے وہ ماں ہو، چاہے بہن ہو، چاہے بیٹی ہو اور چاہے بیوی ہو۔"

واقعی ایسا ہی ہوا۔ وہ جب دُلہن بن کر اتری تو گھونگھٹ اٹھاتے ہی اس نے کچن کو پاکیزگی کا جیتا جاگتا شاہکار بنا ڈالا۔

ایک کچن ہی کیا گھر کے ہر حصے پر بہار آگئی تھی۔

سب سے زیادہ وہ بہار تو اُس کے قرب کی وجہ سے خود ضیاء پر آگئی۔

وہ تھی بھی تو پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر جس کی کوئی تھاہ نہیں تھی یا ضیاء کو لگتی ہی نہ تھی۔ اس کے پیار میں ماں کی شفقت تھی جس کو امی کی موت کے بعد ضیاء ترسے ہوئے تھے۔ بہنوں کی سی غمگساری تھی جو اپنی منفرد سوچوں کی بنا پر ضیاء کو نہ مل سکی۔ بیٹی کی سی معصومیت تھی۔ بیوی کیا وہ تو مجسّم ساتھی تھی۔ بائیں پسلی سے نکلی ہوئی ساتھی۔ جو ہمدم تھی، دمساز تھی۔ مونس تھی۔ سب کچھ تھی۔ وہ آفس سے آتے تو یہ انہیں گیلری میں ٹہلتی مل جاتی۔ والہانہ انداز میں دوڑ کر گلے میں باہیں ڈال کر گردن پہ پیار کر لیتی کہ اس کی پہنچ

جیٹ
میں دھلے کپڑے
زیادہ صاف اور اُجلے
For White and
BRIGHT WASHING
Jet
Wonderful
DETERGENT
کپڑے کیسے ہی ہوں، کتنے ہی میلے ہوں ہمیشہ جیٹ سے دھویئے۔
جیٹ کم وقت اور کم خرچ میں زیادہ کپڑے زیادہ صاف اور اُجلے دھوتا ہے۔
جیٹ
سے گھر بھر کے کپڑے
پل بھر میں اُجلے
(R) JD-1/80
Adarts

یہیں تک بھی تھی۔ ان کپکپاتے ٹھنڈے ہونٹوں کے لمس سے ضیاء کی ساری تھکن دور ہو جاتی۔ وہ اسے اپنے سے لگائے لگائے اندر لے آتے۔ وہ جہاں بھی دم بھر کو بیٹھتے یہ بھاگ بھاگ کر ان کے بے شکن کپڑے گرد سے پاک چپلیں لا کر سامنے رکھ دیتی۔

○

ضیاء کی آمد کے مخصوص وقت پر وہ گھر میں تنہا رہنا چاہتی تھی۔ اگر کوئی آ بھی جاتا تو وہ اسے اس وقت ضرور ٹال دیتی۔ کبھی کبھی کوئی رات گزارنے والا مہمان آ جاتا تو وہ ضیاء کے آنے کے بعد بولائی بولائی پھرتی۔ جیسے کچھ کھو گیا ہو۔۔۔ یا کسی سخت ضروری چیز کی تلاش ہو۔ ضیاء اس کے جذبوں کی قدر کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح چند لمحے تنہائی کے نکال ہی لیتے۔ انہیں بھی گردن پر پیار کروانے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ جب تک پیار نہ کروا لیتے گردن پر ہاتھ پھیرا کرتے۔ اس پوری سال بھر کی ازدواجی زندگی میں انھوں نے کوئی دن اس کام سے عاری نہ چھوڑا تھا۔

ایک دفعہ ضیاء کو کسی سرکاری کام سے اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ انھوں نے لاکھ چاہا کہ نور یا تو میکے چلی جائے یا کسی کو اپنے پاس رہنے کے لئے بلا لے۔ مگر وہ مطلق نہ مانی۔ اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”نہیں ضیاء، اس گھر میں میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ یہاں تم سے وابستہ شوخ یادیں اور تمہاری خوشبو ہر ہر ذرے میں رچی بسی ہوئی ہے۔ میں ان یادوں سے جی بہلاؤں گی اور تمہاری خوشبو سے روح کو سرشار کروں گی۔ بس اور کیا چاہئے مجھے۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تنہائی کے خیال سے ضیاء کا پل بھر بھی جی نہ لگا۔ وہ کام ختم ہوتے ہی پہلی فلائیٹ سے واپس آ گئے۔ وہ دروازے پر ان کی منتظر تھی۔ شاید اس نے گیلری سے انھیں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ نزدیک آتے ہی لپک کر ان سے لپٹ گئی۔

”اب مجھے کبھی چھوڑ کر مت جائیے گا ورنہ مر جاؤں گی پیچھے سے۔“ وہ بچوں کی طرح ان کے سینے میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

ضیاء کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ اسے اپنی باہوں کے حصار میں لیکر ڈرائینگ روم میں آ گئے۔ وہ کوچ پر بیٹھی ان کے کاندھے پر سر رکھے سسکتی رہی اور وہیں سر رکھے رکھے سو گئی۔ اس کا سر ڈھلک کر نیچے آیا تو ضیاء کو احساس ہوا وہ شاید کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھی۔ جبھی تو یوں سو گئی ہے۔ انھوں نے بڑی آہستگی سے نور کو اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ بچوں کی طرح ذرا سی کلبلائی اور دوبارہ بے خبر ہو گئی۔ ضیاء کو خاصی بھوک لگ رہی تھی۔ انھوں نے سوچا تھا کہ نور کے ساتھ ہی کھانا کھائیں گے مگر اسے اتنی مدہوشی کے عالم میں سوتا دیکھ کر انھوں نے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی فرج میں کھانا تلاش کرنے لگے۔ فرج کھانوں سے بھرا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے سامنے کا بچا ہوا کوفتوں کا سالن جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ محترمہ بھوک ہڑتال بھی فرما رہی ہیں۔ عجیب احمق لڑکی ہے۔ ایسی محبت بھی کس کام کی کہ اپنے کو اچھی بھلی اذیت دے ڈالی۔ ان کے دل میں نور کی محبت کا پیمانہ کچھ اور لبریز ہو گیا۔ اس وقت ان کے دل سے بیساختہ دعا نکلی۔

”اے اللہ! اگر انسان ہونے کے ناتے سے میں کبھی بہک کر نور کے سوا کسی اور عورت پر نظر ڈالوں تو میرے رب اس لمحے مجھے موت دے دینا۔ مجھے اپنے پاس بلا لینا کیونکہ اسکی محبت کو ٹھکرا دینے کی سزا اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو سکتی۔“

دعا مانگنے کے بعد انھوں نے بہت مطمئن ہو کر تھوڑا سا دودھ لیا اور دو بسکٹ کھا کر پانی پی لیا۔ نور کی طرح وہ بھی پچھلی کئی راتوں سے بے آرام رہے تھے اس لئے جلد ہی سو گئے۔ صبح مارے نقاہت کے نور سے اٹھے نہیں بن رہا تھا۔ ضیاء نے اپنے ہاتھوں سے اسے ایک انڈا کھلایا اور ایک پیالی دودھ پلایا۔ جب کہیں جا کر اس کی جان میں جان آئی۔ ناشتے کے بعد وہ آفس جانے کے لئے اٹھے تو نور ان سے لپٹ گئی۔

”نہیں میں آج نہیں جانے دوں گی۔“ وہ وارفتگی سے بولی۔

”کیوں بھئی جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔“ ضیاء نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

”اوں ہنہ۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں۔ پورے دو دن میں نے پل صراط پر کھڑے رہ کر کاٹے ہیں۔ اب ان تمام لمحوں کا خراج وصول کروں گی۔“ وہ دوبارہ لپٹ گئی۔

”اچھا ایسا کرتا ہوں زبیری صاحب کو فون کر کے مطلع کر دوں۔“ ضیاء نے ترکیب بتائی۔

”ہاں یہ منظور ہے۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔

ضیاء نیچے فون کرنے چلے گئے۔

اور جب واپس آئے تو وہ تیار ہو چکی تھی۔

نور جسے ضیاء پچھلے سال بھر سے مسلسل دیکھ رہے تھے آج انہیں بالکل نئی اور ادھ کھلی کلی کی طرح لگی۔

نئی سج دھج تھی۔

دل موہ لینے کا نیا انداز تھا۔

دو دن کی جدائی نے وصل کی تمنا کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

وہ بے تاب ہو کر آگے بڑھے اور اسکے کلیوں جیسے نازک جسم بازوؤں میں اٹھا لیا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"سارا دن ان کا اپنا تھا
تنہائی تھی
اور آگ بھی دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔
وہ پیار کے بے اندازہ خزانے لٹاتے رہے
اور نور انھیں سمیٹتے سمیٹتے نہ تھکی۔
فرج میں ڈھیروں کھانا رکھا ہوا تھا۔
دوپہر کو ان لوگوں نے وہی گرم کر کے کھایا
کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد نہ جانے کیوں نور کو قے ہو گئی۔
وہ بجائے تھکاوٹ اور پژمردگی کے خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ لے کر باتھ روم سے باہر آئی۔

"جانی آج میں بہت خوش ہوں۔ مجھے قے ہوئی ہے۔" اس نے سرشاری سے کہا

"ہیں اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟" ضیاء ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"یہ شاید چوچو کی آمد کی اطلاع ہے۔" وہ شرما کر بولی۔

"اوہو! ... ضیاء خوشی کے مارے پاگل ہو گئے۔ انہوں نے نور کو گود میں اٹھا کر سارے کمرے میں چک پھیریاں کھلا ڈالیں

"اللہ... اللہ..." وہ پیٹ پکڑ کر ہنستی رہی۔

"ایسا کرنا شام کو لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کروا لینا۔" ضیاء نے نہ صرف رائے دی بلکہ خود ہی شام کو اسے لیکر کلینک پہنچ گئے۔

وہ چیک اپ کروا کے بڑا بڑا سا منہ بنائے باہر نکلی۔

"کیوں کیا بات ہوئی...؟" ضیاء نے اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر پوچھا۔

"ڈاکٹر کہتی ہیں پندرہ دن بعد آکر چیک اپ کروائیے گا ابھی کچھ نہیں بتا سکتی۔" وہ بسور کر بولی۔

"میں پورے پندرہ دن کیسے انتظار کروں گی۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی رو پڑی۔

"ارے پگلی کہیں کی... اتنی شدت پسندی اچھی نہیں ہوتی پندرہ دن ہی کے لئے کہا ہے نا؟ کون سے پندرہ سال کے لئے کہا ہے۔ دیکھ لینا پتہ بھی نہیں لگیں گے یہ پندرہ دن۔۔" انھوں نے پیار سے تھپتھپا کر کہا۔

مگر ضیاء کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔

ان پندرہ دنوں کا ایک ایک لمحہ اس نے آنے والے مہمان کی یاد میں کاٹا۔ دوسرے دن ہی وہ ایک بڑا سا بکس خرید لائی۔

"اللہ رحم کرے یہ اتنا بڑا بکس کیوں خرید لیا؟" آفس سے آتے ہی سب سے پہلے ضیاء نے یہی سوال کیا۔

وہ ہنستی رہی۔ کچھ جواب نہ دیا۔

"اچھا سمجھا شاید اسے بطور بیڈ روم استعمال کرنے کا ارادہ ہے۔ بالکل نیک خیال ہے۔ چلو اچھا ہے تمہاری شکایت بھی دور ہو جائے گی۔ اور میری رات کو ادھر ادھر لڑھکنے کی عادت بھی ختم ہو جائے گی۔" وہ شوخی سے بولے۔

نور نے انہیں منہ چڑا کر ٹھینگا دکھایا۔

"بڑے آئے کہیں سے اس میں سونے والے۔ میں تو یہ بکس چوچو کے سامان کے لئے لائی ہوں۔" اس نے شرما کر بتایا۔

"ہاہاہا..." ضیاء نے پوری قوت سے قہقہہ لگایا۔ واہ بھئی واہ نام خوب سوچا ہے تم نے چائنا مین کی اولاد کا۔ اور فرض کرو اگر چوچی آ گئی تو کیا کرو گی؟" انھوں نے محض نور کو تنگ کرنے کی غرض سے کہا۔

نور نے فوراً ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بدفال منہ سے نہیں نکالتے۔ پہلا پھل میٹھا ہی ہونا چاہیئے" وہ سہم کر بولی۔

"لڑکیوں سے زیادہ پیاری اور میٹھی چیز کون ہو سکتی ہے۔" انھوں نے نور کی پیشانی چوم کر کہا۔

"نہیں۔ مجھے تو لڑکے چاہیئے ہیں۔" وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"احمق ہو۔ خدا کی قدرت میں کس کا دخل ہے۔ اگر اسے منظور نہ ہوا تو..." ضیاء نے پیار سے سمجھایا۔

"نہیں مجھے یقین ہے وہ میری دعا ضرور سنے گا۔" نور نے زور دے کر کہا۔

"اچھا بھئی تم جیتیں میں ہارا۔ خدا تمہیں پہلا بیٹا ہی دے۔" انھوں نے صدق دل سے دعا دی۔

اس کے بعد تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ وہ بازار جاتی اور کوئی نہ کوئی چیز خرید لاتی۔ ضیاء آفس سے واپس آتے تو انھیں بڑے شوق سے دکھاتی۔ ایک دن تو حد ہی کر دی۔ درزی سے بہت بڑا لحاف سلوایا۔ ضیاء نے دیکھا تو بے ساختہ ہنس دیئے۔

"کیوں بھئی تمہارا چوچو اتنا بڑا لحاف اوڑھے گا کیا؟" انھوں نے لحاف کو پھیلا کر پوچھا۔

"جی نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ کے بنا نیند نہیں آتی اور چوچو میرے بغیر سو نہیں پائے گا۔ اسی لئے میں نے یہ ترکیب نکالی کہ اتنا بڑا لحاف بنواؤں جو تینوں کے کام آ سکے۔" اس نے سمجھایا۔

"مگر یار ابھی تو سردیاں بہت دور ہیں۔" ضیاء اس کی بیوقوفی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

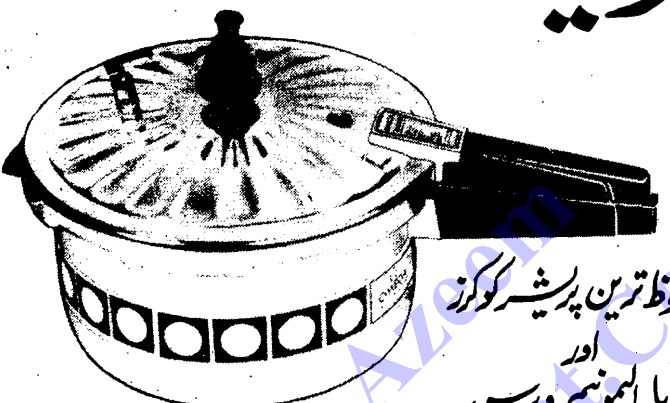

WaqarAzeem pakistanipoint.Com

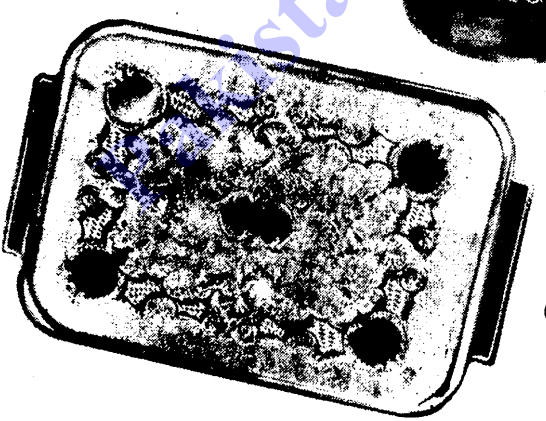

کا مذاق اڑاتے ہوئے بولے۔

"تو کیا ہوا۔ جب چوچو صاحب تشریف لائیں گے تب تک سخت سردیاں آچکی ہوں گی۔" اس نے حساب لگا کر بتایا۔

ضیاء سوچ میں پڑ گئے۔

نور کا یہ ذوق و شوق اتنی بے تابی اور اسقدر یقین۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ابھی اللہ کو منظور نہ ہوا تب کیا ہوگا۔ یہ دیوانی لڑکی تو پاگل ہو جائے گی.... وہ کچھ پریشان سے ہو گئے۔

"نور۔ میری ایک بات مانو گی؟" انھوں نے بہت پیار سے پوچھا۔

"میں نے آپ کی کوئی بات ٹالی ہے؟" اس نے حیرت سے دیکھا۔

"تو ایسا کرو بقیہ خریداری چیک اپ کے بعد کر لینا۔" انھوں نے نور کو سمجھانا چاہا۔

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

رنگ فق پڑ گیا۔

جواب میں سر ہلا کر رہ گئی۔

ضیاء پشیمان ہو گئے۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے لگا لیا۔

"جان میرا یہ مطلب یہ تھوڑی تھا کہ تم یوں اداس ہو جاؤ۔ خدا تمھاری آرزو ضرور پوری کرے گا۔ مگر دیر سویر بھی ہو سکتی ہے اس کے لئے تمھیں ذہنی طور سے تیار رہنا چاہیئے۔" انھوں نے بہت پیار سے سمجھایا۔

ان کے سمجھانے کا تو الٹا ہی اثر ہوا....

وہ اس بری طرح سے پھوٹ پھوٹ کر رو دی کہ ضیاء بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"نور اگر تم چپ نہ ہوئیں تو تمھاری قسم میں بھی رونا شروع کر دوں گا۔" انھوں نے چپ کرانے کا ہر جتن کر لینے کے بعد کہا۔

"نہیں۔ ایسا مت کہو۔" نور نے سہم کر آنسو پونچھ ڈالے

"اچھا اب فوراً تیار ہو جاؤ۔ ہم ہاکس بے چلتے ہیں۔" انھوں نے بہلانے کے لئے کہا اور بڑے چاؤ سے اسے خود تیار کروایا۔

وہ رات گئے تک اسے گھماتے پھرے مگر اسکی اداسی کم نہ ہوئی۔ دوبارہ چیک اپ کا دن آنے تک وہ یونہی کھوئی کھوئی سی رہی۔

چیک اپ والی شام ضیاء نور کے ساتھ ساتھ رہے۔

چیک اپ کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے ان کے سامنے ہی بتایا۔

"کچھ بھی نہیں ہے ان کا وہم تھا۔" اس لمحے ضیاء نور کو سنبھال نہ لیتے تو شاید وہ گر پڑتی۔

"آخر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔ کتنا عرصہ ہوا ہے شادی کو؟" لیڈی ڈاکٹر نے الجھ کر پوچھا۔

"پورے تیرہ مہینے ہو گئے ہیں۔" اس نے بہت مشکل سے بتایا۔

"لو بھئی۔" ڈاکٹر ہنس پڑی۔ "لوگ تو تیرہ سال میں بھی اتنا نہیں گھبراتے۔ اللہ پر شاکر رہتے ہیں۔" اس نے تسلی دی۔

"نہیں ڈاکٹر۔ مجھ میں انتظار کا حوصلہ نہیں ہے۔" وہ بے چین ہو کر بولی۔

اور کسی جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل آئی۔

ضیاء فیس ادا کر کے باہر آئے تو دیکھا وہ گاڑی کی سیٹ سے سر ٹکائے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

"جان اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو۔ ٹھیک تو کہہ رہی ڈاکٹر۔ ابھی کون سی صدی بیت گئی ہے۔" انھوں نے بہت آسان سے کہا۔

"گدھی ہے یہ ڈاکٹر۔ سخت نامعقول ہے۔ میں کسی دوسری ڈاکٹر کو دکھاؤں گی۔" اس نے جل کر کہا۔

"اچھی بات چلو کسی اور ڈاکٹر کو دکھا لینا۔" وہ فوراً راضی ہو گئے۔

دوسری ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد بھی وہ مطمئن نہ ہوئی۔ یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ ضیاء بے چارے اس کی خوشی کی خاطر گھن چکر بنے رہے۔

ایک لیڈی ڈاکٹر نے اسے غیر مطمئن دیکھ کر گائینکالوجی کے سب سے بڑے اسپیشلسٹ کا پتہ بتا دیا۔

اسپیشلسٹ نے سرسری معائنے کے بعد دونوں کی میڈیکل رپورٹ مانگی۔ ضیاء کو اپنے پر اعتماد تھا۔ انھوں نے جلد ہی چیک اپ کروا کے رپورٹ دے دی۔ مگر یہی اعتماد ان کی تباہی کا باعث بن گیا۔ ان پر یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ وہ باپ بننے کے اہل نہ تھے۔

یہ سب کچھ نور کے روبرو بتایا گیا۔

وہ تو جیسے پتھر کا بت بن گئی۔

سارے راستے ضیاء نے لاکھ بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ بس خالی خالی نظروں سے باہر بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھتی رہی۔

گھر آ کر اس پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے یکبس

Waqar Azeem pakistanipoint.com

میں رکھی ہوئی ساری چیزیں تہس نہس کر ڈالیں۔
ضیاء بڑی مشکل میں پھنس گئے۔
اصل مجرم وہ اپنے کو سمجھ رہے تھے۔ اسلئے کچھ بولنے کے مجاز بھی نہ تھے۔ بہت دیر تک ساری کارروائی دیکھنے کے بعد بس یہی کہہ سکے۔
"اتنی اپ سیٹ کیوں ہو رہی ہو۔ فوراً اگلے ماہ مجھے سرکاری کام سے لندن جانا ہے تم بھی ساتھ چلی چلنا۔ اللہ کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالے گا۔"
"میں کچھ نہیں جانتی ضیاء۔ مجھے بچہ چاہیئے —— ورنہ میں خودکشی کرلوں گی۔" وہ ہچکیاں لیتی ان کے بازوؤں میں آن گری۔
ضیاء کو کیا خبر تھی کہ زندگی ایسا موڑ بھی اختیار کر سکتی ہے ورنہ وہ سہرے سے شادی ہی نہ کرتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ چیک اپ کے بعد سے ان کی ساری شوخی، ساری زندہ دلی ایک دم ہی ختم ہو گئی۔ وہ پہروں اسی سوچ میں غلطاں رہتے کہ اگر لندن میں بھی مایوسی ہوئی تب کیا ہوگا۔ کہیں یہ جنونی لڑکی واقعی اپنے آپ کو ختم نہ کرلے۔
مگر لندن سے واپسی پر تو اس سے بھی زیادہ دھماکہ خیز بات ہوئی وہ نور جو ان سے ایک لمحے کے لیے جدا ہونا پسند نہ کرتی تھی، ایئرپورٹ سے اتر کر سیدھی اپنے گھر چلی گئی۔
اور وہ بہت ٹوٹا دل لئے اپنے اسی فلیٹ میں آ گئے جو انھوں نے محض نور کی خاطر خریدا تھا۔
لندن میں انھوں نے نور کو سمجھانے کی بے حد کوشش کی تھی۔
ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی تجویز بھی پیش کی تھی۔
کسی لاوارث بچے کو گود لینے پر بھی اصرار کیا تھا۔
مگر اس پر تو جیسے بچے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔
وہ ہر لمحہ ان سے لڑتی جھگڑتی رہی۔
انہیں طعنے دیتی رہی
مسلسل انہیں کچوکتی رہی
مگر انھوں نے اُف نہ کی۔
وہ سمجھے تھے وقتی ہیجان ہے۔ کم ہو جائے گا تو آپ پشیمان ہو گی۔
مگر یہ وقتی ہیجان نہ تھا۔
ہر ایک کے منع کرنے کے باوجود نور نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ کئی دن تو ضیاء کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔
نور اور اسکی والہانہ محبت کے مظاہرے کیا وقتی تھے۔

برجر- پینٹس کی دنیا میں سرفہرست

برجر گروپ کا دائرہ کار بین الاقوامی سطح پر اس قدر وسعت اختیار کر چکا ہے کہ آج دنیا کے ۲۵ سے زائد ممالک میں اس کے نمائندے اور ذیلی ادارے قائم ہیں۔
پاکستان میں برجر پینٹس آپ کے لئے روبیالیک تیار کرتے ہیں روبیالیک پینٹس کے نام سے پاکستان کے بیشتر لوگ بخوبی واقف ہیں۔ اس کے علاوہ برجر پینٹس پاکستان لمیٹڈ مختلف قسم کے اسپیشلائزڈ کوٹنگز، انڈسٹریل اور میرین پینٹس بھی تیار کرتے ہیں۔

برجر پینٹس پاکستان لمیٹڈ

SAHA AD

"کیا صنف نازک یوں بھی اپنی وفاداریاں بدل لیا کرتی ہے؟"
اب تک تو انھوں نے مردوں ہی کو بے وفا سنا بھی تھا۔ پڑھا بھی تھا۔ اور دیکھا بھی تھا۔

مگر یہاں تو الٹی گنگا ہی بہہ رہی تھی۔

ان کی بے لوث محبت اور چاہت کے بے اندازہ خزانوں سے بھی وہ مطمئن نہ تھی۔

وہ جس نے ان کے ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں جیتے جی انہیں زندہ درگور کئے جا رہی تھی۔

کیا عورت کے ایثار، وفا اور خلوص کے متعلق لکھی گئی ساری کی ساری داستانیں جھوٹی تھیں۔

کیا سب عورتیں بچوں کی ڈوری سے بندھ کر ہی وفادار رہ سکتی ہیں۔

کیا زندگی اسی کا نام ہے؟

انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ نور کسی طرح ان کا موقف مان لے۔ مگر اس نے تو طلاق لے کر ہی دم لیا

صرف دو سالہ ازدواجی زندگی کے بعد اتنا کاری زخم کھا کر وہ سرے سے عورت ذات ہی سے متنفر ہو گئے۔

نور کے طلاق لینے کی وجہ کا چرچا اتنا بڑھا کہ وہ گھبرا کر ملک ہی چھوڑ گئے۔

تین سال تک نگر نگر کی سیاحی کے بعد وہ جب وطن واپس آئے تو انہیں خبر ملی کہ پچھلے ہی سال نور کی دوسری شادی ہو گئی ہے اور وہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی ہے۔ اس کا شوہر دہران میں ملازم ہے۔ سال بھر میں صرف ایک ماہ کے لئے گھر آتا ہے۔ اس خبر سے انہیں بہت اطمینان ہوا۔ ان کی بے پایاں محبت کو ٹھکرانے کے بعد نور جب پورے گیارہ مہینے شوہر سے دور رہتی ہو گی تب ضرور ان کی یاد سانپ بن کر ڈستی ہو گی۔

وہ اپنے تئیں خوش ہوتے رہے۔ نور نے ایک عدد بیٹی کو اور جنم دے لیا۔

وہ کبھی کبھی قدرت سے بہت شاکی ہو جاتے۔ اتنا بڑا وقت گزرنے کے بعد بھی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پائے تھے حالانکہ پاکستان آنے کے بعد عزیزوں اور دوستوں نے بہت دلجوئی کی مگر یہ ایسا زخم نہ تھا جو اتنی جلدی بھر جاتا۔

وہ ہر لمحہ یہی خواب دیکھتے رہتے کہ نور ان کے پاس آئی ہے۔ اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر، اس کے بچے وہیں چھوڑ کر اور کہہ رہی ہے کہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے بچے وچے کچھ نہیں چاہیئیں۔

یا پھر کسی حادثے میں اس کا شوہر اور بچے ہلاک ہو گئے ہیں۔ وہ پھر سے اکیلی رہ گئی ہے اور انھوں نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھام لیا ہے۔

مگر ان کا ایک خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

وہ یونہی خزاں کے ٹوٹے پتے کی طرح ادھر سے ادھر اڑتے رہے اور نور اپنے گھر میں بسی رہی۔

اسی دوران ان کی شادی کے لئے بے شمار رشتے پیش کئے گئے۔ ایسی خواتین کے جو بانجھ تھیں اور ان کے اسی عیب کی وجہ سے ان کے شوہروں نے انہیں طلاق دے دی تھی۔

یا ایسی لڑکیوں کے جو ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے تجربے کے لئے تیار تھیں۔

یا پھر ایسے رشتے بھی آئے کہ لڑکیاں ان کی داستان سننے کے بعد محض ازراہ ہمدردی انھیں اپنانے کو تیار تھیں۔

مگر نور کے بعد انہیں عورت ذات سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

وہ اس کے بعد کسی اور کی طرف دیکھنا گناہ سمجھتے تھے۔

نور نے اگر ان سے بے وفائی کی تو کیا ہوا۔ وہ اپنی وفا پر آنچ نہ آنے دینا چاہتے تھے۔ ان کے ان جذبوں کا لوگوں نے بہت مذاق اڑایا۔ مگر یہ دلوں کے معاملے تھے۔ ان کی گہرائیوں کو بھلا سطحی جذبات رکھنے والے لوگ کیسے سمجھ سکتے تھے جبکہ انھوں نے اپنا فلیٹ جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ حتیٰ کہ نور کی الماری میں اس کے کپڑے تک ویسے ہی سجے ہوئے تھے۔ جب وہ زیادہ ہی بے چین ہو جاتے تو ان کپڑوں کو اپنے اوپر ڈال کر سو جاتے۔ انہیں لگتا جیسے نور اپنی نرم و نازک انگلیوں سے ان کا سر سہلا رہی ہو یا وہ اپنا منہ اسکے بالوں میں چھپائے پڑے ہوں۔ وہ گھنٹوں ایسے خواب دیکھتے رہتے اور جاگنے پر بڑے فریش ہو ہو جاتے۔

ایکدم تازہ تازہ بیاہے ہوئے انسان کی طرح

یہی خواب ان کی زندگی تھے اور یہی حاصل زندگی۔

وہ ان ہی خوابوں کے عادی ہو چلے تھے کہ ایک دن واقعی نور چلی آئی۔

مخصوص کال بیل پر وہ بھاگ کر گیلری میں گئے۔ وہاں نور کھڑی تھی۔ اپنے تمام تر میک اپ اور بناوٹ کے باوجود بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔ اس کا دو سالہ بیٹا اس کی ساری کا پلو پکڑے کھڑا تھا۔ اور بیٹی گود میں تھی۔

ان کا دل چاہا کہ ان دونوں بچوں کو اٹھا کر نیچے پھینک دیں

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

این فرینچ
غیر ضروری بالوں کو
سہولت سے صاف کرتا ہے
این فرینچ کریم یا لوشن لگائیے، چند منٹ انتظار کیجئے اور پھر دھو ڈالئے۔ این فرینچ کا موثر بال صفا عمل کوئی خراش، جلن یا بدنما جڑیں چھوڑے بغیر بال صاف کر دیتا ہے۔
این فرینچ کریم اور لوشن گلاب اور لیمن کی دو دلفریب خوشبوؤں کے ساتھ دستیاب ہے۔
این فرینچ
کریم اور لوشن
Anne French lotion hair remover
Anne French cream hair remover
CREAMS AWAY HAIR FROM FACE LEGS.ARMS AND UNDERARMS
25 gms
MNJ

اور نور کو اپنے بازوؤں میں چھپالیں۔ سب کی نظروں سے بچالیں۔

"کیا اب اندر آنے کو بھی نہ کہو گے؟" نور نے انہیں یوں گم صُم کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

وہ چُپ چاپ ایک طرف کو ہوگئے۔

نور نے اندر آکر دیکھا۔ گھر بالکل ویسے کا ویسا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

وہ بڑے اطمینان سے آکر بیڈ پر بیٹھ گئی اور بچّی کو بیچ میں لٹا دیا۔

ضیاء نے دونوں بچّوں کو دیکھا۔ وہ شاید باپ پر گئے تھے۔ موٹی ناک اور چندھی آنکھوں والے سانولے بچّے۔ جو نور کی گود میں چڑھے بھی بُرے لگ رہے تھے۔

کافی دیر ماحول میں صرف خاموشی کا راج رہا۔

"تم نے پوچھا نہیں میں کیسے آئی؟" نور نے تنگ آکر خود ہی بات نکالی۔

"ہاں بتاؤ۔" ضیاء نے چونک کر سنبھلتے ہوئے کہا

"ظفر دوسری شادی کر رہے ہیں۔" اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"اوہو... وجہ...؟" ضیاء نے حیران ہوکر پوچھا۔

"کہتے ہیں ان تین سالوں میں مجھے تم سے پل بھر کے لئے بھی ذہنی سکون نہیں مل سکا۔ ہر لمحہ یہی خیال رہتا ہے کہ تم اَن چھوئی نہیں ہو۔ کوئی اور بھی تمہارے اس جسم کا مالک رہ چکا ہے۔ تم ایسی ہی راتیں کہیں اور بھی گزار کے آئی ہو۔ تمہیں اولاد کی خواہش تھی تمہیں اولاد مل گئی۔ اب میں اپنی خواہشات کی تکمیل کروں گا۔ کسی کم عمر کنواری لڑکی سے شادی کروں گا۔"

میں نے ان سے کہا ضیاء کہ اب دو بچّوں کی موجودگی میں آپ کو کون بیٹی دے گا۔ کہنے لگے پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ تم ایک کی بات کرتی ہو۔ کہو تو میں ایک ساتھ تین لاکر دکھادوں۔

میں نے اس وقت تو ان کی بات ہنسی میں اڑادی مگر واقعی پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ انہیں نہ صرف رشتہ مِل گیا بلکہ لڑکی والے اب شادی کے لئے خاصی جلدی مچارہے ہیں۔" وہ بات پوری کرکے ضیاء کو غور سے دیکھنے لگی۔

"تو اب مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" ضیاء نے رُکھائی سے پوچھا۔

ان کا لہجہ محسوس کرکے نور چُپ ہوگئی۔

وہ شاید آنسوؤں کو چھپانے کی خاطر اٹھ کر مغربی دریچے میں آکر کھڑی ہوگئی۔

ضیاء نے پلٹ کر دیکھا۔ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں وہ دونوں سورج کی ڈوبتی شعاعوں سے نہایا کرتے تھے۔ اس وقت نور وہاں کھڑی چپکے چپکے آنسو پونچھ رہی تھی۔

انہیں ترس آگیا۔

"تم نے بتایا نہیں نور۔ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟" انھوں نے رسان سے پوچھا۔

"تمہارے کرخت لہجے نے تو میری ساری آس ہی توڑ دی۔ میں تو یہ اُمید لیکر آئی تھی کہ اب یہیں کی ہو رہوں گی۔ مجھے بچّے چاہیئے تھے، بچّے مل گئے ہیں۔ ظفر ٹھیک کہتے ہیں مجھے خود ان کے پاس رہ کر لمحے بھر کو بھی ذہنی سکون نہ مِل سکا۔ ہر لمحہ تمہاری مہک کی یاد سانسوں کو جلاتی رہی۔ اب خدا نے مجھے موقع دیا ہے تو اسے کیوں ضائع کروں۔ اگر ظفر بچوں کو چھین بھی لیں گے تب بھی مجھے پرواہ نہیں۔ یہ بچّے بڑے ہوکر کبھی نہ کبھی تو مجھ سے ضرور آن ملیں گے نا۔ مجھے مایوس نہ کرنا ضیاء تم سے جدا ہوکر میں بہت ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں۔ بہت بکھر گئی ہوں۔ میں اپنے منتشر وجود کو یکجا کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کو جوڑنا چاہتی ہوں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تمہارے پاؤں پکڑتی ہوں۔" وہ جھک کر ضیاء کے قدموں سے لپٹ کر زار زار رونے لگی۔

ضیاء پگھل گئے۔

انھوں نے نور کو اٹھانے کے لئے اپنے سینے پر بندھے ہاتھ کھولے مگر عین اسی وقت ان کے بیڈ پر سوئی ہوئی نور اور ظفر کی بیٹی نے اٹھ کر چنگھاڑنا شروع کردیا۔

نور بیتاب ہوکر ادھر بھاگی۔

ضیا کی بھنویں تن گئیں۔

وہ ہونٹ بھینچ کر سوچنے لگے

یہی بچّے تو تھے جن کی وجہ سے ان کے اور نور کے درمیان علیحدگی ہوئی۔ اب یہی بچّے زندگی بھر ان کے لئے ذہنی کوفت کا باعث بنے رہیں گے۔ نور اسی طرح بے چین ہوہوکر ان کی طرف پلٹتی رہے گی۔ وہ ماں بن چکی ہے۔ اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک بھی مکمل طور سے میری ہوکر نہیں رہ پائے گی۔ اس نے ٹھیک کہا ہے۔ اگر ظفر نے بچّوں کو چھین بھی لیا تب بھی وہ بڑے ہوکر اس سے آن ملیں گے۔ میری راہ کی دیوار بنے رہیں گے نور خوشامد سے محبت سے انھیں اپنے ہی پاس رکھنے کی بات منوالے گی اور میں کچھ بھی نہ کرپاؤں گا۔ سوائے دل ہی دل میں جلنے کے۔ کیونکہ نزدیک آکر یہ مجھ پر سحر کردیتی ہے۔ لگتا

گوری رنگت اور بے داغ جلد حُسن کی علامت

اسٹلمینز بلیچ کریم

اسٹلمینز بلیچ کریم کے باقاعدہ استعمال سے جلد گوری ہوتی ہے اور دھوپ کی تمازت، موسمی اثرات اور کاسمیٹکس کے ناخوشگوار اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔

اسٹلمینز فریکل کریم

جلد کے داغ، دھبے، مہاسے اور چھائیاں دور کرنے اور جلد کو تر و تازگی بخشنے کیلئے اسٹلمینز فریکل کریم استعمال کیجئے۔

امریکہ میں
1891 میں قائم شدہ

دُنیا کی قدیم ترین اور سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کریم

اسٹلمینز جلد کی حفاظت کیلئے آرائش حُسن کے ماہرین کا تجویز کردہ

منادر

کوئی صاحب فراق گورکھپوری سے ہندو مسلم اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے بار بار مساجد و منادر کے الفاظ استعمال کر رہے تھے مندر کی جمع منادر فراق صاحب کے احساسِ جمال پر گراں گزر رہی تھی چنانچہ کافی ضبط کے بعد فراق ایک دم ان کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگے "صاحب! مصیبت یہ ہے کہ منادر میں بنا در بہت آجاتے ہیں۔"

نصرت مرتضیٰ، کراچی

ہے میں ڈسٹرب ہو جاتا ہوں۔ ہر کام اسی کی مرضی کے مطابق کرنے کا پابند۔ اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ ابھی ہی اس کو مایوس کر دوں۔ مجھ میں اب مزید ٹوٹنے کی سکت نہیں ہے۔ بس اتنا ہی انتشار کافی ہے۔ میں نے ان بچوں کے تصور کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے نفرت ہے ان سے۔" انھوں نے مکے تان کر سوچا۔

نور ان کے تاثرات پڑھ رہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیڈ کے نزدیک بنی مغربی کھڑکی پر آکر کھڑے ہو گئے۔ تب کہیں جا کر نور میں بولنے کی ہمت ہوئی۔

"پھر کیا جواب ہے تمہارا ضیاء؟"... اس نے پوری قوت جمع کر کے پوچھا۔

نفرت کی ایک لہر اٹھی جو ضیاء کے سارے وجود پہ چھا گئی۔

"تم میں اتنی ہمت کیسے ہوئی کہ دوبارہ میرے گھر آئیں۔ مجھے برباد کرنے کے بعد اب سکون سے دیکھ کر پھر بے چین ہو ہو گئی ہو۔ سن لو اگر میرے پاس دوبارہ آنا ہے تو ان دونوں سنپولیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا ہو گا۔" انھوں نے بھڑک کر کہا۔

نور بہت دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔

پھر کچھ کہے بغیر بہت خاموشی سے بچوں کو لے کر واپس ہو گئی۔ اور وہ اس کی اٹل حقیقت جیسی موجودگی کو اپنا وہم ہی سمجھتے رہے۔ ایسا خواب گردانتے رہے جو وہ پچھلے کئی سالوں سے مسلسل دیکھ رہے تھے۔

سورج کی روشنی ان کے پیچھے سے ابھر کر سارے سمندر پر پھیل رہی تھی۔

تو وہ ساری رات سمندر کی موجوں میں بیٹھے خواب دیکھتے رہے.... انھوں نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

کچھ دور پر لوگوں کا مجمع تھا۔

بحریہ کے غوطہ خور سمندر میں ڈوبنے والی عورت اور اس کے بچوں کی لاشیں نکال کر لا رہے تھے۔

رات بھر پانی میں بیٹھے رہنے کے بعد ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ حادثے سے متعلق معلومات کرتے۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتے گاڑی میں آ بیٹھے اور سیدھے فلیٹ آ گئے۔

وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ وہ گھر آکر بے خبر سو جانا چاہتے تھے۔

مگر لاک کھولتے ہی عین دروازے کے بیچوں بیچ انہیں ایک پرچہ پڑا ہوا ملا۔

کس کا ہو سکتا ہے یہ... انھوں نے الجھ کر کھولا۔

ضیاء جانی!

تم نے کہا تھا نا، کہ میرے پاس آنا ہے تو ان دونوں سنپولیوں کو اپنے ہاتھ سے ختم کرنا ہو گا۔ آج جب میں ان دونوں کو سمندر برد کرنے جا رہی ہوں تو سوچتی ہوں کہ ایک ماں بھلا اپنے بچوں سے دور کیسے رہ سکتی ہے۔ لہٰذا میں بھی ان ہی کے ساتھ سو جاؤں گی۔ کیونکہ اب میرے لیئے دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ مجھ جیسے بے صبرے انسانوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ بنی ہی نہ تھی۔

اچھا خدا حافظ

فقط نور

ضیاء پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ منظر یاد کرنے لگے جو انہوں نے ابھی ابھی سمندر کے کنارے دیکھا تھا۔

دیر تک پانی میں رہنے کی وجہ سے غبارے کی طرح پھولی ہوئی عورت اور اس کے دو بچوں کی لاشیں۔

یہ خواب تھا یا حقیقت۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ پا رہے تھے۔

✱

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

گلوں میں رنگ بھرے

سحر آفتاب قریشی

کلب کے وسیع و عریض روشنیوں سے جگمگاتے اس ہال میں صرف ایک چہرہ سب رنگینیوں پہ حاوی تھا۔ اس چہرے کے جھلملاتے عکس جو یا تو اس کے خداداد حسن کی وجہ سے تھے یا ہیروں کی چمک دمک سے۔

وہ مسلسل ایک گھنٹے سے صرف اسی کی خاطر کھڑکی کے قریب بیٹھے تھے۔

وہ حسنِ بے نیاز... اس نے تو شاید ان کی طرف ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہ کیا تھا۔ صاحب زادہ الطاف بار بار بےچینی سے پہلو بدل لیتے۔ وہ مسلسل اس کے قریب جانے کا بہانہ سوچ رہے تھے۔ لیکن کوئی حل ان کے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ "خدا جانے یہ کم بخت فراز کہاں مر گیا۔" انھوں نے دل ہی دل میں فراز کو کوسا جس نے اپنی شادی کی خوشی میں آج یہاں اپنے تمام قریبی دوستوں کو پارٹی دی تھی۔ اے کاش فلمی سچوئیشن یہاں بھی پیدا ہو جاتی۔ اور یہ محترمہ جو مسلسل پندرہ دنوں سے میرا قرار لوٹے ہوئے ہیں دلہن بھابھی کی سہیلی نکل آتیں۔" انھیں اپنی بچکانہ سوچوں پر خود ہی ہنسی آرہی تھی۔ فراز دنیا میں ان کا واحد دوست تھا جس کے لیئے وہ جان تک لٹا دینا بھی معمولی بات سمجھتے تھے۔

جب اس کی شادی کے پروگرام شروع ہوئے صاحبزادہ ہر وقت اس کے قریب ہی رہے اور پندرہ دنوں میں وہ اسے کم از کم بارہ مرتبہ تو دیکھ ہی چکے تھے۔ حد یہ کہ کہیں آتے جاتے راستے میں بھی وہ انھیں نظر آہی جاتی تھی۔ الطاف فراز سے حد درجہ بے تکلف تھے۔ لیکن محبت کے معاملات میں ان کے نظریات اتنے نازک اتنے خوابناک تھے کہ کسی سے ان کا ذکر کرنا انھیں حسنِ معصوم کی توہین نظر آیا۔

صاحبزادہ الطاف حال ہی میں اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے یو۔ کے سے لوٹے تھے۔ ان کے ڈیڈی ان کے یو۔ کے قیام کے دوران ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے تھے۔ لے دے کے ایک ممی تھیں جنھیں وہ اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ وہ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ بچپن سے ہی گورنس کی حفاظت میں پوری دنیا سے الگ تھلگ رہے۔ لہٰذا مزاج میں پختگی اور طبیعت میں خاموشی کا عنصر غالب تھا۔ گھر میں کوئی اور بھائی بہن ہوتا تو اور بات تھی۔ ممی ایسی سخت گیر تھیں کہ کبھی آس پاس کے بچوں سے کوئی خاص ربط رکھنے کی اجازت نہ دی۔ دراصل وہ کسی کو اپنے قابل سمجھتی ہی نہ تھیں۔ بے تحاشا دولت اور اونچے اسٹیٹس نے ان کے دماغ میں نخوت بھر دی تھی۔ رشتہ داروں سے بھی بس واجبی سا ہی تعلق تھا۔ کسی سے زیادہ میل ملاقات کو پسند نہ کرتی تھیں۔ بچپن تو جیسے تیسے گزر گیا لیکن شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد الطاف محسوس کرنے لگے کہ ممی ہر وقت کچھ الجھی الجھی سی رہتی تھیں۔ گو ڈیڈی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ لیکن ممی وہ کردار کبھی ادا نہ کر سکیں جو ایک خالص مشرقی بیوی کا ہوتا ہے۔ الطاف اس پہلو پر بہت سوچتے لیکن وہ کبھی کچھ نہ سمجھ سکے کہ یہ سب کیا تھا۔ آخر ممی کو کس چیز کی کمی تھی۔ ممی کے ہونٹوں پر انھوں نے کبھی مسکراہٹ نہ دیکھی تھی۔ انہیں کیا غم تھا۔ کونسا احساسِ محرومی تھا جس نے اتنی خوشیوں کے باوجود ان کا سکون لوٹ لیا تھا۔

اب جب الطاف واپس آئے تو پھر بھی وہی شب و روز تھے۔ اور اب تو احساسِ محرومی کے ساتھ ساتھ بیوگی کی سوگواری بھی شامل ہو گئی تھی۔ گھر کی خاموشی انھیں اب بے حد محسوس ہوا کرتی تھی۔ شاید یہ یو۔ کے کی رنگینیوں اور شور و غل سے پُر ماحول کا اثر تھا۔ اس لئے الطاف اب زندگی میں کچھ تبدیلیاں چاہتے تھے۔ فکرِ معاش سے آزاد ذہن جب کبھی گھبراتا تو وہ گاڑی نکال کر لانگ ڈرائیو پر چلے جاتے یا پھر فراز کے گھر۔ اب فراز شادی کے بندھنوں میں جکڑ گئے تھے۔ گو حقِ دوستی نبھانے کا تو تاعمر عہد تھا۔ لیکن فراز کے شب و روز پر اب ایک اور عزیز ہستی کا حق بھی ہو گیا تھا۔ اس لئے الطاف کی حساس طبیعت نے اس تبدیلی کو بہت زیادہ محسوس کیا۔ فراز انھیں اکثر اپنے پروگراموں میں شریک کرنا چاہتے — لیکن انھوں نے کہہ دیا کہ وہ کباب میں ہڈی بننا پسند نہیں کرتے۔

الطاف ابھی اس کی طرف ہی متوجہ تھے لیکن سوچوں میں بھی گم تھے کہ فراز آ گئے۔ ان کی آمد کا صاحبزادے کو احساس نہ ہوا تو فراز نے اپنا ہاتھ ان کے سامنے لہرایا۔

"میں نے کہا حضرت کسی اور دنیا میں تو تشریف نہیں لے گئے؟"

صاحبزادہ چونکے اور اپنی حالت پر قابو پا کر انھوں نے کہا۔ "مل گئی فرصت؟"

فراز نے سر کھجایا۔ "کیا کریں یار تمھاری بھابھی ہماری ایک پل کی جدائی برداشت نہیں کر سکتیں۔"

"چلو یہ صدمہ جانکاہ ہم ہی برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن ایسا پرابلم تھا اگر تو خواہ مخواہ یہ پارٹی کی مصیبت ہی نہ ڈھالتے۔"

اتنے میں مسز فراز بھی وہاں آ چکی تھیں۔ فراز کے چند اور بے تکلف دوست بھی وہیں جمع ہو گئے اور ہنسی چھیڑ چھاڑ کا پُرلطف سلسلہ چل نکلا جس میں کھو کر صاحبزادہ الطاف بھی چند لمحوں کے لئے بہل گئے۔

فراز کی شادی کی رونقیں تمام ہوئیں تو ڈیڈی کے کسی دوست

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

کی بیٹی کی شادی آ گئی۔ جس میں صاحبزادہ الطاف نے ممی سمیت شرکت کی۔ دعوت ولیمہ کا اہتمام انٹرکان میں تھا۔ پندرہ دنوں سے اس عزیز از جان ہستی کے دیدار نہ ہو سکنے کی وجہ سے صاحبزادہ الطاف کی طبیعت بے حد پریشان تھی۔ ممی بار بار ان کے چہرے کا غور سے دیکھتیں اور پھر خاموش ہو جاتیں۔ وہ وسط سے ذرا ہٹ کر ممی کے ساتھ ایک ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہیں ممی پر بھی تھیں۔ ایک دم وہ حیران ہو گئے ممی کی بدلتی کیفیتیں دیکھ کر۔ ممی بائیں جانب کسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ پہلے پہل تو ان کی نگاہوں میں بے تحاشا حیرت آئی۔ پھر ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ ان کے سینے کے زیر و بم سے صاحبزادہ الطاف کو احساس ہوا گویا وہ سو میل کی لمبی مسافت دوڑ کر طے کر آئی ہیں۔ کافی دیر وہ اُدھر دیکھتی رہیں۔ صاحبزادہ نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا لیکن ان کی نظریں تو اپنے منتہائے نظر پر جا کر ہی اٹک گئیں۔ فیروزی رنگ کی مون لائیٹ کی خوبصورت میکسی اور فیروزے کے نازک سیٹ میں ایک بار پھر وہ ساری محفل پر چھائی ہوئی تھی۔ صاحبزادہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

انھوں نے اسے پہلی نظر دیکھتے ہی اپنا سب کچھ مان لیا تھا اب یہ قسمت کی بات تھی کہ آج تک بات تو درکنار اس کے قریب جانے کی ہمت بھی نہ کر سکے تھے۔ عین اسی لمحے جب اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو ممی نے انھیں پکارا۔

"الطاف!..." ممی کی آواز میں دنیا جہان کا درد سمویا ہوا تھا۔ انھوں نے چونک کر دیکھا۔

"الطاف مجھے گھر لے چلو۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

الطاف نے حیران ہو کر ممی کی طرف دیکھا جو کہنیاں ٹیبل پر ٹکائے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی تھیں۔ الطاف تعمیلِ حکم میں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور میزبان محفل سے معذرت کرتے ہوئے ممی کو لے کر گھر آ گئے۔ ممی آتے ہی لباس تبدیل کئے بغیر بیڈ پر بے سُدھ پڑ گئیں۔ الطاف پریشان سے ان کے سرہانے بیٹھے ان کا سر دباتے رہے۔

"ممی پلیز آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ خدارا کچھ تو بتایئے۔"

"طافی.... مجھے تنہا چھوڑ دو بیٹے.... میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

الطاف چپ چاپ اٹھ کر باہر آ گئے۔ اور اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کرکے یونہی کوئی میگزین اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگے۔ کچھ ممی کی پریشانی اور کچھ محفل چھوڑ آنے کا ملال۔ کم از کم وہ اپنی پیاسی نظروں کی پیاس تو بجھا لیتے۔ جی چاہا پھر لوٹ جائیں لیکن ایسا نہ کر سکے۔

پورا ایک ہفتہ ممی نے گھر سے باہر قدم نہ نکالا۔ اور الطاف بھی ان کی وجہ سے اَپ سیٹ رہے۔ صبح مِل جاتے اور چار بجے گھر لوٹتے۔ چائے پی کر لان میں اخبار کی یا میگزین کی ورق گردانی میں مصروف رہتے۔ ساتھ والے بنگلے میں کچھ نئے لوگ شفٹ ہوئے تھے۔

تقریباً ایک ماہ پہلے۔ ان کے بچے کی سالگرہ کا کارڈ موصول ہوا۔ تو ممی نے انھیں پریزنٹ لانے کا کہا۔ الطاف بضد ہو گئے کہ آپ بھی ساتھ چلیے۔ مجھے پریزنٹ کا انتخاب بہت مشکل لگتا ہے۔ اصل میں وہ چاہتے تھے کہ ممی تنہائیوں کے حصار سے کچھ دیر کے لئے تو باہر نکلیں گی۔ وہ ناولٹی میں ایک باکس پہلے ہی ریزرو کرا چکے تھے۔ کوئی مزاحیہ پکچر تھی۔ الطاف پکچر کے رسیا تھے نہ ممی لیکن وہ ممی کی تفریح طبع کے مختلف بہانے ڈھونڈ رہے تھے۔ کار جب سینما ہاؤس پہ رُکی تو ممی چونکیں لیکن الطاف کار لاک کرکے ان کا ہاتھ تھام کر اندر چلے آئے۔ واپسی پر پریزنٹ بھی لینا تھا۔ انھوں نے گاڑی صدر کی طرف موڑ دی۔ ایک دوکان کے آگے گاڑی کھڑی کرکے وہ اندر چلے آئے۔ ممی ان کے پیچھے تھیں سیلزمین نے ان کی مطلوبہ چیزیں سامنے لا رکھیں۔ ممی اور الطاف نے مشترکہ طور پر پسند کرکے پریزنٹ پیک کرا لیا۔

کاؤنٹر پہ بل ادا کرکے وہ پلٹنے والے تھے کہ سامنے ایک ادھیڑ عمر باوقار شخص کے ساتھ وہ نظر آئی۔ غالباً وہ اس کے ڈیڈی تھے۔ ان کے ہاتھ میں کافی سارے بنڈل تھے اور ان کے پیچھے وہ مسکراتی چلی آ رہی تھی۔ آسمانی رنگ کے کرتہ شلوار میں دوپٹہ سر پہ ڈالے وہ ایک معصوم سا خوبصورت پھول نظر آ رہی تھی۔

"بیٹی آج کے لئے یہ شاپنگ کافی ہے یا کچھ اور بھی؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں ڈیڈ۔ بھلا میرے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ یہ بھی آپ کے اصرار پر میں نے یہ سب کچھ پسند کیا ہے۔"

دونوں ان کے قریب سے گزر گئے۔ الطاف نے ممی کی طرف دیکھا تو ان کا چہرہ انہیں ولیمے کے دن سے بھی زیادہ حسرت ناک اور شعلہ بار نظر آیا۔ وہ تیزی سے باہر آئیں۔ الطاف بھی آئے جب گاڑی کا دروازہ کھول رہے تھے تو بنڈل پچھلی سیٹ پر پھینکتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر کچھ شناسائی سے مسکرا رہی تھی جبکہ اس کے ڈیڈی گاڑی اسٹارٹ کر رہے تھے۔ الطاف نے ممی کے لئے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ اور وہ بیٹھ گئیں۔

"ممی کوک پئیں گی آپ؟"

"نہیں بس اب گھر چلو۔"

وہ چل پڑے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پہ وہ سفید امپالا

Wajid Azeem
pakistanipoint.com

جا رہی تھی جس میں الطاف کی ساری دلچسپیاں قید تھیں۔ چوراہے پر ٹریفک رکی تو دونوں ماں بیٹے اس کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن بیٹے کی نظر اور جگہ تھی اور ماں کی نظر اور جگہ۔

گاڑی ان کے آگے سبک خرامی سے چلتی رہی اور الطاف بھی اسی رفتار سے چل کر اپنے دل ناداں کو اس دور دراز کے نظارے سے بہلاتے رہے یہاں تک کہ وہ گاڑی ایک کوٹھی کے اندر داخل ہوگئی۔ الطاف نے دانستہ گاڑی آہستہ کرکے اس گھر کی طرف غور سے دیکھا اور چل پڑے۔

○

الطاف اپنے آفس سے آرہے تھے۔ یونیورسٹی روڈ... پر وہ اکیلی ہراساں کھڑی تھی۔ دور تک کسی ٹیکسی وغیرہ کا نام تک نہ تھا۔ الطاف لاشعوری طور پر گاڑی آہستہ کرنے لگے کہ اس نے ہاتھ ہلایا۔ الطاف نے گاڑی روک دی۔ وہ بھاگ کے قریب آئی الطاف نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور سر باہر نکالا۔ گرمی کے مارے اس کا برا حال تھا۔

"سنیئے!..."

الطاف صرف اسے دیکھتے رہ گئے... ان کی نظریں اس کے سراپا پر جمی تھیں یوں جیسے نظروں کے ذریعے دل میں بٹھا لینا چاہتے ہوں۔ ایک مدت بعد تو انہیں اس قدر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ پھر وہ کیوں ہاتھ سے گنواتے۔ دونوں کتنی دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ تب... اس نے ہی اس خاموشی کو توڑا

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو..." وہ کچھ کہنے سے ہچکچا رہی تھی۔

الطاف نہ سمجھتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ گئے اور انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے ایک نظر انہیں دیکھا اور گاڑی میں قدم رکھا۔ گود میں فائل رکھے وہ بڑے آرام سے بیٹھ گئی اور دروازہ بند کردیا۔ الطاف اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے اسے دیکھ رہے تھے... اس نے جھکی جھکی نگاہیں اٹھائیں اور ان کی طرف دیکھا.... ان کی نظروں میں کچھ ایسی تپش تھی کہ اس کا چہرہ گلابی ہوگیا۔

"چلئے!..." وہ ایک بار پھر گویا ہوئی۔

"پلیز مجھے یہ یقین کر لینے دیجیے کہ یہ خواب تو نہیں ہے" الطاف کے لہجے میں ان کی تمام تر محبتیں مجتمع تھیں۔ وہ کچھ لجا سی گئی... الطاف نے ایکسیلیٹر پہ پاؤں رکھا۔

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" انھوں نے اپنا چہرہ اس کی طرف موڑا تو وہ مسکرا دی۔ اس کے کلیوں جیسے لب کھل گئے۔

"سویرا!..."

"واقعی میری تاریک زندگی میں سویرا بن کر ہی تو داخل ہوگئی ہیں آپ"

سویرا نے اک نگاہ ان پر ڈالی اور اس کی نظریں جھک گئیں۔

الطاف گاڑی چلاتے رہے اور وہ خاموش بیٹھی رہی۔ گاڑی رکی تو وہ ہوش میں آئی۔ سامنے دیکھا۔ مزار قائداعظم کے گیٹ پر تھے۔ الطاف باہر نکلے اور سویرا وہیں بیٹھی رہی۔

"آئیے نا سویرا..."

ان کے لہجے میں اس قدر اپنائیت تھی کہ سویرا کسی مقناطیسی کشش کے تحت کھنچتی ہی چلی آئی۔ وہ اندر گئے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد سیڑھیاں اتر کے مزار کے سائے میں خوبصورت سے گلشن میں چلے آئے۔ جہاں بہاریں گویا ان کی منتظر تھیں۔ الطاف نے سویرا کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

وہ ایک دم سے آپ سے تم پر آگئے۔

"میری طرف دیکھو سویرا!" سویرا نے ان کی طرف دیکھا۔

اگر تمہیں میری آنکھوں میں صادق جذبوں کی جھلک نظر آ رہی ہو تو میرا ہاتھ تھام لو۔ حیات کی کٹھن راہوں پر تنہا چلتے چلتے تھک گیا ہوں میں۔ مجھے تمہارا سہارا چاہیئے"

وہ اک لمحہ جو الطاف پر تو کئی روز پہلے گزر چکا تھا، سویرا پر بھی قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔ الطاف کے الفاظ سے زیادہ ان کی نگاہوں نے اثر کیا۔ الطاف نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے

"اگر آپ کو ناگوار گزرا ہو تو میں معذرت خواہ ہوں"

"الطاف!..." سویرا کے لبوں سے اپنا نام سن کر ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔ سویرا نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"ڈیڑھ ماہ سے جو خلش آپ کے سینے میں ہے، اس سے میرا دل بھی خالی نہیں"

ایک تو اپنا نام سن کر وہ حیران تھے دوسرے اس کے الفاظ نے چونکا دیا۔

"سویرا" انھوں نے کہا "تمہارا بے حد مشکور ہوں میں" ان کی آنکھوں میں احساس ممنونیت کی جھلک تھی۔

سویرا نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اونچے لمبے باوقار صاحبزادہ الطاف اس کے قریب کھڑے تھے۔ گندمی رنگت میں احساس محبت، چاہے اور چاہے جانے کے یقین نے سرخیاں بھر دی تھیں۔ ان کے گداز ہونٹوں کا بھورا سا تل بھی مسکرا اٹھا تھا اور سیاہی مائل بھوری آنکھیں بن پیئے ہی کسی نشے میں ڈوبی

Wadi Azeem Pakistanipoint.com

نظر آرہی تھی۔

"آؤ سویرا عہد کریں کہ پیمانِ وفا کو جان سے گزر کر بھی نبھائینگے
تم صرف میرے لئے ہو اور میں صرف تمہارے لیے۔"

سویرا نے فرطِ جذبات سے ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لئے۔

گاڑی میں بیٹھے تو دونوں ہی خوشی کے نشے میں سرشار تھے۔ سارا راستہ دونوں خاموش رہے۔ گاڑی اس کے گھر کے سامنے روک کر انھوں نے دروازہ کھولا۔ وہ باہر نکلی اور انہیں خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوئی الطاف وہیں کھڑے رہے۔

رہ رہ کر انہیں خیال آرہا تھا کہ انھوں نے سویرا سے یہ بھی نہ پوچھا کہ دوبارہ کب ملوگی۔ بس روزانہ جانے۔ اس کے گھر کے سامنے آہستگی سے گاڑی ڈرائیو کرتے، لیکن وہ کہیں نظر نہ آتی۔ کئی بار جی چاہا کہ اندر چلے جائیں لیکن ایک جھجک آڑے آئی اور وہ نہ جا سکے۔ آخر خدا نے ان کی دعائیں سُن ہی لیں۔

نیشنل سینٹر میں کسی تقریب کے سلسلے میں ان کو دعوت نامہ آیا تھا۔ الطاف سویرا کی یاد میں گم کسلمندی سے بستر پر پڑے تھے۔ اچانک ہی اٹھے اور تیار ہو کر ممی سے کہنے کے بعد چلے آئے۔ اندر قدم رکھتے ہی سامنے وہ نظر آئی۔ اس کے ڈیڈی بھی ساتھ تھے۔ سویرا نے انہیں دیکھا اور خوشیوں کے عکس سے جھلملاتے چہرے کے ساتھ بے تابی سے ان کے قریب آئی۔

فرطِ جذبات نے دونوں کی زبانیں گنگ کر دیں۔ ایک لمحہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ تبھی سویرا نے ایکدم چونک کر ڈیڈی کی طرف دیکھا۔

"ان سے ملیئے ڈیڈی یہ صاحبزادہ الطاف احمد ہیں"۔

اور یہ میرے ڈیڈی رضا احمد۔۔۔"

دونوں نے ہاتھ ملایا۔ رضا احمد نے گرمجوشی سے ان کا ہاتھ دبایا۔

"غالباً آپ ایور گرین ٹیکسٹائل مل کے۔۔"

الطاف نے ان کی بات کاٹ دی۔

"رضا صاحب! قطع کلامی معاف۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے صرف میرے نام اور میرے کردار کے حوالے سے پہچانیں"

رضا احمد مسکرائے اور سویرا نے بڑے فخر سے ان کی طرف دیکھا۔ تینوں قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئے اور رضا احمد بڑی دلچسپی سے الطاف سے باتیں کرتے رہے۔

ان کا شاندار سراپا اور باوقار شخصیت گفتگو کا خوبصورت انداز رضا احمد کے دل میں گھر کر گیا۔ اتنے میں ایک نوجوان انکے قریب آیا۔

"ڈیڈی انکل فاروق آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔

پھر وہ اچانک الطاف کی طرف متوجہ ہوا۔ اور سویرا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ لیکن سویرا کی بجائے رضا احمد نے جواب دیا۔

"بیٹے یہ آج سے آپ کے دوست صاحبزادہ الطاف احمد۔
اور یہ میرا نکما سا اکلوتا بیٹا عدنان رضا"۔

عدنان نے الطاف سے ہاتھ ملایا اور رضا احمد سے کہا

"خدا کے لئے ڈیڈی میری اس قدر تعریف مت کیا کیجئے۔
اب تو ماشاءاللہ میں ایک مکمل انجینئر ہونے جا رہا ہوں"۔

رضا احمد تو اپنے دوست کے پاس چلے گئے اور وہ تینوں وہاں بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد تقریب شروع ہوئی اور ختم بھی ہوگئی۔ ریفریشمنٹ کا اچھا خاصا اہتمام تھا۔ سویرا تمام وقت الطاف کے قریب رہی اور الطاف اس پھولوں سے زیادہ معطر، کلیوں سے زیادہ نازک، چاند سے زیادہ روشن، شگوفوں سے زیادہ حسین اور شبنم سے زیادہ پاکیزہ لڑکی کو گھر واپس آجانے کے بعد بھی اپنے قریب محسوس کرتے رہے۔ وہ حیران تھے کہ محبت یوں بھی ہوجایا کرتی ہے کہ دنیا میں اس ایک چہرے کے علاوہ اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

وہ جو دوست احباب میں خشک مزاج اور تنہائی پسند مشہور تھے ایک دم سے شوخ ہو کر رہ گئے تھے۔

فراز نے اس تبدیلی کو بے حد محسوس کیا اور وہ اس تبدیلی کا سارا کریڈٹ اپنی شادی کو دیتے تھے۔ الطاف خوشیوں کے ہجوم میں گھر کر اپنی ممی کی پریشانیاں بھی بھول چکے تھے۔ کل اتوار تھا اور انھوں نے سویرا کے ساتھ ساحل سمندر پر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ساری رات صبح طلوع ہونے کے انتظار میں گزار دی۔

صبح ناشتے کے بعد وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئے۔ اپنی پسندیدہ خوشبو سے معطر ہوئے اور مسٹرڈ عوامی سوٹ میں ملبوس نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگتے ہوئے وہ ممی کے کمرے میں آگئے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" خلافِ توقع اتوار کے دن باہر جاتا دیکھ کر ممی نے سوال کیا۔

کار کی چابی کا رنگ انگلی میں گھماتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"ممی وہ کچھ دوستوں کے ساتھ ساحل تک جانے کا پروگرام ہے"۔

ممی نے بھرپور نظروں سے ان کا جائزہ لیا تو وہ ان کے قریب چلے آئے اور ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ ممی نے ان کی پیشانی چوم لی۔

"میرا بیٹا آج بے حد خوش لگ رہا ہے۔ کیا مل گیا ہے آج؟"

Nazia Azeem
Paksitanipoint.com

"بہت کچھ ممی۔ بہت کچھ!" انھوں نے سرشار لہجے میں کہا۔ اور ممی نے پیار سے انہیں بھینچ لیا۔ کچھ دیر کو وہ اپنی پریشانی بھول گئیں۔ الطاف چلے گئے اور ممی اپنی پرانی دنیا میں کہیں کھو کر رہ گئیں۔

ممی برآمدے میں ان کے انتظار میں ٹہل رہی تھیں۔ الطاف سرشار وجود کے ساتھ ان کے قریب آئے۔ ان کے انگ انگ میں مسرتیں رقص کر رہی تھیں۔ ممی کی آواز نے ان کے بڑھتے قدم روک دیئے۔

"الطاف میں اپنے کمرے میں تمہاری منتظر ہوں۔"

"جی بہتر ممی۔ میں ابھی آتا ہوں!"

تھوڑی دیر بعد وہ ممی کے کمرے میں تھے۔

مسلسل تین گھنٹے ان سے جو کچھ سنا وہ ان کی ہستی کو تہہ و بالا کر دینے کو کافی تھا۔ الطاف چکرا کر رہ گئے۔ ان کی سانسیں گویا سینے میں ہی اٹک کر رہ گئیں۔ انھوں نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ممی کے بہتے آنسوؤں نے ان سے زندگی بھر کی خوشیاں چھین لی تھیں۔ ان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ آج ڈیڈی کی عظمتوں اور ممی کی بیزاریوں کا مسئلہ ان کی سمجھ میں آیا تھا۔ ڈیڈی نے ایثار و قربانی کی انتہا کر دی تھی اور ممی ان کے احسانات کے بوجھ تلے دب کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گئیں کہ نہ صحیح ماں بن سکیں نہ صحیح بیوی۔

کتنا ظالم تھا وہ شخص جس نے ممی کو ازلی بدنصیبی بخش دی تھی۔ ممی ان کی ماں تھیں۔ ماں جو دنیا کا مقدس ترین رشتہ ہے جس کے آگے دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ جس کی عظمتوں کو فرشتے بھی سلام کرتے ہیں۔ جس کے قدموں میں دنیا اور آخرت کے سارے خزانے ہیں۔ جسے خدا نے اولاد کے لئے قبلہ و کعبہ بنا دیا ہے۔ جس کی رضا میں خدا کی رضا ہے۔ وہی ماں آج کچھ طلب کر رہی تھی۔ ساری عمر کی مہربانیوں، جنم دینے کی ساری تکلیفوں اور صعوبتوں کا بدلہ مانگ رہی تھی۔ ماں کی آنکھ میں آنسو ان کے دل کو برمے کی طرح چھید رہے تھے۔ ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ ماں چاہے غلطیوں کی مرتکب تھی۔ پھر بھی قابلِ صد احترام تھی۔ ماں جس نے ان کی حیثیت سے کچھ بڑھ کر طلب کیا تھا۔ ماں جس نے انہیں ایک ایسی راہ پہ چلنے کے لئے کہا تھا جو کانٹوں سے بھری ہوئی تھی جس کی طرف دیکھنا بھی الطاف کی طبع نازک اور نفس کے لئے گناہِ عظیم تھا۔ جس بارے میں وہ بھول کر بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ ماں ان سے بھیک مانگ رہی تھی۔ اپنی عمر بھر کی کرب زدہ زندگی کو آسودگی کی راہ پر ڈالنے کے لئے زخمی روح، کچلی ہوئی روح کا درماں مانگ رہی تھیں۔ انتقامی جذبوں کی تسکین کا سامان مانگ رہی تھیں جس کی سنگدلی نے ان سے جینے کا حوصلہ چھین لیا تھا۔ وقت کی ساری طنابیں صاحبزادہ الطاف کے ہاتھ میں تھیں۔ چاہتے تو ماں کو خوشیوں سے ہمکنار کر دیتے۔ پریشان اور الجھے ذہن سمیت وہ ماں کے سامنے بیٹھے تھے۔ روح کی ساری طمانیت سویرا کی سارے دن کی رفاقت کا احساس ہوا ہو کر رہ گیا تھا۔

"الطاف اگر تم نے مجھے اس جلتے ہوئے صحرا کی تپش سے جس سے میری روح سلگ رہی ہے، نہ نکالا تو میں تجھے دودھ نہ بخشوں گی۔"

"ممی!" الطاف دل گیر لہجے میں بولے۔

"مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔ ممی! اتنے بڑے فیصلے یوں پل بھر میں نہیں کئے جاتے ۔۔۔ آپ نے مجھ سے میری بساط سے بڑھ کر مانگا ہے۔ کاش آپ نے دنیا کے خزانوں کی تمنا کی ہوتی کاش آپ نے پہاڑوں کا سینہ چیرنے کا حکم دیا ہوتا۔ کاش آپ نے جان کا نذرانہ مانگا ہوتا۔ لیکن یہ سب بہت مشکل ہے بہت ہی مشکل۔ ایک بے گناہ کو جرمِ ناکردہ کی سزا کیوں دی جائے۔ ممی آپ انتقامی جذبوں سے ذرا الگ ہو کر صرف ایک ماں بن کر سوچیے کہ آپ مجھے کن راہوں پہ چلنے کے لئے کہہ رہی ہیں!"

"الطاف!" ممی کے لہجے میں چٹانوں سے بھی زیادہ سختی تھی۔ "میں تمہاری تقریر نہیں سن سکتی۔ مجھے صرف ہاں یا نا میں جواب چاہیئے!"

"صرف ایک رات کی مہلت!"

وہ اٹھ آئے اور اپنے کمرے میں آ گئے۔ کھانا بھی انھوں نے نہ کھایا۔ ملازمہ دودھ لے کر آئی اور وہ بھی تپائی پر جوں کا توں پڑا رہا۔

ممی نے ایک گھڑی میں اپنے وجود کی ٹھنڈی چھاؤں سے جلتے شعلوں میں پھینک دیا تھا۔ زخمی زخمی وجود اور الجھے الجھے دماغ کے ساتھ وہ بیڈ پر سویرا کی تصویریں پھیلائے بے تابی سے ایک ایک کو اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے وہ تصویریں اکٹھی کیں اور قریب پڑی میز پر تقریباً پھینک دیں۔ مختلف پوز تھے۔ کسی میں وہ اس کے ساتھ تھے۔ کسی میں تنہا۔ کہیں پانی میں پاؤں ڈالے، کہیں پتھروں پہ بیٹھے، کہیں گھوڑے کی سواری کرتے۔ اور کہیں اونٹ کی۔ ہر ادا دلکش تھی۔ ہر ادا پیاری تھی۔ لیکن الطاف کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے جن میں سویرا کی ہستی ادھر سے ادھر اڑتی چلی جا رہی تھی۔

اگلی صبح وہ اپنے پراگندہ خیالوں میں اس قدر الجھے تھے کہ مالک ایزدی کے سامنے سر بھی نہ جھکا سکے۔ دوسرے دن وہ کمرے میں ہی بند رہے اور بربادیوں کا ماتم کرتے رہے۔ ان منھ بند

Waqar Azeem Paksitanpoint.com

کلیوں کے مرجھا جانے کا سوگ مناتے رہے، پھول بننا جن کے نصیب میں ہی نہ تھا۔ محبت کے ان جذبوں کو سینے میں دفن کرنے کی کوشش کرتے رہے جو ان کے خیال میں لازوال تھے۔ محبتوں کی ان تباہ کاریوں نے ان کے رعنائیوں سے بھرپور چہرے کو پژمردہ کر دیا تھا۔ آنکھوں میں ویرانیوں نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ آج ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ہوش و خرد کی دنیا سے دور چلے جائیں۔ اس قدر مدہوش ہو جائیں کہ سویرا کی یاد کی ہلکی سی رمق بھی ان کے قریب نہ آئے۔

دل و دماغ اچھائی اور برائی کی مسلسل جنگ سے برسرپیکار تھے تکیوں میں منہ دیئے وہ اپنی سوچوں میں سرتاپا غرق تھے۔ شام کے وقت وہ کمرے سے باہر نکلے۔ روح کے سارے زخم چھپائے نہا دھو کر لباس تبدیل کر کے وہ ممی کے پاس گئے۔ ممی نے ان کے دل میں خنجر اتار کر چوبیس گھنٹے انہیں تنہا ہی تڑپنے دیا تھا۔

صاحبزادہ الطاف کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ ممی نے ان کی طرف دیکھا۔

"ممی میں آپ کی ہر خواہش کا احترام کروں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ پلٹ آئے اور گاڑی نکال کر بے مقصد سڑکوں پر پھرتے رہے۔ ایک کیفے میں چائے پی اور پھر فراز کے ہاں آ گئے۔

فراز اور بھابی ان کی طبیعت کی ایک بار پھر تبدیلی پر حیران تھے۔ ایک ہی ماہ میں صاحبزادہ کئی روپ بدل چکے تھے آج کی تبدیلی کے بارے میں دونوں کرید کرید کر پوچھتے رہے لیکن وہ کچھ نہ بتا سکے۔ فراز نے ان کا جی بہلانے کی بھرپور کوشش کی۔ بھابی اپنے ہاتھوں سے بہترین ڈشز بنا کر لائیں اور فراز اصرار کر کے انہیں کھلاتے رہے۔

شب و روز کچھ اس قدر بے ترتیبی سے گزر رہے تھے کہ دل دنیا سے ہی اچاٹ ہو گیا۔ ان کی خوشیوں کو جانے کس کی نظر نے چاٹ لیا تھا۔ الطاف ایک بے جان لاشے کی طرح آفس جاتے اور چار بجے لوٹ کر آنے کے بعد کمرے میں بند ہو جاتے۔ پورے بیس دن گزر چکے تھے۔ انھوں نے نہ سویرا کو دیکھا تھا۔ نہ دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ وہ آفس میں تھے کہ چپراسی ایک کارڈ لیکر اندر آیا۔ صاحبزادہ الطاف یوں چونکے کہ چپراسی بھی حیران رہ گیا۔ انھوں نے آنے والے کو اندر لانے کا کہا اور خود نارمل ہو کر بیٹھ گئے۔

"ہیلو الطاف بھائی!..."

الطاف کھڑے ہو گئے۔ عدنان کا چہرہ اس قدر شگفتہ اور خوشگوار دیکھ کر ان کے سینے کی خلش اور بھی بڑھ گئی۔

"ہیلو عدنان کیسے ہو؟ بیٹھو..." انھوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اور خود بھی قریب جا بیٹھے۔

"یہ آپ نے ڈیڈی پر کیا جادو کر دیا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے آپ کا ذکر خیر ہی ان کے لبوں پر ہے۔"

عدنان نے چھوٹتے ہی ان پر سوال داغا۔

"بندہ کیا کر سکتا ہے؟" ان کا مختصر جواب تھا۔

"اچھا یہ کارڈ لے لیجئے۔ ڈیڈی میرے جانے کی خوشی میں ڈنر دے رہے ہیں جس میں آپ کی شمولیت گیسٹ آف آنر کے طور پر بے حد لازمی ہے۔ اور وہ چڑیل بھی تاکید کر رہی تھی۔"

عدنان نے جلدی سے کہا۔ سویرا نے انھیں اپنے گھر کے بارے میں بہت کچھ بتا رکھا تھا۔ لہٰذا وہ سب سمجھ گئے۔

"اچھا الطاف بھائی میں چلتا ہوں، کیونکہ کافی کام کرنا ہے۔"

وہ اٹھنے لگا۔ لیکن اتنے میں ملازم کوک لیکر آ گیا اور دونوں نے بوتلیں ہاتھوں میں تھام لیں۔ عدنان نے تو جلدی سے دو چار گھونٹ لیئے اور بوتل رکھ دی۔ لیکن الطاف جانے کن سوچوں میں گم ہو گئے۔

عدنان نے میز بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ چونکے اور وہ بائے بائے کرتا ہوا چلا گیا۔

کل شام کا بلاوا تھا۔ الطاف کے دل و دماغ میں بیس دن سے جو توڑ پھوڑ تھی اسے ممی کی جز وقتی باتوں نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔ رضا احمد کے خلاف نفرت کا ایک لاوا تھا جو ذہن میں پک رہا تھا اور سویرا کی معصوم ذات بھی اس کی زد میں آنے سے نہ رہ سکی۔ سویرا کا وہ روپ جو دل کے معبد میں کسی مقدس دیوی کی مانند براجمان تھا، اسے الطاف نے دل کے کسی کونے میں ہی دفن کر دیا تھا۔ اور اب انھیں سویرا سے صرف اس صورت میں ملنا تھا کہ وہ رضا احمد کی بیٹی ہے۔ بیٹھے بٹھائے ان کے ذہن میں جانے کیا آئی کہ وہ فراز کے آفس چل دیئے۔ فراز ان کی بے وقت آمد سے گھبرا گئے۔ لیکن صورت حال سے آگاہ ہونے کے بعد دونوں دوست ایک تو سچی مسرتوں کے ساتھ اور دوسرا دھوکہ دہی کے احساس کے ساتھ رضا احمد کے گھر کی طرف چل دیئے۔

"یار فراز تمہیں یہ تو علم ہے کہ ممی نے کبھی میرے کسی معاملے کو نہ اہمیت دی ہے اور نہ دلچسپی لی ہے۔ لہٰذا میں ان کا جانا ضروری نہیں سمجھتا۔ اگر رضا احمد صاحب ممی کے بارے میں دریافت کریں تو تم کہہ دینا کہ وہ یہاں نہیں ہیں اور ہم یہ معاملہ جلد اس لیئے طے کرنا چاہتے ہیں کہ عدنان بھی ہماری خوشیوں میں شریک ہو۔ مجھے یقین

Nagar Azeem Pakistanipoint.com

ہے کہ وہ میرا پرپوزل ٹھکرا نہیں سکتے۔
فراز خوش ہونے کے ساتھ حیران بھی تھے کہ عمروں کے ساتھ کا فیصلہ لمحوں میں کیسے ہو گیا اور صاحبزادہ الطاف کا مزاج گرگٹ کی مانند لحظہ بہ لحظہ رنگ کیوں بدل رہا ہے۔

صاحب زادہ الطاف کوئی ڈھکی چھپی شخصیت نہ تھے اور فراز نے جن خوبصورت الفاظ میں ان سے رشتہ منظور کر لینے کی درخواست کی تھی، رضا احمد نے اسی وقت ہاں کر دی حتیٰ کہ سویرا کی رائے کا بھی انتظار نہ کیا۔

صاحبزادہ الطاف بار بار دروازے کی طرف دیکھتے، لیکن وہ انھیں نظر نہ آئی۔ بیگم رضا نے صاحبزادہ الطاف کو ایک ہی نظر میں بیٹی کے لئے پسند کر لیا تھا اور الطاف کے صدقے واری ہو رہی تھیں۔

"بیٹے تمھاری ممی کی موجودگی ازحد لازمی تھی۔" بیگم رضا نے الطاف کو مخاطب کیا۔

فراز جلدی سے بولے۔

"آنٹی مجبوری ہے۔ اگر عدنان کل نہ جا رہا ہوتا تو ممی کا انتظار کر لیتے۔ لیکن آنٹی الطاف ان کے اکلوتے بیٹے ہیں اور ان کی ممی نے انھیں اپنی پسند سے بیاہ کرنے کی مکمل اجازت دے رکھی ہے۔"

اسی وقت سویرا کمرے میں داخل ہوئی اور دروازے میں ہی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ صاحبزادہ الطاف کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات میں جو تبدیلی آئی اسے سب نے واضح طور پر محسوس کیا۔ اس کی دھڑکنیں کچھ اس طرح بے ترتیب ہوئیں کہ وہاں کھڑا رہنا ہی دوبھر ہو گیا۔ اس کے پیچھے اس کی چھوٹی بہن نویرا بھاگتی ہوئی گئی۔

"سویرا باجی مبارک ہو۔"

سویرا نے بڑھتے قدم روک کر اس سے پوچھا "کس بات کی؟"

"اس بات کی کہ ایورگرین ٹیکسٹائل ملز کے مالک صاحبزادہ الطاف احمد کے ساتھ کل آپ کی انگیجمنٹ ہے۔"

اس خبر نے اس کے ہوش و حواس اڑا دیئے۔ دل کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے تک آئی اور بیڈ پہ گر سی گئی۔ آنکھوں پر بازو رکھے وہ سسک پڑی اور آنسو خواہ مخواہ ہی امڈے چلے آ رہے تھے۔

ایکدم جو اتنی خوشی ملی تو پیمانہ لبالب بھرنے پہ چھلک گیا۔

"میں تو آپ سے روٹھی ہوئی تھی۔ بیس دن کی غیر حاضری پر آپ ایک اور سرپرائز دینے چلے آئے۔ سچی الطاف آپ کے ایسے دھماکے کسی دن میری جان لے لیں گے۔ محبت کی ابتدا اچانک ہمیشہ کے لئے اپنانے کا فیصلہ اچانک۔ جانے کیا ہیں آپ ــــ!

پھر اسے الطاف کی بے تاب محبتوں کا اتنا یقین ہو گیا جتنا خدا کی واحد لاشریک ذات کا۔ تبھی بیگم رضا کمرے میں آ گئیں۔

"بیٹی وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔ شاپنگ ذرا جلدی میں کرنا ہے اس لئے فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔" ممی نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ نویرا انھیں سویرا کی رضامندی کے بارے میں بتا چکی تھی۔

سویرا نے مارے شرم کے تکیوں میں منہ چھپا لیا۔

"ممی میں نہیں جاؤں گی۔ انھیں جو کچھ لینا ہے خود ہی لے لیں۔"

اسی دم فراز اندر آنے کی اجازت چاہ رہے تھے۔ ممی نے انھیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سویرا اٹھ بیٹھی۔

"سویرا بہن آپ کے بغیر تو صاحب زادہ جانے کو تیار ہی نہیں۔ چلئے نا!"

فراز کے لہجے میں سویرا کے لئے پیار ہی پیار سمویا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ جانے کے لئے آمادہ ہوئی۔ گاڑی میں فراز آگے بیٹھے اور وہ پچھلی سیٹ پہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے کچھ الجھی کچھ بکھری بیٹھی تھی۔ فراز اپنے گھر اتر گئے۔ الطاف نے انہیں تمام قریبی دوستوں کو فون کرنے کا کہہ دیا۔ بھابھی سویرا کو دیکھ بہت خوش ہوئیں۔ دونوں فوراً ہی واپس چلے آئے۔ سویرا خاموش سی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ درد کی ایک لہر الطاف کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ بھی خاموش بیٹھے تھے۔ دونوں میں سے کوئی گفتگو میں پہل نہ کر سکا۔ سویرا نے ان طرف دیکھا۔ ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے وہ بڑے خاموش سے بیٹھے تھے۔ سویرا کے خیال میں آج کے دن سے زیادہ خوشی کا کوئی دن نہیں تھا۔ اور صاحبزادہ کی یہ خاموشی، پیشانی پر الجھنوں کی لکیریں۔ بار بار وہ ہونٹ بھینچے جا رہے تھے۔ سویرا نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو انھوں نے رخ سویرا کی طرف موڑا۔ الطاف کی آنکھیں اسے کچھ نم سی لگیں۔ بے حد پریشان ہوئی۔ الطاف کی نگاہوں میں ایسا بیگانہ پن تھا گویا پل بھر کی شناسائی نہیں ہے۔ سویرا کی سوچوں کی لہریں مختلف سمتوں میں بہنے لگیں۔ وہ منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ بس ٹپ ٹپ اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ اور اس کا سر الطاف کے کندھے پہ ٹک گیا۔

صاحبزادہ الطاف کے دل پر کچھ ایسی چوٹ پڑی کہ ان کے ہاتھ اسٹیئرنگ وھیل پہ کانپ گئے۔ انھوں نے سائیڈ دے کر گاڑی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

روک دی۔

"کیا بات ہے، کیوں رونے لگیں۔ اگر یہ بندھن منظور نہیں تھا تو گھر پر ہی انکار کر دیا ہوتا۔" ان کا کٹھور لہجہ سویرا کے کلیجے میں تیر کی طرح اتر گیا۔

"یہی سوال اگر میں آپ سے کروں تو؟" اس نے چھم چھم برستی آنکھیں صاحبزادہ الطاف پر ٹکا دیں۔ الطاف ایک ٹک اُسے دیکھا کیے۔

"میں کوئی تمہاری طرح آنسوؤں کی برسات میں ڈوبا ہوں۔" ان کا لہجہ قدرے شگفتہ تھا۔

"آئینے میں اپنا چہرہ دیکھئے ذرا اس پریشانی اور سنگ دلی کی کتنی گہری چھاپ ہے۔"

سویرا نے سامنے لگے آئینے کی طرف اشارہ کیا تو صاحبزادہ نے ایک دم قہقہہ لگایا۔

"اچھا تو جناب کو ہماری سنگدلی نے رُلا دیا۔ اب شکوہ ہو گا کہ بیس دن کہاں رہا۔" انھوں نے سویرا کا گال تھپتھپایا۔

"تمہارے یہ آنسو اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ یہ بیس روزہ جدائی کے غم کا اظہار ہے۔ بھئی یہ بالکل غلط بات ہے۔ اگر مجھ سے ملنے کا اسقدر اشتیاق تھا تو میرے پاس چلی آتیں۔ اور سویرا بیگم آج ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ خوشیوں کا استقبال ہنستے مسکراتے ہوئے کرو۔"

سویرا کو اُن کے بدلتے موڈ نے بیحد حیران کر دیا۔ بہر حال اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور صاحبزادہ الطاف نے جیب سے سفید بے داغ رومال نکال کر اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کر دیا۔

○

منگنی معمولی طریقے پر کرنے کا پروگرام تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصا شاندار پروگرام بن گیا۔ سویرا کی تمام دوست مدعو تھیں اور ادھر سے فراز و صاحبزادہ الطاف کے مشترکہ دوست، رضا احمد کے رشتہ دار و دوست احباب۔ وسیع و عریض لان بے حد عمدگی سے سجایا گیا تھا۔ تقریباً چھ بجے بیوٹی پارلر سے آ گئی تھیں اور سویرا کی دوستوں نے ان کے ساتھ مل کر خوب سجا سنوار دیا۔ ایک مکمل پیکر رعنائی تھا سویرا کا وجود۔ سرخ بنارسی ساڑھی اور ہیرے کا خوبصورت سیٹ۔

"شہنیلہ آپی!" نویرا نے سویرا کی ایک دوست کو مخاطب کیا۔ "مجھے تو ڈر ہے کہیں صاحبزادہ الطاف ودا عی کی ضد ہی نہ کر بیٹھیں" اور سویرا نے جس کے لبوں پر ایک دلفریب تبسم رقص کناں تھا،

شرما کر سر جھکا لیا۔ باہر کے شور و غل میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تو وہ بھی باہر چلی گئیں۔

صاحبزادہ الطاف آ چکے تھے۔ چاکلیٹ کلر کے سوٹ میں ملبوس صاحبزادہ الطاف بے تحاشا ہینڈسم اور سمیشنگ نظر آ رہے تھے۔ سیاہی مائل بھورے گھنے بال بڑی نفاست سے سیٹ کیے ہوئے تھے۔ صاحبزادہ الطاف اپنے خوشیوں سے یکسر خالی دماغ اور چہرے پر سجی مسکراہٹ دونوں کے امتزاج میں فراز کو بے حد عجیب نظر آئے لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ نویرا ان کا ہاتھ تھام کر لڑکیوں کے جھرمٹ میں لے آئی۔ فراز بھی ساتھ تھے اور دوسرے چند بے تکلف دوست بھی۔ لڑکیوں نے خوب چوٹیں کیں لوک جھونک کا یہ دلچسپ سلسلہ تقریب کے شروع ہونے تک رہا۔ پھر نویرا اور دوسری لڑکیاں سویرا کو ہال میں لے آئیں جہاں اُسے وسط میں پڑے صوفے پر بٹھا دیا۔ تبھی رضا احمد صاحبزادہ الطاف کو لے آئے اور انھیں بٹھا کر خود بھی قریب بیٹھ گئے۔ سویرا کے ساتھ بیگم رضا بیٹھی تھیں اور فراز کیمرہ سیٹ کیے ان خوبصورت لمحات کی مووی بنانے میں مصروف تھے۔ منگنی کے تمام مراحل کی دسیوں تصویریں انھوں نے لیں۔ صاحبزادہ الطاف سویرا کے معصوم اور دلکش چہرے کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکے۔ بس چپ چاپ ان کے نرم و گداز ہاتھ کی مخروطی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

سویرا نے بھی سب کے اصرار پر بدقت تمام صاحبزادہ الطاف کو انگوٹھی پہنائی۔ اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے کانپتے ہاتھوں نے بھی الطاف کے وجود میں آگ لگا دی۔ لیکن یہ آگ تو اندر روشن تھی۔ یہ تپش تو کوئی اور تھی جو ان کا تن من جلائے جا رہی تھی۔

پھر تھوڑی دیر بعد سب کھانے میں مشغول تھے۔ صاحبزادہ الطاف بمشکل چند نوالے کھا سکے۔ تبھی شہنیلہ ان کے قریب آئی۔

"آپ کے حلق سے تو نوالے ہی نہیں اتر رہے۔" اس نے شوخی سے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کھلا دیجئے تو شاید اتر جائیں۔" الطاف نے بھی شوخی سے جواب دیا۔

"نا بابا... مجھے سویرا کے ہاتھوں اپنی کھال تھوڑی اتروانی ہے۔" فراز چہکے۔ "شہنیلہ جی۔ ایسی خوفناک باتیں میری بھوک اڑا دیتی ہیں۔"

"ویسے صاحبزادہ کا علاج یہ ہے کہ انہیں اپنی دلہن کے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت دی جاتی۔"

الطاف نے انھیں گھورا اور پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

رات گئے تقریب سبھی مہمان لوٹ گئے۔ حماد اور نویرا کے

اصرار پر صاحبزادہ الطاف ابھی تک وہیں رہے۔

الطاف ڈرائینگ روم میں بیٹھے خاصے بور ہو رہے تھے۔ حالانکہ عدنان اور نویرا نے دلچسپ باتوں کا سلسلہ چھیڑ رکھا تھا۔ رضا احمد اور بیگم رضا تھکان کی وجہ سے معذرت کر کے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ عدنان اٹھ کر باتھ روم میں گیا تو نویرا نے ان کے قریب آ کر سرگوشی کی۔

"الطاف بھائی اگر دیدار کرنے ہوں تو مشرقی سمت کے بالکل آخری کمرے میں تشریف لے جائیے!"

الطاف اٹھ کر باہر چلے آئے۔ نویرا ان کے پیچھے آئی۔

"بھیا! میں نے سویرا باجی کو آپ کی قسم دیکر عہد لیا تھا کہ جب تک الطاف بھائی آپ کو نہ دیکھیں آپ اسی ڈریس میں رہیں گی!"

الطاف مسکرائے اور سویرا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

سویرا سوچوں میں بیٹھی گم تھی۔ چند لمحے الطاف دروازے میں کھڑے پردے کی اوٹ سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر چپ چاپ اس کے قریب چلے آئے۔

رومانس کی خوشبو سے پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ سویرا نے انہیں دیکھتے ہی چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ الطاف اسکے قریب بیٹھ گئے۔

"رونمائی کا تحفہ لینے میں ابھی بہت دیر ہے دلہن بیگم!"

الطاف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سویرا کچھ اور بھی لجا کر سمٹ گئی۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں بھلا؟" یوں ہی جھکے جھکے اس نے کہا۔

"آیا نہیں بلایا گیا ہوں! تمہارے پیغام پر ہی یہاں آیا ہوں!"

"میرے پیغام پر... اس نے حیران ہو کر سر اٹھایا۔ سمجھ گئی یہ سب چالاکی نویرا کی ہے!"

"بہر حال چالاکی جس کی بھی ہو مجھ غریب پر احسان ہے آپکے ہو یا سالی صاحبہ کا!" انھوں نے شرٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک مخملیں ڈبیہ نکالی۔ اسے کھولا اور ایک خوبصورت لاکٹ سویرا کے گلے میں ڈال دیا۔

"اسے اپنے دستِ نازک سے کھول کر دیکھئے حضور کہ اس میں کیا ہے!"

دل کی شکل کے لاکٹ کو سویرا نے کھول کر دیکھا تو اس میں صاحبزادہ الطاف کی تصویر تھی۔ اس نے مشکور نظروں سے الطاف کی طرف دیکھا۔

"اتنا سب کچھ خریدنے کے بعد اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"ابھی سے کنجوس بیویوں کی طرح سوچنے لگیں!" الطاف نے قہقہہ لگایا۔

سویرا نے ان کی جانب محبت سے لبریز نگاہ ڈالی اور نظریں جھکا لیں۔

"آؤ سویرا۔ آج کی رات کے باقی لمحے دور کہیں کسی تنہا گوشے میں ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے گزار دیں!"

اس وقت رات کے گیارہ بجے کہاں جائیں گے آپ اور ڈیڈی ممی اس بات کی اجازت بھی...!

الطاف نے اس کی بات کاٹ دی۔ ڈیڈی ممی سے میں اجازت حاصل کر چکا ہوں۔ البتہ تمہیں میرا ساتھ ناگوار ہو تو بیشک نہ چلو!" انھوں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ سویرا نے ان کا بازو تھام لیا۔

"ایک منٹ میں ذرا لباس تبدیل کر لوں!"

الطاف بیٹھ گئے اور سویرا ڈرائینگ روم میں چلی گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ میک اپ کی قید سے آزاد اپنے سرخ و سپید چہرے پر صبح نو کی تازگی لئے پنک کلر کی سادہ سی ساڑھی میں ان کے سامنے موجود تھی۔

چاندنی رات کے نورانی عکس میں پھولوں کے کنج کے قریب بیٹھے وہ مستقبل کے حسین خوابوں میں کھوئے تھے۔ اپنے پاگل پاگل جذبوں کے بوجھ تلے دبے وہ سویرا کی گود میں سر رکھے آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ اس کے نرم گرم وجود کا احساس بجلی بن کے ان کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ بارہا وہ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیتے۔ سویرا بھی ان کی اس قدر قربت سے پگھلی جا رہی تھی۔

"ایک بات کہوں سویرا؟"

وہ ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔

راہِ حیات پر چلتے چلتے اگر ہم تم بچھڑ جائیں تو...؟"

سویرا نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"الطاف... آپ کو ایسی سوچ بھی ذہن میں نہیں لانا چاہیئے!"

"کیا تم میرے بغیر رہ لوگی؟"

سویرا نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"الطاف۔ اظہار جذبوں کی موت ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ اب آپ کے بغیر سانس لینا بھی دشوار ہے!"

الطاف نے عقیدتمندانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا سویرا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

"جانِ من خوشی کے ہر موقع پر تم اشک بہانے لگتی ہو!"

"آپ جان جلانے والی باتیں جو کرتے ہیں!"

تقریباً دو بجے وہ گھر لوٹے۔ ملازم ان کے انتظار میں گیٹ کے

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

قریب بیٹھا تھا۔ تھک کر بے چارہ وہیں سو گیا تھا۔ صاحبزادہ نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا اور اپنے بستر پر سونے کے لئے کہا۔ وہ اپنے کمرے میں چلے آئے۔ تنہائیاں میسر آئیں تو اندر کا انسان صاحبزادہ پر غالب آگیا۔

یہ ڈرامہ جو تم رچا رہے ہو۔۔۔ اس کا انجام کتنا بھیانک ہے۔ اتنی پاکیزہ لڑکی کے ساتھ جس سے تمہاری دلی وابستگی بھی ہے۔ اس قدر دھوکہ بازی۔ صاحبزادہ لباس تبدیل کر کے بیڈ پر آ لیٹے لیکن نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

یہ مشیت ایزدی بھی کتنی سخت ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ سویرا رضا احمد کی لڑکی نہ ہوتی۔ انھیں اپنے کئے فیصلے ایک دم سے اتنے بودے اور کھوکھلے لگ رہے تھے کہ وہ یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ ان کی محبت میں پختگی ہے یا انتقامی جذبوں میں۔

رات کا باقی حصہ آنکھوں میں کٹ گیا۔ صبح سات بجے کے قریب ممی کا فون آیا۔ وہ پچھلے تین دنوں سے اسلام آباد اپنے بھائی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔

صاحبزادہ نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو ممی میں الطاف ہوں۔"

"جی بالکل خیریت ہے۔"

"جی ہاں ہو گئی۔ فراز نے بے حد مدد کی ہے۔"

"نہیں۔ فراز کو اصل معاملے کا کچھ علم نہیں ہے۔"

"آپ کا بیٹا ہوں معاملوں کو نبھانا بھی جانتا ہوں۔"

"آپ سے کیا ہوا وعدہ ضرور نبھاؤں گا ممی۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا یہ اس ماں کا حکم ہے جس کے قدموں تلے جنت ہے۔ میں جان پر کھیل کر بھی آپ کو خوشیاں بخشوں گا۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ انھوں نے جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ ممی سے التجا کریں۔ "ممی میں نے برسوں کی تلاش کے بعد اسے پایا ہے۔ اس کو کھو دینا بہت دشوار ہے۔" لیکن نہ کہہ سکے۔

اگلے دن انھوں نے بہت بڑے ڈنر کا اہتمام کیا جس میں سویرا کے گھر والوں کے علاوہ سب دوست احباب شامل تھے۔ فراز اور بھابی بھی موجود تھے۔ بھابی تو صبح سے آکر یہاں انتظامات میں لگی تھیں۔

شام چھ بجے کے قریب رضا احمد بیگم رضا اور سویرا کو لے کے ساتھ آئے۔ صاحبزادہ الطاف نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور ڈرائینگ روم میں لے آئے۔ جہاں پہلے سے بھی لوگ بیٹھے تھے۔ بھابی نے سویرا کو بیٹھنے ہی نہ دیا۔

"اس گھر کے فرائض تم پر بھی لاگو ہیں۔ اِدھر کچن میں چلو میرے ساتھ۔"

سب ہی ہنسنے لگے اور شرم کے مارے بیر بہوٹی بنی سویرا باہر چلی گئی۔

"جناب صاحبزادہ اس کمرے میں آپ کے منتظر ہیں۔"

بھابھی نے سویرا کو کمرے کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔ پتہ نہیں کس وقت صاحبزادہ الطاف نے بھابھی سے یہ سب کہہ ڈالا تھا۔ کتنی گھڑیاں یونہی بیت گئیں۔ بھابھی نے دروازہ ناک کیا۔

"الطاف بھائی مہمانوں کی نازک حالت پر رحم فرمائیے۔"

الطاف سویرا کے ساتھ باہر آئے۔ بھابھی شرارت سے مسکرائیں۔

"آنتیں تو ہماری بھی قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"تبھی اتنے آرام سے تشریف فرما تھے۔"

تینوں ڈائننگ ہال میں چلے آئے۔ اور باقی مہمان بھی وہیں آ گئے۔

○

یہ رنگین شب و روز بڑی تیز رفتاری سے اُڑے چلے جا رہے تھے۔ سارے شہر میں صاحبزادہ الطاف احمد کی سویرا کے ساتھ منگنی کے چرچے تھے۔ صاحبزادہ ہر تقریب میں اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ تفریحی مقام ہو یا پکچر ہاؤس کوئی جگہ ان کی محبتوں کے احوال سے بے خبر نہ تھی۔ گوشہ گوشہ چپہ چپہ حسین یادوں کا امین تھا۔ سویرا کو یوں لگتا کہ وہ کوئی طویل حسین خواب دیکھ رہی ہے۔ سہیلیاں اس کی قسمت پر رشک کرتیں تو اس کا سر فخر سے تن جاتا۔ صاحبزادہ نے محبتوں کی بارش کر دی تھی اس پر کہ سویرا کو آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر اپنے سے زیادہ خوش نصیب کوئی نظر نہ آتا تھا۔ پچھلے دنوں اچانک صاحبزادے کا جاپان جانے کا پروگرام بن گیا۔ کوئی بے حد ضروری کام تھا۔ انھوں نے عجلت میں سویرا کو فون کیا اور ایئرپورٹ چلے آئے۔

سویرا اور رضا احمد انہیں الوداع کہنے چلے آئے۔ سویرا اُداس اُداس ان کے قریب کھڑی تھی۔ رضا احمد اپنے قریب کھڑے کسی دوست کی طرف متوجہ ہوئے تو موقع غنیمت جان کر انھوں نے سویرا کو کتنی ہی تسلیاں دے ڈالیں۔ جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا تو وہ انہیں الوداع کہتے ہوئے چلے آئے۔

○

جاپان سے واپسی میں ایک ماہ لگ گیا۔ واپس آتے ہی انھوں نے سویرا کو فون کیا۔ وہ بے انتہا خوش ہوئی۔ جب سویرا نے سنا کہ وہ ابھی اس کے گھر آ رہے ہیں۔ وہ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر کے ڈریسنگ

ٹیبل کے قریب آئے۔ برش ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ برش ہاتھ میں لئے لئے ہی وہ فون کے قریب آئے۔

"ہیلو.... ممی السلام علیکم ... جی ہاں کل رات ... سفر خیریت سے گزرا.... آپ کی بہو بیگم ... خوب کیا نام دیا اس بےچاری کو .... ممی مجھے آپ کے انتظار کا بے حد احساس ہے۔ لیکن .... جلد ہی اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جائے گا۔ بہت جلد.... آپ بے فکر رہیئے۔ رضا احمد صاحب تاحیات ماہی بے آب کی طرح تڑپیں گے۔" الطاف کی آواز کانپ کر رہ گئی۔

اور جو کچھ ممی نے کہا ان الفاظ نے صاحبزادہ الطاف کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جذبۂ انتقام نے انھیں اندھا کر دیا۔ ان کی نگاہوں کے سامنے ممی بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنی کھڑی تھیں۔

"نہیں.... نہیں محبت کو فرض پر قربان کیا جا سکتا ہے۔"

وہ ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے بدبدائے۔

میری ممی صدیوں سے جس عذاب کو جھیل رہی ہیں وہ اب سویرا کا مقدر ہوگا۔

انھوں نے دوبارہ ریسیور اٹھایا اور سویرا کا نمبر ملانے لگے۔

نوری نے فون اٹھایا۔ انھوں نے سویرا کو بلانے کو کہا۔

"ہیلو" ... سویرا کی سریلی آواز ان کے من میں اتر گئی ایک زخمی کی چیخ کی طرح۔

"سویرا ڈیئر سفر کی تکان میرے تم تک پہنچنے میں مانع ہو رہی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ... کہ تم میرے پاس آجاؤ...؟"

"گاڑی گھر پر نہیں ہے اور نوری ابھی اکیلی رہ جائے گی ممی ڈیڈی اپنے کسی دوست کے گھر گئے ہوئے ہیں۔ آپ آجائیں نا .... اس کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔" آپ کو علم ہے کہ یہ ایک ماہ کس طرح گزرا ہے۔ ایک ایک لمحہ گن گن کر گزارنا پڑا۔"

اور آپ کا خیال ہے کہ ہم چین سے رہے۔ خدا کی قسم ایک لمحے کے لئے بھی تمھاری یاد سے غافل نہ ہو سکے۔"

"الطاف آپ میری محبت کی شدتوں کو کسی پیمانے سے ناپ ہی نہیں سکتے۔" سویرا کی آواز میں لرزش تھی۔

تبھی آنے سے انکار ہے نا،" الطاف نے تاک کر نشانہ لگایا۔

"اچھا میں ابھی آرہی ہوں۔"

وہ فٹافٹ تیار ہوئی۔ آئینے میں اپنے آپ کو سو زاویوں سے دیکھا۔ پرس ہاتھ میں اٹھایا اور باہر آئی۔

نوری نے پوچھا تو اسے مسکرا کر دیکھا اور ہاتھ ہلا کر باہر آگئی۔

صاحبزادہ الطاف ہمہ تن گوش اس کے منتظر بیٹھے تھے۔ ٹیکسی رکنے کی آواز آئی تو وہ اپنے کمرے سے باہر آئے۔ تیزی سے باہر کی طرف چلے۔ سویرا ٹیکسی والے کو پیسے دے رہی تھی۔ الطاف نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دس کا نوٹ ڈرائیور کو دے کر سویرا کو لے کر اندر چلے آئے۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی سویرا انھیں دیکھ کر مبہوت ہو گئی۔ ...... صاحبزادہ الطاف اس کے جسم سے اٹھنے والی مہک سے مدہوش ہوئے جا رہے تھے۔ .... کرتے کے گریبان سے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ ....

"کتنا تڑپایا آپ نے ... خط ہی لکھ دیا ہوتا۔

"میں تمھیں آزما رہا تھا سویرا۔ در اصل فراقِ محبت کی آگ کو کچھ اور بھڑکا دیتا ہے۔ ہے نا؟"

انھوں نے اس کے گھنیرے بالوں کو.... آہستہ سے چھو لیا۔

انھوں نے سویرا کے پھولوں سے نازک وجود کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"سویرا یہ دوریاں اب برداشت سے باہر ہیں۔"

سویرا کی نظریں جھک گئیں۔ صاحبزادہ اٹھ کر دریچوں سے باہر دیکھنے لگے۔

الطاف کے انتقامی ذہن کے منصوبے سویرا کے سان و گمان میں بھی نہ تھے۔

"قانونِ شریعت دو دلوں کی رضامندی کا نام ہے۔ کبھی لوگوں کے سامنے ایک دوسرے کو اپنانے کا عہد اور کبھی آج کی طرح تنہائی میں۔" الطاف نے زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ قہقہہ کم اور اندر کے آدمی کی چیخ زیادہ تھی۔ وہ اس کے قریب آئے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ الطاف نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ لیکن سویرا نے اپنی ساری قوتیں مجتمع کر کے اپنا آپ چھڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ ایک لمحے میں اس نے بھاگ کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی صاحبزادہ الطاف کی فریم شدہ تصویر اٹھائی اور پوری قوت سے الطاف پر دے ماری۔ الطاف نے۔ بچاؤ کی خاطر سر جھکا کے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لئے۔ لیکن پھر بھی فریم کا کونا ان کے سر پر بڑی شدت سے لگا اور وہ چکرا کر قالین پر گر پڑے۔

○

پندرہ دن جو پندرہ صدیوں پر حاوی تھے صاحبزادہ پر کسی کوہِ گراں کی طرح آکر گزر چکے تھے۔ دوسری تکلیف کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ سر کے زخم کو تو وہ ہنس کر بھی سہہ لیتے لیکن دل کے زخم چین نہ لینے دے رہے تھے۔ سویرا کا نام بھی وہ اپنے ناپاک لبوں پر لانا گناہ سمجھ رہے تھے۔

آج ان کا غسلِ صحت تھا جس میں تمام لوگ مدعو تھے۔ دور

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

یار کے رشتہ دار، قریبی عزیز، دوست احباب اور رضا احمد کے گھر والے۔

ممی کا اور رضا احمد کا سامنا ہو ہی گیا۔

ایک لمحے کو رضا احمد چکرا کر رہ گئے۔ بیگم رضا اور نویرا ان کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو لیا اور اندر چلے آئے۔

بیگم رضا اپنے طور پر دل ہی دل میں سویرا کے نہ آنے پر اسے کوس رہی تھیں کہ کتنی منتیں کی تھیں سب نے لیکن وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بیگم رضا سمجھتی تھیں کہ شرم کے باعث نہیں آ رہی اور رضا احمد کا خیال تھا کہ ابھی بخار کی وجہ سے نقاہت ہے۔ نویرا تو اس سے باقاعدہ ناراض ہو کر آئی تھی۔

صاحبزادہ پندرہ دن کی اس تکلیف میں بہت کمزور اور زرد ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں کی تاکید تھی کہ انھیں مقوی غذاؤں کی اشد ضرورت ہے لیکن صاحبزادہ کھانا برائے نام ہی کھاتے۔ ان کے حالِ دل کی رازدار صرف ممی تھیں۔ بارہا الطاف رضا فیملی کا سامنا کرتے ہوئے اتنے خوف زدہ ہو جاتے کہ ان کا دل کانپنے لگتا۔ ابھی رضا احمد ان سے بازپرس کریں گے.... لیکن رضا احمد اور ان کے گھر والوں کی صاحبزادہ الطاف کے لیے محبتیں روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور صاحبزادہ اپنے پریشان دماغ سمیت ان حالات کو حیرانی سے دیکھ اور سوچ رہے تھے۔

سویرا ازل اور ابد کے دوسرے سِرے پر کھڑی رہ گئی تھی کہ ان کے لبوں پر سویرا کا نام بھی نہیں آ سکتا تھا۔

فوزیہ میڈیکل کالج میں سال دوم کی طالبہ تھیں، جن دنوں رضا احمد کراچی سے مائیگریٹ ہو کر لاہور آئے تھے وہ سال چہارم میں تھے۔ انھوں نے فوزیہ کو کیا دیکھا بس دل و جان ہار بیٹھے۔ دوسرے سال اپنے والدین کو لا کر ہمیشہ کے لیے اسے اپنانے کا عہد پکا کرنے کے لیے منگنی کی انگوٹھی اسے پہنا دی۔ فوزیہ بھی انہیں پسند کرتی تھیں۔ رضا احمد محبت کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھنے کے قائل تھے اور فوزیہ سرِعام اظہار کی۔ اسی بات پر دونوں میں کافی اختلافات پیدا ہو گئے.... انھیں محض جلانے کی خاطر فوزیہ نے اپنی کلاس کے ایک لڑکے اسلم درانی کے ساتھ خواہ مخواہ ہی التفات بڑھا لیا۔ اسلم کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ گھاگ شکاری تھا۔ کئی معصوم لڑکیاں اس کے جال میں پھنس چکی تھیں۔ بات مذاق ہی مذاق میں بہت آگے بڑھ گئی۔ ہر جگہ دونوں ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے۔ اس معاملے پر رضا احمد خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے فوزیہ سے اچھی خاصی جھڑپ لی۔ لیکن ہوشیار صیاد اپنا جال کچھ اس طرح پھیلا چکا تھا کہ دام میں گرفتار وہ نوخیز کلی اس کی قید سے باہر نہ آ سکی۔ جب نام نہاد محبت کا ڈراپ سین ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ فوزیہ وہ گوہرِ نایاب لٹا بیٹھی تھیں جو ایک پاکباز لڑکی کا سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ یہ بات رضا احمد کے علم میں بھی آئی۔ ان کے دل کے معبد خانے میں رکھی فوزیہ کی صاف و شفاف تصویر دھندلی پڑ گئی۔ شیشہ دل پر فوزیہ کی طرف سے کچھ اس طرح بال آیا کہ وہ دوبارہ اس کی طرف نہ پلٹ سکے۔ محبت کی شکستگی نے ان سے جینے کا حوصلہ چھین لیا تو وہ قرار حاصل کرنے کی خاطر بیرونِ ملک چلے گئے۔ جہاں سے پانچ سال بعد ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگریوں سمیت لوٹے اور آتے ہی والدین کی پسند پر بیاہ کر لیا۔ ماضی ایک خلش بن کر سینے میں دفن تھا۔ ایک عورت کی بے وفائی نے جو داغ بخشا تھا دوسری عورت نے اسے دھونے کی اور مٹانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ رضا احمد ملک کے ہر حصے میں چند چند سال گزارنے کے بعد اب کراچی میں اپنا ذاتی ہاسپٹل چلا رہے تھے۔ کاتبِ تقدیر نے ایک بار پھر ان دونوں کا سامنا کرا دیا تھا۔ وہ رات رضا احمد نے تقریباً سوچتے سوچتے گزار دی۔

اور چین سے فوزیہ بھی نہ سو سکیں۔

آخر رضا احمد کا کیا قصور تھا جس کی پاداش میں وہ ان کی بیٹی کو سزا دینے چلی تھیں۔ وہ سوچ سوچ کر نادم ہوئی چلی جا رہی تھیں۔

رضا احمد تو دل برداشتہ ہو کر دنیا کے جانے کس گوشے میں چلے گئے تھے۔ سب کچھ گنوا دینے کے بعد جب ہوش آیا تو وہ اسلم کی شکل دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ رضا احمد کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر والدین نے ان کی شادی شہر کے انتہائی معزز گھرانے کے نوجوان صاحبزادہ احمد علی سے کر دی۔

فوزیہ جو گناہوں کا بوجھ تنہا اٹھا اٹھا کر تھک گئی تھیں انھوں نے من و عن سب کچھ صاحبزادہ احمد علی سے کہہ ڈالا۔ صاحبزادہ احمد علی فراخ دل انسان تھے۔ انھوں نے فوزیہ کو سہارا دیا اور ماضی کو جوانی کی لغزش سمجھ کر معاف کر دیا۔

لیکن ایک احساسِ کمتری جو فوزیہ پر چھایا تو دو سال کے بعد صاحبزادہ الطاف کی آمد بھی اسے ختم نہ کر سکی۔

ان کے ذہن میں ہر وقت ایک لاوا پکتا رہتا۔ یہ اس محبت کا ردِعمل تھا جو درحقیقت انھیں رضا احمد سے تھی لیکن جیسے اپنی ہی نادانیوں سے وہ کھو بیٹھی تھیں۔ محبت کا احساس پچھتاوا بن کر ساری عمر ان کے ساتھ رہا کہ صاحبزادہ احمد علی کی محبت کے ساتھ

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ساتھ دنیا جہان کی اعلیٰ آسائشیں اور نعمتیں بھی اس محبت کا بدل نہ بن سکیں۔ وہ تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ صاحبزادہ الطاف ایک غلطی کا اعادہ کرنے سے بچ گئے اور فوزیہ کو صراط مستقیم نظر آگئی۔

وہ رضا احمد کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر بھی تو اپنے زخمی دل کی تسکین کر سکتی تھیں۔ آج تک وہ یہی سمجھتی آئی تھیں کہ انھیں رضا احمد سے شدید نفرت ہے۔ لیکن شدید نفرت تو شدید محبت کا پرتو تھی۔

صبح اٹھتے ہی انھوں نے ناشتے کے بعد بیگم رضا کو فون کیا کہ وہ ان کے گھر آرہی ہیں۔ خاصے اہتمام سے تیار ہو کر اور انتہائی خوشی کے ساتھ وہ رضا احمد کے گھر چل دیں۔

○

بیگم رضا ان کی آمد سے بے حد خوش تھیں اور ان کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ انھوں نے نویرا کو خوب پیار کیا اور سویرا کے متعلق پوچھا تو بیگم رضا مسکرا اٹھیں۔

"میں نے اسے آپ کی آمد کے بارے میں بتا تو دیا ہے۔ پتہ نہیں اب تک کیوں نہیں آئی۔ میں اسے بلواتی ہوں۔" انھوں نے نویرا کو بھیجا۔

تھوڑی دیر بعد سویرا ان کے سامنے تھی۔ بڑے ادب سے سر جھکا کر اس نے آداب کہا اور سمٹی سمٹائی ان کے قریب بیٹھ گئی۔

ممی کی نظریں اس کا غائرانہ جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے دل میں سویرا کے لئے پیار ہی پیار بھر آیا۔ انھوں نے فرطِ جذبات سے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ان کے بیٹے کی پسند واقعی لاجواب تھی۔ دوسری خصوصیت جو انہیں آجکل ہی محسوس ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ وہ رضا احمد کی بیٹی تھی۔ سویرا کو گرمجوشی سے پیار کر کے انہیں یوں محسوس ہوا کہ وہ تپتے ریگستانوں سے ایک دم کسی نخلستان میں آگئی ہوں۔

تھوڑی دیر ان کے پاس خاموش سی بیٹھنے کے بعد وہ باہر چلی گئی۔

انھوں نے مسکرا کر کہا

"بیگم رضا اب آپ میری بیٹی مجھے دے دیجئے۔ میں تنہائیوں سے اکتا چکی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہفتہ پندرہ دنوں کے بعد ہی کوئی تاریخ مقرر کر لیں۔"

بیگم رضا نے کہا

"میں رضا صاحب کے بغیر آپ کو کیا جواب دے سکتی ہوں... انہیں اعتراض نہ ہو تو میری بھی عین خوشی ہے۔"

لیکن ممی کے وہاں بیٹھنے تک رضا احمد لوٹ کر نہ آئے۔ شام کو ممی نے پھر فون کیا اور رضا احمد کو شام کے کھانے پہ آنے کی دعوت دی۔

آج صاحبزادہ الطاف بھی گھر پہ نہ تھے۔ جانے کہاں اپنے دل کی بے چینیوں کا علاج ڈھونڈنے گئے تھے

رضا احمد سات بجے کے قریب آئے تو فوزیہ بسروچشم ان کی منتظر تھیں۔ رضا احمد نے انہیں دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا کر وہ نادم نادم سی ان کے سامنے بیٹھی تھیں۔

"کیسی رہیں فوزیہ؟"

اس مختصر فقرے میں جانے کیا کچھ تھا۔ اسے فوزیہ ہی سمجھ رہی تھیں۔ خاموشی ہزار زبانیں بنی جا رہی تھی۔

"خدا کے لئے رضا یہ میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے۔"

فوزیہ ان کے قدموں میں بیٹھی تھیں اور آنسو ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔

"مجھے معاف کر دو رضا... تمہیں آزار پہنچا کر میں ساری زندگی سکون کا ایک لمحہ نہ گزار سکی۔ گناہوں کا کفارہ شاید ابھی تک ادا نہ ہو سکا۔ کاش تم نے مجھے اپنے دامنِ محبت میں تھوڑی سی جگہ دے دی ہوتی، لیکن نہیں... اب وقت گزر چکا ہے اور مجھے اپنے کئے کی سزا بھی ٹھیک ملی ہے۔ روشنیوں کی چکاچوند سے پاگل ہو کر ان کے پیچھے بھاگنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ سویرا ان تمام دکھوں پر بھاری ہوگی۔ وہ صرف میرے بیٹے کی زندگی ہی میں نہیں میری حیات کے لئے بھی سویرا بن کر آئے گی۔ اجالوں کا پیام۔ میرے گناہوں کی سیاہی سے بھرے دل کے لئے روشنی کا مینارہ۔ ماضی کے رشتے اسی صورت استوار کر کے ہی میں سکون حاصل کر سکتی ہوں۔"

"الطاف تمھارا ہی نہیں اب تو میرا بیٹا بن چکا ہے۔ تم جب چاہو اپنی بیٹی اپنے گھر لے آؤ۔ فوزیہ! تمہیں اندوہناک ماضی کو یاد کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں نے تو تمہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی تمہارے چہرے سے تمھاری داستانِ حیات پڑھ لی تھی۔ لغزشیں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ یوں کہو کہ خدا کو ہمارا ساتھ ہی منظور نہ تھا۔"

رضا کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

اور فوزیہ اس عظیم انسان کے سامنے آپ ہی آپ دل میں شرمندہ ہوئے جا رہی تھیں! اگر ان کے ناپاک منصوبوں کی تھوڑی سی بھنک بھی رضا احمد کے کان میں پڑ جائے تو ــــ وہ کانپ کر رہ گئیں۔

پھر کافی دیر وہ مستقبل کی باتیں کرتے رہے اور ڈنر کے بعد رضا احمد گھر لوٹ گئے۔

○

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

اپنے طرز کی شادیوں میں سے ایک شادی صاحبزادہ الطاف اور سویرا کی شادی تھی۔ ممی نے جی بھر کر ارمان نکالے تھے۔ شاندار قسم کی دعوتِ ولیمہ کے بعد شادی کے ہنگاموں سے تھکے ہارے افراد آرام کر رہے تھے۔ اور صاحبزادہ الطاف اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے مسلسل سوچوں میں گم تھے۔ کیسی شادی تھی۔ کیسا ملن تھا یہ کہ تنہائی میں اپنی دلہن سے بات کرنا تو درکنار اسے دیکھنے کی جرأت بھی نہ ہوئی تھی۔ شبِ زفاف جب شریر دوستوں سے رات کے ایک بجے رہائی ملی اور وہ کمرے میں داخل ہوئے تو ان کی دلہن سفید ناٹی میں ملبوس منہ ڈھانپے صوفے پر بے خبر سوئی ملی۔ ان کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اسے جگا سکیں۔ بس چپ چاپ پھولوں اور سنہری لڑیوں سے آراستہ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے رات گزار دی۔ صبح کے قریب ان کی آنکھ لگ گئی۔ ابھی وہ گہری نیند نہ سوئے تھے کہ نویرا اور اس کی اور سویرا کی سہیلیاں آدھمکیں اور انھیں کمرے سے نکالی کا حکم مل گیا۔

دو ایک بار وہ کسی کام سے اندر آئے تو وہ غارتِ گرِ دین و ایماں مکمل طور پر دلہن بنی اپنی سہیلیوں سے مصروفِ گفتگو تھی کہ ان کی طرف نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔ نویرا انھیں پکڑ کے قریب لے آئی۔

"چہ... چہ بے چارے الطاف بھائی... ہمیں بددعائیں دے رہے ہوں گے کہ... وہ ہنسنے لگی اور انھیں سویرا کے قریب بٹھا دیا۔ حسنِ جہاں سوز کی تپش نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ سویرا نظریں جھکائے بیٹھی رہی اور لڑکیاں موقع محل کے اعتبار سے فقرے چست کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد کمرہ خالی ہو گیا۔ صاحبزادہ الطاف نے دروازہ بند کر دیا۔

"کیا بندہ گناہ گار کی خطائیں اب تک معاف نہیں ہو سکیں"

انھوں نے پیار میں ڈوبے لہجے میں ندامت کے ساتھ کہا۔ لیکن سویرا نے جواب میں ایک ایسی نگاہ ان پر ڈالی جس میں سوائے حقارت کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ صاحبزادہ شرمندہ ہو گئے۔

"سویرا خدا کیلئے باہر کسی نفرت کا مظاہرہ نہ کرنا... ورنہ"

"مظاہرہ کرنا ہوتا تو کئی دن پہلے ہو چکا ہوتا۔" اس کے لہجے میں دنیا جہان کی بیگانگی تھی۔

دعوتِ ولیمہ میں دونوں صاحبزادہ الطاف کے دوستوں اور سویرا کی سہیلیوں میں گھرے رہے۔ رسم کے مطابق صاحبزادے نے اپنے ہاتھوں سے سویرا کو کھانا کھلایا اور سویرا نے ان کے منہ میں لقمہ دیا۔ فراز نے سارے منظر کیمرے میں مقید کر لیے۔ صاحبزادہ الطاف زیادہ سے زیادہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا گویا دونوں میں کوئی رنجشِ خاطر ہے ہی نہیں۔ ان کے دل سے دعا نکلی کہ کاش یہ لمحات یہیں رک جائیں۔

آج سویرا اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ دو بار نویرا کا فون آ چکا تھا۔ لیکن صاحبزادہ الطاف ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کر کے ٹال چکے تھے۔ وہ تنہائی چاہتے تھے۔ تین دنوں سے وہ جو عذاب مسلسل جھیل رہے تھے، اس سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ سویرا تم نے مجھ سے شادی کرنے سے ہی انکار کر دیا ہوتا۔ لمحہ لمحہ کی موت سے ایک بار مر جانا کم ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ سویرا کا انتقام کس قدر سخت تھا کہ قریب رہ کر وہ بات کرنے کی بھی روادار نہ تھی۔ انہیں یوں نظر انداز کئے رہتی گویا کمرے میں کوئی دوسرا فرد ہے ہی نہیں۔ صاحبزادہ بھی آخر انسان تھے کب تک برداشت کرتے انھوں نے سویرا سے دو بدو بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سویرا کی نظروں میں ان کے لیے جو حقارت تھی وہ صاحبزادہ کا دل جلا دیتی تھی۔ وہ سویرا کو کیا بتلاتے کہ ان کی اس حرکت کے پس منظر میں کیا محرکات تھے۔ وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے ممی پر سارا بوجھ ڈال کر اپنی صفائی پیش کر دیتے لیکن ماں کی بے عزتی انہیں مر کر بھی گوارا نہ تھی۔

سویرا کا بہیمانہ سلوک اس کے شدید قسم کے اعتماد کا بھرم ٹوٹ جانے کا نتیجہ تھا۔ صاحبزادہ الطاف پر اسے اندھا اعتماد تھا۔ خلوتوں میں وہ ایسے لمحات سے بارہا دوچار ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی شرافت کے قدم ذرہ برابر نہ ڈگمگائے تھے۔ نہ وہ عادی مجرم تھے۔ انھوں نے تو دنیا میں صرف سویرا کو محبوبہ کی حیثیت سے دیکھا اور شریکِ حیات بنانے کی خواہش کی تھی۔ بیچ میں ممی کا مسئلہ آ گیا تو انھیں یوں لگا گویا انھیں ممی نے کند چھری سے ذبح کر دیا ہو۔ لیکن ممی نے اپنے آپ کو اس قدر مظلوم ثابت کیا کہ صاحبزادہ الطاف ماں کی محبت میں سرشار ہو کر سویرا کی وفاؤں سے دغابازی کر بیٹھے۔ لیکن دل کے معاملوں میں سویرا کی محبت ہی غالب رہی۔ اگر انتقامی جذبوں میں سویرا کی رضامندی بھی شامل ہوتی تو سویرا ان سے بچ کر یوں نہ جا سکتی تھی۔ صاحبزادہ الطاف گو فرشتہ نہ تھے لیکن سویرا کی عصمتوں کے امین ضرور تھے۔ اب جبکہ شرعی طور پر وہ ان کو سونپ دی گئی تو ان کے تعلقات دو اجنبیوں سے بھی بدتر تھے۔

شام کو صاحبزادہ سویرا کو واپس لے آئے۔ نویرا انھیں کار تک چھوڑنے آئی۔ ہنسی مذاق تو گویا اس کی فطرت تھی۔ سو وہ دونوں بھی ان کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکے۔

گاڑی میں ان کے قریب بیٹھ کر بھی وہ ان سے دور تھی اور صاحبزادہ بھی سوچوں کی دنیا میں گم گاڑی چلا رہے تھے۔

○

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

"آپ نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر میرے دل کے سارے جذبات فنا کر دیئے ہیں۔ آپ میرے دوست نہیں دشمن تھے۔" سویرا کرختگی سے انہیں جواب دے رہی تھی۔

"سویرا میں فرشتہ تو نہ تھا۔ ایسا غارت گر ایمان حسن دیکھ کر کس کافر کا دل پگھل نہ جائے گا۔ جب اس قدر تنہائی اور قربتیں میسّر ہوں تو ایسی غلطیاں بعید از قیاس نہیں ہوتیں۔ یہ مت بھولو کہ مرد عورت سے کبھی شکست نہیں کھا سکتا۔ اگر میں بھی بروقت نہ سنبھل جاتا تو سب کچھ سرزد ہو گیا ہوتا۔ پھر تم نے کونسی کسر اٹھا رکھی تھی۔ اپنی طرف سے تو تم نے مجھے جان سے مارنے کا ہی سامان کر لیا تھا۔ اگر مجھ سے ایسی ہی نفرت ہو گئی تھی تو نکاح کیوں قبول کر لیا" صاحبزادہ الطاف کے لہجے میں بھی کافی تیزی تھی۔ سویرا نے سنگ دلی سے ان کی طرف دیکھا۔

"تاکہ تمہارے جرم کی سزا تمہیں دے کر اپنی آنکھوں سے تمہیں تڑپتا دیکھوں۔"

"یہ سب اسی وقت تک ممکن ہے جب تک تمہیں یہ یقین ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یاد رکھو میں بھی کوئی دوسرا قدم اٹھا سکتا ہوں۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ دوسرا قدم اٹھائینگے یا تیسرا میں اس دن کے بعد سود و زیاں کے احساس سے ناواقف ہو چکی ہوں۔"

"سویرا میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی ان حرکتوں سے کب باز آؤ گی؟"

صاحبزادہ کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

"شاید کبھی نہیں۔" سویرا کی آواز بھی خاصی اونچی تھی۔

کافی دیر کے بعد تھک کر صاحبزادہ بیڈ پر لیٹ گئے اور سویرا حسب معمول صوفے پر بازو رکھے بیٹھی رہی۔ وہ مسلسل اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل میں درد ہی درد تھا۔ وہ ظالم ان سے ان جان بنی لیٹی تھی۔

○

زخمی زخمی وجود کو سنبھالے سویرا کی سنگ دلی کا نشانہ بنے صاحبزادہ الطاف یہ بوجھ تنہا اپنے آپ اٹھائے جا رہے تھے۔ نہ تو ممی سے کچھ کہہ سکتے تھے اور نہ سویرا کے سامنے ممی کو مورد الزام ٹھہرا اپنی پوزیشن صاف کر سکتے تھے کہ عزیز از جان ممی کی توہین انھیں مر کر بھی گوارا نہ تھی۔ صاحبزادہ نے اپنے آپ کو کاروباری مشاغل میں بے طرح الجھا لیا۔ صبح سات بجے کے گئے شام گئے گھر لوٹتے اور کھانا کھانے کے بعد کبھی ممی کے کمرے میں کچھ وقت گزارتے ورنہ اپنے کمرے میں چپ چاپ لیٹے رہتے۔ کبھی طبیعت زیادہ گھبراتی تو لانگ ڈرائیو پر چلے جاتے۔ دوستوں سے تعلق بھی برائے نام رہ گیا۔ حتیٰ کہ فراز اور بھابی سے ملنا بھی چھوڑ دیا مبادا وہ چہرے پر لکھی محرومیوں کی تحریر پڑھ نہ لیں۔

سویرا کی محبتوں میں جتنی شدت تھی نفرت اس سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ ان سے بات کرنا تو درکنار۔ ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ سویرا نے پورے گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ ممی کی خدمت کو اپنا ایمان سمجھ لیا تھا۔ ممی اس پر نثار نظر آتی تھیں لیکن ان کا وجود اور ان سے تعلق رکھنے والی ہر چیز اس کے لئے شجر ممنوعہ تھی۔ ممی کے سامنے تو وہ ان سے یوں ملتی گویا ان میں کوئی رنجش بالاتعلقی ہے ہی نہیں۔ ممی بے چاری کچھ نہ سمجھ پائیں۔ لیکن جب انھوں نے صاحبزادہ الطاف سے کہا کہ وہ سیر و سیاحت کے لئے غیر ممالک جانے کی تیاری کریں تو سویرا نے ممی کے سامنے ہی انکار کر دیا۔ انکار کرتے وقت اس کے چہرے پر زمانے بھر کی تلخی تھی جسے الطاف کے ساتھ ساتھ ممی نے بھی محسوس کیا۔ دل میں شکوک نے سر ابھارا۔

"ایسا تو نہیں کہ..." ان کے ذہن نے ایک منٹ میں بات کی تہہ پالی۔ سویرا نے برائے نام کھانا کھایا اور اٹھ گئی۔ ممی اس سے استفسار بھی نہ کر سکیں۔ الطاف نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ممی بہت سوچ بچار کے بعد کچھ وضاحت طلب کرنے کے لئے ان کے کمرے کی طرف آئیں۔ لیکن باتوں کی آواز سنے ان کے بڑھتے قدم رک گئے۔

صاحبزادہ اور سویرا دونوں ہی سخت لہجے میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ممی کی خواہش کا احترام کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میں خود ہی آپ کی دنیا سے بہت دور جا رہا ہوں جہاں آپ کی یاد مجھے ستانے کبھی نہ آ سکے گی اور نہ آپ میری شکل دوبارہ دیکھیں گی۔ دیکھ لیجئے یہ کاغذات صرف ٹکٹ لینا باقی ہے۔"

"مجھے آپ کی موجودگی یا دوری سے کوئی غرض نہیں ہے میری بلا سے آپ جہاں بھی جائیں۔" سویرا نے سنگدلی سے کہا۔

"آپ یہاں رہنا پسند کریں تو ٹھیک ورنہ آپ اپنے والدین کے گھر بھی جا سکتی ہیں۔ اور اگر چاہیں تو ہمیشہ کے لئے بھی۔ میں آپ کو ایسی زندگی گزارنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا جو آپ کی طبع کے لئے ناقابل برداشت ہو۔"

سویرا نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر کھڑی ممی لرز گئیں۔ ان

کا بیٹا اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ اور وہ چپ چاپ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ صاحبزادہ نے اپنی باہر جانے کی خبر ان سے پوشیدہ رکھی تھی۔ وہ بے طرح پریشان ہو گئیں۔ اس مشکل کا کیا حل تھا ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ شکست خوردہ سی اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

دوسرے دن صاحب زادہ معمول کے مطابق صبح صبح ہی چلے گئے۔ سویرا کی نفرتوں کی بجلیاں کچھ اس طرح گریں کہ آرزوؤں کے خرمن جل کر خاکستر ہو گئے۔ اپنی زندگی انھیں ایک سنگین مذاق نظر آنے لگی تھی۔ بھری دنیا میں کوئی ایسا نظر نہیں آرہا تھا جس سے دل کی بات کہہ سکتے۔ آہیں اور نالے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئے تھے۔ وہ کیا کریں ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تھک ہار کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آج اپنا دل فراز کے سامنے کھول کر روح کا بوجھ ہلکا کریں گے۔

○

ادھر ممی نے بھی نازک حالات کے پیش نظر بہت سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا اور سویرا کے کمرے میں آئیں۔ سویرا بھی اداس اداس اور پریشان سی بیڈ پر بیٹھی تھی انہیں قریب پاکر اٹھ بیٹھی۔

"سویرا... میری بھورانی... کیا تم میرے بیٹے کے ناکردہ جرم کو معاف نہیں کر سکتیں" سویرا نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں۔ انھوں نے سویرا کو گلے لگا لیا اور جی بھر کے روئیں۔ سویرا کے دل میں بستے غم بھی آنکھوں میں آگئے...... خاصی دیر بعد جب بادو باراں کے یہ طوفان گزر گئے تو ممی نے دل کھول کر سویرا کے سامنے رکھ دیا۔ جوانی سے لیکر آج تک کے حالات پوری سچائی سے بیان کر دیئے۔ سویرا ششدر سی ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔ ممی نے حرف آخر بھی کہہ ڈالا۔

لیکن سویرا ساکت بیٹھی تھی کہ طاقت جنبش ہی نہ تھی۔

"مجھے معاف کر دو بیٹی... میں تمہاری گناہ گار ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے تمہیں محفوظ رکھا اور میرے بیٹے کو بھی اور مجھ گناہ گار کو سیدھی راہ دکھائی۔ الطاف نے اپنی زندگی بھر کی خوشیاں میری جھولی میں ڈال دی تھیں چاہے اس کی زندگی اس کے اپنے لئے عذاب ہی کیوں نہ بن گئی۔ چاہے مجھے راضی کرنے والا یہ قدم اس کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں ہی باعث ذلت کیوں نہ ہوتا۔ اس نے اپنے تئیں میرا حکم ماننا ہی تھا۔ یاد رکھو بیٹی جو مرد اپنی ماں کے معاملے میں مخلص نہیں ہو سکتا وہ بیوی کا وفادار بھی نہیں ہو سکتا۔ اب بھی حالات کی ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے چاہو تو دونوں کی زندگی رعنائیوں کی آئینہ دار بن جائے ورنہ جہنم سے بھی بدتر۔ میں تم سے صاحبزادہ کی خوشگوار زندگی کی بھیک مانگتی ہوں۔

نادرہ خاتون کا ناول

کنول

اس گھر میں دو دو چڑیا گھر تھے۔
ایک چڑیا گھر جانوروں کا
دوسرا انسانوں کا
قہقہے بھی آنسو بھی ایک مہکتوں بھرا رومان

کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے

مجلد ۔ قیمت ۲۵ روپے

نادرہ خاتون کے دوسرے ناول

شعاع ———— ۳۰ روپے
حنا ———— ۳۰ روپے
عرفانہ ———— ۱۸ روپے
لبنیٰ ———— ۲۰ روپے
دردانہ ———— ۲۰ روپے
علینہ ———— ۲۵ روپے
زیر طبع

خیام پبلشرز چوک اردو بازار لاہور

جرم اتنا ہولناک نہیں کہ معاف نہ کر سکو!"

تبھی سویرا آنکھوں میں آئے اشکوں سمیت مسکرا دی اور ممی نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ کر بھینچ لیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

ممی سرشار اپنے کمرے میں لوٹ گئیں اور سویرا بھاگ کر صاحبزادہ کی تصویر کے قریب آئی اور اسے اٹھا کر بیڈ پر آگئی۔ اس نے بلاارادہ تصویر پر اپنے لب رکھ دیئے۔ اپنی سنگ دلی اور صاحبزادہ کے صبر و شکیب کا اندازہ کر کے وہ پھر اشکبار ہوگئی۔ اس نے تصویر سینے سے لگا لی۔ آنکھیں بند کیے کیے ماضی کا ایک ایک لمحہ اس کی نظروں کے سامنے آگیا۔ اس نے چونک کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف سہ پہر کے تین بجے تھے۔ اسے یوں لگا کہ صاحبزادہ کی واپس آنے میں گویا کئی صدیاں باقی ہیں۔ خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وہ اٹھی اور الماری کے قریب آئی۔

الماری میں موجود تمام کپڑے نکال کر باہر پھینک دیئے کسی لباس کا انتخاب بے حد مشکل لگ رہا تھا۔ بڑی مشکلوں کے بعد اس نے گولڈن کلر کا ایک خوبصورت لباس منتخب کیا اور باتھ روم میں چلی گئی۔ نہانے سے فارغ ہو کر وہ ڈریسنگ روم میں پہلی بار بے حد خوشدلی کے ساتھ خود کو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر سنوارنے لگی۔ بالوں کو خوبصورت انداز میں سیٹ کرنے کے بعد صاحبزادہ کے پسندیدہ سینٹ کا اسپرے کر کے اس نے اپنا آخری جائزہ لیا۔ ایک دم اُسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ تصوّر میں صاحبزادہ جو آ گئے تھے۔ ایک مدت کے روٹھے محبوب کو منانا تھا سو اس کے لئے ہر قسم کے اہتمام کی ضرورت تھی۔

سویرا اپنے ہی خیالوں میں گم بیڈ روم میں آئی تو صاحبزادہ پر نظر پڑی۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ آج خلافِ معمول وہ جلد کیسے لوٹ آئے۔ وہ دانتوں میں انگلی دبائے دروازے میں ہی کھڑی رہ گئی۔ صاحبزادہ اس کی طرف پشت کیے اپنی الماری کھولے چیزیں الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ سویرا شرماتی جھجکتی دبے پاؤں ان کے قریب آئی۔ صاحبزادہ غموں کے ہجوم میں یوں گھرے تھے کہ انہیں گرد و پیش کا احساس ہی نہ تھا۔ سویرا نے آہستہ سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ بیحد حیران ہو کر ایک دم پلٹے۔ سویرا کا یہ نیا روپ اور چہرے پہ جگمگاتی خوشیاں... ان کے دل میں غصے اور نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے نہایت کرب سے سوچا۔

یہ شاید صبیح کی باتوں کا اثر ہے۔ سویرا آزادی کا مژدہ سن کر یوں بے طرح خوش ہے۔ غم کی آگ کچھ اور بھی بھڑک اٹھی۔ ہجر و فراق کے بھڑکتے شعلے کچھ اور بھی بلند ہو گئے کہ ان شعلوں کے پس منظر میں سویرا کی نگاہوں میں چاہت کی دنیا بھی نظر نہ آئی۔ انھوں نے سویرا کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا اور اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جانے کے لئے قدم اٹھائے۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟..." سویرا کے خوبصورت لبوں کی مسکراہٹ انہیں طمانچہ بن کر لگی

"ابھی تو صرف آفس تک جا رہا ہوں لیکن فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ پرسوں کسی فلائٹ سے چلا جاؤں گا۔ آپ اپنی کہیئے۔ شاید گھر جانے کے لئے تیار ہیں۔ آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا اور کچھ نہیں تو ایک ظالم کے ساتھ یہ آخری سفر یادگار رہ جائے گا۔ ان کے لہجے میں درد ہی درد سمویا تھا اور نگاہوں میں حسرت ہی حسرت۔ سویرا کی آنکھوں کی جھیلیں شفاف پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے ان کا بازو تھام لیا۔

"آپ کہیں نہیں جائیں گے..." سویرا کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"اذیتوں کا جو دردناک سلسلہ میں نے اپنی لاعلمی اور آپ نے چند مصلحتوں کے تحت جاری رکھا آج ختم ہو گیا ہے۔ میری آنکھوں پر بندھی پٹی جس کو اتار کر میں آپ کے دل میں جھانک سکی آج کھل گئی ہے اور میں اتنی نادم ہوں کہ تین ماہ کے ان جور و ستم کے بدلے معافی کے الفاظ نہیں ڈھونڈ پا رہی!" اس نے اپنا سر صاحبزادہ الطاف کے سینے پر ٹکا دیا۔ لرزتے وجود سمیت اسے یوں لگا کہ وہ ابھی گر جائے گی۔ صاحبزادہ اس نئی اور اچانک تبدیلی پر حیران و پریشان تھے۔ سویرا نے ان کے الجھے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ صاحبزادہ لمحہ بھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے رہے اور پھر... نفرتوں کے طویل پُل صراط کو عبور کرنے کے بعد اچانک سویرا کی آنکھوں میں چھپے چاہت کے طوفانوں سے آگاہ ہو کر وہ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ سویرا کے نازک نازک مہکتے وجود کو اپنے بیحد قریب محسوس کر کے شادمانی کا احساس بیکراں ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ انھوں نے روح کے سناٹوں میں سویرا کو کسی خوبصورت نغمے کی طرح اُترتا محسوس کیا۔

سویرا... میری زندگی... میری روح....

وہ اسے آنکھوں میں جذب کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ دھڑکنوں سے بھی زیادہ قریب اس محبوب ہستی کو انھوں نے سینے سے لگا لیا۔

بڑی دیر کے بعد وہ ہوش و خرد کی دنیا میں لوٹے اور ہاتھ میں پکڑے کاغذات پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر کے کمرے میں بکھرا دیئے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اپنے ہی روبرو تھے

اقبال بانو

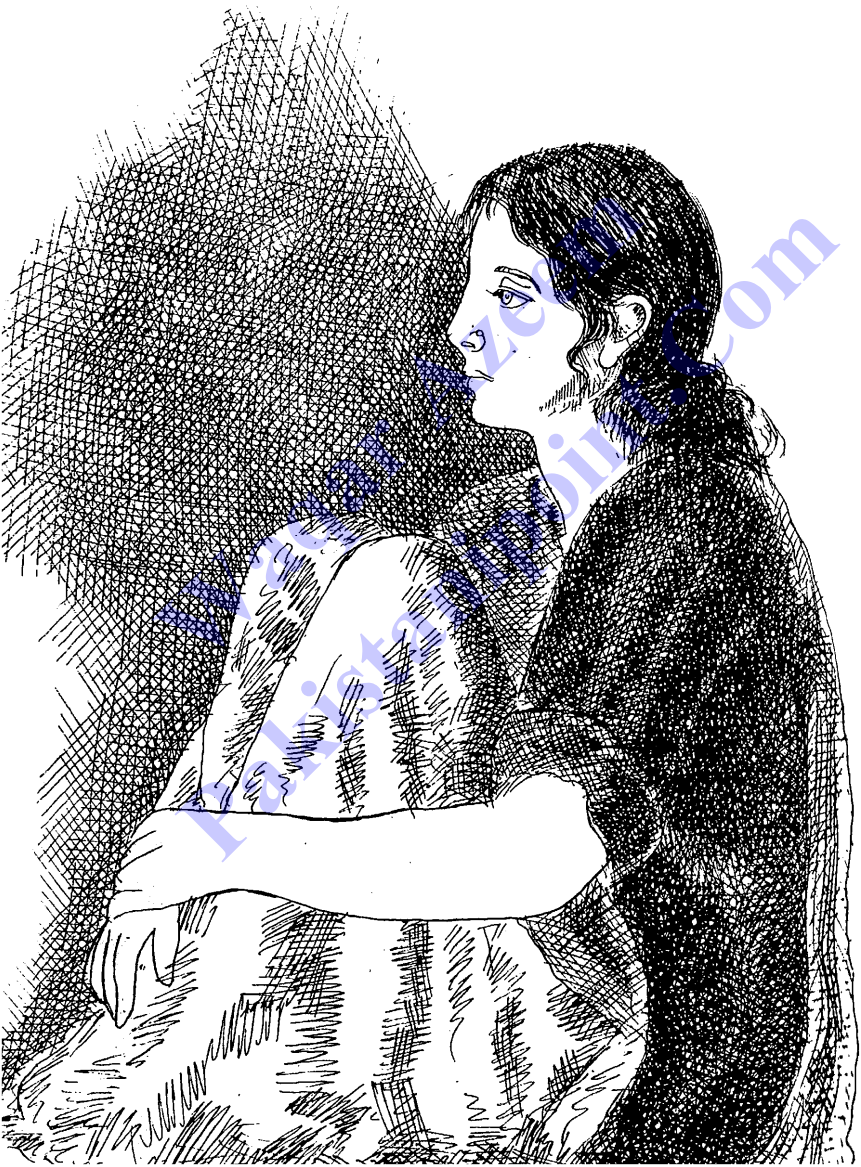

www.Pakistanipoint.com

"اَنّا بی وہ آ رہے ہیں" ندا دوڑتی ہوئی آئی اور اُن کے قریب ہی تخت پر دراز ہو گئی مارے خوشی کے اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا ہمیشہ اداس رہنے والی آنکھوں میں جگنو جگمگا رہے تھے۔

"اَنّا بی آخر میں انہیں یاد آ ہی گئی اور بھلا کبھی ناخنوں سے گوشت بھی جدا ہوا ہے آپ سچ کہتی ہیں اَنّا بی کہ اگر کسی کو دل سے یاد کیا جائے تو وہ ضرور آتا ہے میرے جذبے سچے تھے نا" وہ مارے خوشی کے اَنّا بی سے لپٹ گئی۔

"ندا بیٹے کون آ رہا ہے؟" اَنّا بی نے محبت سے اُس کی پیشانی چوم لی۔

"بابا... میرے بابا" ندا نے ایک جذب کے عالم میں کہا۔

"یعنی... یعنی کہ احمد علی صاحب" اَنّا بی کا چشمہ مارے حیرت کے ڈھلکا جا رہا تھا۔

"ہاں اَنّا بی وہی۔ یہ دیکھیں اُن کا ٹیلی گرام آیا ہے وہ پرسوں آ رہے ہیں" ندا نے گلابی کاغذ اُن کے سامنے لہرایا۔

"مگر"

"اَنّا بی میرے بابا کیسے ہیں؟" ندا نے پوچھا

"بہت ہی خراب" اَنّا بی کے منہ سے ایک دم نکلا۔

"اَنّا بی!" ندا ایک جھٹکے سے اُن سے علیحدہ ہو گئی۔

"آپ... آپ میرے بابا کی شان میں گستاخی مت کیجئے اَنّا بی، مجھے اپنے بابا اور مما بہت پیارے ہیں" ندا نے ہلکے سے انہیں سرزنش کی۔

"ندا میرا مقصد یہ نہیں ہے"

"پھر کیا مقصد تھا آپ کا؟"

"تم سمجھو چاند اس میں بھی کوئی چال ہے کہ وہ دس سال بعد تم سے ملنے آ رہے ہیں آخر کیوں؟"

"مصروف رہے ہوں گے" ندا نے اپنے بابا کی طرفداری کی

"میرا دل تو انجانی خوشیوں سے دھڑک رہا ہے ندا۔"

"اُوہو ایک یہ آپ کی مشکل ہے کہ ذرا کوئی ایسی بات سنی اور آپ کا بوڑھا دل دھڑکنے لگا۔"

"آپ اپنے دل کا علاج کرائیے" ندا شوخی سے بولی۔

"چل شریر!" اَنّا بی اُس کی بات سن کر جھینپ گئیں۔

"اُوہ سوئیٹ اَنّا بی" ندا نے اُن کے دونوں گال چوم لئے۔

"میں عثمان کو خوشخبری سنا آؤں"

ندا نے کہا اور پھر اُن کا جواب سنے بغیر ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اَنّا بی اُداس نظروں سے اُسے جاتا دیکھتی رہیں۔

ندا تو جو اتنی معصوم ہے تجھے خبر نہیں بٹیا کہ تیرا بابا کتنا شاطر ہے یقیناً اُس کی کوئی چال ہے اِس میں بھی کہ وہ تجھ سے ملنے آ رہا ہے تیری اتنی خوشیاں وہ ملیا میٹ کر دیں گے... مگر تو تو ہر فکر سے آزاد ہے اچھا بڑا تو سوچتی نہیں۔ اور ویسے بھی جن لوگوں کو کبھی خوشیاں نہ ملی ہوں ذرا سی کاغذی خوشی بھی اُن کے لئے بہت ہوتی ہے اور ایسے ہی لوگوں میں ندا تھی۔

اس بات کو کافی سال گزر گئے تھے۔ وقت نے اُن باتوں پر گرد ڈال دی تھی اَنّا بی بہت پیچھے پہنچ گئیں گئے دنوں میں اُن واقعات پر سے وقت کی گرد کو جھاڑا.... اُن کے سامنے ایک روشن ساون آ گیا اَنّا بی یعنی صغراں بی بی اپنی اَماں کے ہمراہ چوہدری دلاور خان کے ہاں ملازم تھیں چوہدری دلاور خان کا شمار چکوال کے بڑے جاگیرداروں میں ہوتا تھا میلوں پر اُن کی زمینیں تھیں۔

پانچ بیٹوں کے بعد خدا نے انہیں بیٹی دی تھی ثریا دلاور...

ثریا اور صغراں بی بی میں صرف دو برس کا فرق تھا یعنی صغراں بی بی بڑی تھیں اِس کے باوجود دونوں بہت گہری سہیلیاں تھیں ثریا اسکول جاتیں تو صغراں بی بی بھی ساتھ جاتیں یہ اور بات کہ صغراں بی بی تو پرنسپل کی چپراسن کے پاس بیٹھی رہتیں اور ثریا کلاسز اٹینڈ کرتیں۔ یوں بہت وقت آگے بڑھ گیا ثریا نے میٹرک کیا تو اُن کے لئے رشتوں کی بھرمار ہو گئی صورت شکل کی بھی اچھی تھیں کُندن کی طرح چمکتا جسم اور سب سے بڑھ کر دولت مند باپ کی بیٹی تھیں یوں بھی جس گھر میں بیری ہوتی ہے پتھر تو ضرور ہی آتے ہیں مگر نشانے پر کوئی ایک ہی فٹ بیٹھتا ہے۔

ثریا کو احمد علی کے آنگن میں بہار بن کر اُترنا تھا احمد علی ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے تھے بہت امیر یوں سمجھیں کہ ثریا کے والد کے ہم پلہ تھے سو جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق ثریا دلاور دو بول پڑھ کر ثریا احمد علی بن گئیں، جہاں مادی چیزیں اور رقم زمینیں انہیں جہیز میں ملیں وہیں انہیں صغراں بی بی بھی جہیز میں ملیں۔

احمد علی ثریا کو دیکھ دیکھ کر جیتے... مہینوں انہوں نے ثریا کو نیچے نہ اُترنے دیا یوں لگتا جیسے کہ ہاتھ بھی مشکل سے لگاتے ہوں گے کہ میلی نہ ہو جائیں ثریا کو احمد علی کے قرب نے اور بھی حسن بخشا تھا وہ اور بھی دلآویز ہو گئی تھیں احمد علی انہیں بہت کم میکے جانے دیتے اگر وہ جاتیں بھی تو ساتھ خود جاتے۔

WaqarAzeem
Pakistanipoint.Com

یونہی محبت کے ہنگوڑے میں جھولتے ہوئے پورے تین سال بیت گئے اور گئے دنوں نے انہیں ایک خوبصورت سی بیٹی ندا سے نوازا۔

دونوں ندا کو پاکر بہت خوش تھے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ثریا شرما کر نظریں جھکا لیتیں مگر احمد علی کی شوخ نظریں اُن کے چہرے کا حصار کئے رہتیں ندا زیادہ تر صغراں بی بی کے پاس رہتی سب بہت خوش تھے مگر بعض مرتبہ خوشیاں بہت عارضی ہوتی ہیں۔

ثریا بھی خوشیوں کے ہنگوڑے میں جھولتی ہوئی ایکدم بیدار ہوگئیں۔

وہ شب بہت تاریک تھی جب ثریا سیاہ چادر کی بکل مارے ایک کاغذ ہاتھ میں لئے صغراں بی بی کے ہمراہ اُس عالیشان حویلی سے باہر آگئیں۔

صغراں بی بی کا دل چاہ رہا تھا وہ پوچھیں۔

ثریا جی آپ تو بڑے ڈھول تاشوں کے ساتھ اِس حویلی میں اُتری تھیں یہاں آپ نے کئی سال گزارے ہیں۔ یہاں آپ کو احمد علی کی رفاقتیں اور محبتیں ملی ہیں یہیں پر قدرت نے آپ کو دنیا کے خوبصورت ترین روپ ماں سے نوازا ہے پھر آپ کیوں جارہی ہیں؟ اُن کے ہاتھ میں کاغذ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھیں۔

تب ہی صغراں بی بی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟"

"بسوں کے اڈے پر۔" ثریا سپاٹ آواز میں بولیں۔

"آپ نے ندا کو چھوڑ دیا؟"

"میں ندا کو اپنے ساتھ تو نہیں لائی تھی۔" ثریا نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ صغراں بی بی خاموش ہو رہیں۔ دونوں خاموشی سے آگے بڑھتی جارہی تھیں صغراں بی بی کے ذہن میں ہزاروں سوال جگنوؤں کی مانند چکے لگا رہے تھے۔ آخر انہوں نے پھر ہمت کر کے پوچھا۔

"آپ کیوں جارہی ہیں؟" انہوں نے دماغ میں چبھتی پھانس نکال پھینکی۔

"میرا دانا پانی اِس گھر سے اُٹھ چکا ہے صغراں۔" ثریا ایک آہ بھر کر بولیں۔

"یہ کاغذ دیکھ رہی ہو۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ اُس کی طرف بڑھایا۔

"ہاں۔"

"یہ ... یہ طلاق نامہ ... اِس گھر سے مجھے یہ چیز ملی ہے۔" ثریا نے کہا۔

"نہیں۔" صغراں کا رواں رواں چیخ اُٹھا وہ تو سمجھی تھیں کہ اِس کاغذ میں کچھ اور لکھا ہوگا ثریا کے اماں یا بابا کی بیماری کی خبر ہوگی اتنا انہیں اندازہ تھا کہ کوئی اہم بات اس کاغذ پر تحریر ہے... مگر یہ کچھ تو اُس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

"مگر یہ سب کچھ مجھے تو یقین نہیں آرہا۔" صغراں نے کہا۔

"ہاں صغراں مجھے خود یقین نہیں آرہا۔"

"مگر ایسا کیوں ہوا؟"

"تمہیں پتہ ہے ندا پانچ برس کی ہونے والی ہے۔" ثریا نے کہا۔

"ہاں۔" صغراں نے کہا۔

"اور میں اب تک دوبارہ ماں نہیں بنی۔"

"یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں نہ کوئی ایسی اہم بات ہے۔" صغراں بولی۔

"مگر ندا کے باپ کے لئے بہت اہم بات ہے اُسے اپنی جائیداد کا وارث چاہیئے اور۔" ثریا رک گئیں۔

"اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے کہ میں دوبارہ ماں نہیں بن سکتی۔" ثریا اک آہ بھر کر بولیں۔

"بی بی!" صغراں حیرت سے انہیں تکنے لگی۔

"ندا کے باپ نے مجھ سے دوسری شادی کی اجازت مانگی مگر میں روایتی عورت بن گئی یہ نہ سوچا کہ میرے انکار پر وہ میرے منہ پر کالک مل دے گا مجھے بہت مان تھا اپنی محبت پر اپنے عورت پن پر۔ مگر اُس نے میرے انکار پر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا میں خوش رہی مگر آج چند دن پہلے اُس نے مجھے طلاق نامہ دیدیا۔ اپنے اور میرے رشتے کی زنجیر توڑ دی اب بھلا میں وہاں رہ کر کیا کرتی وہ گھر میرے لئے حرام ہو چکا ہے اسی لئے تو میں تمہیں لے کر آگئی" ثریا نے دھیرے دھیرے اُسے سب کچھ بتا دیا۔

اور اگر وہ صغراں کو نہ بتاتیں تو اور کسے کہتیں صرف واحد وہی تو غمگسار تھی اُن کی صغراں اپنی سکھی اپنی مالکن کے دکھ پر آنسو بہا رہی تھی اُس کا گھر اُجڑنے پر صغراں کا دل ماتم کناں تھا۔ مگر ثریا کی آنکھ نم نہ تھی اُس کی آنکھیں سے آنسو نہ ٹپکا تھا۔

"بی بی ندا کا کیا ہوگا؟"

"وہ اپنے باپ کے پاس رہے گی۔"

"آپ تو رہ لیں گی جی پر میں کیا کروں گی! ماں نہ ہوتے ہوئے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

بھی میں خود کو اس کی ماں سمجھتی ہوں آخر میں اُسے گود وں کھلاتی رہی ہوں جی صبح اُٹھ کر مجھے نہ پائے گی تو بہت روئے گی جی "صغراں رو دی۔

"اُس کا باپ اُسے عادت ڈال دے گا" ثریا تلخی سے بولیں صغراں خاموشی سے اُسے دیکھ کر رہ گئی۔

ایک ماں تھی جس نے ندا کو جنم دیا تھا جس نے اس کی تخلیق کی تھی اُسے کوئی پرواہ ہی نہ تھی اپنی بیٹی کی۔

اور ایک صغراں ماں نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ماں تھی جس نے ندا کو جنم تو نہ دیا تھا مگر بازؤوں میں لے کر اُسے لوریاں سنائی تھیں اُسے بازوؤں میں جھلایا تھا سینے سے لگا کر اپنے دل کو قرار دیا تھا اور اب وہی دل ندا کے لئے بے قرار ہوا جا رہا تھا۔

صغراں بی بی کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اُن کے گالوں کو خوب بھگو رہے تھے وہ اپنی ممتا کے لٹنے پر فریاد بھی نہ کر سکی تھیں آخر کو وہ ملازمہ تھیں۔

پھر وہ دونوں لاری کے ذریعے چکوال پہنچیں جب وُہ سُرخ حویلی میں داخل ہوئیں تو صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا۔

سب انہیں یوں اچانک دیکھ کر بہت حیران ہوئے بھا بھیاں دوڑی آئیں بھائیوں کے دل انجانی خوشیوں سے دھڑکنے لگے اماں بابا بھی آ گئے سب آنگن میں جمع تھے اور ثریا خالی خالی نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھیں کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کر گلے لگا تا۔

"ثریا تو اور اس وقت اکیلی۔۔ ندا اور احمد کہاں ہیں؟" آخر چوہدری دلاور خان نے دھڑکتے دل کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

تب ثریا نے طلاق کا کاغذ باپ کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور وہ کاغذ ایک کے بعد ایک ہاتھ میں ہوتا ہوا بڑے بھائی کے ہاتھ میں چلا گیا۔

"آخر ہوا کیا؟" اماں نے حیرت سے صغراں کو دیکھا تب ایکدم ثریا اماں کہہ کر ماں سے لپٹ گئیں اور وہ دھواں دھار روئیں کہ سرخ حویلی کے در و دیوار اُن کی چیخوں سے لرز اُٹھے دھرتی کا سینہ پھٹ گیا۔

"اماں میرا گھر اُجڑ گیا میری گود اُجڑ گئی۔"

ثریا مسلسل یہی کہے جا رہی تھیں سب ہونقوں کی طرح کھڑے تھے۔

"آخر اُس نے سمجھا کیا ہے میں اُس کے ٹکڑے کر دوں گا"

"میں اُس مردود کا خون پی جاؤں گا" سکندر لالہ کا خون ایکدم جوش مارنے لگا۔

"آخر اُس نے سمجھا کیا ہے میں اُس کے ٹکڑے کر دوں گا" امین بھائی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولے۔

"ثریا لاوارث نہیں پانچ بھائیوں کی بہن ہے ہم اُسے ختم کر دیں گے" طالب بھائی کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔

"نہ لالہ نہ" ثریا روتے روتے ایکدم ہوش میں آ گئی اماں کے سینے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"اُسے کچھ نہ کہنا لالہ"

"اوئے کیوں؟" چوہدری دلاور خان غصے سے پھنکارے۔

"او۔۔۔ وہ میری ندا کا پیو ہے بابا۔ میں ندا کو یتیم کیسے دیکھوں گی"

"وہ سمجھے گا ہم ڈر گئے ہیں" لالہ سکندر غرائے۔

"سمجھنے دیں۔ میری قسمت کا لکھا یہی تھا" ثریا نے کہا۔

"تو اس کی قسمت میں بھی ہمارے ہاتھوں سے موت لکھی ہے" طالب بھائی سانپ کی طرح پھنکارے۔

"طالب بھائی اُس کو کوئی نقصان نہ پہنچے آخر وہ میری ندا کا باپ ہے" ثریا نہایت ہی مضبوط لہجے میں بولی۔ "اگر اُسے کوئی نقصان پہنچا تو میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔"

واہ ری عورت تو واقعی ایک پہیلی ہے جو کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تجھے کوئی نہیں بوجھ سکتا ایسی ہی ایک عورت ثریا بھی تھی جو نہیں چاہتی تھی کہ احمد علی کو کوئی نقصان پہنچے اور اُس نے ندا کی آڑ لے کر کہا تھا کہ اُس کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچے اصل میں وہ اب بھی احمد علی کو چاہتی تھی اتنی جلدی محبتیں تو ختم نہیں ہوتیں۔

صغراں بی بی حیرت سے ثریا کو تک رہی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ سب نے قسمت کے لکھے پر سمجھوتہ کر لیا۔۔ مگر نہ جانے کیوں ثریا اپنا دکھ کسی پہ ظاہر نہ کرتی اماں بابا اور بھائیوں کے سامنے مسکراتی رہتی مگر جب صغراں بی بی، ثریا کے کمرے میں اُن کے ساتھ سوتی تو ثریا کی سسکیاں اُس کے کلیجے کے پار ہو جاتیں یوں لگتا کہ ڈھیر سارے تیر دل میں کھب گئے ہوں۔

قسمت اور تقدیر کے لکھے پہ بہت کم لوگ بھروسہ کرتے ہیں انہیں میں چوہدری دلاور خان اور اُن کے بیٹے بھی تھے انہوں نے ندا کے لئے مقدمہ کر دیا۔

ثریا کو پتہ چلا تو وہ بہت روئی چلائی۔

"میں نے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میری اُجڑی گود دوبارہ بھر دیں"

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

مرکہا نہیں تھا مگر ہمیں احساس تو ہے۔" چوہدری دلاور خان بولے۔

"تو اس شخص کا احساس کریں جسے اپنی بیٹی سے بہت محبت ہے جو آپا کی نگرانی میں بیٹی ہونے کے باوجود رات کو کئی بار اٹھ کر اس کے کمرے میں جاتا کہ کہیں آپا کی غفلت سے اس کی بیٹی پر کمبل نہ ہو۔ یا کوئی اور بات ہو۔" ثریا نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

"تو کیا تم اُسے نہیں چاہتیں؟" سکندر لالہ بولے۔

"اسی لیے ہم نے مقدمہ کیا ہے کہ جسے وہ بہت چاہتا ہے وہ اس سے چھین لی جائے اُسے پتہ تو چلے گا۔" چوہدری دلاور علی کی آواز میں تلخی ہی تلخی تھی۔

ثریا صرف انہیں دیکھ کر ہی رہ گئی۔

طلاق کے صرف سترہ روز بعد عدالت میں احمد علی اور ثریا کا پھر ٹکراؤ ہو گیا۔ ثریا برقعہ میں تھیں اُن کے ساتھ اُن کے چار کڑیل جوان بھائی اور ایک باپ تھا۔ اور صغراں بی بی تھی۔

احمد علی اپنے ملازم کے ساتھ تھے جس کے پاس ندا تھی۔

ندا نے جھپٹے ہی صغراں بی بی کو دیکھا۔

"اناں بی... اناں بی" کہہ کر ایسی مچلی کر سب لوگ تکنے لگے۔

صغراں بی بی نے ہاتھ بڑھایا تو احمد علی کا ملازم کریمو ندا کو گود میں لیے پیچھے ہٹ گیا۔

"اناں بی۔ اناں بی۔" ندا چلا رہی تھی۔

"کریمو تو اور میں تو ایک سے ہیں مجھ سے ندا کو ملنے سے نہ روک۔" صغراں بی بی کی آواز رندھ گئی۔ وہ احمد علی کو دیکھ کر رہ گیا۔

"مالک اسے کہیں نا۔" صغراں بی بی نے احمد علی سے کہا۔

تب احمد علی کے کہنے پر کریمو نے ندا کو صغراں بی بی کے بازوؤں میں دے دیا اور صغراں بی بی چونک گئی۔ ندا کا بدن تپ سے جھلس رہا تھا۔

اور وہ اپنے بخار سے بے خبر بولے جا رہی تھی۔

"اناں بی آپ کہاں چلی گئی تھیں۔"

میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔

بابا کہتے تھے کہ اب آپ نہیں آئیں گی۔ دیکھیں بابا اناں بی آ گئی ہیں آپ بڑے گندے ہیں آپ نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ اور میں تو اناں بی کے بغیر رہ بھی نہیں سکتی۔" ندا نے اناں بی کے گالوں کو چوم لیا اناں بی نے اُسے بھینچ بھینچ لیا۔

پھر عدالتی چارہ جوئی ہوئی مجسٹریٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ جب تک ندا سات سال کی نہیں ہو جاتی اپنی ماں کے پاس رہے گی۔

"نہیں میں اناں بی کے پاس رہوں گی۔" ندا نے مجسٹریٹ کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا سب اُس پانچ سالہ بچی کو دیکھنے لگے پورے ہال میں سب کے چہروں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

"ٹھیک ہے۔" سب نے ندا کے فیصلے سے اتفاق کر لیا۔

سرخ حویلی میں آ کر ندا وہ مچلی کہ سب کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

وہ سرخ حویلی میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"میں اناں بی کے پاس رہوں گی۔"

"بٹیا میں تمہارے پاس ہی تو ہوں تم میرے پاس ہو۔" صغراں بی بی نے اُسے سمجھایا۔

"میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

"اپنے بابا کے گھر؟"

"نہیں۔"

"پھر جہنم میں رہو گی۔" لالا امین نے اُسے ڈانٹ دیا تو وہ زخمی چڑیا کی طرح سہم کر صغراں بی بی کے سینے سے چمٹ گئی اس نے کسی کی طرف بھی نہ دیکھا۔

شام درختوں پر چھا چکی تھی جب ثریا کے سب سے چھوٹے بھائی معین آ گئے انہوں نے کراچی میں ایک فیکٹری لگوائی تھی جس کی مشینری لینے وہ جاپان گئے ہوئے تھے ثریا کا بچپن ان کی گودوں میں اور کندھے پر گزرا تھا اور ثریا کے بھائیوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ وہی تھی انہوں نے ایم اے کیا اور پھر برکلے یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری حاصل کی تھی معین نے جب یہ سب حالات سنے تو ظاہر ہے انہیں بھی بہت دکھ ہوا۔

"اب اس نواب زادی کو دیکھو جو یہاں رہنا نہیں چاہتی۔" سکندر نے غراتے ہوئے ندا کی طرف اشارہ کیا۔

"تو آپ لوگ کیوں لے آئے؟" معین بھائی نے پوچھا

اس کے پاس بھی نہیں رہنا چاہتی۔" سکندر بھائی بولے۔

تب معین نے مسکرا کر صغراں بی بی کی گود میں بیٹھی اس ننھی سی گڑیا کو دیکھا جس کے سنہری بالوں میں سرخ ربن تھا اور وہ سرخ و سپید گڑیا اپنی کنچی کنچی آنکھیں پٹ پٹا کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

معین نے پہلی بار بھانجی کو دیکھا تھا انہیں بالکل یوں لگا جیسے ننھی ثریا اُن کے سامنے آ گئی ہو۔

"بیٹا کہاں رہو گی؟" معین نے نہایت محبت سے پوچھا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

"انّا بی کے پاس" وہ ہٹ سے بولی۔

"ہم یہاں سے کہیں اور جائیں گے۔"

"کیوں؟" معین نے حیرت سے پوچھا۔

"میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔" ندا صغراں بی بی کی بالیوں سے کھیلتی ہوئی بولی۔

"میرے ساتھ چلو گی؟" معین نے ایکدم پوچھا۔

"کہاں؟... مگر آپ کون ہیں؟"

"کراچی لے چلوں گا... اور میں آپ کا ماموں ہوں بیٹا" معین نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"انّا بی ساتھ ہوں گی نا؟" ندا نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے۔" ندا نے سمجھدار لوگوں کی طرح سر ہلایا تو معین اُس کی معصومیت پر ہنس دیئے۔

"اپنی ممّا کے پاس نہیں رہو گی؟" انہوں نے پوچھا۔

"ناں جی" ندا نے زور زور سے گردن ہلا دی اور اُس سمے ثریا کے دل کے سیکڑوں ٹکڑے ہو گئے اور اُن ٹکڑوں کی کرچیں اُسے اپنے آنکھوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں... اُس سے مزید سب میں نہ بیٹھا گیا اور وہ اپنے کمرے میں آگئیں۔

اور پھر سب کی مخالفت کے باوجود معین انّا بی اور ندا کو کراچی لے آئے یہاں اُن کا بزنس بھی تھا اور فیکٹری بھی بہادر آباد میں اُن کی بہت بڑی کوٹھی تھی۔

ندا کا یہاں دل لگ گیا۔

وہ سارا دن طویل و عریض کوٹھی میں کھیلتی۔ لان میں پھولوں پر اڑتی تتلیوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی خود بھی تتلی ہی لگتی اِسطرح پورے چھ ماہ بیت گئے معین ندا کو چاہتے تھے شام کا وقت وہ ندا کے ساتھ گزارتے اُس سے کھیلتے اور دور بیٹھی صغراں بی بی اپنے سانولے سلونے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لئے اُن ماموں بھانجی کی محبت کو دیکھتے ہوئے رشک کرتی جب معین آجاتے تو ندا اپنی انّا بی کو بھی بھول جاتی ندا کا اسکول میں داخلہ کروا دیا گیا صبح انّا بی کے ساتھ اسکول جاتی اور دوپہر کو پھر دونوں ساتھ ہی واپس آتیں۔

پھر ایک روز بالکل اچانک ہی ثریا آگئیں مگر وہ تنہا نہ تھیں، نہایت بے تحاشہ بھڑکیلے لباس میں ملبوس ایک وجیہہ و تشکیل شخص کے ساتھ جب صغراں بی بی نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گئیں۔

"بی بی!" صغراں بی بی کے لب کپکپائے۔

"بھئی تو حیران ہو رہی ہے یہ میرے شوہر صفدر خان ہیں مڈل ایسٹ میں ڈاکٹر ہیں بس ہم دو روز بعد ہی چلے جائیں گے" ثریا بتا رہی تھیں۔

"سلام صاحب!" صغراں بی بی نے اُن کے قریب کھڑے شخص کو نہایت ادب سے سلام کیا، پھر ثریا اپنے شوہر، بڑے بھائی سکندر اور بھابی زرینہ کے ہمراہ آگے بڑھ گئیں اور صغراں بی بی... برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر گہری سانسیں لینے لگیں۔

انہیں تو علم بھی نہ تھا کہ ثریا کی شادی ہو گئی طلاق کو ابھی صرف چھ ماہ تو ہوئے تھے کیا احمد علی کی رفاقتیں اتنی جلدی فراموش کر دیں ثریا بی بی نے کیا عورت اسی کو کہتے ہیں، صغراں بی بی کے دل کی عمیق گہرائیوں میں جیسے ماتم ہونے لگا۔

صغراں بی بی نہ جانے کب تک یونہی کھڑی رہتی اُسے ایکدم اپنے قریب ہی تیز خوشبو کا احساس ہوا پلٹ کر دیکھا تو قریب ہی ثریا کھڑی تھیں۔

"بی بی... کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا" صغراں نہایت آہستگی سے بولی۔

"پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا صغراں" ثریا نے کہا۔

"میں سمجھی نہیں" صغراں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ندا کہاں ہے؟" ثریا نے بات پلٹ دی۔

"اوہ خیال آ گیا" صغراں کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی۔

"ماں اپنے بچوں کا ہمیشہ خیال رکھتی ہے" ثریا نے صغراں کے لہجے کی تلخی کو امرت سمجھ کر دل میں اتار لیا۔

"مگر مصلحت کی خاطر خاموش رہتی ہے۔" صغراں بی بی نے ٹکڑا لگایا۔

"بالکل صحیح کہا تم نے" ثریا نے جواب دیا۔

"کیا آپ کے شوہر کو ندا کے بارے میں علم ہے" صغراں نے پوچھا۔

"ہاں میں نے انہیں بتا دیا ہے"

"طلاق کی وجہ بھی" صغراں نے پوچھا۔

"میں نے انہیں مطمئن کر دیا ہے ویسے وہ بھی اب تک کئی بار ندا کو پوچھ چکے ہیں" ثریا نے لان میں لگے رنگ برنگے پھولوں پر نظریں گاڑ دیں۔

صغراں بی بی خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تم نے بتایا نہیں ندا کہاں ہے؟"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"وہ اسکول گئی ہے۔"

"کب تک آئے گی؟"

"بس ابھی میں اُسے لینے جانے ہی والی تھی دیکھو دیر ہو گئی۔"

صغراں بی بی نے بے قراری سے کہا اور پھر تیزی سے پورچ کی جانب بڑھ گئی جہاں ڈرائیور اُس کا منتظر تھا۔

☆

دوپہر کے کھانے پر سب ہی موجود تھے معین بھی آج وقت سے پہلے آ گئے تھے۔

ندا اپنی آتا بی کی گود میں چڑھی بیٹھی تھی۔

"بیٹا ہمارے ساتھ چلو گی؟" صفدر نے نہایت محبت سے پوچھا انہیں بھی ندا بہت پسند آئی تھی اور ویسے بھی وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو خواہ مخواہ بچوں ہی سے جیلس ہوتے ہیں۔

"نہیں۔" ندا نے زور زور سے گردن ہلائی۔

"کیوں بیٹا؟"

"میں آتا بی کے پاس رہوں گی۔" اُس نے آتا بی کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

"مگر میں تو آپ کو زبردستی لے جاؤں گا۔" صفدر شوخی سے بولے۔

"پھر میں روؤں گی تو آپ تنگ آکر واپس چھوڑ جائیں گے۔ کیوں آتا بی؟" ندا نے آتا بی کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹا!" آتا بی نے اُس کا منہ چوم لیا۔

"مگر میں تو آپ روئیں گی بھی تب بھی واپس نہیں چھوڑنے آؤں گا۔" صفدر کو اُسے ستانے میں مزا آ رہا تھا۔

"پھر میں مر جاؤں گی۔" وہ نہایت معصومیت سے بولی۔

"خدا نہ کرے۔" صغراں بی بی نے ندا کو بھینچ لیا۔

"آپ تو بس ڈر جاتی ہیں آتا بی۔" ندا کھلکھلا کر ہنس دی۔

سب نے خاموشی سے کھانا کھایا۔

اور پھر دو روز پلک جھپکتے میں گزر گئے اور ثریا صفدر خان کے سنگ چلی گئیں بھلا جانے والوں کو بھی کوئی روک سکا ہے جاتے سمے جب وہ ندا کو لپٹا کر رو رہی تھیں تو تب صغراں بی بی نے سوچا ممتا کبھی نہیں مرتی یہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے اِس کو فنا نہیں۔

اور ثریا کی ممتا بھی ندا کے لئے زندہ تھی۔

یونہی مزید دو سال اور بیت گئے

ثریا اپنے گھر میں خوش تھیں اُن کے خطوط آتے رہتے۔

ادھر معین آجکل بے حد پریشان تھے۔

وہ رہ رہ کر سوچتے۔

آخر میں اُس سے کس طرح کہوں؟

کیسے بات شروع کروں

اگر وہ مان گئی تو پھر خاندان والوں کو کیسے مناؤں گا۔

معین رات رات بھر کمرے میں ٹہلتے ہوئے بے شمار سگریٹ پھونکتے ہوئے یہ سب سوچ ڈالتے۔

اور آج کل واقعی وہ بہت پریشان تھے آج کی رات بھی گزشتہ کئی راتوں سے مختلف نہ تھی معین مسلسل سوچے جا رہے تھے۔ اور سگریٹ پھونکے جا رہے تھے پورے کمرے میں دھواں بکھرا ہوا تھا ہر طرف سگریٹ کی باس پھیلی ہوئی تھی ایک دم ہی اُن کا جی گھبرانے لگا تو وہ باہر آ گئے برآمدے میں خواہ مخواہ ہی ٹہلنے لگے اور جب اُن کے قدم رکے تو وہ ٹھٹھک کر رہ گئے انجانے میں بلا ارادہ ہی وہ ندا کے کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے وہ سخت کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے۔

اب آ ہی گئے ہو تو دستک دے دو معین شاید کوئی دوسری طرف سے جواب دے دے۔ اُن کے ذہن نے راہ دکھائی اور انہوں نے دستک دے دی۔

چند لمحے بعد ہی اُن کے سامنے صغراں کھڑی تھی۔

"جی مالک۔" وہ آنکھیں ملتی ہوئی انہیں بہت ہی اچھی لگ رہی تھی نیند کے خمار سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سانولا سلونا چہرہ زردی مائل سا لگ رہا تھا وہ ایک ٹک اُسے تکنے لگے

"کوئی کام تھا مالک؟"

صغراں کی آواز انہیں خیالوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔

"ہاں۔ ذرا میرے سر میں درد ہو رہا ہے تم ایک پیالی چائے بنا دو تو مہربانی ہوگی۔" انہوں نے ایک دم بات پلٹی "میں تمہیں تکلیف نہ دیتا اب خانساماں بھی سو گیا ہے نا۔"

"آپ اپنے کمرے میں چلیں میں ابھی لاتی ہوں چائے۔"

چند لمحے بعد صغراں بی بی معین کے لئے چائے لے آئیں۔

"لیجئے مالک۔"

صغراں نے پیالی میں چائے انڈیل کر معین کے سامنے رکھ دی۔

"صغراں۔"

انہوں نے نہایت گمبھیر آواز میں انہیں پکارا۔

"جی مالک!"

صغراں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور کہیں مالک!"

"صغراں مجھے لاگ لپیٹ نہیں آتے اور نہ میں ایسی باتیں کر سکتا ہوں بس ہوں ایک جاٹ ٹیپر یہ تو تمہیں بھی علم ہے لفظوں کی چو بچیں لڑانا مجھے نہیں آتا۔"

"میں سمجھی نہیں۔" صغراں نے اُن کی تمہید سے گھبرا کر پوچھا۔

"صغراں میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں!" معین نے ہمت کر کے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

"کیا!" صغراں حیران و ششدر انہیں دیکھے گئیں۔

"ہاں صغراں ندا مجھے بہت پیاری ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے پاس رہے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کیوں کہ اماں مجھے شادی کے لیے مجبور کر رہی ہیں اور کیا خبر آنے والی ندا کو قبول کرے یا نہ کرے کیونکہ محبت کا بٹوارہ کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی سوائے تمہارے۔۔۔"

"نہیں مالک یہ آپ کی غلط سوچ ہے۔۔۔۔۔۔ آخر ندا بھانجی ہے اور اُس سے محبت کرنا آپ کا حق ہے۔"

"کوئی یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔" معین بولے۔

"مالک آپ شادی کر لیں مگر مجھ سے نہیں کسی اچھی سی عورت سے اگر وہ ندا کو برداشت نہ کر سکی تو میں ندا کو لے کر چلی جاؤں گی۔"

"سب سے بہتر کیوں نہیں شادی کر لیتیں مجھ سے تاکہ آنے والی کل کا خدشہ نہ رہے کہ تمہیں جانا پڑے۔" معین بولے۔

"نہیں مالک دنیا کیا کہے گی میں دھرتی ہوں اور آپ آکاش میں اُوپر نہیں جا سکتی اور آپ جھک کر اپنی عظمت کو ملیا میٹ نہ کریں آپ بلندی پر ہی اچھے لگ رہے ہیں مجھے ندا کی معصوم محبت کے سامنے دنیا کی ساری محبتیں ہیچ لگتی ہیں مالک مجھے اور کوئی محبت نہیں چاہیئے مجھے یہی معصوم و سچی محبت بہت ہے جس میں کوئی لاگ لپیٹ نہیں جو کہ ہر طمع سے آزاد ہے۔"

صغراں بولتی رہیں اور معین خاموشی سے سنتے رہے۔

وہ کچھ بھی نہ کہہ پائے۔

اب بھلا کیا کہتے۔

بہانہ تو ندا کا تھا ورنہ تو اُن کا دل تو نجانے کیسے سانولی سلونی سی صغراں پہ آ گیا تھا۔ اور اب اُن کی تمنا کئے جا رہا تھا۔

مگر صغراں نے ٹکا سا جواب دے دیا اور انہوں نے دل سے کہہ دیا۔

میاں وہ ملازمہ۔۔۔ بھلا تم اُس کے لیے کیوں دیوانے ہو رہے ہو مجھے تو اُس سے بھی اچھی لڑکی مل سکتی ہے تمہیں خود ہی قرار آ جائے گا جب کسی اچھی سی لڑکی کی محبت پاؤ گے۔

بس وہ مثل تھی کہ مل نہ سکا تو انگور کھٹے ہیں۔

یونہی پورے چھ ماہ گزر گئے۔

اب گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا تھا اور وہ تھیں رینا بیگم معین کی بیگم صاحبہ۔۔۔ جو کہ معین کی عم زاد بھی تھیں۔

گھونگٹ اُلٹتے ہی انہیں جو وجود پہلے کھٹکا۔

وہ صغراں کا تھا

سانولی سلونی صغراں جس میں بے تحاشہ کشش تھی اس کی سیاہ آنکھیں ہی متوالی سی تھیں۔ اور وہ ڈر گئیں کہ کہیں اُن کے شوہر معین اِن متوالی آنکھوں کے اسیر نہ ہو جائیں مگر رینا بیگم کو علم نہ تھا کہ معین تو بہت عرصہ ہوا اِن آنکھوں اور بھولے بھالے چہرے کو من میں بسا بیٹھے ہیں۔۔۔ یہی معصوم صورت ہی انہیں اپنا ہم پلہ نہ سمجھ کر ٹھکرا بیٹھی پھر یہ ہوا کہ اُٹھتے بیٹھتے رینا بیگم، صغراں کے کام میں کیڑے نکالتیں سخت سست کہتیں اور صغراں بی بی سب کچھ سنے جاتیں منہ سے بھاپ تک نہ نکالتیں۔

ایک روز صغراں بی بی ندا کے کپڑوں پر استری کر رہی تھیں کہ رینا بیگم آ گئیں۔

"صغراں!"

"جی مالکن! کوئی کام تھا تو بلوا لیا ہوتا۔"

"میں نے سوچا کہ میں خود ہی تم سے بات کر لوں۔"

"جی ضرور!"

صغراں نے استری رکھ دی اور ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں صغراں؟" رینا بیگم نے کہا۔

تو صغراں بی بی کو یوں لگا جیسے کہ کسی نے انہیں آگ میں لا پھینکا ہو اور اُن کا وجود دھیرے دھیرے جلا جا رہا ہو۔

"میں سمجھی نہیں مالکن!" صغراں بی بی گھٹی گھٹی آواز میں بولیں

"تم اتنی بھی بچی نہیں ہو صغراں!" رینا بیگم کا لہجہ سخت تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کر لو اپنا گھر بسا لو کب تک اوروں پر پڑی رہو گی۔"

"مالکن شادی کی عمر تو گزر گئی میں تو اسی گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہوں اور آپ لوگ اور تو نہیں میرے اپنے ہیں۔" صغراں بی بی کا دل درد چھپا کر ہنس دیں۔

"مگر تم کو یہ پتہ ہے کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔" رینا بیگم کچکچا کر بولیں۔

"مالکن۔" صغراں بی بی کپکپا کر رہ گئیں۔

"بس میں چاہتی ہوں کہ تم جلد از جلد شادی کر لو اور اس گھر کو چھوڑ دو۔"

"کیوں؟"

"یہ بتاؤ کہ تمہاری حیثیت کیا ہے جو تم نے مجھ سے سوال کیا کیوں؟ بس تم کو میں حکم دیتی ہوں کہ کسی طرح بھی ہو سکے تو یہ گھر چھوڑ دو... ورنہ۔" رینا بیگم نے کڑے تیوروں سے انہیں دیکھا اور ان کی ورنہ میں کھلی دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ پھر وہ صغراں بی بی کا جواب سنے بغیر چلی گئیں۔

اور صغراں بی بی نے پریشان ہو کر اپنا چکراتا سر تھام لیا۔

اُف میں کہاں جاؤں گی کون سا در کھٹکھٹاؤں گی۔

مالک تو بعض لوگوں کی ایسی قسمت کیوں بناتا ہے۔

اتنا مجبور و بے بس۔

کیا غریب لوگوں کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

کیا غربت اتنا بڑا جرم ہے!

صغراں بی بی سوچتی رہیں اور آنسو اُن کے گالوں کو بھگوتے رہے۔

☆

پھر پتہ نہیں صغراں بی بی نے معین کو کس طرح راضی کیا کہ وہ یہاں نہیں رہنا چاہتیں تب معین نے انہیں چکوال بھیج دیا وہیں اُن کی زمینیں تھیں جہاں بڑی سی سرخ پتھروں والی حویلی تھی۔ کسی کو علم نہ تھا کہ معین نے صغراں بی بی کو وہاں بھیج دیا ہے اور ندا کو انہوں نے مری کانونٹ میں بھیج دیا تھا۔

تب صغراں بی بی کا دل اُدھڑ کر رہ گیا تھا جس کی خاطر وہ اپنا گھر نہیں بسانا چاہتی تھیں وہی اُن سے دور کر دی گئی پھر انہوں نے خود کو تسلی دے دی۔

مگر یہ ہے کہ اب وہ گاؤں میں پرسکون تھیں ہر ہفتے ندا کو ملنے جاتی تھیں۔ اور ندا نے بھی وقت سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

یونہی وقت کا پہیہ گردش کرتا رہا اور پھر ندا بڑی ہوتی گئی اور صغراں بی بی بوڑھی ہوتی گئیں معین کبھی بھی گاؤں نہ آتے بس ہر ماہ ایک معقول رقم بھیج دیتے تھے۔

پھر سینئر کیمبرج کیا تو پتہ چلا تو انہوں نے لاہور میں انہیں ایک کوٹھی لے کر دی اور انہوں نے ندا کو کالج میں داخل کروا دیا۔

اب صغراں بی بی بہت خوش تھیں کہ ندا اُن کے پاس رہی تھی صبح وہ ڈرائیور کے ساتھ ندا کو چھوڑنے جاتیں اور دوپہر کو لے آتیں بس اُن کی یہی مصروفیات تھیں ندا بھی بہت خوش تھی

ہاں کبھی کبھی وہ ضرور اپنے ممّا پاپا کے بارے میں پوچھتی اور صغراں بی بی اُسے مطمئن کر دیتیں گھنٹوں اُن کے بارے میں باتیں کرتیں اور وہ بالکل کسی کہانی کی طرح دلچسپی سے سب باتیں سنتی رہتی۔

پھر سامنے والی کوٹھی میں کوئی عدنان صاحب آ کر رہے تو اُن کا بیٹا عثمان جو آٹھ سال کا تھا وہ ندا کا دوست بن گیا کالج سے آنے کے بعد وہ کچھ وقت صغراں بی بی کے ساتھ گزارتی اور پھر شام کو وہ عثمان کے ساتھ کھیلتی کبھی کیرم کبھی ٹینس کبھی کرکٹ وہ عثمان کے ساتھ بچہ ہی بن جاتی اپنی خوشیوں میں اُسے ضرور شریک کرتی اور عثمان بھی ندا کے ساتھ بہت ہل گیا تھا اگر وہ نہ جاتی تو فوراً آ جاتا۔

"ندا آپی آپ کیوں نہیں آئیں؟" اس کا پہلا سوال یہی ہوتا۔

"بھئی بھول گئی تھی۔"

"نہیں جی میں تو نہیں بھولا آپ دادی اماں ہیں جو بھول جاتی ہیں؟" وہ پوچھتا تو ندا ہنس دیتی اور پھر اُسے لپٹا کر چوم لیتی۔

اور آج وہ اپنے پاپا کے آنے کی خوشخبری سنانے بھی عثمان کے پاس گئی تھی۔

"ندا تو بہت معصوم ہے بہت ہی معصوم۔" صغراں بی بی نے سوچا آنسو اُن کی بوڑھی آنکھوں میں اُمڈے چلے آ رہے تھے۔

ندا کے دو روز بہت مصروف گزرے وہ عثمان اور نوکروں کے ساتھ مل کر گھر سجاتی رہی اپنے پاپا کے لئے کمرہ درست کیا اور پھر اپنا بیڈ بھی اُس نے وہیں لگا دیا۔

"امّاں بی آپ ناراض مت ہوئیے گا۔" جب وہ اپنا بیڈ اپنے پاپا کے کمرے میں رکھ رہی تھی تو اس نے صغراں بی بی سے کہا کیونکہ وہ ہمیشہ امّاں بی کے کمرے میں سوتی تھی۔

"نہیں بیٹا میں بھلا کیوں ناراض ہوں گی تیری خوشی میں میری خوشی۔" صغراں بی بی نے اُسے لپٹا کر چوم لیا۔

"امّاں بی میرے پاپا کیسے ہیں؟

دیکھئے یہ گلدستہ اچھا لگ رہا ہے نا؟

یہ بیڈ شیٹ ٹھیک ہے نا؟

پاپا کو پسند آئے گا نا یہ کمرہ؟"

ندا ہر بات صغراں بی بی سے ضرور پوچھتی اور وہ اُسے تسلی دیتی

رہتیں کہ اُس کے پاس ہر چیز پسند کریں گے۔
"اتا جی میں پاپا کو اپنے پاس پورا ایک ماہ رکھوں گی۔"
"اچھا" صغراں بی بی کہتیں۔
"ہاں وہ رہیں گے نا؟" ندا پوچھتی۔
"کیوں نہیں رہیں گے آخر تم اُن کی بیٹی ہو۔" صغراں بی بی کہتیں۔
اور وہ اِن دو دنوں میں یہ سوال کئی بار کر چکی تھی اور صغراں بی بی کئی کئی بار جواب دے چکیں تھیں۔
اُس روز موسم بھی بہت خوشگوار تھا جس روز احمد علی کو آنا تھا اور ندا پورے گھر میں تتلی کی مانند اُڑتی پھر رہی تھی اُس سے دن کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔
"اتا جی کب آئیں گے پاپا؟" ندا نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"بیٹا مجھے کیا خبر تار میں نہیں لکھا۔"
"لکھا ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتی۔" وہ منہ بنا کر بولی۔
"بیٹا آجائیں گے تو پریشان نہ ہو۔" صغراں بی بی نے کہا۔
ندا نے دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا وہ اپنے پاپا کے ساتھ کھانا کھانا چاہتی تھی۔
"میں نے تمہارے ماموں معین کو بتا دیا ہے کہ تمہارے پاپا آرہے ہیں۔" صغراں بی بی نے کہا۔
"کب بتایا آپ نے؟" ندا نے پوچھا۔
"کل تم عثمان کی طرف گئی تھیں نا تو اُن کا فون آیا تھا۔"
"کیا کہہ رہے تھے معین ماموں؟" ندا نے دلچسپی سے پوچھا۔
"کچھ نہیں بولے کہنے لگے اچھا ہے آئیں آخر ندا اُن کی بیٹی ہے۔" صغراں بی بی نے بتایا تب ہی ملازم نے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔
"ارے پتہ بھی نہ چلا اور پاپا آگئے۔" ندا مارے خوشی کے بغیر چپل پہنے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی مگر وہ پردہ تھام کر ٹھٹھک کر رہ گئی وہ ٹک ٹک دیکھے گئی۔
"یہ... یہ کون ہیں؟"
یہ تو میرے پاپا نہیں... اُس کا اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔
مگر اِن تینوں میں سے میرے پاپا کون سے ہیں۔
سامنے ہی صوفے پر تین افراد براجمان تھے۔
ایک تو پچاس پچپن سال کے تھے مگر اُن کے چہرے پر بہت جاہ و جلال تھا۔ اور دو ادھیڑ عمر کے تھے تب ہی صغراں بی بی آگئیں۔
"ندا اندر نہیں گئی۔"
تب وہ چپ چاپ ہٹ گئی صغراں بی بی اندر آگئیں۔
"سلام مالک" صغراں بی بی نے جھک کر سلام کیا۔
"ندا یہ تمہارے نانا ابا ہیں اور یہ تیرے ماما سکندر اور یہ امین ماما ہیں۔"
صغراں بی بی نے اتنے سالوں بعد بھی اُن سب کو پہچان لیا تھا ندا نے اپنے ننھیال والوں کو نہیں دیکھا تھا سوائے معین ماموں کے اس لئے اپنے نانا کو نہ پہچان سکی۔
"ارے تو یہ ندا ہے۔" سکندر نے حیرت سے کہا۔
"پاپا بالکل ثریا کی طرح ہے نا؟" امین اپنے باپ سے مخاطب تھے۔
"ہاں بھئی میں بھی حیران ہوں کہ اسے ثریا کہاں سے آگئی۔" دلاور خان نے مسکرا کر کہا۔
"آ ندا... میری ثریا۔" دلاور خان نے بازو پھیلا دیئے۔
ندا جھجکی۔ رکی اور پھر وہ اُن کی کھلی باہوں میں سما گئی۔
مگر نجانے کیوں اُس کا دل بجھ گیا تھا اُس کی آنکھوں کی چمک معدوم ہو گئی تھی۔
"ندا ہم تجھے لینے آئے ہیں بیٹا۔"
"مجھے؟"
"ہاں ہاں ہمارے ساتھ چلو گی نا؟" دلاور خان بولے۔
"مگر..." ندا نے کہنا چاہا کہ میرے پاپا آرہے ہیں مگر وہ نہ کہہ سکی بات بدل کر بولی۔
"نانا ابا میرا کالج کھلنے والا ہے آج کل چھٹیاں ہیں تو گھر میں ہوں۔"
"اور وہیں رہ کر واپس آجانا۔"
"ناں... نہیں پھر کبھی سہی۔" ندا بولی حالانکہ اُس کا اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، نانا ابا اب میں آپ کو کیسے یاد آگئی آپ کیوں لینے آئے ہیں اتنے سال گزر گئے ہیں میں اپنوں کی محبتوں کو ترستی ہوئی اتا جی کی پناہ میں اُن کے سینے سے لگ کے سب کی محبتوں کو حاصل کرنے کی سعی کرتی رہی مگر میرے اندر کے خلا بہت بڑھ گئے ہیں انہیں کوئی بھی پُر نہیں کر سکتا
صغراں بی بی کھانے کے اہتمام میں لگ گئی تھیں اور ندا ڈرائنگ روم سے اٹھ آئی تھی اب وہ ٹیرس پر کھڑی اپنے پاپا کی منتظر تھی اُس کی نظریں گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔
"پاپا" کتنا میٹھا لفظ ہے زبان سے ادا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

شہزادی بھر دی گئی۔

"پاپا، کب آئیں گے آپ؟"

ندا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ تو بالکل ہی مایوس ہو گئی تھی۔

"پاپا جب آپ مجھے اپنے ملنے کی خوشی سے دوچار نہیں کرنا چاہتے تھے تو مجھے ٹیلی گرام دینے کی کیا ضرورت تھی اتنی بے قراری تو مجھے کبھی بھی نہیں ہوئی پلیز پاپا آجائیں نا۔" ندا رو دینے کو تھی۔

تب ہی ندا نے دیکھا ایک ٹیکسی گیٹ پر آ کر رکی اس میں سے ایک شخص برآمد ہوا اس نے ڈرائیور کو کرایہ دیا اور پھر اس نے گیٹ کے باہر لگی بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ بیل کی آواز نے پورے گھر میں شور مچا دیا تھا۔

ندا تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ پر پہنچی اور گیٹ کھول دیا۔

"پاپا" اس کے لب کپکپا کر رہ گئے ندا کا دل کہہ رہا تھا یہی میرے پاپا ہیں۔

"ندا" گیٹ پر کھڑے شخص کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

اور وہ پاپا کہہ کر ان سے لپٹ گئی۔

احمد علی بھی اسے لپٹائے بے خود ہوئے جا رہے تھے۔ کبھی اس کا منہ چومتے۔ پیشانی پر بوسوں کی بارش کرتے اور وہ ان کے سینے سے اس طرح چمٹی ہوئی تھی جیسے کہ آج ہی ساری محبتیں ا برسوں کا اپنا حق وصول کرے گی۔

پھر وہ اسے لپٹائے لپٹائے گیٹ سے اندر آئے۔

"اتا بی... اتا بی" ندا نے اتا بی کو پکارا۔ ندا کی آواز مارے خوشی کے لرز رہی تھی۔ تب ہی صغراں بی بی آ گئیں۔

سامنے ہی تو گلاب کے پودوں کے جھنڈ کے پاس وہ اپنے پاپا احمد علی سے لپٹی کھڑی تھی۔ صغراں بی بی کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

احمد علی، ندا کو چھوڑ کر آگے بڑھے اور صغراں بی بی کے قدموں میں بیٹھ گئے۔

"صغراں آپ بہت عظیم ہیں بہت ہی عظیم مجھے سب کچھ علم ہے کہ آپ نے میری ندا کی خاطر بہت کچھ کیا ہے اس کی خاطر آپ نے شادی نہیں کی۔ صغراں اصل ماں تو ندا کی آپ ہیں آج کل جب اپنے بھی کسی کے ساتھ اچھائی نہیں کرتے آپ نے غیر ہو کر جو کچھ کیا ہے۔ میں زمین میں گڑھ کر رہ گیا۔

---- ہوں صغراں بی بی۔" احمد علی رو دیئے۔

صغراں بی بی تو گم صم سی کھڑی رہ گئیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہ تھیں بھلا کبھی یوں بھی ہوا ہو گا کہ اتنا رئیس آدمی ان کے قدموں میں جھکا ہوا تھا۔

"مالک!" صغراں بی بی کے لب کپکپائے وہ جھکی اور احمد علی کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

"کیوں مجھے شرمندہ کر رہے ہیں مالک ندا سے مجھے بہت کچھ ملا ہے بہت محبتیں دی ہیں اس ننھی سی جان نے اس کی محبت سب محبتوں سے پاک ہے کوئی حرص نہیں اس کی محبت میں کوئی لالچ نہیں ہے۔" صغراں بی بی کے آنکھوں میں آنسو آ گئے

"ندا کو میں نے جنم نہیں دیا۔ مگر پالا تو ہے جنم دینے سے زیادہ لے پالک کی محبت ہوتی ہے میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا مالک... بس میں نے اپنے ممتا کے جذبات کی خاطر ایسا کیا۔" صغراں بی بی ہولے ہولے بولے گئیں۔

"مگر آپ آ کیسے گئے۔؟"

معین میرا بہت اچھا دوست ہے صغراں بی بی وہ مجھے ایک ایک لمحے کی اطلاع دیتا رہا ہے جب ندا مری میں تھی میں وہاں جاتا تھا اور اسے دور دور سے دیکھا کرتا تھا۔"

"آپ کی بیگم منع نہیں کرتیں؟" صغراں بی بی نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"وہ منع کیوں کرے گی۔ اس نے مجھے کیا دیا ہے"

"آپ کے بچے؟"

"صرف ندا ہے۔ باقی نام اللہ کا۔" احمد علی ہنس کے بولے ان کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

"اوہ" صغراں بی بی سب کچھ سمجھ گئیں کہ انہیں ندا اتنی یاد کیوں رہ گئی اور بچے ہوتے تو ان کی محبتوں میں وہ ندا کو بھلا دیتے۔ مگر اولاد تو مرد کی قسمت سے ہوتی ہے۔ اور معلوم نہیں وہ کون سی ڈاکٹر تھی جس نے احمد علی کو بتایا کہ ثریا ماں بننے کی سعادت دوبارہ حاصل نہیں کر سکتی مگر اب تو ثریا کے تین بچے تھے اور وہ بہت خوش تھیں انہوں نے تو اپنی محبتیں پالی تھیں ننھے ننھے بچوں میں کھو کر وہ ندا کو بھلا بیٹھی تھیں۔

اور احمد علی وہیں کھڑے تھے جہاں سے چلے تھے ان کا آنگن بچوں کی کلکاریوں سے محروم تھا۔ سناٹے گونجتے تھے ان کے آنگن میں....

اور اسی لئے وہ اپنی ندا کو بھلا نہ سکے تھے۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

"پاپا" ندا کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔
"جی بیٹا!" احمد علی نہایت محبت پاش لہجے میں بولے۔
"نانا ابا بھی آئے ہیں" ندا بولی۔
"کیا؟" انہوں نے حیرت سے کہا۔
"پاپا میں آپ کی منتظر تھی مگر وہ آگئے ہیں یہ ناتفاق" ندا ہنس دی۔ اور احمد علی کا دل نہ جانے کیوں بیٹھنے لگا۔

پھر وہ سب ڈرائنگ روم میں آگئے۔

ندا نے صاف محسوس کیا کہ احمد علی کو دیکھ کر اُس کے نانا اور ماموں کی تیوریاں پر بل پڑ گئے تھے انہوں نے اچھی طرح بات نہ کی اُن سے۔

اَنا بی نے چائے کا اہتمام کر دیا سب نے خاموشی سے چائے پی۔

"میرے ساتھ چلو گی نا ندا؟" احمد علی نے ندا سے پوچھا۔
"کہاں پاپا؟"
"بھئی گھر اپنے گھر" احمد علی ہنس کر بولے۔
"اَنا بی؟ یہ بھی چلیں گی نا؟" ندا نے کہا۔
"مجھے علم ہے کہ تم اپنی اَنا بی کے بغیر نہیں جاؤ گی" احمد علی نے ندا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
"ہاں پاپا میں چلوں گی" ندا بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔ وہ یہ بھول گئی کہ تھوڑی دیر پیشتر وہ اپنے نانا ابا سے انکار کر چکی ہے۔
"احمد علی، ندا تمہارے ساتھ نہیں جائے گی" دلاور خان گرج کر بولے۔
"کیوں؟" احمد علی نے کہا۔
"بس یہ ہمارے ساتھ جائے گی یہ ہماری ہے" سکندر ماما بولے۔
"اس کی شریانوں میں تو میرا خون دوڑ رہا ہے اس کا زیادہ حق مجھ پہ ہے میرا حق اس پہ ہے" احمد علی بولے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔
"سنو احمد علی اگر تم نے اسے لینا ہے تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ جیسے ہم نے کھٹکھٹایا تھا" دلاور خاں اک غرور سے بولے۔
"کیا مطلب؟" احمد علی نے حیرت سے کہا۔
"مطلب بتانے کا میں عادی نہیں ہوں اگر اسے لینا ہے تو عدالت سے لو" امین ماما نے احمد علی کے پہلو میں کھڑی ندا کو گھسیٹ لیا۔

ندا کی تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی اُس کے ذہن میں دھماکے سے ہو رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے کہ بھک سے اُس کا دماغ اُڑ جائے گا۔

"ندا میری بیٹی ہے یہ میرے ساتھ جائے گی آخر میں اس کا باپ ہوں" احمد علی بولے۔
"یہ ہماری ہے" سکندر ماما بولے۔
"یہ تو شکر ہے کہ معین نے ٹیلی فون پر بتا دیا کہ تم ندا سے ملنے آ رہے ہو مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ اسے لینے آئے ہو گے ورنہ تم تو اسے لے کر چلے جاتے" امین ماما زہرخند سے بولے۔
"یہ ہمارے ساتھ جائے گی تیاری کرو ندا" دلاور خان نے نواسی کو حکم دیا۔
"یہ میرے ساتھ جائے گی" احمد علی بولے۔
"تم اس سے پوچھ لو یہ کس کے ساتھ جائے گی" دلاور خان نے کہا۔
"ندا تم میرے ساتھ چلو گی نا۔ یہ میری عزت کا سوال ہے ندا۔ میں ہارنا نہیں چاہتا اس سے پہلے بھی ہار چکا ہوں" احمد علی نے بڑے ارمان سے ندا سے پوچھا۔
"تم ہماری ہو ندا۔ تم بتاؤ ساتھ چلو گی نا۔ اس شخص نے اپنی محبتوں سے تمہیں اس لئے دور کر دیا کہ بقول اس کے تمہاری ماں اسے وارث نہیں دے سکتی تھی۔" امین ماما نے ندا کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا۔

حالانکہ اسی لہجے میں اور یہی الفاظ بارہا اَنا بی دہرا چکی تھیں یہ الفاظ اس کے لئے نئے نہیں تھے۔

"بتاؤ بیٹا چلو گی نا؟" احمد علی نے بے قراری سے پوچھا۔
"ندا پتر جلدی فیصلہ کر" سکندر ماما بولے۔

ندا نے جو کہ سر جھکائے کھڑی تھی سر اٹھایا اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اس نے سب کی طرف دیکھا ایک ایک کے چہرے پر اُسے اپنی محبتیں نظر آ رہی تھیں۔

ایک ایک دل اُس کا متمنی تھا۔

اور پھر اُس کی نظریں ایک چہرے پر ٹک گئیں۔

کمرے میں اِک سکوت طاری تھا۔

اور ندا دھندلائی دھندلائی نظروں سے اُس چہرے کو تک رہی تھی جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا اُس چہرے کو اپنے سامنے پایا تھا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

اُس چہرے نے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ جھوٹی محبت نہیں کی تھی۔

"بتاؤ ندا۔

بولو ندا

فیصلہ کرو ندا۔

سب کہہ رہے تھے۔

تب ندا کے لب کپکپائے۔

"میرا فیصلہ سُن لیں مسٹر دلاور خان، جناب سکندر اور اِین صاحب" وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اُن کے قریب پہنچ گئی پھر آگے بڑھی۔

اور مسٹر احمد علی صاحب میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میرا اب بھی وہی فیصلہ ہے جو کہ آج سے برسوں پہلے میں نے بھری عدالت میں کیا تھا اور اِس فیصلے کو دنیا کی کوئی عدالت منسوخ نہیں کر سکتی ... اور میرا فیصلہ یقیناً آپ سمجھ چکے ہوں گے اگر نہیں تو ... تو وہ یہ فیصلہ ہے" ندا دوڑ کر انّا بی سے لپٹ گئی۔

"انّا بی میں کہیں نہیں جاؤں گی میں آپ کے پاس رہونگی یہ لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر مجھے لینے آئے ہیں اِن کے دلوں میں بغض ہے اور میں کھوٹے دِل والوں کے پاس نہیں رہنا چاہتی ہوں میں آپ جیسی پیاری اور محبت کرنے والی عورت کے پاس رہنا چاہتی ہوں آپ انہیں کہیں کہ یہ میرے گھر سے چلے جائیں اور پھر کبھی یہاں کا رخ نہ کریں ندا صرف صغراں بی بی کی ہے اِس کی رہے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ۔ انہیں کہیں یہ چلے جائیں" ندا چیخ پڑی اور پھر تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

سب حیران دشمشدر رہ گئے۔

سب کے چہرے سوال بنے ہوئے تھے۔

اور پھر کوئی کچھ بھی نہ بولا شاید سب اپنے آپ سے شرمندہ تھے۔ یا اِس لیئے کہ بھی خاموش تھے کہ چلو ندا نے اچھا فیصلہ کیا ہے اگر وہ ہماری نہیں ہے تو کسی اور کی بھی نہیں سب جا چکے تھے۔

اور صغراں بی بی بس ہلتے پردے کو تک رہی تھیں۔

پھر وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی ندا کے کمرے میں آئیں جو کہ اُس نے اپنے پاپا کے لیئے سجایا تھا۔

پورا کمرہ اُلٹا پڑا تھا پتیل کا گلدان کمرے کے بیچوں بیچ پڑا تھا وال کلاک چکنا چور ہوا پڑا تھا اور ندا بستر پر اوندھی لیٹی تکیئے میں منہ دیئے سسکیاں لے رہی تھی۔

ندا کے دکھ پر صغراں بی بی کا دِل ادھڑ کر رہ گیا اُن کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر رو دیں۔ اگر وہ خود رو دیتیں تو ندا کو کون تسلی دیتا۔ وہ آگے بڑھیں اور ندا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ندا رونے سے خوشیاں تو نہیں ملتیں بیٹیا" صغراں بی بی گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"انّا بی مجھے زندگی کی پہلی خوشی مل رہی تھی جو کہ میرے اپنوں نے ہی لوٹ لی۔ بتائیے انّا بی یہ کہاں کا انصاف ہے" ندا روتے ہوئے اُن سے لپٹ گئی۔

"بیٹیا یہ دنیا ہے اور یہاں بہت سے حادثے ہوتے ہیں اِنسان کو اِس کے لیئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور دکھوں کے زہر کو اَمرت سمجھ کر پی جانا چاہیئے۔ تم تو بہادر ہو بیٹیا" صغراں بی بی اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

"آپ ... آپ معین ماموں کو لکھ دیں یا فون کر دیں کہ وہ ہمیں خرچہ نہ بھیجا کریں مجھے اُن کی بھی ضرورت نہیں ہے ہمارے گھر کوئی نہ آئے۔ میں انّا بی سروس کروں گی اپنا بار ہم خود اُٹھائیں گے میرا یہ فیصلہ ہے اور آپ معین ماموں کو بتا دیں۔ بتا دیں انہیں کیونکہ میں انّا بی کب تک ... دکھوں کے زہر اَمرت سمجھ کر پیوؤں آخر ایک روز میرا پورا وجود زہریلا ہو جائے گا روم روم ...... میں زہر بس جائے گا کہہ دیں انہیں کہ ہمیں کوئی ضرورت نہیں اُن کی" ندا بولے گئی۔

"اچھا میں کہہ دوں گی۔ تو آرام کر"

"انّا بی میرا فیصلہ صحیح ہے نا" ندا نے معصومیت سے پوچھا

"ہاں بیٹیا بالکل ٹھیک ہے تمہارا فیصلہ" انّا بی نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ اور پھر کتنے ہی صغراں بی بی کے آنسو ندا کے ریشمی بالوں میں جذب ہو گئے۔

پتہ
بیوٹی بکس
پوسٹ بکس ۴۷ کراچی

کیا آپکے بال گر رہے ہیں؟
بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل
استعمال کریں
سوہنی ہیئر آئل تیار ہو کر آ گیا ہے،
بہت محدود تعداد میں ہے، دستی خریدنے کیلئے
۴۷۔ اردو بازار۔ کراچی
باہر کے لوگ وی پی سے بھی منگوا سکتے ہیں

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ساحلوں کے خواب

لبنیٰ عروج

"**تمہارے** اندر قوتِ فیصلہ کی ازحد کمی ہے۔"

"ہاں میں مانتا ہوں۔" اشعر حسن کے انداز میں اپنی اس کمی کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی بے بسی آگئی تھی۔

"یار خود کو مضبوط کرو۔ جو فیصلہ ایک دفعہ کر لو اس پر ڈٹ جایا کرو۔"

"میں چاہتا تو بہت ہوں کہ ایسا ہی کرسکوں پر دوسرے ہی پل جیسے مجھے اپنا ہی فیصلہ سراسر غلط لگنے لگتا ہے۔"

"دوبارہ مت سوچا کرو۔ بس جو سوچا ایک ہی بار سوچو۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔" اشعر حسن نے سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔

"اچھا اب میں جاؤں؟" شجاع اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"پھر کب آؤ گے؟"

"جب تم بلاؤ۔" شجاع حسبِ عادت ہنسا اور اشعر حسن اسے چھوڑنے گیٹ تک چلا آیا۔

"اچھا دوست۔ خدا حافظ۔" شجاع کے جانے کے بعد اشعر حسن نے وہیں گیٹ سے ٹیک لگالی تھی اور جانے کن سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ جلتا ہوا سگریٹ سلگ سلگ کر خود بخود ختم ہوتے جا رہا تھا۔ مگر وہ اس کی تپش سے بے خبر تھا۔ ایک دم احساس ہوا تو سگریٹ کا وہ بچا ہوا حصہ نیچے پھینک کر اپنے جوتوں سے مسل ڈالا۔ پھر تھکے تھکے سے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

"اتنی دیر سے کہاں تھے برخوردار؟" ابا میاں اس کے کمرے میں چلے آئے۔

"یہیں تھا ابا میاں۔" وہ جو پلنگ پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا جھٹ مؤدب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر کیا سوچا تم نے؟"

"بس جی فی الحال تو کچھ بھی نہیں سوچا۔" اشعر کے انداز میں پھر پہلے والی بے بسی آگئی تھی۔

"ویسے میرا تو خیال ہے میاں تم سیدھے سبھاؤ رحیم بھائی کی بیٹی کے لئے ہاں کر دو۔" ابا میاں کا لہجہ حسبِ عادت تحکمانہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

"ادھر میرا فیصلہ پوچھتے ہیں ادھر اپنا فیصلہ سنائے جا رہے ہیں۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔ پر دوسرے پل وہ باہر جا چکے تھے۔ "مجھے رحیم چچا کی وہ آٹھ جماعتیں پاس لڑکی ہرگز نہیں چاہیئے۔ میرے خوابوں کی تعبیر اتنی بھیانک ہرگز نہیں ہوگی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ پھر وہ دوسرے پل اپنے فیصلے سے خود ہی گھبرا سا گیا۔

لیکن اگر ابا میاں نے یہی چاہا تو میں کب انکار کر پاؤں گا!

اس نے خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کا یہ فیصلہ کسی نے سن تو نہیں لیا۔ وہ پھر چپ چاپ پلنگ پر پڑ گیا۔ آج کی چھٹی کا دن بھی ضائع ہوتا نظر آ رہا تھا۔ شجاع بھی آ کے جا چکا تھا اور کسی سے اتنی دوستی بھی نہیں تھی جو اپنی پرابلمز شیئر کر لیتا۔ بس سگریٹ پر زور چلتا تھا جو اس نے پی پی کر کئی پیکٹ ختم کر ڈالے تھے۔ سگریٹ ختم ہو گئے تو اس نے پلکیں موند کر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ لئے اور سوچوں میں کھو گیا۔

"اس سال میں نومبر میں پورے ستائیس سال کا ہو جاؤں گا۔" اس نے حساب لگایا۔ وہ ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا۔ ایم اے اکنامکس کے بعد اسے مقامی کالج میں لیکچررشپ اختیار کئے دو سال ہو چکے تھے۔ وہ خوبصورت تھا۔ نوجوان تھا برسرِ روزگار تھا مگر اس میں قوتِ فیصلہ کی ازحد کمی تھی اور یہ کمزوری اس پر اس وقت غلبہ پالیا کرتی تھی جب اس کا سامنا ابا میاں سے ہوتا تھا۔ ابا میاں کے مزاج میں حاکمیت پسندی بہت زیادہ تھی۔ انھوں نے بچپن سے لے کر اب تک اس پر ہمیشہ اپنے فیصلے ٹھونسے تھے۔

وہ آرمی جوائن کرنا چاہتا تھا مگر ابا میاں کو لیکچررشپ پسند تھی۔ ان کا خیال تھا کہ پیشہ بھی معزز ہے پھر فائدے بھی ہزاروں ہی ہیں۔ دو ماہ کی چھٹیاں الگ، پھر ہینڈسم پے، معاشرے میں باعزت مقام اور جانے کیا کیا۔ انھوں نے اسے دلائل دیئے تھے۔ وہ چپ چاپ ہاں کر بیٹھا۔ یونیورسٹی میں وہ دو سال ٹک رہا۔ مگر اس کی شخصیت بہت دبی دبی رہی۔ اس کے اندر کہیں ابا میاں کا خوف بیٹھا رہتا تھا۔ وہ باوجود چاہنے کے کبھی اپنے خول سے باہر نہ نکل سکا۔ چپ چاپ کتابوں میں گم رہتا، یا پھر شجاع کے ساتھ کینٹین چلا جاتا تھا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"یار تم بہت بے وقوف ہو۔ یونیورسٹی لائف میں اتنا چارم ہوتا ہے اسے خوب انجوائے کرو۔"

"شجاع تمہارے نزدیک انجوائے کا مطلب یہی ہے نا کہ میں کسی لڑکی سے فرینڈشپ کرلوں۔ اس کے ساتھ پکچرز دیکھوں، چائنیز میں کھانے کھاؤں، پھر اس کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں!" وہ آگے جانے کیا کہتا کہ شجاع کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

"تم اس کی محبت میں گرفتار ہو جاؤ پھر اس سے شادی کرنا چاہو تو تمہارے "ابامیاں"، ظالم سماج بن کر بیچ میں آجائیں۔ ہے نا یہی ہوگا نا۔"

"تمہیں تو بس سوائے مذاق کے کچھ سوجھتا ہی نہیں!"

وہ ہنر مندہ سا ہو گیا تھا۔

"بھائی میرے یہ وقت، یہ دور تمھارا دور ہے۔ ابا میاں کا نہیں۔ وہ بہت پرانے ہو چکے۔ وہ اس وقت کا ساتھ نہیں دے پائیں گے۔ اور تم اگر ان کا ساتھ دینا چاہو گے تو نہ ادھر کے رہو گے نہ ادھر کے۔" وہ چپ سا ہو گیا۔ تب شجاع کو جیسے اس پر ترس آ گیا۔

"اشعر تم بہت فرماں بردار قسم کے بیٹے ہو۔"

"ہاں شجاع ہمیں ابا میاں کی حاکمیت پسندی نے بہت فرماں بردار بنا دیا ہے۔" وہ رو دینے کو تھا۔ شجاع اسے اور بھی ہمدردی سے دیکھنے لگا۔ "شجاع میری زینت آپا تھیں نا انہیں پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن ابا میاں نے ان کی علین ایف اے میں اس وقت شادی کر دی جب وہ تھرڈ ایئر میں ایڈمیشن کے سہانے خواب دیکھ رہی تھیں۔ مجھ سے چھوٹی علینی تھی۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی مگر ابا میاں نے اس کی میٹرک کے فوراً ہی بعد شادی طے کر دی۔ وہ بہت زیادہ حساس تھی شجاع۔ لیکن ابا میاں کو اپنے فیصلے مسلط کرنے کا خبط تھا۔ انھوں نے اس کے ہاتھ پیلے کر کے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب ان دونوں کے ڈھیروں کے حساب سے بچے ہیں۔ دونوں کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ علینی جتنی نفاست پسند اور نازک خیالات کی مالک تھی۔ اس کا شوہر اتنا ہی اجڈ اور گنوار ہے۔ وہ اپنے گھر میں بہت ناخوش ہے، پر ابا میاں مطمئن ہیں۔"

اشعر حسن بولتے بولتے چپ ہوا تو شجاع کو اس پر پیار آ گیا۔

"یار تم اپنے اس ماحول کے اسیر ہو جس میں تم نے تربیت پائی ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔"

"ہاں شجاع ایسا ہی ہے۔"

"تم اب خود کو بدل ڈالو میرے یار۔ یہاں ابا میاں دیکھنے تھوڑی آئیں گے۔"

"نہیں شجاع ہم تینوں بہن بھائی ان پرندوں کی مانند ہیں جنھیں پر کاٹ کر پنجرے میں مقید کر دیا گیا ہو۔ وہ اس قید کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ انھیں آزاد بھی کر دیا جائے تو وہ اڑ نہیں پاتے اسی پنجرے میں لوٹ جاتے ہیں چپ چاپ۔"

"واقعی تم صحیح کہہ رہے ہو۔ تمہارے ابا میاں کی گرفت بہت مضبوط ہے ورنہ یہاں آ کر تو لڑکے اپنا آپ بھول جایا کرتے ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو، کچھ فیصلے ماں باپ کو اولاد پر بھی چھوڑ دینے چاہئیں ورنہ وہ ساری عمر سہاروں کے محتاج رہتے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی کا سخت فقدان ہوتا ہے۔"

"ہاں شجاع یہی حال اب میرا ہے۔ بینچ اکنامکس کا چناؤ بھی ابا میاں کی خواہش پر کیا تھا۔" وہ بڑی بے بسی سے بولا تو شجاع کو اس سے اور بھی ہمدردی ہو گئی۔

"آؤ یار کینٹین چلیں۔" شجاع نے اسے بازو سے تھام کر اٹھا لیا۔ وہ دونوں کینٹین میں آئے تو شجاع حسب عادت کینٹین میں بیٹھے ہوئے لڑکے لڑکیوں سے ہیلو۔ ہائے میں مصروف ہو گیا تھا اور وہ اپنی ڈارک گرین گلاسز میں سے مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔ جو بچوں کی طرح معصوم اور بے ضرر لگ رہا تھا۔ اسے کسی کی نگاہوں کی تپش محسوس تو ہوئی تھی پر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ تب اس نے اپنی عادت کے خلاف بلا وجہ ہی ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تو اسی سرخ و سفید رنگت والی لڑکی کو جو گرین گلاسز چڑھائے بڑی بے نیازی سے بیٹھی تھی، اس پر اس کی نظریں تھم کر رہ گئیں چند لمحوں کو۔ پھر وہ ایک دم چونک پڑا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ یوں جیسے اس نے کوئی بہت بڑی خطا کر دی ہو۔

تب ہی شجاع اپنی میز پر واپس آ گیا۔

"سنو اشعر حسن تمہارے لئے بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" وہ سخت گھبرا کر بولا۔

"یہی کہ کسی صنف نازک سے دوستی کرو۔ تاکہ تمہارا اعتماد بحال ہو۔ تمہارے اندر حوصلہ پیدا ہو۔ کیا سمجھے۔"

"یار یہ روگ میرے بس کا نہیں۔" اشعر نے کنکھیوں سے اس ڈارک گلاسز والی لڑکی کو دیکھا جو اپنی میز پر تنہا بیٹھی چائے کا کپ سامنے رکھے سوچوں میں گم تھی۔

"واہ افشین آغا نہیں اس پوری یونیورسٹی میں کوئی اچھا بھی لگا تو یہ بدھو جس کا ساری کلاس مذاق اڑایا کرتی ہے۔ جسے نہ کپڑے پہننے کا سلیقہ ہے نہ اعتماد سے گفتگو کر سکتا ہے۔" اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرائی پھر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

انہی دنوں الیکشن کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ ایسا موقعہ ہوتا ہے جب لڑکوں کو بہانے بہانے سے لڑکیوں کے قریب آنے ان سے گفتگو کرنے کا موقعہ بڑی سہولت سے مل جاتا ہے۔ ان ہی دنوں وہ بڑے غیر محسوس طریقے پر اس کے بے حد قریب آ گئی۔ وہ اس کا التفات پا کر بے پناہ پریشان ہو اٹھا۔ پر وہ بڑی مستقل مزاجی سے اس سے ملتی تھی۔ باتیں کرتی تھی۔ پھر چل دیتی تھی۔

"واہ میرے یار" شجاع نے نہایت بے تکلفی سے اس کی کمر پر دھول جمائی۔

"کیا ہوا شجاع؟"

"یعنی ابھی کچھ ہوا ہی نہیں۔" شجاع پھر ہنسا۔

"ویسے تم تو چھپے رستم نکلے یار۔ اس لڑکی کو جیتا ہے جس سے ساری یونیورسٹی کے لڑکے بات تک کرنے کو ترستے ہیں۔"

"میں... میں نے تو اس سے کچھ بھی نہیں کہا یار!" وہ یوں گھبرایا کہ شجاع دیر تک ہنستا رہا۔

"دیکھو اس سے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ ملا کرو۔ مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرو۔ خود بخود تمہاری یہ جھجک دور ہو جائے گی۔"

شجاع اُسے بڑے قیمتی مشوروں سے بلا فیس نوازتا رہتا تھا۔ اُسے خود بھی اب یہی محسوس ہوتے لگا تھا کہ وہ افشین کے بغیر زندہ نہیں رہ پائے گا۔ لیکن وہ جب بھی بولتا اس کی گفتگو ابا میاں کے گرد گھومتی رہتی تھی۔ افشین کو سخت جھنجھلاہٹ ہوتی۔ پر اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت کو دیکھ کر وہ چپ ہو جایا کرتی تھی۔ وقت گزرتا رہا افشین اس کے متعلق بہت کچھ جان گئی تھی کہ وہ گھر کے ماحول کا اسیر اور ابا میاں کی شخصیت کے رنگ میں رنگا ہوا ایسا شخص ہے جو باوجود چاہنے کے اپنے اس خول کو توڑ نہیں سکتا۔

انہی دنوں ان کے فائنل ایئر کے ایگزامز تھے۔ وہ ہر روز اپنی اسی معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ افشین کو ملا کرتا تھا۔ وہ آجکل بہت چپ چپ بہت اُداس رہنے لگی تھی۔ اس سے بچھڑ جانے کا احساس اُسے تڑپا جاتا تھا لیکن وہ ویسا ہی تھا بے حس، بے جان پتھر۔

"سنو اشعر۔ اب ہم ایک نامعلوم مدت تک کے لئے جدا ہو جائیں گے!" آخری پیپر والے دن وہ بہت دیر تک اس کے ساتھ لان کے ایک تنہا سے کنج میں بیٹھی رہی تھی۔

"ہاں افشین پھر کب ملیں گے؟" اس نے اپنی فطری معصومیت سے پوچھا تو افشین نے وہ الفاظ کہہ ہی دیئے جنہیں اس نے بڑے دنوں کی انتھک محنت کے بعد جوڑا تھا۔

"دیکھو اشعر تم پر اپنے ابا میاں کا بہت زیادہ اثر ہے۔ تم اُن سے بہت متاثر ہو۔"

"ہاں وہ تو ہوں" اشعر اُداس سا ہو گیا تھا۔

"تم ان کے کئے فیصلوں سے کبھی انحراف نہیں کر پاؤ گے ہمیشہ ان کے فیصلوں کے محتاج رہو گے نا۔"

افشین کی اس بات پر اس نے چونک کر سر اُٹھایا تو افشین نے منہ پھیر لیا۔

"اشعر میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ... کہ مجھے تم سے بے پناہ، بے تحاشا ـــــ تم سمجھ رہے ہو نا اشعر... تم سے بچھڑ کر میں بہت دُکھ سہوں گی۔ پر پھر بھی میں نے یہ فیصلہ اپنے آپ کیا ہے کہ تم ساری زندگی اس خول کو توڑ نہ پاؤ گے اس لیئے میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گی کچھ نہیں چاہوں گی۔ گو کہ تمہیں بھول جانا ازحد ـــ بے حد مشکل ہوگا۔"

اس نے بڑی معصومیت سے آنسو پی لئے تھے۔ پھر پرس جھلاتی اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔ وہ بہت دیر تک اُدھر دیکھتا رہا تھا۔ پھر سر جھکا کر گھاس اکھاڑنے لگا تھا۔ شجاع نے جب ساری بات سنی تو بہت بگڑا تھا۔

"تم نے اسے روکا بھی نہیں؟"

"یار وہ بہت جلدی گئی تھی!" اشعر حسن نے بے بسی سے کہا تو شجاع نے سر پیٹ لیا۔

پھر وہ گھر چلا آیا۔ ابا میاں کی سرخ آنکھیں، غرور سے تنی تنی گردن اور حاکمیت پسندی کو دیکھا تو اسے افشین آغا کا فیصلہ بہت مناسب لگا۔ "بھلا میں ابا میاں سے کیا ٹکرا سکتا تھا!" اشعر حسن نے بزدلی کی انتہا کو پہنچ کر سوچا۔

پھر پبلک سروس کمیشن میں درخواستیں بھیجنے لگا۔ کچھ ابا میاں کے تعلقات کام آئے اور کچھ اس کی اپنی ذاتی قابلیت۔ وہ بہت جلد برسرِ روزگار ہو گیا۔ کالج میں وہ ایک ذمہ دار، حساس اور فرض شناس استاد ہوتا تھا جس کے طلباء اس کے لیکچر سے مطمئن ہوتے تھے۔ مگر گھر آتے ہی وہ سہما سہما ابا میاں کے فیصلوں کا اسیر اشعر حسن بن جاتا تھا جسے محض اسی لئے افشین آغا چھوڑ گئی تھی کہ وہ کسی بھی فیصلے پر خود سے عمل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔

"تمہارے بیوی بچوں کا بیڑہ غرق ہو جائے گا اشعر حسن۔ خود میں فیصلے کی قوت پیدا کرو ورنہ بیوی تم پر چھا جائے گی۔ بچے خودسری اور من مانی اپنا لیں گے۔ تب تم کیا کرو گے؟"

"یار شادی ابھی ہوئی نہیں اور تمہیں بیوی بچوں کی پڑ گئی ہے"

"جو مرد ہوتے ہیں نا مردان کو پلاننگ کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ پورے ایک کنبے کا دارومدار ہوتا ہے ان پر۔ ان کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داریاں ہوتی ہیں!"

"لیکن شجاع میں ابا میاں کی طرح حاکمیت پسند نہیں بننا چاہتا!"

"تم درمیانی راہ تو اپنا سکتے ہو نا۔ کم از کم مشورہ دینے کے قابل تو ہو جاؤ!" شجاع بہت پیارا دوست تھا۔ اس کے دُکھ سکھ کا ساتھی۔ اس کے پرابلمز کو شیئر کرنے والا بے لوث اور بے غرض مشورے دینے والا۔ وہ شجاع کو بہت چاہتا تھا۔ پر اس کے مشورے اکثر اس کے سر پر سے گزر جاتے۔ وہ ان پر عمل کرنے کی خود میں اہلیت نہیں پاتا تھا۔

"اماں بی آپ نے بھی ساری زندگی چپ چاپ ابا میاں کے فیصلوں کے سامنے سر جھکا کر گزار دی۔ کبھی کسی فیصلے کے خلاف آواز نہ اٹھائی تو پھر اب میں کس طرح ابا میاں کے سامنے ڈٹ جاؤں؟"

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

لوحِ وفا

نویدہ فضال تارڑ

قرینے سے ترتیب دیئے گئے سُرخ اور زرد پھولوں کی مہکتی چھاؤں میں پتلی پتلی موم بتیوں کی لو تھرتھرا رہی تھی تابندہ بیگم نے سفینہ کا ہاتھ تھام کے اُسے سادہ سا کیک کاٹنے میں مدد دی اور پھر خود ہی آہستگی سے پھونک مار کے شمعیں بجھا دیں۔

"سالگرہ مبارک ہو میری جان۔" اس کا ماتھا چُومتے ہوئے اشکوں کا گھٹا گھٹا سیلِ رواں بہہ نکلا۔

"مما یہ سب کیا ہے؟ بھلا یوں بھی برتھ ڈے منائی جاتی ہے؟" سفینہ نے منہ بسورا۔

"ہاں بیٹا!" حسرتوں سے چُور چُور لہجہ تھا۔

"ہوں ... نہ آپ نے میری فرینڈز کو بلایا نہ دوسرے لوگوں کو ... اور پھر عاشی، مینا وغیرہ تو اتنی دھوم دھام سے سالگرہ مناتی ہیں، بس مما! میں کیک بھی نہیں کھاؤں گی اور نہ ہی آپ سے بولوں گی" سفینہ اپنی محرومی کے احساس سے زار زار رونے لگی۔

"بس کرو بیٹا! تم نہیں جانتیں تمہاری ماں خود کس قدر دُکھی اور مجبور ہے۔" انہوں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"بھابی! کس قدر افسوس کی بات ہے میرے ہوتے ہوتے آپ کیوں خود بھی دُکھی ہو رہی ہیں اور سفینہ کو بھی رلا رہی ہیں۔" اندر آتے ہوتے جمال احمد کو ساری صورتِ حال سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔

"آداب! بھائی صاحب! آپ کب آئے؟" تابندہ نے اشکوں سے لبریز سرخ متورم آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"ادھر آؤ بھئی بیٹے! اتنی چھوٹی سی بات پہ تو نہیں رویا کرتے بولو کیا لوگی ہم سے ... ہاں!"

"کچھ نہیں تایا ابا۔"

"ارے واہ کیسے نہیں ہم ابھی تمہیں تمہاری مما جان اور عمیرہ کو بازار لیتے چلتے ہیں۔ وہاں جو کہو گی کھلائیں پلائیں گے اور ڈھیر سارے تحفے بھی خرید کے دیں گے ٹھیک ہے؟" انہوں نے بڑے پیار سے سفینہ کے بال سلجھاتے ہوئے کہا تو وہ فوراً عمیرہ کو یہ اطلاع دینے بھاگ گئی۔

"آپ ناحق تکلیف کر رہے ہیں بچی تھی یونہی بہل جاتی۔" تابندہ نے آنکھوں کے گوشوں پہ ٹھہر جانے والے آنسو انگلی سے صاف کرتے ہوئے بڑی مدھم سی آواز میں کہا۔

"بھابی! آپ غیروں والی باتیں مت کیا کریں میں جانتا ہوں اِس گھر میں آپ کو کبھی بھی زیادہ سُکھ اور عزت نہیں ملی پھر بھی آخر کو سفینہ ہمارا خون ہے اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی تکمیل کرنا ہمارا فرض ہے وگرنہ کوئی بچہ اِس عمر میں کمپلیکس کا شکار ہو جائے تو ہمیشہ کے لئے اُس کی شخصیت مسخ ہو کے رہ جاتی ہے۔"

جمال احمد ہمیشہ کی طرح اپنے نرم شیریں لہجے میں اُن کی دلجوئی کرتے رہے پھر حسبِ وعدہ انہیں باہر گھمانے پھرانے کے لئے لے گئے سفینہ کی پسند کی ڈھیروں چیزیں خرید ڈالیں۔ اور جب وہ واپس آئے تو برآمدے میں کھڑی تہزیت کی خشمگیں نگاہیں سیدھی تابندہ کے دل میں اُتر گئیں۔

"یا خدایا مرد شوہر کے روپ میں ہو یا باپ کی جگہ پہ ایک عورت کے لئے اس کا وجود کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ تو وہ طاقتِ پرواز سے محروم اُس ننھے منے، چڑیا کے بچے کی مانند ہوتی ہے جو سہما ہوا اپنے گھونسلے میں دبکا رہتا ہے۔

"تم نے ہمیں کیا ٹھکرایا بلال احمد! کہ لگتا ہے ساری دنیا کے لئے ہی ہمارا وجود کسی شاخ سے ٹوٹے آوارہ پتے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہو۔ وہ تابندہ افتخار جو اپنی خوبصورتی، سمارٹ نیس اور ذہانت اور سلیقے کی وجہ سے سارے خاندان میں مشہور تھی بالکل بے مایہ اور تہی دامن ہو کے رہ گئی ہے دُکھوں، محرومیوں اور تنہائیوں کا ایک الاؤ اس کی ذات کے اردگرد دہکتا رہتا ہے تم تمہارا ان سارے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں بلال احمد ... خدارا اَب تو لوٹ آؤ ... لوٹ آؤ بلال احمد" تابندہ کے سسکتے کراہتے ہوئے دل نے انہیں بے تحاشہ صدائیں دے ڈالیں۔

تابندہ پہلے روز ہی سے بلال احمد کے دل میں اپنے لئے

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

جگہ نہ بنا سکیں عروسی سیج پہ پلکوں کی چلمن گرائے گردن جھکائے اپنی ہی دھڑکنوں کے شور میں گم جب بہت سارا وقت بنا کسی آہٹ کے اور سرگوشی کے گزر گیا تو انہوں نے ڈرتے ڈرتے پلکیں اُٹھائیں بلال احمد صوفے پہ بیٹھے سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہے تھے دھوئیں نے اُن کے وجیہہ چہرے کے اردگرد ہالہ سا بنا رکھا تھا سوچ کی سلوٹیں اور تفکرات کے سائے تابندہ سے پوشیدہ نہ رہ سکے نرم گرم خوشگوار دھڑکنیں معدوم ہونے لگیں۔

بلال احمد نے کوئی وضاحت نہیں کی کوئی الزام نہیں دھرا کوئی نقص نہیں نکالا لیکن وہ قربت، وہ چاؤ وہ لگاؤ جو شادی کے ابتدائی ایام میں شوہر اور بیوی کے درمیان پروان چڑھتا ہے مفقود

Www.PakistanPoint.Com

ہی رہا بے حد سپاٹ خشک اور لگا بندھا سا رویہ تھا اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت بھر بھر کے تابندہ اپنے آپ کا جائزہ لیتی رہتی۔

لیکن خوبصورت چمکتی آنکھیں دراز زلفیں اور صبیح رنگت جن کا جادو سر چڑھ کے بول سکتا تھا چُپ رہتے۔

ہاں! ذہن کے کسی گوشے سے یہ صدا اُٹھتی کہ۔

"تابندہ بی بی! یہ تو سارا نصیبوں کا کھیل ہے جن کے نصیب روشن ہوں وہ بدصورت عورتیں بھی شوہروں کے دِلوں پہ حکمرانی کرتی ہیں۔

اِس ساری جمع تفریق کا حساب تو اُس خدا کے ہاتھ میں ہے وہ بہت تڑپیں، سُن گُن لینے کی کوشش کی لیکن بلال احمد تو گویا اپنی ذات کو پتھر کے حصار میں دے چکے تھے جب لیڈی ڈاکٹر نے ماں بننے کی نوید دی تو سُنی سنائی باتوں کے مصداق اُس پتھر میں جونک لگنے کی اُمید بندھ گئی لیکن جونک تو کیا لگتی دراڑیں کیا پڑتیں اُلٹا بلال احمد چُپ چپاتے سویڈن چلے گئے۔

ٹھکرائے جانے کے دکھ نے تابندہ کو نڈھال سا کر دیا۔

لیکن جلد ہی سفینہ کے ننھے وجود نے انہیں کسی حد تک بہلا دیا ہر دو تین ماہ بعد ایک معقول رقم وصول کرتے ہوئے انہیں یوں لگتا وہ کسی سے بھیک لے رہی ہوں شکوہ مچلتا۔

"واہ بلال احمد! بھلا یہ روپے پیسے آپ کا نعم البدل کیسے ہو سکتے ہیں میں اِن سے اپنی ضروریات تو پوری کر سکتی ہوں لیکن اپنے سر کا تاج اور سفینہ کے لئے شفقت و محبت تو نہیں خرید سکتی۔"

حساس اور خوددار سی تابندہ کے لئے یہ وقت بہت کٹھن تھا۔ وہ اپنی ساس، جیٹھ جیٹھانی اور اُن کے بچوں کے ساتھ اُس گھر میں رہ رہی تھیں جہاں انہیں بیاہ کے لایا گیا تھا جب شوہر ہی بیوی کو رد کر دے تو پھر سسرال والے کیوں اُسے سینے سے لگانے لگے۔"

حلیمہ خاتون بیٹے کے گھر سے نکل جانے کا سارا الزام تابندہ پہ ہی لگاتیں پھر نزہت تھی جسے تابندہ ایک آنکھ نہ بھاتی ہر چہرہ بے مہر تھا سوائے جمال احمد کے... وہ اتنے شفیق اور مہربان تھے کہ تابندہ کے لئے اُن کا وجود کسی گھنیرے درخت سے کم نہ تھا نزہت کو شوہر کی یہ دلداری ہرگز گوارہ نہ تھی کتنی ہی سرد جنگیں اُن کے بیڈ روم میں لڑی گئیں لیکن وہ جمال احمد سے اُن کی طبعی نرم دلی اور ہمدردی نہ چھین سکیں۔

"تابندہ بھی اندھی بہری نہ تھیں سب جانتی اور سمجھتی تھیں۔ لیکن مصلحتوں اور مجبوریوں نے انہیں چُپ چاپ زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھا دیا تھا اُن کے اپنے والد بقیدِ حیات نہ تھے والدہ بھائیوں کے رحم و کرم پہ تھیں حالات کو دیکھتے ہوئے اُمّی اور بھائیوں نے زور لگایا کہ وہ میکے چلی آئے لیکن تابندہ اُس گھر کو نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں جس سے اُن کی شناخت قائم تھی۔

وہ بلال احمد کی بیوی اور اُس گھر کی بہو کی حیثیت سے پہچانی جانا چاہتی تھیں خواہ اِس کے لئے انہیں درد کی کتنی ہی منزلوں سے کیوں نہ گزرنا پڑتا۔ انہیں منزلوں پہ آبلہ پا چلتے چلتے ایک طویل مسافت انہوں نے طے کر لی تھی سفینہ اَب جوان ہو چکی تھی۔ ہمیشہ اچھے سکولوں میں پڑھا اور اب وہ شہر کے بہترین کالج میں زیرِ تعلیم تھی!

تو سب ٹھیک تھا لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اُس کے شعور کی طرف آتے ذہن سے حسّاسیت نہیں مٹا پائی تھیں چھوٹی سے چھوٹی بات اِس کے لوحِ دل پہ پتھر کی لکیر کی مانند نقش ہو جاتی احساسِ کمتری کی آہنی دیواروں نے اُس کے وجود کو پیس کے رکھ دیا تھا باپ کی بے اعتنائی گھر والوں کا سلوک اردگرد کے لوگوں کے چلائے جانے والے نشتر پہ سلے رویّے اور احساسات اُس کا ذہن بڑی جلدی قبول کر کے دل میں اُتارتا رہا۔

تابندہ دیکھ دیکھ کے کڑھتیں لیکن وہ بیٹی کو دُکھوں اور محرومیوں کے بگولوں سے نکال لانے پہ قادر نہ تھیں بے آواز شکوے اور التجائیں کرتے کرتے اُن کا اپنا دل اَب تھک چکا تھا۔ بلال احمد جیسے ایک خواب بن کے اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہو چکے تھے۔

وہیں انہوں نے کسی سویڈش عورت ثریا سے شادی کر لی تھی اور اپنے تین بچوں سمیت خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے ایسے میں تابندہ کی رہی سہی اُمیدیں بھی نااُمیدی کے تاریک مقبرے میں دفن ہو گئی تھیں۔ وہ سردیوں کے خنک شب و روز تھے کچن میں کچھ کام نمٹانے کے بعد تابندہ اپنے کمرے میں آئیں تو سفینہ ڈبہ کھولے بڑے سے کاغذ پہ بے حد انہماک سے رنگ برنگے بٹنوں سے مختلف گھر اور پھر اُن میں بسنے والی فیملیز بنا رہی تھی درمیان میں جلی حروف میں بلال پیلس لکھ رکھا تھا۔

"یہ ہوتے پاپا اور یہ ممّا۔"

اور یہ میں... لیکن اتنا بڑا گھر اور اتنے تھوڑے لوگ! دو بھائی ہونے چاہئیں اور ایک بہن"۔

وہ سب میں سے منفرد اور خوبصورت بٹن چن کے بلال پیلس میں رکھتے ہوئے خود ہی بڑبڑا رہی تھی وہ اپنے اِس کام میں اتنی مگن تھی کہ اُسے تابندہ بیگم کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی۔

اپنی اِس پاگل سی بیٹی کے انوکھے خوابوں اور سوچوں پہ اُن کا اپنا دل جیسے بھٹرنے لگا خدا جانے کیا بات تھی سفینہ کو مختلف قسم اور رنگوں کے بٹن جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ کسی خالی کونے میں بیٹھ کے خود سے ہی باتیں کرتی رہتی اور اَب اِس عمر میں بھی اُس کا یہ شوق برقرار تھا وہ دِل کی حسرتیں یونہی پوری کرتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔

"سفی بیٹے!"

"جی ممّا" وہ چونک کے سیدھی ہو گئی۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی" وہ نظرانداز کرتے ہوئے بظاہر خوشدلی سے بولیں۔

"ممّا وہ... وہ ہماری ہوم اکنامکس کی مس نے ایک فائنل بنانے کو کہا ہے اُس میں فراک اور قمیض کے خاکے پہ ہم رنگ بٹن بھی لگانے تھے وہی دیکھ رہی تھی۔"

اُس نے اٹکتے ہوئے صاف جھوٹ بول دیا "بلال پیلس" کے لفظ پہ رکھا اس کا سفید نازک سا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"میں تمہیں خوش رکھنے کے لئے اپنے دل کا درد چھپا جاتی ہوں اور تم اپنی ماں کو مطمئن کرنے کے لئے اپنی ساری آرزوؤں پہ بڑا خوبصورت سا پردہ ڈال دیتی ہو یہ مصنوعی پن یہ غلاف یہ کھوکھلی باتیں سب بے حد تکلیف دہ ہیں میرے خدایا!"

انہوں نے پلکوں کو زور زور سے جھپکتے ہوئے پھر سے اپنے آپ پہ قابو پا لیا۔

ش

"سفی او سفی" حسن دور ہی سے چلّاتا آ رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے؟" وہ جھنجھلا گئی۔

"ہمارا نزول ہمیشہ ہی تمہارے لئے مصیبت کا باعث ہوتا ہے آخر کیوں سفینہ بیگم؟"

مجھے جو نظر آتا ہے ظاہر ہے وہی کہوں گی" وہ بے نیازی سے کہہ کے دوبارہ کتاب پہ جھک گئی۔

"ہوں... پوز تو یوں کر رہی ہو جیسے اِس دفعہ اگلے پچھلے تمام تعلیمی ریکارڈ تم ہی توڑو گی"

"تم سے مطلب؟"

"بھئی اِس لئے کہہ رہا ہوں کہ سیدھے سیدھے چکی چولہے کی طرف دھیان دو کیا فائدہ وقت اور پیسہ برباد کر رہی ہو"

"وقت میرا اپنا ہے اور پیسہ تم سے مانگنے نہیں جاتی۔"

"کیا خبر ایسی سیچویشن بھی کبھی آ جائے۔" وہ کسی اور ہی ترنگ میں بولا۔ لیکن سفینہ کو یوں لگا وہ اُس کی کم مائیگی پہ طنز کر رہا ہو ایک دم اُس کا چہرہ غصّے کی شدّت سے سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ خاموشی سے کتابیں اُٹھا کے وہاں سے اُٹھ آئی اور حسن کفِ افسوس ملتا رہ گیا۔

اسکول کالج، گھر، باہر ہر جگہ پہ اُسے اپنی ذات کے اکیلے پن کا احساس ہوتا رہا لڑکیاں جب بڑے فخر سے چہرے پہ لازوال خوشیوں کے رنگ سجائے باپ کی شفقتوں اور بہن بھائیوں کی چاہتوں کے قصے سناتیں تو تاریک جامد سناٹے اُس کے اندر رینگ آتے وہ سمجھتی تھی کہ ممّا کی ساری محبت پانے کے بعد وہ مکمل ہو چکی ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ اندر سے اُٹھنے والی سرگوشیاں اُسے بے چین کر ڈالتیں۔

"تمہاری سوچیں غلط ہیں سفینہ بلال! اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے خود ساختہ فلسفے مت گھڑو بہن بھائی، باپ اِن سارے رشتوں اِن ساری محبتوں سے ہی تو انسان کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے تم جانتی ہو کہ تم خود کتنی اکیلی اور تنہا ہو تمہارے دل کا وہ خانہ ہمیشہ ہی سے خالی ہے جس میں ایسی الوہی محبتیں اور پیار ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے لیکن میں کیا کروں میرے چاہنے سے کیا ہو سکتا ہے" وہ سسک اُٹھی۔

سفینہ عجیب سی کیفیات سے گزر رہی تھی اُلجھی اُلجھی بکھری بکھری... کبھی وہ کارنس پہ سجی بلال کی تصویر کو بے تحاشا چومنے لگتی تو کبھی دوسرے ہی لمحے اُس کا جی چاہتا کہ وہ اِس تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اپنی ساری محرومیوں کا ازالہ باپ سے شدید اور بے پناہ نفرت جتا کے کرتی رہتی اور یونہی تھوڑی سی آسودگی حاصل کر لیتی۔

ایک روز وہ کالج سے لوٹی تو ایک اجنبی سی تحریر والا سبز ایروگرام میز پہ پڑا تھا۔

پیاری باجی!

میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں آپ کو کیسے مخاطب کروں چند ماہ قبل میں نے ڈیڈی کی زبانی سنا تھا کہ پاکستان میں میری ایک اور ممی اور بہن بھی ہے مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ اور میرا دل

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

چاہا کہ میں آپ کو خط لکھوں آپ مجھے ضرور جواب دیجئے گا۔ مجھے خوشی ہوگی ممی کو سلام اور پیار۔

آپ کا بھائی

عمر

ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھا گیا یہ خط سفینہ نے بار بار پڑھا اور اُس نے محسوس کیا کہ انجانی سی مسرّت کی لہریں اُس کے پورے جسم میں دوڑ رہی ہیں یہ آناً فاناً کیسے جذبوں نے اُس کے تپتے ہوئے دل میں ہلچل مچانی شروع کر دی تھی ایک لمحہ کو بلال احمد اور اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کے خلاف اُس کے دل میں نفرت نے سر اُٹھایا کہ وہی تو اُس کے اور مما کے دشمن تھے لیکن محبت کے اِس منہ زور ریلے کے آگے وہ نفرت دب کے رہ گئی۔

ساری رات سوچنے کے بعد اُس نے عمر کو خط لکھ ڈالا۔ عمر اپنی ماں اور بہنوں کے برعکس طبیعت کا حامل تھا اُسے محض کبھی کبھار کی جانے والی ڈیڈی کی گفتگو سننے کے بعد اپنی دوسری ماں اور بہن سے بے پناہ لگاؤ ہو گیا تھا۔

اُس نے بڑی کوشش کے بعد اردو بھی سیکھ لی تھی نماز قرآن بھی باقاعدگی سے پڑھتا جبکہ جینیٹ اور سارہ ہو بہو ماں کے نقشِ قدم پہ چل رہی تھیں ثریا کی طرح انہوں نے بھی باپ کے مذہب اور نظریات کو قبول نہیں کیا تھا شخصی آزادی کی ڈور تھامے ہوئے وہ بہت دور نکل گئی تھیں بلال احمد کڑھتے اُن کی غیرت دن میں کئی کئی بار جاگتی اور پھر اپنی موت آپ مر جاتی۔

یہ سارا جال جس میں اب وہ کسی بے بس پر کٹے پنچھی کی مانند پھڑپھڑا رہے تھے ان کا اپنا ہی تو بچھایا ہوا تھا۔ سویڈن کی مستقل شہریت ثریا کا حسن اور اب بچوں کا ساتھ یہ ساری زنجیریں اُن کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھیں وہ ان سب کو چھوڑ کے کہاں جاتے؟ اُس گھر میں اُس تابندہ کے پاس جنہیں انہوں نے بڑی حقارت سے ٹھکرانے کے بعد پلٹ کے خبر تک نہ لی تھی۔ وہ کیسے اپنے فیصلے کا بھرم کھو دیتے۔

وہ فیصلہ جو ہمارے ملک کے بیشتر عاقبت نااندیش نوجوانوں کے جی کا روگ بن جاتا ہے کچھ تو پچھتاووں کے ناگ کے پھن کو اَنا اور ہٹ دھرمی کے ہتھوڑے سے کچل ڈالتے ہیں کچھ اس کے ڈنک کی اذیت کو سہتے رہتے ہیں اور کچھ بے وفائی اور پشیمانی کے داغ سجائے اپنے مرکز اپنی دھرتی اپنے اصل خمیر کی طرف لوٹ آتے ہیں کہ اس دھرتی کا سینہ بڑا کشادہ ہے یہ سمیٹنے سے لگانے کی عادی ہے ٹھکرانے کی نہیں۔

بلال احمد بھی انہیں میں سے ایک تھے دیارِ غیر میں عمر ایک ایسی ہستی تھی جو انہیں سہارا دیتے ہوئے تھا وہ اب اکثر جانے کس جذبے کے تحت اُس سے اپنے گھر تابندہ اور بیٹی کی باتیں کرتے رہتے جس کی انہوں نے ابھی تک شکل بھی نہ دیکھی تھی۔

بس جمال احمد نے انہیں خط کے ذریعے بیٹی کی پیدائش کی خبر دی تھی اُن دنوں ثریا سے نئی نئی شادی کا خمار اُن پہ طاری تھا اس لئے اِس خبر کو انہوں نے مطلق اہمیت نہ دی لیکن جوں جوں وقت گزرتا رہا تھا بلال احمد اپنے وجود کے اُس حصے کو اپنے سے بے حد قریب محسوس کرنے لگے تھے۔

انہیں تابندہ یاد آنے لگی تھی اُس کی وہ گہری گہری آنکھیں جن میں شکوہ اور درد مچل رہا ہوتا انہیں اپنے اردگرد دبکتی ہوئی محسوس ہوتیں وہ اس کا دبا دبا سا تبسم، صبیح رخساروں پہ جھک آنے والی پلکیں شائستہ لب و لہجہ یہ سب تصوّرات میں آ کے انہیں بے چین و بے قرار کر ڈالتے۔

اسی لئے انہوں نے عمر کو خط لکھنے پہ اکسایا تھا کہ وہ اسی طریقے سے اپنی بیٹی اور تابندہ کے قریب ہونا چاہتے تھے سفینہ کی تحریر کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے اگلے خط میں اُس کی رنگین تصویر تھی۔

ہلکا آسمانی آنچل سر پہ جمائے بلاشبہ وہ بڑی مقدس اور پیاری لگ رہی تھی۔ بلال احمد نے چپکے سے اپنے لب اُس کی تصویر پہ رکھ دیئے۔

سبھی کے لئے یہ خبر بڑی حیرت انگیز تھی نزہت بیگم نے ہمیشہ کی طرح ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کئی خیال آرائیاں کر ڈالیں تابندہ سوتیلے رشتے کے باوجود مطمئن اور خوش تھیں کہ ممکن ہے یہی ذریعہ باپ بیٹی کو ملانے کا سبب بن جائے حسن اُسے جان بوجھ کے چھیڑتا رہا۔

"بڑی خوشی ہو رہی ہو گی! سچ سچ بتاؤ امپورٹیڈ چیزوں کے لالچ میں خط و کتابت بڑھائی جا رہی ہے نا..."

"ہاں ہاں کمینی اور بھوکی جو ہوں میں..." اپنے جذبوں کی اِس تضحیک پہ سفینہ کھول کے رہ گئی۔

"اِس میں شک ہی کیا ہے" حسن نے اُس کے غصّے سے لال ہوتے ہوئے چہرے کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہوئے ایک اور تیر چلایا۔

"تم میرے سامنے مت آیا کرو سمجھے!"

"کیوں نہ آئے، وہ بلال انکل کی طرح گھر سے نکلنے سے تو رہا" نجانے کہاں سے نکل کے عمیرہ نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا، تو وہ تیز تیز چلتی ہوئی کمرے میں آگئی غصے اور توہین کی شدت سے اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

"مما! میں ایک منٹ یہاں نہیں رکوں گی عمر کو خط لکھنا طعنہ بن کے رہ گیا ہے سب لوگ مذاق اڑا رہے ہیں مجھ سے یہ ہر پل کی تضحیک برداشت نہیں ہوتی مما..."

وہ تابندہ بیگم کے گلے سے لگ کے بڑی بری طرح رو رہی تھی، انہوں نے اسے دلاسہ دیا سمجھایا بجھایا لیکن اندر ہی اندر آنسوؤں کے پھندے سے ان کے حلق میں اٹکتے رہے۔

عمر کے خطوط باقاعدگی سے آرہے تھے معصوم معصوم سے خلوص کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے اس نے سفینہ کو لکھا کہ وہ بڑے سمر ٹائم کے تہوار سے پہلے سٹاک ہوم چلی آئے ہم سب مل کے اس مخصوص میدان میں جائیں گے موسیقی سنیں گے اور درخت پہ چراغاں کریں گے پھر میں آپ کو شہزادہ یوجین کا محل پارلیمنٹ کے جزیرے سلاوسن کا پل اور رائل پیلس دکھانے جاؤں گا۔ آپ کے لئے میں نے بہت سی خوبصورت چیزیں اکٹھی کر رکھی ہیں پلیز آپی! آپ آجائیں نا...

سفینہ اپنے اس پیارے سے دور دیس رہنے والے ان دیکھے بھائی کی بچکانہ خواہشات پہ زیر لب مسکرا کے رہ جاتی۔

کچھ اور وقت سرکا سفینہ نے ابھی گریجویشن ہی کی تھی کہ جمال احمد نے اسے حسن کے لئے مانگ لیا گو تابندہ اس رشتے پہ ذرا بھی خوش نہ تھیں لیکن ہمیشہ کی طرح شوہر کے آگے ان کی ایک نہ چلی تابندہ تو پہلے ہی جمال احمد کی مہربانیوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔

حسن میں کوئی کمی بھی نہ تھی ابھی حال ہی میں اس نے ہاؤس جاب مکمل کیا تھا اور اب C.M.H میں باقاعدگی سے ڈیوٹی انجام دے رہا تھا بس ایک ہی خدشہ تھا کہ آیا حسن بھی سفینہ کو پسند کرتا ہے یا نہیں خود انہوں نے ساری عمر یہ عذاب سہا تھا اور نہ رہی تھیں بیٹی کے لئے وہی راہیں منتخب کرنے کی غلطی وہ کیسے کر سکتی تھیں اسی لئے یہ خدشہ زبان پہ لے آئیں۔

"آپ کا کہنا میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے بھائی صاحب لیکن کیا اس رشتے میں حسن کی رضا بھی شامل ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ کونسی سوچیں آپ کو ستا رہی ہیں۔ لیکن آپ یقین رکھئے بھابی! میں انشاء اللہ خوش رہے گی حسن کی مرضی معلوم کئے بغیر میں خود بھی یہ قدم نہ اٹھاتا۔"

اس وضاحت کے بعد تابندہ کے سر سے جیسے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا۔ ... نے سنا تو حیرت زدہ رہ گئی۔

"مما... میں ہرگز حسن سے شادی نہیں کروں گی۔"

"کیوں آخر؟!"

"آپ کو معلوم ہے وہ مجھ سے کتنی نفرت کرتا ہے ہمیشہ اور ہر قدم پہ اس نے میرا مذاق اڑایا ہے اور توہین کی ہے میں ایسے شخص کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی مما! پلیز آپ اتنا غلط فیصلہ مت کریں۔"

"پاگل مت بنو سفی! تمہیں پتہ ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کے پیتا ہے میں نے ہر طرح سے سوچ سمجھ کے ہی بھائی صاحب کو زبان دی ہے اور پھر یہ رشتہ حسن کے ایما پہ ہی کیا جا رہا ہے۔"

"جس گھر میں بچپن سے لے کر اب تک میں سلگتی رہی ہوں اب وہیں ساری عمر گزارنا... بے حد مشکل ہے اپنی بیٹی کو اتنے کڑے امتحان میں مت ڈالیں مما۔" اس نے تابندہ بیگم کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔

لیکن ان کے پاس بھی تو کوئی اور راہ نہ تھی جمال احمد کی بات رد کرنے کے بعد وہ کہاں جاتیں۔

"سنو بیٹا! اب تو میں ساری بات طے کر چکی ہوں تمہیں اپنی مما کا مان رکھنا ہے اور دیکھنا کہ اس فیصلے پہ تمہیں کبھی بھی پچھتانا نہیں پڑے گا انشاء اللہ!"

انہوں نے اس کا چہرہ تھامتے ہوئے بڑے ہی یقین اور رسان سے کہا تو بغاوت کی آندھیوں میں گھری ہوئی سفینہ بلال جیسے سب کچھ بھول گئی۔

ساری دنیا میں وہی تو تھیں جنہیں وہ پوجا کرنے کی حد تک چاہتی تھی ان کا مان رکھنے کے لئے تو اگر اسے جان سے بھی گزر جانا پڑتا تو بھی وہ نہ ہچکچاتی اپنی جلتی ہوئی بوجھل آنکھوں پہ مما کا سرد ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ان کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

بعد میں اس نے محسوس کیا کہ حسن بہت خوش خوش پھرا کرتا ہے لیکن اب بھی وہ غصے سے چڑانے ستانے سے باز نہ آتا حیرت کی بات یہ تھی کہ سفینہ نہ تو لال بھبوکا ہو کے اسے جلی کٹی سناتی اور نہ ہی اس کے برعکس اس کے چہرے پہ حیا کے دھنک رنگ

لہراتے ہوئے نظر آتے بس وہ بالکل خاموش ہوکے رہ گئی تھی گود میں ہاتھ رکھے جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔

جمال احمد اس شادی میں اپنے دل کے سارے ارمان نکال رہے تھے گھر عزیز و اقارب سے بھر گیا تھا ہنسی قہقہے، نغمے ہر سو بکھرے رہتے معصوم سی سفینہ پہ دلہناپے کا بہت روپ آیا تھا اب ان گھڑیوں میں بھی اس کا دل لطیف احساسات سے خالی تھا اسے پاپا اور عمر بے طرح یاد آ رہے تھے رخصتی کے وقت دعائیں دینے اور گلے لگانے کے لئے صرف ایک ماما تھیں وہ ان سے لپٹ کے اتنی شدتوں سے روئی کہ چند لمحوں کے لئے دیکھنے والوں کی بھی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

مختلف اندیشوں اور خیالوں میں گھری وہ حسن کے رویّے ہی سے متعلق سوچ رہی تھی یوں روایتی انداز میں سر جھکا کے اسے حسن کا انتظار کرنا بے حد عجیب لگ رہا تھا قدموں کی چاپ ابھری تو اس کے لئے اپنے دل کی بے ترتیب ہوتی دھڑکنیں سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

"سفینہ بیگم! کہیں آج بھی تو لڑنے جھگڑنے کا ارادہ نہیں ہے" وہ چپکی بیٹھی رہی۔

"اوہ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم تو میری شکل بھی دیکھنے کی روادار نہیں ہو میں تمہارے ان الفاظ کو یاد کر دکھاؤں گا سفینہ بی بی!"
اس نے بڑے سرد سے لہجے میں کہا تو سفینہ کانپ کے رہ گئی۔

"اُف خدایا! کیا پھر وہی ڈرامہ دہرایا جائے گا لیکن وہ ماما تھیں میں یہ سب برداشت نہ کر پاؤں گی مر جاؤں گی حسن جمال! انہیں اپنی نفرتیں ختم کرنی پڑیں گی دیکھ لینا"
اس نے اپنے ڈوبتے دل اور گڈمڈ ہوتی سوچوں کے ساتھ ایک اٹل فیصلہ کر لیا جب اس کی طرف سے اب بھی خاموشی رہی تو حسن نے چونک کے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھا اس کی پلکیں لرز رہی تھیں اور چہرے پہ جا بجا پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

"سفی!" اس نے سفینہ کا ہاتھ تھاما جو بالکل سرد ہو رہا تھا۔

"حسن جمال صاحب! آپ کو بلال احمد کے نقشِ قدم پہ نہیں چلنا پڑے گا میں خود ہی آپ کی راہ سے ہٹ جاؤں گی۔"
پتھروں کی سی سنگینی تھی اس کے لہجے میں۔
حسن ایک دم کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

"جاؤ گی کہاں سفی جان! ان ہاتھوں کا حصار اتنا کمزور تو نہیں"
اس نے بڑے پیار سے سفینہ کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حلقے میں لیا تو وہ حیران سی اس کی بدلتی کیفیات دیکھتی رہ گئی۔۔۔

بعد کے شب و روز دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت میں گزر گئے حسن ساون کے موسم کی طرح پل پل رنگ بدلتا رہتا کبھی اس کے پیار کی مسلسل رم جھم سفینہ کا تن من بھگو ڈالتی تو کبھی بے نیازی کی تیز دھوپ اس کی روح تک کو جھلسا دیتی لیکن اس نے اپنی طرف سے کبھی کسی ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا تالاب میں ٹھہرے پانی کی طرح وہ بظاہر پرسکون سی پھرا کرتی۔

دو ہفتے بعد وہ کھاریاں چلے آئے کینٹ میں ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر ملا ہوا تھا وہ سارا دن گھر کو سجانے سنوارنے میں گزار دیتی بڑی محنت سے اس نے گلاب اور گل داؤدی کے پھول بنائے تھے اور اسے یہ ارینجمنٹ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

"یہ پھول کہاں سے آئے" حسن کی گھر آتے ہی ان پہ نظر پڑی تو پوچھ بیٹھا۔

"میں نے خود بنائے ہیں"

"اوہ! میں سمجھا شاید کسی پھیری والے سے خریدے ہوں گے تمہارے TASTE کو کیا ہوا ہے سفی"

"ہوتا کیا تھا ہمیشہ ہی سے ایسا ہے"
اس نے بظاہر لاپرواہی سے کہا حالانکہ حسن کے الفاظ نے اسے بڑی ٹھیس پہنچائی تھی وہ اب بھی ہر موقع پہ اسے ستانے سے باز نہیں آتا تھا۔

خدا جانے کیا بات تھی وہ اسے چھیڑے بنا رہ ہی نہیں سکتا تھا جب وہ غصے میں آ کے جلی کٹی سناتی تو حسن کا جی چاہتا وہ اسے اپنی پلکوں میں چھپا لے اس روپ میں وہ اسے ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگتی شادی کے بعد بھی وہ اپنی روش بدل نہیں پایا تھا لیکن یوں لگتا تھا سفی نے اس کی کسی بات کا نوٹس نہ لینے کا عہد کر رکھا ہے اور یہ صورتِ حال حسن کو جھنجلانے کے لئے کافی تھی۔

آخر یہ اسی طرح لڑتی جھگڑتی۔ ہنستی، کھلکھلاتی کیوں نہیں! یوں لگتا ہے جیسے زندگی کی ساری حسیات ختم ہو کے رہ گئی ہوں
ایک روز وہ ہاسپٹل جانے کے لئے تیار ہو کے ڈرائنگ روم میں آیا، تو میز ابھی خالی پڑی تھی پہلے ہی وہ لیٹ ہو رہا تھا کچن میں آیا تو وہاں بھی مکمل خاموشی تھی۔

"کبیرا" اس نے زور سے اردلی کو آواز دی۔
لیکن کسی طرف سے "جی سر" کی آواز نہ آئی۔
برآمدے میں آیا تو سفی سیڑھیوں پہ چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

"آج بھوک ہڑتال کا ارادہ ہے کیا؟"

"کیوں؟"

"حد ہو گئی ہے آٹھ بج چکے ہیں اور ابھی ناشتے کے کوئی آثار نہیں یہ کبیر صبح ہی صبح کہاں چلا گیا اور آپ کس لئے باہر بیٹھی ہوئی ہیں" حسن کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

"کبیر کو میں نے کسی کام سے مارکیٹ بھیجا ہے اور اُسی کے انتظار میں باہر بیٹھی ہوں"

"سفینہ! مجھے یہ لاپرواہی ہرگز پسند نہیں تم خود اگر ناشتہ بنا لیتی تو کوئی قیامت تو برپا نہ ہو جاتی"

حسن نے اُسی غصے میں کار نکالی اور بغیر کچھ کھائے پیئے چلا گیا۔

"ہوں... لاپرواہی پسند نہیں تو کرلی ہوتی کسی سگھڑ لڑکی سے شادی! میں نے التجا تو نہیں کی تھی" سفینہ اُلٹا اُسی پہ خیالوں میں خفا ہونے لگی۔

چند روز بعد موسم کی تبدیلی سے حسن کو ٹمپریچر ہو گیا اُس کی طبیعت کافی خراب تھی سفینہ اُن دنوں مما کا خط نہ آنے کی وجہ سے پریشان سی تھی کچھ حسن کی اُس دن والی تیز و تند گفتگو کے بعد وہ اور بھی محتاط ہو کے رہ گئی تھی اِسی ناراضگی میں اُس نے حسن کی خرابیٔ طبیعت کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔

گیسٹ روم میں گھسی سارا سارا دن کتابیں اور رسالے پڑھتی رہتی کبیر بے چارے پہ بیک وقت گھر کی ذمہ داری اور صاحب کی تیمارداری کا بوجھ آن پڑا تھا وہ بیگم صاحبہ کی اس لاپرواہی پہ کڑھتا رہتا۔

"سفی! آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

کتاب سے سر اٹھا کے سفینہ نے دیکھا حسن دروازے کے بیچ کھڑا ہوا تھا اُلجھے ہوئے بال، سرخ انگارہ سی آنکھیں اور چہرے پہ نقاہت کے آثار!

"کچھ نہیں" یہ ہمیشہ کی طرح مختصر سا جواب تھا۔

"تم... تم مجھے پاگل کرکے چھوڑو گی سفینہ! کبھی اپنے رویے کے بارے میں غور کیا ہے؟"

"میرا رویہ کیسا ہے میں خود نہیں جانتی"

"زیادہ بننے کی کوشش مت کرو تابندہ آنٹی نے کیا یہی تربیت دی ہے تمہیں؟"

"لڑکیاں ہمیشہ اپنے گھریلو ماحول سے متاثر ہوتی ہیں حسن! میں نے جب ایسا ماحول دیکھا ہی نہیں تو تربیت کیسے ہو سکتی ہے"

"یہی تو تمہاری بھول ہے بلال انکل کا چلے جانا کوئی ایسا انوکھا المیہ بھی نہیں ہے کہ تم اُس کے سوگ میں اپنا گھر بھی بھلا بیٹھو یوں لگو کہ تمہیں مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں جو بیوی تکلیف میں اپنے شوہر کا خیال نہیں رکھتی اُس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے"

"آپ جو کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی ہوگا"

"میں بھی زبردستی کا قائل نہیں چاہو تو اپنے لئے کوئی اور راہ منتخب کر سکتی ہو"

جانے کیسے یہ الفاظ حسن جمال کے لبوں سے ادا ہوئے اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے باہر چلا گیا۔

ایک تلخ سی مسکراہٹ سفینہ کے چہرے پہ پھیل کے معدوم ہو گئی۔

"بس یہی تمہاری اصلیت تھی حسن جمال! جب میری ماں اُس گھر میں آ کے سدا تنہائی کے دوزخ میں جلتی رہی تو اُسی گھر کا کوئی فرد مجھے کیسے خوشیاں دے سکتا ہے تم سب ایک ہی اہلیت رکھتے ہو خواہ وہ بلال احمد ہو یا حسن جمال۔"

وہ اَب بھی ویسی ہی پُرسکون تھی جیسے یہ ساری گفتگو، یہ طرزِ عمل اُس کے لئے نیا نہ ہو بڑے اطمینان سے اُس نے اپنے چند کپڑے اور ضروری چیزیں سمیٹیں اور ٹرین پہ سوار ہو گئی تابندہ اور گھر کے سارے افراد اُسے دیکھ کے حیران رہ گئے لیکن سفینہ نے کئی طرح کے بہانے بنا کے سب کو مطمئن کر دیا۔

ابھی اُسے یہاں آئے دو دن ہی ہوئے تھے عاشی سے ملنے گئی تو اُس نے دوپہر کے کھانے پہ زبردستی روک لیا سہ پہر ڈھلے واپس آئی تو گھر میں غیر معمولی سی ہلچل مچی ہوئی تھی وہ اپنے کمرے کی طرف آ گئی لیکن دروازے پہ ہی جیسے زمین نے اُس کے قدم جکڑ لیئے۔

صوفے پہ بھوری بیس سوٹ پہنے کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا تابندہ بیگم کے چہرے پہ بڑی شرمگیں سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور وہ نظریں جھکائے آہستہ آہستہ پیالی میں چمچ ہلا رہی تھیں

"مما" ایک گھٹی گھٹی سی آواز ہوا کے دوش پہ بکھر گئی دونوں نے چونک کے دیکھا اور تابندہ بڑی تیزی سے اُس کی طرف چلی آئیں۔

"سفی! آؤ دیکھو تو کون آیا ہے" اُن کی آواز خوشیوں کے بوجھ سے کانپ رہی تھی۔

"سفینہ! سفی بیٹے!" بلال احمد بڑی بے تابی سے بانہیں پھیلا کے اُس کی طرف بڑھے۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

یہ لمحے یہ ساعتیں بڑی حساس، بڑی کٹھن تھیں۔

وہ تحفظ اور محبت کے جس سائبان کے لئے ساری عمر ترستی رہی تھی وہ اُس کے سامنے تھا۔

لیکن انہیں گھڑیوں میں اُسے اپنا اور مما کا جلتی دھوپ میں جھلستے رہنا بھی یاد آ گیا۔

سدا کے محروم اور ترسے ہوئے دل کو اگر اچانک خوشی مل بھی جائے تو وہ اُسے چھوتے ہوئے ڈرتا ہے۔

اسی طرح سفینہ بھی اِس اجنبی سے شخص کی جو اس کا باپ تھا کج ادائیاں نہیں بھولی تھی۔

اس نے تابندہ بیگم کو چپ چاپ آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ طویل خنک راتوں میں انہیں بے تابی سے ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا باپ کی شفقت کے تمنائی دل کی پکاریں سنی تھیں۔

لوگوں کے کیسے کیسے طنز برداشت کئے تھے۔

پھر وہ اتنی جلدی کیسے سب کچھ بھول جاتی۔

اُس نے بڑی خالی خالی نظروں سے دیکھا بلال احمد کی باہیں ٹوٹی ہوئی شاخ کی مانند گر چکی تھیں اور وہ بڑے نادم، بڑے پشیمان سے کھڑے تھے ایک دم سکون کی ایک سرد سی لہر اُس کی جلتی ہوئی روح کو آسودگی بخش گئی اور وہ اُلٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔

"بڑی پاگل ہے سنی!" تابندہ خواہ مخواہ ہی شرمندہ ہوتے ہوئے بولیں۔

بعد میں سبھی نے اُسے سمجھایا تابندہ بیگم نے التجائیں کیں۔ لیکن وہ اپنے باپ سے اُس بے تکلفی اُس پیار کا مظاہرہ نہ کر سکی، جو اِس رشتے کا تقاضہ تھا۔

تابندہ یوں خوش تھیں جیسے انہیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو وہ سارا سارا دن بلال احمد کے آگے پیچھے پھرتی رہتیں کبھی کچن میں اُن کی پسند کے کھانے بنا رہی ہیں تو کبھی کمرے میں پھول سجا رہی ہیں بڑے عرصے بعد اُن کے لبوں پہ تبسم کی کلیاں چٹکی تھیں۔ اور آنکھوں میں حیا کے خمار آگیں ڈورے لہراتے تھے سفینہ کن انکھیوں سے اُن کی طرف دیکھتی رہتی۔

"واہ رے! یہ عورت ذات بھی کیسے کیسے رنگ بدلتی رہتی ہے کتنی جلدی خوش فہمیوں کے جال میں اسیر ہو جاتی ہے۔ وفا پرست صلیبیں، محض انہی کا مقدر رہتی ہیں سچی وفاؤں کا علم بلند کرتے ہوئے بڑے سکون سے صلیب پہ لٹک جائیں گی اب یہ مما ہیں اِن کو شوہر نے کیا دیا صرف چھ ماہ کا لگا بندھا ساتھ اور ایک بچی پھر پلٹ کے خبر تک نہ لی۔

کیسی کیسی اذیتیں انہوں نے اکیلے ہی سہیں لیکن اب پورے بیس سال بعد بلال احمد کو اپنے سامنے کیا پایا کہ آن کی آن میں سب کچھ بھول گئیں کیسے اِس عمر میں بھی اُن کے چہرے پہ ویسے ہی انوکھے اور لازوال رنگ اُتر آئے ہیں جیسے کوئی نو بیاہتا دُلہن ہو۔

ہوں... عورتوں کی ایسی ہی وفا شعاریوں بے دام کی غلامی اور پوجا نے مردوں کو اس حد تک آمر اور جابر بنا دیا ہے میں تو اپنی عزت نفس کا اتنا سستا سودا ہرگز بھی نہ کرتی۔"

اُس نے تلملاتے ہوئے کتنی ہی زہریلی سوچوں کا دھواں اپنے اندر اتار لیا

پھر سفینہ نے سنا کہ مما بلال احمد کے ساتھ سوئیڈن جا رہی ہیں ایک لمحے کو اُسے یوں لگا کہ دل کی دھڑکنیں بند ہو جائیں گی۔

آپ... آپ بڑے ہی سنگدل ہیں بلال احمد! مجھ سے میری آخری متاع بھی چھین لے جائیں گے۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گی اُس نے سوچا اور پھر خود ہی نفی کرتی رہی۔

"مما! میں نے جو کچھ سُنا کیا وہ سچ ہے"

"ہاں بیٹے! تمہارے پاپا کی یہی خواہش ہے"

وہ ہینگر پہ سے ساڑھی اتارتے ہوئے اپنی بیٹی سے نظریں چرا گئیں۔

"پاپا کی کیا بات ہے اب ثریا بیگم اِس دنیا میں نہیں رہیں تو اُس کی جگہ پُر کرنے کے لئے وہ آپ کو لے جا رہے ہیں کہ ہاؤس کیپر کی بھی ضرورت نہ رہے گی اور بگڑی ہوئی لڑکیوں کی تربیت بھی ہو جائے گی لیکن آپ سوچتی کیوں نہیں مما! کیا آپ کی غیرت یہ سب گوارا کر رہی ہے!"

"سنی! تمہیں اپنے پاپا کے لئے اتنی توہین آمیز سوچیں نہیں رکھنی چاہئیں۔"

تابندہ نے بڑے تند لہجے میں اُسے سرزنش کی۔

"لیکن مما..."

"کیا تمہیں اپنی ماں کی خوشی عزیز نہیں ہے میں نے ساری عمر تنہائی اور محرومی کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں برہنہ سر اور برہنہ پا گزاری ہے جیتے جی دوزخ میں جلی ہوں اب اگر دنیا ہی جنت کے دروازے مجھ پہ وا ہو رہے ہیں تو تم... تو تم... سنی..."

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

اِس سے آگے وہ رک گئیں لیکن سفینہ کو یوں لگا جیسے اس کی کنپٹیوں پہ گولی داغ دی گئی ہو اُسے اپنے اندر انتہائی کمزوری اور خالی پن کا احساس ہوا شاید زمانے بیت گئے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی تباہ شدہ سفینے کی آخری مسافر ہو وہ مستقبل سے نا اُمید مگر اس کی ماں پہ اُمید! ساری رات سفینہ نے کرب کے انگاروں پہ لوٹتے ہوئے گزار دی سب کچھ اُس کی نظروں کے سامنے گڈمڈ ہو رہا تھا۔

"تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنا سب کچھ کھو چکی ہو۔ مما کی بکراں محبت، پاپا کے تحفظ کی چادر۔

اور... اور حسن کا انوکھا نرالا پیار۔

اِن بیکار کی سوچوں اور طرزِ عمل نے تمہیں ذہنی مریضہ بنا ڈالا ہے اپنے وجود کو سب کے لئے قابلِ نفرت مت بناؤ سفی!!

سب کو مناؤ، پاپا کو مما کو اور حسن جمال کو کہ جھکنے میں ہی عظمت ہے۔ اپنی عزیز از جان مما سے اُن کی خوشیاں مت چھینو! پاپا کو تہی دامن مت لوٹاؤ۔

، وگرنہ تمہارے پاس کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔

اِن پراگندہ سوچوں میں نور کی کرنیں اُبھریں تو اِس الوہی روشنی میں وہ ہلکی پھلکی ہو کے سو گئی۔

اس کا پیغام پاتے ہی شام کو پریشان سا حسن لاہور چلا آیا وہ اُسے برآمدے میں ہی مل گئی۔

"خیریت تو ہے سفی!" وہ ساری لڑائی بھول چکا تھا۔

"وہ... میں... میں آپ کے بغیر اُداس ہو گئی تھی اور پھر پاپا سے بھی تو ملنا تھا آپ کو!"

انگلیوں کو مسلتے ہوئے اُس نے بمشکل کہا حسن نے اپنے حواس بحال کر کے غور سے اُس کی طرف دیکھا سفینہ پہلے سے بڑی مختلف لگ رہی تھی بہترین لباس میک اَپ۔ اور چہرے پہ پھیلے شفق کے سائے۔

"ہوں... تو یہ بات ہے،"

وہ تبسم کو لبوں میں دباتے ہوئے بولا۔

"کیا۔؟"

"ادھر آؤ بتاتا ہوں۔"

اُس نے اردگرد دیکھتے ہوئے سفینہ کو اپنے سے قریب کر لیا۔

"پلیز حسن!" وہ بے طرح گھبرا گئی۔

"اَب میں کچھ نہیں سنوں گا۔ تم نے مجھے پہلے ہی بے حد تڑپایا ہے بونگی لڑکی! محبت کے انداز بھی نہیں سمجھتیں!"

"سمجھ گئی... بس بس..." ہنستے ہوئے سفینہ نے حسن کو پرے دھکیل دیا اور خود اندر بھاگ گئی۔

اگلے روز سہ پہر کی فلائیٹ سے بلال احمد اور تابندہ کو سویڈن چلے جانا تھا ماں سے جدائی کی کسک کے باوجود اَب سفینہ خوش اور مطمئن تھی۔

ایئرپورٹ پہ اُس کی نگاہیں بار بار مما کی طرف اُٹھ رہی تھیں جو ہلکی سبز فرنچ شیفون کی ساڑھی میں بے طرح بج رہی تھیں بلال احمد کے چہرے پہ بھی سچی خوشیوں کا عکس تھا ان کے کشادہ سینے میں سمائی ہوئی سفینہ کو یوں لگا اُس کی ہستی کا ادھورا پن ختم ہو گیا ہو۔

پاپا کے قدم سے قدم ملا کے چلتی ہوئی مما کو بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اُس نے مضبوطی سے حسن جمال کا ہاتھ تھام لیا۔

اطلاع

بیرونِ ملک مقیم اُردو پڑھنے والوں کیلئے

پاکستان میں شائع ہونے والے ڈائجسٹ اور رسالے ہم سے منگوائیں:

سالانہ منگوائیں یا ششماہی:

پاکستان میں رہنے والے بھی اپنے احباب کو اُردو کے رسائل و کتابیں تحفہ میں دینے کیلئے ہم سے رابطہ قائم کریں:

تفصیلات اور پرچوں کی فہرست کیلئے لکھیں:

شفیع برادرز

پوسٹ بکس نمبر ۵۸۶، کراچی

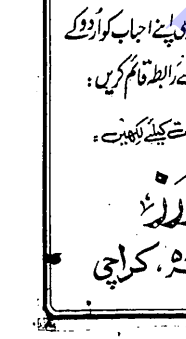

زخم بہاروں کے

طاہرہ سعید

آخری قسط

"اچھا بیٹے یہ بتاؤ یہ ٹائیگر تمہارا کوئی کام بھی کرتا ہے۔"

"جی ہاں ڈیڈی میں اسے کہتا ہوں رومال اٹھا کر لاؤ فوراً اٹھا لاتا ہے' میں کہتا ہوں جاؤ صنوبر کو بلا لاؤ تو اس کا دوپٹہ پکڑ کر کھینچ لاتا ہے۔"

"واہ واہ پھر تو میرے بیٹے کا کتا بڑے کام کا ہے۔ اسی لئے تو میں اپنے بیٹے کے لئے لایا ہوں۔" ارمان اسے چومتے ہوئے بولے۔

"اچھا اب گھر چلیں شام ہو گئی۔"

"چلیئے۔" رضوان ان کی انگلی پکڑ کر چلنے لگا۔

وہ دونوں جب گھر پہنچے تو نیلم انہیں باہر لان ہی میں مل گئی۔ رضوان اور ارمان کو دیکھ کر وہ جلدی سے ان کی طرف لپکی۔

"بھائی جان آج باجی بڑے غصے میں ہیں۔"

"کیوں؟" ارمان رضوان کو گود سے اتارتے ہوئے بولے۔

"بس کہہ رہی تھیں کہ آپ رضوان کو روز گھر سے باہر کیوں لے کر جاتے ہیں اور بے جا لاڈ پیار سے آپ نے اسے بگاڑ ڈالا ہے۔"

"اگر میں اسے ہر روز باہر گھمانے کے لئے لے کر جاتا ہوں تو حرج ہی کیا ہے۔" وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

نیلم بھی ارمان کے پیچھے جانا چاہتی تھی کہ سحر آ گئی۔

"کہاں جا رہی ہو نیلی؟"

"وہ بھائی جان آ گئے ہیں ان کا کھانا بھجوانے جا رہی ہوں۔"

"یہ اتنے سارے نوکر کس لئے ہیں مجھے تمہارا ایسے معمولی معمولی کام کرنا ہرگز پسند نہیں۔"

"مگر باجی اس میں برائی بھی کیا ہے؟"

"برائی ہو یا نہ ہو آئندہ تم ان کا کوئی کام نہیں کرو گی۔"

"ٹھیک ہے میں کوئی کام نہیں کروں گی بشرطیکہ آپ ان کے سب کام کیا کریں۔" نیلم شرارت سے بولی۔

"میں کیا کروں یا نہ کروں یہ میرا معاملہ ہے۔ مگر تم ہرگز کوئی کام نہیں کرو گی۔"

"آخر وہ تمہارے لگتے کیا ہیں۔" سحر جھنجلا کر بولی۔

"وہ میرے پیارے پیارے دولہا بھائی ہیں۔"

"نیلم۔" سحر بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہیں کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو جواد کے ہر کام کی نگرانی کیا کرو۔ وہ بے چارہ سارا سارا دن کاموں میں الجھا رہتا ہے۔"

"باجی آج تو آپ نے ان کے متعلق کہہ دیا آئندہ مت میرے سامنے ان کی کوئی بات کیجئے گا۔ ایسا ذلیل شخص میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔" نیلم نے تنفر سے جواب دیا۔

"نیلم ہوش میں رہ کر بات کرو وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔"

"جی ہاں ایسا لائق اور غیرت مند بھائی جس نے بہن کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر میں اپنی عزت کی حفاظت نہ کرتی تو نجانے آج کہاں ہوتی۔"

"وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہے نیلم۔ کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے کہ اسے معافی دلوا دوں تم سے۔"

"میں انہیں زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔ آپ نہیں جانتیں باجی مجھے کس کس طرح انہوں نے اذیتیں پہنچائی ہیں۔"

"اچھا صرف ایک بار اس سے مل تو لو۔"

"آپ ملنے کی بات کرتی ہیں میں ان کا نام سننا پسند نہیں کرتی۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے اب ان سے کس قدر نفرت ہے۔ میں اس جگہ رہنا ہی پسند نہیں کرتی جہاں وہ موجود ہو۔ یہ یہاں بھی صرف ارمان بھائی کی وجہ سے رہ رہی ہوں ورنہ جس دن جواد بھائی نے یہاں قدم رکھا تھا میں اسی دن چلی جاتی۔"

"مگر دیکھو نیلم میں نے بھی تو انہیں معاف کر دیا۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"آپ نے انہیں معاف کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ آپ ان کے گھناؤنے منصوبوں کے متعلق نہیں جانتیں۔ دشمن کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔"

"مگر وہ اب بہت بدل چکے ہیں نیلم۔ تمہیں غلط فہمی ہے ان کے متعلق۔"

"وہ کبھی نہیں بدل سکتے باجی، کبھی نہیں بدل سکتے۔ آپ اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ جواد بھائی اپنی روش چھوڑ چکے ہیں۔ اگر وہ بدلتے تو میں پہلی شخص ہوتی جو انکے سب گناہ بھول کر انہیں اپنی دعاؤں میں شامل کرتی اور دوبارہ اپنا پیار اپنے بھائی پر نچھاور کرتی۔" نیلم رونے لگی۔

"پگلی تم کیوں روتی ہو۔ تم صرف ایک بار اس سے مل لو۔ مجھے یقین ہے تمہارے سارے گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

"پلیز باجی! مجھے مجبور مت کریں۔"

"یہ رضوان کدھر گیا۔" سحر نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"اندر اپنے ڈیڈی کے پاس ہوگا۔" نیلم آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ایک تو یہ لڑکا نجانے کس طرف جا رہا ہے۔ ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ ہزار بار منع کیا ہے ادھر جانے کے متعلق نیلم تم انہیں بتا دینا کہ وہ رضوان سے نہ ملا کریں۔"

"باجی یہ تو ظلم والی بات ہے۔ بھائی جان رضوان سے اتنا شدید پیار کرتے ہیں کہ کوئی سگا باپ بھی نہیں کرتا ہوگا۔"

"مگر میں اسے پسند نہیں کرتی نیلم۔ ارمان اس طریقے سے میرے قریب نہیں آسکتے۔"

"اگر بھائی جان آپ سے مایوس ہو کر کسی اور جانب متوجہ ہوگئے تو آپ کیا کریں گی؟ آخر وہ انسان ہیں۔"

"وہ جو مرضی کرتے رہیں مجھے پرواہ نہیں۔"

"کچھ نہیں تو رضوان کا ہی خیال کریں۔ اُسے اب باپ کی شفقت اور محبت حاصل ہے۔ باپ کے وجود کے بغیر وہ احساس کمتری میں نہیں مبتلا ہو جائے گا۔ باجی آپ کو اب اپنے لئے نہیں بلکہ ارمان بھائی اور رضوان کے لئے جینا ہے۔"

"بس کرو نیلم۔ جاؤ مجھے تم تنہا چھوڑ دو۔" سحر کانپتے ہوئے دل کے ساتھ بولی۔

نیلم کی باتوں نے اس کے دل کو جھنجوڑ دیا تھا اور اس کے کانوں میں بار بار یہی فقرہ گونج رہا تھا۔

"اگر بھائی جان آپ سے مایوس ہو کر کسی اور جانب متوجہ ہوگئے تو آپ کیا کریں گی؟

آپ کیا کریں گی؟"

"اوہ خدایا میں کیا کروں؟"

سحر نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

سحر ہال کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اس کے پاس ہی دوسرے صوفے پر جواد بیٹھا تھا سحر بولی۔

"جواد بھائی۔ میں آپ کے نام سے بہت ڈرا کرتی تھی۔"

"تو اب ڈر نہیں لگتا۔؟" جواد نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں اب تو بالکل نہیں لگتا۔"

"ارے ہاں سحر ایک بات یاد آئی۔" جواد کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

"یہ نیلم آجکل نظر نہیں آتی۔ کہاں ہوتی ہے؟"

"یہیں ہوتی ہے، کیوں کچھ کام ہے؟"

"کام تو کوئی نہیں۔ بس ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے وہ تمہارے ہی پاس رہتی ہے نا؟"

"جی ہاں اسی محل میں رہتی ہے۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے ہی ساتھ والے کمروں میں رہتی ہے۔"

"نہیں۔ وہ ارمان صاحب کے رہائشی حصہ کی جانب رہتی ہے۔" سحر نے بتایا۔

"تو پھر وہ سب باتیں صحیح ہیں۔" جواد گردن ہلا کر بولا۔

"کونسی باتیں جواد بھائی؟" سحر نے بیتابی سے پوچھا۔

"وقت آنے پر بتاؤں گا۔"

"کیا وقت آنے پر بتاؤں گا ابھی بتایئے نا جواد بھائی؟"

"ابھی اتنا کہنا کافی ہے کہ تم نیلم کو آج ہی اپنے پاس بلا لو۔ میرا مطلب ہے اُسے رہنے کے لئے اپنے ہی قریب کمرہ دے دو۔"

"بہت اچھا۔ مگر جواد کوئی بات بھی تو ہو؟"

"اتنی بے صبری اچھی نہیں سحر۔ بس تمہارا فائدہ اسی میں ہے اور اتنا خیال رکھا کرو کہ وہ زیادہ سے زیادہ تمہارے پاس رہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا اب میں ذرا چلوں۔ منشی جی سے کچھ حساب کتاب لینا ہے۔"

اللہ خیر کرے۔ نجانے کیسی باتوں کے متعلق اپنا اندیشہ ظاہر کر رہے تھے۔ وہ کس وجہ سے چھپا گئے ہیں؟ وہ باتیں کس کے متعلق ہیں؟ نیلم کے متعلق یا ارمان کے متعلق —؟ خیر اب جواد بھائی ملیں گے تو پوچھوں گی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔ سب سے پہلے نیلم کو بلا کر اپنے کمروں کے پاس والے کمرے میں رہائش کے متعلق حکم سنایا۔

نیلم حیران سی رہ گئی۔

"مگر باجی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مجھے تقریباً سال ہوگیا ہے وہاں رہتے ہوئے۔ اب ایسی کیا بات ہوگئی۔ آپ سے جواد بھائی نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں انہیں کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس میں مناسب

Wadar Azeem
Pakistanipoint.com

نہیں سمجھتی کہ تم میری نظروں سے دور رہو۔ بس آج ہی ادھر آجاؤ۔"

"بہت بہتر۔" وہ کچھ سوچتی ہوئی وہاں سے چل دی۔

شام تک نیلم سحر کے ساتھ والے کمرے میں آگئی تھی۔ ارمان دو دن کے دورے کے بعد جب محل پہنچے تو انہیں نیلم کے کمرہ چھوڑنے پر بڑی حیرانی ہوئی اور انہوں نے اسی کے متعلق پوچھنے کے لئے نیلم کو بلا بھیجا۔

"کیا بات ہے نیلم۔ تم ادھر کیوں چلی گئیں؟"

"بس ویسے ہی بھائی جان۔"

"کیوں ادھر کوئی تکلیف تھی۔ اگر کسی تکلیف کی وجہ سے اُدھر گئی ہو تو مجھے بتا دیں۔"

"نہیں بھائی جان ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس ویسے ہی ادھر چلی گئی۔"

"میں نہیں مان سکتا۔ تمہیں میری قسم نیلم سچ سچ بات بتاؤ۔ کیا ہوا تھا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ بھائی جان بس انہوں نے حکم دیا کہ میں اُدھر آجاؤں۔"

"اور تم چلی گئیں۔ میرا تو انتظار کیا ہوتا۔ اتنی مدت بعد انہیں تمہیں قریب رکھنے کا کیسے شوق ہوا۔ اچھا اب تم جاؤ۔ بس اس سے بات کروں گا۔"

ارمان نے نیلم کو بھیج کر پہلے کپڑے بدلے اور پھر بستر پر لیٹ کر سوچنے لگے۔ ان کی سمجھ میں آرہا تھا کہ سحر نے یہ کیوں کیا۔ وہ آخر کیا چاہتی ہے۔

رات کو ارمان نے سحر کو اپنے کمرے میں ہی بلا بھیجا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپس میں جو بات بھی ہو جواد اور نیلم کے متعلق وہ دوسرے بھی سنیں۔ خلاف توقع سحر انہیں کے کمرے میں آگئی۔ ویسے ارمان کو بالکل ہی امید نہ تھی کہ سحر ان کے بلانے پر یوں چلی آئے گی۔

"کیا بات ہے؟" سحر نے آتے ہی دریافت کیا۔

"تشریف رکھیں۔" ارمان نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

"معاف کیجئے گا میں بیٹھوں گی نہیں۔ رضوان ابھی سویا نہیں۔"

"یہ آپ نے نیلم کو ادھر کیوں بلا لیا؟" وہ بغیر تمہید کے بولے۔

"آپ کو اعتراض ہے کوئی؟" سحر نے چبھتی ہوئی نظر ارمان پر ڈالی۔

"ظاہر ہے اعتراض ہے تبھی پوچھا ہے۔"

"اگر میں کہوں میری مرضی کی بات ہے تو؟"

"تو آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نیلم میری ملازم ہے اور مجھے کام کے سلسلے میں بار بار اسے بلانا پڑتا ہے۔"

"کام کے سلسلے میں یا......" سحر نے فقرہ وہیں چھوڑ دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ارمان نے پلٹ کر پوچھا۔

"مطلب آپ خود سمجھ سکتے ہیں نواب صاحب! بہتر ہے میری زبان نہ کھلے۔"

"نہیں تمہیں کھل کر صاف صاف بتانا ہوگا۔"

"میں کیا بتاؤں سارا زمانہ باتیں کر رہا ہے۔"

"میں زمانے کی نہیں تمہاری بات کر رہا ہوں۔ تم بتاؤ تم کیا سمجھتی ہو مجھے۔" ارمان کو غصہ آگیا۔

"ہونہہ۔ میں نے کیا سمجھنا ہے۔ ابھی تو میں دیکھ رہی ہوں کہ حالات کیا کیا رُخ بدل رہے ہیں۔"

"حالات نہیں بدل رہے بلکہ تم خود بدل گئی ہو۔ تم نے جواد کو ہر چیز کا کرتا دھرتا بنا کر اچھا نہیں کیا۔"

"اچھا کیا یا نہیں یہ مرضی کی بات ہے۔"

"تمہاری مرضی اس معاملے میں نہیں چل سکتی۔ قانونی طور پر میں ریاست کا مالک ہوں۔ میری شرافت دیکھو۔ ابھی تک میں نہیں بولا۔"

"بول کر آپ کیا کریں گے۔ وارث آپ نہیں میں ہوں میرا بیٹا ہے۔"

"ہاں وہی بیٹا جس کے دشمن کو تم نے سب کچھ سونپ دیا ہے۔"

"یہ آپ کو جواد کی فکر کیوں ہے اس لئے کہ وہ تمہاری ہر پل کی رپورٹ مجھے پہنچاتا ہے۔ شکر ہے مجھے پہلے ہی پتہ چل گیا ہے ورنہ نجانے یہاں کیا کچھ ہوتا۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔"

"منہ دکھانے کے قابل تو میں نہیں ہوں۔ میں شوہر ہو کر بھی تم سے کوئی اپنی بات نہیں منوا سکتا۔"

"بات تو میں آپ کی کبھی نہیں مانوں گی۔ ساری عمر حسرت ہی رہے گی۔"

"مگر میں یہ کھیل ہی ختم کر دوں گا۔ آج ہی تمہیں یہ فیصلہ

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کرنا ہوگا کہ جواد اس محل میں رہے گا یا میں رہوں گا۔"

"یہ دھمکی آپ کسے دے رہے ہیں؟" اندر سے سحر کا دل یہ سن کر دہل گیا تھا۔ "میں اُسے نہیں نکال سکتی۔"

"کیوں؟" ارمان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ اس کے بالکل نزدیک آ گئے۔ "سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمہارا کتنا خیر خواہ ہے تم اُسے نہیں نکالو گی۔"

"نہیں نکالوں گی۔"

"نہیں نکالو گی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"نہیں۔"

"ایک بار پھر کہو۔" وہ غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔

"نہیں۔"

"نہیں!" اس کے ساتھ ہی ارمان کا ہاتھ اٹھ گیا اور انہوں نے کئی طمانچے اس کے رخساروں پر دے مارے۔

"میں تمہیں ختم کر دوں گا۔ میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا۔ مگر تم نے میری چاہت میرے پیار کا یہ صلہ دیا۔" انہوں نے اُسے بازوؤں میں بری طرح جکڑا ہوا تھا سحر سکتہ کی صورت میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بالکل ہی ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ ارمان نجانے کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

"میں تمہیں یوں تباہ نہیں ہونے دوں گا میں کنارے پر کھڑا ہو کر تمہارے ڈوبنے کا تماشا نہیں دیکھ سکتا۔ تم میری بیوی ہو اور آج میں شوہر بن کر ہی تم سے بات کروں گا۔"

سحر کو ارمان کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا بے سدھ ہوتے ہوئے اس نے اتنا دیکھا تھا کہ وہ ارمان کے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی اور ارمان اس پر جھکا کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا اُسے کچھ پتہ نہ چلا۔ صدمے اور خوف سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

سحر کو جب ہوش آیا تو اس نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ ارمان کا بیڈ روم تھا۔ اسے سمجھ نہ آیا۔ کہ وہ ڈرائینگ روم سے بیڈ روم میں کیسے آ گئی۔ اس کا نائٹ گاؤن بھی ایک جانب کرسی پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں اُسے پہنا۔ اچانک اُسے تکیہ کے پاس ایک سفید رنگ کا کاغذ نظر آیا۔ اس نے جلدی سے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

میری جان!

سحر آج میں تم سے بہت دور جا رہا ہوں۔ میں صرف اسی امید اسی آس پر یہاں تھا کہ کبھی نہ کبھی میری سچی لگن اور محبت کا تم پر اثر ہوگا۔ مگر کئی سال کی لگاتار محنت کے باوجود آج تک تمہاری محبت حاصل نہ کر سکا۔ سحر میں جانتا ہوں۔ جواد نے تمہیں بدظن کرنے کے لئے شرمناک الزام مجھ پر عائد کیا ہے۔ مگر مجھے تمہاری اور رضوان کی قسم ہے کہ میں نے نیلم کو ہمیشہ اپنی بہن سمجھا ہے اور سمجھتا رہوں گا۔

سحر مجھے تمہاری قسم ہے کہ میں نے کبھی کسی لڑکی کی طرف غلط نظروں سے نہیں دیکھا۔ میں تمہارا ہوں اور ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔ مجھے معاف کر دینا کہ کل رات میرا ہاتھ تم پر اٹھ گیا۔

تمہیں تمہارے پیارے بیٹے کی قسم اپنے گناہگار کو معاف کر دینا اب میں کبھی تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا۔ صرف اتنا ضرور کہوں گا سحر تم اپنا اور رضوان کا خیال رکھنا۔ جواد سے محتاط رہنا۔ اس کے ارادے خطرناک ہیں۔ کاش میں تمہارے کسی کام آ سکتا۔ میری طرف سے رضوان کو ڈھیروں پیار، نیلم کو سلام۔

تمہارا گناہگار

ارمان

سحر یہ خط پڑھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ارمان کے متعلق اُسے یقین تھا کہ وہ کبھی اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ ارمان آج اسے تنہا چھوڑ گیا تھا — آج بھری دنیا اسے ویران لگ رہی تھی۔ در و دیوار بھی جیسے اُسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ سامنے ہی دیوار پر ارمان کی تصویر گولڈن فریم میں مسکرا رہی تھی۔

"ارمان یہ تم نے کیا کیا۔ تمہارے بغیر میں کچھ بھی نہیں میں آج اعتراف کرتی ہوں ارمان تمہارے بغیر میری زندگی سونی ہے۔ ارمان خدارا واپس چلے آؤ۔" وہ تصویر کے فریم سے سر ٹکائے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

ارمان کو گئے دس دن ہو چکے تھے۔ سحر نے کئی جگہ ارمان کا پتہ کروایا۔ مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ رضوان کی باپ

کے بغیر بُری حالت ہو چکی تھی۔ کئی دن بیمار رہنے کے بعد وہ بستر سے اٹھا تھا۔ سحر اُسے سوپ پلا رہی تھی کہ نیلم آ گئی۔

"آہا رضوان تو آج بڑا خوش نظر آ رہا ہے۔"

"پھوپھو جان ممی ہمیں لے کر جا رہی ہیں۔"

"کہاں؟"

"ڈیڈی کے پاس۔ میں اور میرا ٹائیگر جائیں گے۔" رضوان نے بڑی خوشی سے بتایا۔

"باجی کیا واقعی بھائی جان کا پتہ چل گیا ہے؟" نیلم نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں نیلی۔ ابھی کچھ پتہ نہیں چلا۔" سحر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"نہیں۔ نہیں ممی جھوٹ بولتی ہیں۔ ابھی ابھی کہہ رہی تھیں کہ اگر سوپ پیو گے تو تمہارے ڈیڈی کے پاس چھوڑ آؤں گی — مجھے ڈیڈی کے پاس جانا ہے۔" رضوان زور زور سے رو رہا تھا۔

"ہاں بیٹا لے چلوں گی۔ تم اللہ میاں سے دعا مانگو — وہ تمہارے ڈیڈی کو بھیج دیں گے۔" سحر کی آنکھیں برسنے لگیں۔

"باجی! آپ رو رہی ہیں۔" نیلم انہیں چپ کرانے لگی۔

"نیلم روؤں نہ تو کیا کروں۔ ارمان کی محبت کا احساس مجھے اس کے جانے کے بعد ہوا ہے۔ اس کے جانے سے دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ دماغ سوچ سوچ کر پاگل ہو چکا ہے کتنی زیادتیاں ہم نے اس کے ساتھ کیں۔ تنگ کیا۔ مگر وہ حرفِ شکایت کبھی لب پہ نہ لائے۔ ایک بار صرف ایک بار وہ ہمیں معاف کر دیں تو ہمیں سکون مل جائے گا۔"

"انشاءاللہ بھائی جان ضرور لوٹیں گے۔" نیلم نے انہیں تسلی دی۔ "آپ بے فکر رہیں۔ وہ ضرور واپس آئیں گے۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے نیلی۔ ایک طرف ہمیں ارمان کی پریشانی ہے۔ دوسری جانب جواد ہمیں تنگ کر رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں وہ۔" نیلم نے دریافت کیا۔

"بارہ لاکھ روپے کا بل منظور کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ آئے دن لوگ ان کی شکایتیں لے کر آتے ہیں۔ کل سیر سری یہی ذکر کیا تو صاف انکار کر دیا کہنے لگے۔ یہ مجھ پر میرے دشمن الزام لگا رہے ہیں۔"

"باجی بھائی جان نے آپ کو پہلے ہی روکا تھا۔ آپ نے خود ہی سارے اختیارات دیئے ہوئے ہیں۔ میں نے خود آپ کو بتایا تھا کہ جواد بھائی نہیں بدل سکتے۔"

"اور تو اور صنوبر اور شکیل مجھے بتا رہی تھیں۔ کہ شام ہوتے ہی آوارہ اور غنڈے قسم کے مرد کمرے میں جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں چاروں طرف سے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لی جاتی ہیں اور رات کے بارہ ایک بجے تک نجانے اندر کیا ہوتا رہتا ہے۔ اگلے دن صفائی کرنے والا بے شمار بوتلیں اور دوسری فضول قسم کی چیزیں اکٹھی کرتا ہے۔ تم ہی بتاؤ۔ نیلی ہماری اب کیا عزت ہے۔ آبا حضور کے ہوتے ہوئے کبھی ایسا کوئی کام نہیں ہوا۔ ارمان نے کبھی ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ اور نہ ہی ایسے آوارہ قسم کے لوگ کبھی اس محل میں آئے۔ ملازم تک باتیں کرتے ہیں کل جب میں نے انہیں بلایا اور انہیں کہا بھی — کہ جواد بھائی آپ ایسے لوگوں کا محل میں داخلہ بند کر دیں ورنہ میں انہیں ملازموں سے دھکے دے کر باہر نکلوا دوں گی — تو کہنے لگے۔ تم ویسے ہی فکر کرتی ہو۔ سحر ایسی کوئی بات نہیں۔ آج کے بعد کوئی ایسا شخص محل میں داخل نہیں ہو گا۔"

"مگر باجی آپ کو سختی سے کہنا چاہیئے۔ یہ آپکی عزت کا سوال ہے۔"

"میں سختی کس بِرتے پر کروں نیلی۔ ارمان کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ اور شیر ہو گیا ہے۔"

"مگر باجی گستاخی معاف۔ ارمان بھائی کو آپ سے کیا ملا سوائے آپ کی بے رخی اور نفرت کے۔ وہ یہاں کس لئے رہتے رضوان اور آپ کی وجہ سے کتنے پریشان رہتے تھے۔ ساری ساری رات ان کے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی تھی۔"

"بس کرو نیلی۔ مجھے اپنے گناہوں کا احساس ہے۔ مگر میں کیسے وہ دن واپس لاؤں۔ اس کے جانے کے بعد اب اس کی یاد ستا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے نیلی۔ اگر ارمان کو ہم نے جلد ہی نہ دیکھا تو سانس بند ہو جائے گی۔ تم نے رضوان کو دیکھا۔ چند ہی دن میں اس کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ مجھ سے اس کی حالت نہیں دیکھی جاتی۔ ہم دونوں اس کے لئے دن رات تڑپ رہے ہیں۔ نجانے وہ بھی ہمیں یاد کرتا ہو گا یا نہیں۔" سحر رونے لگی۔

"اب رونے سے کیا فائدہ باجی۔ بس اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ آپ دونوں کو جلد از جلد ملا دے۔ اگر ارمان بھائی واپس آ جائیں تو ان کی قدر کیجئے گا۔" نیلی یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی اور سحر بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

٭ ٭ ٭ ٭

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

رضوان لان میں ٹائیگر کے ساتھ گھاس پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اپنے آپ ہی باتیں کئے جا رہا تھا۔

"ٹائیگر۔ تمہیں پتہ ہے ڈیڈی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں ٹائیگر ڈیڈی کیوں چھوڑ گئے؟ ڈیڈی ہوتے تو وہی لے کر جاتے ٹائیگر تم ہمیں ڈیڈی کے پاس لے چلو — تم ہی انہیں ڈھونڈ لاؤ انہیں کہنا کہ رضوان کا دل بہت خراب ہو رہا ہے۔ میں تمہیں ڈھیر ساری رنگ برنگ کی چڑیا لا کر دوں گا۔ پھر ان سے تم کھیلا کرنا۔ میں تمہیں گاڑی بھی دے دوں گا۔ جب میرے ڈیڈی آئیں گے۔ اچھا چلو اٹھو ڈیڈی کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ اکیلے تمہیں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے — بولو —"

ٹائیگر جواباً کان ہلانے لگا۔

"چلو پھر میں بھی چلتا ہوں۔ ہم دونوں مل کر ڈیڈی کو ڈھونڈیں گے۔"

ٹائیگر رضوان سے آگے آگے گیٹ کی جانب چلنے لگا۔

"رضوان — رضوان کہاں جا رہے ہو؟" سحر اسے ڈھونڈتے ہوئے لان کی طرف آ نکلی تھی۔

"ممی ہم ڈیڈی کو تلاش کرنے جا رہے ہیں۔"

"نہیں بیٹے آپ نہیں جائیں گے۔ آؤ میرے ساتھ تمہارے ڈیڈی خود ہی آ جائیں گے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لانے لگی۔

"نہیں ڈیڈی خود نہیں آئیں گے میں انہیں لینے جاؤں گا۔"

"اور بیٹے اگر تمہیں کوئی پکڑ کر لے گیا تو —؟ چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔"

"اچھا تو ٹائیگر کو بھیج دیتا ہوں یہ ڈیڈی کو لے آئے گا۔ جاؤ ٹائیگر — ڈیڈی سے کہنا جلدی جلدی گھر واپس آ جائیں۔ میرا ان کے بغیر دل نہیں لگتا۔"

رضوان چھوٹے چھوٹے ہاتھ اس کے سر پر پھیرنے لگا۔

"اچھا جاؤ۔ مگر ڈیڈی کو ضرور اپنے ساتھ لے کر آنا۔"

ٹائیگر دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور رضوان بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔

"ممی یہ ٹائیگر کتنی دیر میں واپس آ جائے گا؟"

شام کو انتظار کرتے کرتے تنگ آ کر رضوان نے پوچھا۔

"بیٹے ابھی آنے ہی والا ہو گا۔" وہ سامنے تپائی پر رکھی ارمان کی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

"ممی ڈیڈی چلے کیوں گئے۔ آپ ان سے ناراض رہتی تھیں اس لئے؟"

"ہاں بیٹے۔ اسی لئے چلے گئے۔"

"ممی۔ ڈیڈی گئے کہاں ہیں؟ اللہ میاں کے پاس؟"

"نہیں بیٹے۔ خدا نہ کرے۔" سحر نے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔

"ممی جیسے ہم انہیں یاد کرتے ہیں ڈیڈی بھی ہمیں یاد کرتے ہوں گے۔"

"ہاں بیٹے۔"

"تو پھر وہ جلدی سے آ کیوں نہیں جاتے۔ اب وہ آئیں گے تو میں ان سے روٹھ جاؤں گا۔ میں ان سے نہیں بولوں گا — ڈیڈی گندے ہیں جو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔" وہ رونے لگا۔

"نہیں بیٹے وہ بہت اچھے ہیں وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ وہ دیکھو ٹائیگر آ گیا۔" سحر نے دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ٹائیگر اندر کی جانب آ رہا تھا۔ اس کے بال گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے پھرتا آیا تھا۔

"کیوں ٹائیگر ڈیڈی ملے؟" رضوان سحر کی گود سے اتر کر ٹائیگر کے پاس بیٹھ گیا۔ جواباً ٹائیگر نے سر جھکا لیا جیسے شرمندہ ہو کہ وہ اس کے ڈیڈی کو تلاش نہیں کر سکا تھا۔

"جاؤ صنوبر۔ اسے دودھ اور گوشت ڈالو۔ نجانے کہاں کہاں سے تلاش کرتا آیا ہے۔" سحر نے کہا تو صنوبر ٹائیگر کو لے کر باہر چلی گئی۔ اور سحر رضوان کو چپ کرانے لگی جو کہ پھر باپ کو یاد کر کے رونے لگا تھا۔

❖ ❖ ❖

ارمان کو گھر سے نکلے آج ایک ماہ سے زائد ہو چکا تھا۔ محل سے نکل کر وہ سیدھے ریسٹ ہاؤس پہنچے تھے جو کہ آج کل خالی پڑا ہوا تھا۔ اور ایک فرضی نام سے انہوں نے وہاں رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر بہت کم نکلا کرتے تھے اور اپنی گاڑی بھی انہوں نے گیراج میں بند کروا دی تھی۔ تنہا پڑے پڑے جب وہ اکتا جاتے تو رات کی تاریکی میں تھوڑی سی دیر کے لئے گاڑی لے کر باہر نکل جاتے۔

آج انہیں چند چیزیں خریدنی تھیں۔ ورنہ وہ اپنی اکثر و بیشتر چیزیں کسی نہ کسی ملازم سے منگوا لیا کرتے تھے۔ شام کے ٹائم انہوں نے گاڑی نکالی اور ایسے راستے کی جانب موڑ دی جہاں پر سحر یا محل کے کسی بھی فرد سے ملنے کا امکان نہ تھا۔ ایک غیر معروف سے بازار میں انہوں نے ایک اسٹور کے آگے

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

گاڑی کھڑی کی۔ اپنی مطلوبہ اشیاء خریدیں اور واپس چل پڑے۔ اس عرصے میں انہوں نے ٹائیگر کی جانب غور نہیں کیا تھا جو مسلسل بھونکتا ہوا ان کی گاڑی کا تعاقب کر رہا تھا۔ ارمان کی نظر ایک دو دفعہ بیک مرر پر پڑی بھی۔ انہیں کتا بھی نظر آیا کہ گاڑی کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ مگر وہ پہچان نہ سکے کہ ٹائیگر ہے وہ ریسٹ ہاؤس پہنچے، گاڑی سے اترے۔ ابھی کار کا دروازہ بھی بند نہ کیا تھا کہ وہی کتا جس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا ارمان کے قدموں میں گر کر ہانپنے لگا۔

"ارے ——— یہ تو ٹائیگر ہے ——— یہ کیسے آگیا ——— ٹائیگر ——— ٹائیگر ——— " انہوں نے ٹائیگر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اسے پچکارنے لگے۔ جواباً ٹائیگر ان کے پیروں پر اپنا منہ رگڑنے لگا۔

ارمان نے اس کے لیے دودھ اور گوشت منگوایا اور اس کے آگے رکھ دیا۔ ٹائیگر گوشت کھانے لگا۔ پھر دودھ پی کر اس نے زبان اپنے ہونٹوں پر پھیری اور ارمان کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

"اب کیا ارادہ ہے نواب صاحب۔ گھر چلیے؟"

"اچھا! اب تم گھر واپس جاؤ۔ رات ہونے والی ہے اور ہاں سنو رضوان کا خیال رکھنا۔ میرے بیٹے کو اداس مت ہونے دینا۔" ارمان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"شاباش اب بھاگ جاؤ۔" ارمان نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ٹائیگر نے ایک لمبی جست لگائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔

رات کے 9 بجے ٹائیگر جب محل پہنچا تو سحر رضوان کو سلا چکی تھی۔ سنبل نے جب ٹائیگر کو دروازے پر پنجے مارتے ہوئے دیکھا تو وہ اسے پچکارتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اس کے آگے دودھ اور گوشت رکھا اور دروازہ بند کرکے چلی گئی۔

صبح ہی جب رضوان جاگا تو سحر اسے لے کر لان میں چہل قدمی کرنے آگئی۔ ٹائیگر جو نجانے کب سے باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے رضوان کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا۔

"ٹائیگر تم پھر اکیلے آگئے۔ ڈیڈی کو کیوں نہیں لے کر آتے۔" رضوان سحر کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے پاس آگیا۔

"بس میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اب میں خود ڈیڈی کو ڈھونڈوں گا ہم دونوں مل کر ڈیڈی کو تلاش کریں گے تم میرے ساتھ چلو گے نا!" وہ ٹائیگر کو پیار کرنے لگا۔

سحر ان دونوں سے کافی فاصلے پر اپنی ہی سوچوں میں گم پھر رہی تھی۔ رضوان نے ایک نظر اپنی ماں کی جانب دیکھا پھر بڑے گیٹ کی جانب چلنے لگا۔ ٹائیگر ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ بڑے گیٹ کے پاس کافی دیر تک وہ دونوں ایک درخت کے پیچھے چھپے رہے رضوان کو پتہ تھا کہ چوکیدار اسے باہر نہیں جانے دے گا۔ چوکیدار تھوڑی سی دیر کے لئے گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کمرے میں گیا تو رضوان نے ادھر ادھر دیکھ کر باہر کی جانب دوڑ لگا دی ٹائیگر بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ نکلا۔

رضوان کو محل سے نکلے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا اس عرصہ میں وہ تھک کر چور چور ہو چکا تھا۔ ٹائیگر تھوڑے ہی فاصلے پر بنی ایک عمارت کی طرف منہ کرکے بھونکنے لگا۔

"تم مجھے بیٹھنے نہیں دو گے" وہ تنگ آکر اٹھ کھڑا ہوا ٹائیگر نے پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ کافی دیر چکر دار سڑک پہ چلنے کے بعد وہ اونچائی پر بنی اس عمارت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں ارمان ٹھہرا ہوا تھا دونوں جب وہاں پہنچے تو ایک آدمی باہر آرہا تھا ٹائیگر رضوان کو سیدھا ارمان کے کمرے کے پاس لے گیا۔ دروازہ بند تھا۔ ٹائیگر دروازے پر پنجے مارنے لگا۔

"بابا یہاں کون رہتا ہے؟" رضوان نے ایک بوڑھے آدمی سے پوچھا جو صحن میں رکھے گملوں کو پانی دے رہا تھا۔

"یہاں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں آج اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہیں۔"

"کب تک آئیں گے؟" رضوان نے پوچھا۔

"ابھی آنے ہی والے ہیں۔" مالی بابا کام چھوڑ کر ان کے پاس آگیا۔ "آپ ان کے کیا لگتے ہیں؟"

"میں ان کا بیٹا ہوں بابا۔ ان سے ملنے آیا ہوں۔"

"اچھا اچھا بیٹا کہاں سے آئے ہو؟" وہ رضوان سے پوچھنے لگا۔

"میں محل سے آیا ہوں۔ میرے ڈیڈی نواب ہیں۔ وہ ہمیں چھوڑ کر آگئے۔" رضوان معصومیت سے بتانے لگا۔ مالی اس کی باتوں پہ ہنس پڑا۔

"محل تو یہاں سے بہت دور ہے بیٹے اور نواب لوگ تو محل میں رہتے ہیں وہ بھلا یہاں کیوں آکر رہیں گے۔ یہاں تو صرف مسافر یا لوگ ٹھہرتے ہیں جاؤ بیٹا گھر جاؤ تمہاری ماں تمہیں تلاش کرتی ہو گی۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"نہیں میں ڈیڈی کے بغیر گھر نہیں جاؤں گا ممی بھی ڈیڈی کو تلاش کرتی ہیں میرا ڈیڈی کے بغیر دل نہیں لگتا"

"بیٹے میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہاں کوئی نواب نہیں آتا۔ نواب تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں"

"اچھا پھر میرے ڈیڈی یہاں بھی نہیں ملیں گے" وہ مایوس سا ہو کر بولا۔

"ہاں بیٹا اب تم گھر جاؤ وہ ضرور یہیں آجائیں گے"

"گھر چلو ٹائیگر ڈیڈی یہاں نہیں ہیں ممی پریشان ہو رہی ہوں گی" رضوان نے پیار سے اُسے تھپکا۔

وہ دونوں باہر نکل آئے اور سڑک کی ڈھلان پہ سنبھل سنبھل کر چلنے لگے کہ اچانک ٹائیگر بھونکتا ہوا ایک کھیت کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ رضوان اُسے زور زور سے پکارنے لگا۔

"ٹائیگر ٹائیگر واپس آؤ ٹائیگر"

مگر ٹائیگر بھاگتا ہوا کافی دور ایک آدمی کے پاس جا کر بھونکنے لگ گیا۔ رضوان پریشان سا ابھی تک وہیں کھڑا تھا اُس نے دیکھا ٹائیگر کسی کو ساتھ لیے اُس کی جانب آ رہا ہے وہ آدمی ٹائیگر کے ساتھ ساتھ تقریباً بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو رضوان نے پہچان لیا۔ یہ ارمان تھے۔

"ڈیڈی" وہ تیر کی طرح اُن کی طرف لپکا اور ارمان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"رضوان میرے بیٹے میرے چاند" ارمان نے اُسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا اور بے تحاشا اُس کا منہ چومنے لگے۔

"ڈیڈی آپ ہم سے ناراض ہو کر کیوں آگئے۔"

"میرے بیٹے تو یہاں کیسے آیا؟" ارمان نے پوچھا۔

"مجھے ٹائیگر لے کر آیا ہے۔ چل چل کر میری ٹانگیں دکھنے لگ گئیں۔"

"ڈیڈی گھر چلیے چلیں گے نا"

ارمان نے رضوان کے سوال پہ چونک کر اُسے دیکھا۔

"نہیں بیٹے میں نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے" وہ دُکھی سے ہو گئے۔

"ممی روتی ہیں میں انہیں کہتا تھا مجھے ڈیڈی کے پاس لے چلیں تو وہ رونے لگ جاتی تھیں وہ آپ کو یاد کر کے روتی تھیں نا ڈیڈی"

"نہیں بیٹے ہمیں یاد کر کے کس نے رونا ہے آپ بسکٹ کھائیے۔" ارمان نے اُس کا دھیان بٹانا چاہا۔

"ڈیڈی میرا آپ کے بغیر بالکل دل نہیں لگتا اگر آپ نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ میں آپ کے پاس ہی رہوں گا مجھے اپنے پاس رکھیں گے نا ڈیڈی" رضوان مچل گیا۔

"بیٹے دل تو میرا بھی نہیں لگتا مگر تمہاری ممی تمہارے بغیر اداس ہو جائیں گی"

"تو انہیں بھی یہاں لے آئیے ڈیڈی" وہ معصومیت سے بولا

"کیسے لے آئیں بیٹے وہ کبھی بھی یہاں نہیں آئیں گی۔"

"وہ آئیں گی ڈیڈی"

"اوہ سوئیٹ بیٹا ہمیں یاد ہی نہیں تھا بیٹا کہ آپ نے آنا ہے۔ ورنہ آپ کے لئے ہم ٹافیاں منگوا کر رکھتے" ارمان نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا "میں ابھی تمہیں ٹافیاں لے کر دوں گا" ارمان نے اُس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

"پہلے ڈیڈی آپ گھر چلیں میں ٹافیاں نہیں لوں گا میں نے ممی سے بھی کہا تھا کہ میں اب کچھ نہیں لوں گا۔ آپ صرف ڈیڈی کو ڈھونڈ لائیں۔"

"چلو بیٹے اب تمہیں گھر چھوڑ آؤں کافی دیر ہو گئی ہے تمہاری ممی پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"آپ بھی چلیں گے نا"

"ہاں ہاں میں بھی چلوں گا آؤ ٹائیگر" ارمان دونوں کو لے کر باہر آگئے۔ گاڑی نکالی اور شہر کی جانب چل پڑے۔

ارمان نے محل کے گیٹ سے کافی فاصلے پہ گاڑی روک لی

"جاؤ بیٹا"

"آپ بھی چلیئے نا"

"میں بیٹا آؤں گا ضرور مگر ابھی نہیں"

"پھر کب آئیں گے؟"

"بس جلد ہی آؤں گا"

"اگر آپ نہ آئے تو؟"

"تو میں اپنے بیٹے کو اپنے پاس بلا لوں گا" ارمان نے اُس کے گال پہ پیار کرتے ہوئے کہا۔

"بس اب تم جاؤ" "اچھا خدا حافظ"

"خدا حافظ" رضوان نے ننھا سا ہاتھ ہلایا۔

رضوان کافی دیر تک کھڑا ارمان کی کار کو جاتا دیکھتا رہا اور پھر جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ واپس مڑا لیکن ابھی مڑا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے گود میں اٹھا لیا رضوان کا دم گھٹنے لگا۔ نجانے کیسی دوائی بُو تھی کہ وہ تھوڑی ہی

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

دیر میں بالکل بے سُدھ ہو گیا اُس آدمی نے تھوڑی دُور درختوں میں چھپی ایک پرانی جیپ کو بستی کی جانب موڑ دیا ٹائیگر بھونکتے ہوئے گاڑی کا تعاقب کر رہا تھا اُس کی سانس پھول چکی تھی مگر وہ لگاتار گاڑی کے پیچھے بھاگتا رہا۔

آخر کار گاڑی ایک پرانی مگر مضبوط اور بہت بڑی عمارت کے سامنے جا کر رُک گئی برآمدے میں کھڑے تین آدمی بھاگ کر گاڑی کے پاس آ گئے انہوں نے رضوان کو اُٹھایا اور اندر لے گئے ٹائیگر چپ چاپ یہ کارروائی گیٹ کے پاس کھڑا دیکھتا رہا پھر وہ واپس مڑ گیا اور محل کی جانب دوڑ لگا دی۔

☆

محل میں رضوان کی غیر موجودگی کا علم ہی نہ ہو سکا ناشتہ پر سحر نے صنوبر سے کہا۔

"جاؤ رضوان کو بلا لاؤ۔"

کافی دیر بعد صنوبر واپس آئی تو اس نے آ کر بتایا کہ رضوان نہیں ملا۔

"کمرے میں دیکھا؟"

"جی ہاں۔"

"لان میں؟"

"صاحبزادی حضور کہیں بھی نہیں ہیں چھوٹے سرکار کو ہر جگہ تلاش کر آئی ہوں۔"

"اوہ میرے خدا وہ کہاں گیا۔" سحر بے چین ہو کر باہر کو بھاگی ذرا سی دیر میں سارے محل میں شور مچ گیا تھا رضوان کا واقعی کہیں پتہ نہ تھا۔

سحر کا رو رو کر بُرا حال تھا نیلم اُسے تسلیاں دے رہی تھی۔ جواد نے بھی دکھانے کے لئے کئی آدمی دوڑا دیئے مگر ساتھ ہی انہیں تاکید کر دی تھی کہ اگر رضوان کا پتہ چلے تو محل کی بجائے وہ اُسے اُس عمارت میں لے جائیں جو حال ہی میں اُس نے خریدی تھی وہ دکھاوے کے طور پر سحر کے پاس بیٹھا تھا۔ مگر دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ رضوان اُس کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جائے شام ہو چکی تھی مگر رضوان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

"ہائے میرا بیٹا نجانے کہاں ہے وہ تو کبھی اتنی دیر باہر نہیں رہا تھا میں اُسے کہاں تلاش کروں۔" رو رو کر سحر کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

"باجی خدا پر بھروسہ رکھیں وہ جہاں بھی ہوا میرے آدمی اُسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔" جواد نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اگر رضوان نہ ملا تو بھائی جان میں بے موت مر جاؤں گی۔ میرا بچہ مجھے لا دیجئے خدارا مجھے میرا بیٹا لا دیں۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"تم ویسے ہی دل چھوٹا کرتی ہو فکر مت کرو ہر صورت میں رضوان مل جائے گا۔" وہ پھر پولیس اسٹیشن فون کرنے لگا۔ سحر وضو کر کے اللہ کے حضور جھک گئی دعا مانگ کر جب وہ فارغ ہوئی تو جواد جا چکا تھا عشارات گہری ہوتی جا رہی تھی مگر سحر بے چین ہو کر باہر ٹہل رہی تھی اُس کی نظریں گیٹ کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ رات گئے تک جب رضوان کا کچھ پتہ نہ چلا تو سحر مارے صدمے کے بیہوش ہو گئی ڈاکٹروں ... کی مدد سے جب اُسے ہوش میں لایا گیا تو وہ ہوش میں آتے ہی چیخنے لگی۔

"رضوان۔ میرا بیٹا میرا لال کہاں ہے خدا کے لئے مجھے اُس کے پاس لے چلو وہ میرے بغیر کبھی سویا نہیں اور آج کی رات وہ کیسے سوئے گا۔ مجھے جانے دو میں اپنے بچے کو ڈھونڈ کر لاؤں گی۔"

سب اُسے تسلیاں دے رہے تھے مگر وہ روئے جا رہی تھی ڈاکٹر نے اُس کی حالت کے پیش نظر نیند کا انجکشن لگا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ پرسکون نیند سو رہی تھی۔

اگلی صبح نو بجے کے قریب جواد سحر کے کمرے میں آیا۔ سحر ابھی تک سو رہی تھی اور نیلم پاس ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔

"رضوان کا کچھ پتہ چلا؟" نیلم نے پوچھا۔

"ہاں! مگر وہ ہمیں اتنی جلدی نہیں مل سکتا۔" جواد مایوسی سے بولا۔

"کیا مطلب، وہ ہے کہاں؟"

"ابھی یہ نہیں پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے مگر جن لوگوں کے پاس ہے انہوں نے اُسے رہا کرنے کی شرط رکھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ کہتے ہیں کہ اگر رضوان کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو ۱۲ لاکھ روپے دینے پڑیں گے۔"

"۱۲ لاکھ روپیہ اتنی بڑی رقم!" نیلم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "یہ تو بلیک میل ہوا ہمیں پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیئے۔"

"پولیس کو اطلاع دیں گے تو وہ لوگ اُسے جان سے مار ڈالیں گے۔ ہمیں خاموشی سے اُن کا مطالبہ پورا کرنا ہوگا۔"

"مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے وہ رضوان کو واقعی چھوڑ

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

دیں گے؟"

"ہمیں اس بات کا رسک لینا ہی پڑے گا۔" جواد سحر کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے۔؟"

"ویسی ہی ہے ابھی تو جاگی نہیں بس جاگنے ہی والی ہیں۔"

نیلم نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ سحر نے آنکھیں کھول دیں اس نے گردن گھما کر اردگرد دیکھا۔ پھر پوچھا۔

"میرا بیٹا آ گیا۔؟"

"وہ آنے ہی والا ہے باجی۔" جواد آگے بڑھ کر بولے۔ وہ ابھی آجائے گا۔"

"اسے لے آیئے جواد بھائی خدارا اسے جلدی لے آیئے۔ میرا اس کے بغیر یہاں دم گھٹ رہا ہے۔" وہ بیڈ پر۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"رضوان کے یہاں آنے کی ایک شرط ہے۔" جواد ذرا رک کر بولے۔

"کیا؟" سحر نے بے چینی سے پوچھا۔

"جو لوگ رضوان کو لے کر گئے ہیں وہ رضوان کی قیمت بارہ لاکھ بتاتے ہیں۔"

"میں رضوان کے لئے بارہ لاکھ تو کیا ۲۰ لاکھ دینے کو تیار ہوں مگر میرا بیٹا مجھے لا دو۔"

سحر جواد کو جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔

"جلدی کریں جواد بھائی اسے جلدی جا کر لے آئیں۔"

"اتنی جلدی نہیں سحر ہمیں رات آٹھ بجے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ انہوں نے آٹھ بجے کا ٹائم دیا ہے۔"

"مگر یہ اتنا بڑا دن اس کے بغیر کیسے گزاروں گی میرے بیٹے نے نجانے رات کھانا کھایا بھی ہوگا یا نہیں میں کیا کروں کہاں جاؤں۔"

"آپ پریشان مت ہوں باجی بس اللہ سے دعا کیجئے وہ جلد از جلد رضوان کو واپس گھر بھیج دے۔" نیلم اسے تسلیاں دینے لگی مگر ماں کی ممتا کو کہیں بھی چین نہ تھا۔

"خدا خدا کر کے رات کے آٹھ بجے تو جواد وہ بریف کیس اٹھا کر جس میں بارہ لاکھ روپے کے نوٹ تھے جانے کو تیار ہوا سحر بھی ساتھ جانے کی ضد کرنے لگی۔

"میں ضرور جاؤں گی مجھے بھی ساتھ لے چلیئے۔"

اور نجانے کیا سوچ کر جواد نے اسے بھی ساتھ بٹھا لیا گاڑی محل سے باہر نکلی اور شہر سے باہر جانے والی سڑک پر تیزی سے بھاگنے لگی جتنی تیزی سے گاڑی بھاگ رہی تھی اس سے زیادہ تیزی سے سحر کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ رضوان جلد سے جلد اسے مل جائے ایک گھنٹہ سے زیادہ فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک وہ جگہ نہیں آئی تھی جہاں رقم دے کر رضوان کو حاصل کرنا تھا سحر اب خاموش نہ رہ سکی اور بول اٹھی۔

"جواد بھائی ابھی اور کتنی دور جانا ہے؟"

"بس تھوڑی سی دیر کی بات ہے۔ جواد نے گاڑی گھنے جنگل کی طرف موڑ دی فضا میں جھینگروں اور جنگلی جانوروں کے بولنے کی آوازیں گونج رہی تھیں سحر خوف زدہ سی بیٹھی تھی۔ اگر رضوان کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی بھی ادھر کا رخ نہ کرتی گھپ اندھیرے میں صرف کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وہ غور سے دیکھتی تھی۔ مگر اس جنگل میں دور دور تک کسی عمارت کا نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی سحر نے چونک کر دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر ایک اور کالے رنگ کی گاڑی کھڑی تھی۔

جواد نیچے اترا اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا تو اچانک نجانے کہاں سے دو نقاب پوش نکل آئے۔

"رقم لائے ہو؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"ہاں!" جواد نے بریف کیس دکھاتے ہوئے جواب دیا۔

"کتنی؟"

"بارہ لاکھ۔ جتنی مانگی گئی تھی۔"

"مگر یہ رقم کم ہے۔"

"تم لوگوں نے اتنی ہی رقم کے لئے لکھا تھا۔"

"ہاں مگر یہ بچے کی زندگی کی ضمانت ہے۔"

"مگر یہ بے ایمانی ہے جتنی آپ لوگوں نے رقم مانگی اتنی ہی دی جا رہی ہے۔" جواد نے احتجاج کیا۔

"بے ایمانی۔ ناانصافی ایک شہزادے کی قیمت صرف بارہ لاکھ ہا ہا ہا۔" نقاب پوش کا قہقہہ جنگل میں گونج اٹھا۔

"اگر تم رضوان کی زندگی چاہتے ہو تو یہ رقم فوراً ہمارے حوالے کرو ورنہ اسے ابھی اور اسی وقت تمہارے سامنے گولی مار دی جائے گی۔" یہ کہہ کر نقاب پوش نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا دوسرے ہی لمحے ایک اور نقاب پوش رضوان کو لے کر گاڑی سے اترا رضوان کے دونوں ہاتھ پشت پر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے منہ جگہ جگہ سے سوجا ہوا تھا جیسے کسی نے بے دردی سے مارا ہو۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"رضوان میرے بچے!" سحر تڑپ کر گاڑی سے اُتری اور رضوان کی جانب لپکی۔

"امی۔" رضوان نے آگے بڑھنا چاہا مگر نقاب پوش کی آواز پر رک گیا۔

"بتاؤ اِس کی قیمت ۲۰ لاکھ روپیہ مزید ہے اگر سودا منظور نہیں تو ابھی اور اِسی وقت اِس کی لاش نظر آئے گی۔"

"نہیں نہیں جواد تم یہ رقم دے دو میں بیس لاکھ اور دے دوں گی مگر خدا کے لئے میرے بچے کو مت مارنا یہ مرگیا تو میں بے موت مر جاؤں گی۔ خدا کے لئے اِسے مت مارنا۔" سحر ہاتھ باندھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی "مجھے ایک بار اسے گلے سے لگا لینے دو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

"نہیں کل اسی ٹائم باقی رقم مل جائے گی تو تمہارا بیٹا تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔ اگر تم لوگوں نے چالاکی سے کام لینے کی کوشش کی تو تمہارے بیٹے کی لاش تمہارا استقبال کرے گی۔" نقاب پوش نے بریف کیس جواد سے لے لیا اور رضوان کو گاڑی کی طرف لے جانے لگے تو وہ چلانے لگا۔

"نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا ممی مجھے بچاؤ یہ لوگ مجھے مارتے ہیں مجھے چھوڑ دو ممی ممی" سحر تڑپ کر آگے بڑھی مگر جواد نے راستہ روک لیا۔

"باجی آپ مت آگے جائیں ہو سکتا ہے وہ لوگ رضوان کو کوئی نقصان پہنچا دیں ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ آیئے واپس چلیں کل آپ کا بیٹا ضرور آپ کو مل جائے گا۔"

سحر بھیگی آنکھوں سے گاڑی کو جاتے دیکھتی رہی جس میں سے رضوان زور زور سے اُسے پکار رہا تھا۔

"ممی مجھے بچایئے ممی مجھے اپنے ساتھ لے چلیئے ورنہ یہ لوگ مجھے مار دیں گے ممی ممی۔" اُس کے کانوں میں ابھی تک رضوان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

"چلیئے باجی!" جواد نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور گاڑی میں بٹھا دیا سحر کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا جواد نے اُس کی حالت دیکھ کر گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی وہ گاڑی کو فل اسپیڈ سے دوڑاتا ہوا جب محل واپس پہنچا تو نیلم اور بہت سے دوسرے لوگ باہر کھڑے ہوئے تھے جواد نے گاڑی روک کر دروازہ کھولا نیلم بھاگ کر قریب آگئی

"رضوان میاں آگئے؟"

"نہیں جلدی کرو پہلے باجی کو باہر نکالو۔" جواد سہارا دے کر سحر کو باہر نکالنے لگا۔

"کیا ہوا باجی کو؟"

"بے ہوش ہو گئی ہیں۔"

چند ہی لمحوں میں اُسے خوابگاہ میں پہنچا دیا گیا ڈاکٹر سحر کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

☆

اگلے دِن صبح دس بجے خیام ہوٹل میں جواد موجود تھا اُس کے تمام دوست بھی موجود تھے "اور آج تمہارے لئے شام خیام ہوٹل میں شاندار سی چائے اور مس روزی کا ڈانس رات بھر پہلی کامیابی کی خوشی میں تم میں سے ہر ایک کو چالیس چالیس ہزار روپیہ انعام کے طور پر۔" جواد نے اعلان کیا۔

"ہپ ہپ ہرے" تمام نے تالیاں بجائیں۔ "باس زندہ باد۔"

"میں شوکت اور انور کی اداکاری سے بہت خوش ہوں جو کل انہوں نے دکھائی ہا ہا ہا۔ سحر کو علم تک نہ ہو سکا کہ اُس کے ساتھ کوئی چال چلی جا رہی ہے۔"

"استاد وہ کہیں پولیس سے مدد نہ لے۔" شوکت نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"نہیں میں نے اُس کے دل میں خوف ہی اتنا بٹھا دیا ہے کہ اگر ہم نے پولیس سے مدد لی۔ تو رضوان قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ کل آئی جی پولیس بھی آیا تھا مگر سحر نے اُسے جواب دے دیا اور کہا کہ۔

"آپ لوگ اِس معاملہ میں بالکل الگ تھلگ رہیں میں خود ہر کام بہتر طور پر سمجھ سکتی ہوں" اُس نے سحر کو بڑا سمجھانے کی کوشش کی مگر ہر بار سختی سے یہی کہتی

"آپ کا بہت بہت شکریہ جب آپ کی ضرورت ہوئی تو آپ کو بلا لیا جائے گا۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے باس۔ ورنہ بڑی دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔"

انور بولا

"دشواریاں ہمیں دیکھ کر خود ہی بھاگ جاتی ہیں انور کس کی مجال ہے جو جواد کے سامنے کھڑا ہو سکے۔" جواد سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"استاد نواب صاحب کا پتہ چلا۔"

"نہیں! وہ کانٹا ہمیں نکالنا پڑتا مگر وہ خود بخود ہی نکل گیا۔ اُن کی موجودگی میں ہمارا کام مشکل ہو جاتا۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"مشکل میں پھر بھی حل کر لیتا رضوان سے پہلے ارمان ہمارا نشانہ بنتا بعد میں ہم رضوان کو پکڑ لیتے۔"

"باس۔ آج رات؟ . بات جواد نے کاٹ دی

"ہاں آج رات پھر تم چاروں ہی جاؤ گے۔ رضوان کو ساتھ لے کر مگر سنو جونہی بیس لاکھ روپیہ میں تمہیں دوں تو تم روپے لیتے ہی رضوان کو آگے کر دو گے رضوان جونہی سحر کی طرف آگے بڑھے گا۔ تو انور کی گولی رضوان کو ختم کر دے گی ہاہاہا میرے انتقام کا پہلا حصّہ ختم ہو جائے گا۔ سحر بھی کیا یاد کرے گی کہ کس سے پالا پڑا ہے

"سمجھ گئے تم لوگ"

"یس باس!" سب یک زبان ہو کر بولے۔

"رضوان کی نگرانی کون کر رہا ہے" اُس نے پوچھا۔

"سردار اور حیات ہیں" شوکت نے بتایا۔

"اچھا انہیں کہہ دیا تھا کہ بہت ہوشیار رہ کر اُس کی نگرانی کریں"

"آپ فکر مت کریں باس سب کچھ ٹھیک ہے۔"

جواد نیا جام بنانے لگا۔

اِدھر یہ لوگ باتیں کر رہے تھے اُدھر اپنے آفس میں خیام ہوٹل کا مالک ٹیپ سُن رہا تھا جس میں جواد اور اُس کے ساتھیوں کی گفتگو تھی ٹیپ سُن کر وہ پریشان سا ہو گیا بیل بجا کر اُس نے چپڑاسی کو بلایا۔

"سُنو آفس کے قریب کسی کو مت آنے دینا" یہ کہہ کر وہ مینجر کو فون کرنے لگا مینجر آیا تو اس نے کہا۔

"مینجر میں ذرا باہر جا رہا ہوں ارمان صاحب کے پاس تمہیں تو پتہ ہی ہے ریسٹ ہاؤس کا شاید کچھ دیر لگ جائے تم ایسا کرو آج شام تک ٹیپ ہونے والی بات چیت سُننا اگر کوئی ضروری بات ہو تو فون پہ اطلاع دے دینا۔"

"یس سر" مینجر نے مؤدبانہ کہا۔ آپ بے فکر رہیں۔

"خدا حافظ"

"خدا حافظ!" وہ باہر نکلا گاڑی اسٹارٹ کی اور چند ہی لمحوں بعد وہ ریسٹ ہاؤس کی جانب جا رہا تھا۔ وہ جس وقت ریسٹ ہاؤس

پہنچا تو ارمان اپنے کمرے میں بیٹھا ٹائیگر کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ مگر ٹائیگر زور زور سے چیخ رہا تھا وہ ارمان کے کپڑے بار بار پکڑ کر کھینچتا دروازے کی طرف بھاگتا پھر واپس آ جاتا۔

"آؤ آؤ منیر میں صبح سے پریشان ہوں"

"کیوں کیا بات ہے؟" منیر نے پوچھا۔

"ایک تو رضوان گم ہو چکا ہے دوسرے صبح سے ٹائیگر نے تنگ کر رکھا ہے۔ نجانے کیا کہتا ہے بہت دیر سے سر کھا رہا ہے"

"رضوان کا تو مجھے بھی پتہ ہے" وہ افسوس سے بولا بے چارہ معصوم نجانے کہاں ہو گا۔"

"تم سناؤ کیسے آئے؟"

"میں ایک بڑی خبر لے کر آیا ہوں"

"کیا مطلب؟"

"رضوان جواد اور اُس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ چکا ہے صاحبزادی حضور بلیک میل کا شکار ہو کر بارہ لاکھ دے چکی ہیں اور بیس لاکھ آج دیا جائے گا"

"میں جواد کا خون پی جاؤں گا" ارمان کا منہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔

"خون پینے سے فی الحال کچھ نہیں ہو گا۔ تم پہلے رضوان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرو"

"میں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی ہے یقین کرو دو دن سے میں نے ایک لقمہ تک نہیں کھایا کہ نجانے رضوان کو کھانا ملا بھی ہو گا یا نہیں مجھ پر اُس وقت تک کھانا حرام ہے جب تک اپنے بیٹے کو ڈھونڈ نہیں لیتا۔"

"لو تم پہلے ٹیپ سنو" منیر نے پلگ لگاتے ہوئے کہا۔

"اب کیا کریں منیر۔ آج رات میں سحر کا پیچھا کروں گا" انہوں نے ٹیپ سُن کر کہا۔

"لیکن ہو سکتا ہے وہاں لوگوں کی تعداد زیادہ ہو" منیر کچھ سوچ کر بولا۔

"میں اپنے ساتھ پولیس اور فوج کے کچھ لوگ لے کر جاؤں گا میں رضوان کو مرنے نہیں دوں گا۔ منیر رضوان زندہ رہے گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" منیر بولا۔

"چلو پھر چل کر کچھ انتظام کریں" ارمان منیر کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں باہر آ گئے گاڑی اسٹارٹ کی تو ٹائیگر چھلانگ مار کر گاڑی میں آ گیا۔

"چلو دوست تم بھی اگر جانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے"

منیر گاڑی چلا رہا تھا ارمان کا ذہن اِس وقت کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو ارمان" منیر نے اُسے سوچتے دیکھ کر پوچھا

"کچھ نہیں یہی پریشانی ستا رہی ہے کہ رضوان کو کوئی نقصان نہ پہنچے"

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"اللہ کرے وہ ٹھیک ٹھاک ہو بڑا پیارا بچہ ہے میں نے اسے تمہاری سالگرہ کے موقع پر دیکھا تھا مگر اب ہمیں تمام کام بڑی ہوشیاری سے کرنا ہے اگر ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو گئی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"ہاں یہی میں سوچ رہا ہوں" ارمان نے جواب دیا۔

☆

شام کو سحر نے دُعا مانگ کر جواد سے اپنے کمرے میں آنے کے متعلق کہلوایا مگر نوکر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگیا۔

"جی وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"

"کہاں ہیں پھر؟"

"کہیں باہر گئے ہیں" نوکر نے ادب سے جواب دیا۔

"کتنی دیر ہوئی؟"

"انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا" صبح سے ہی گئے ہوئے ہیں۔"

"اچھا تم جاؤ" سحر پریشانی سے ٹہلنے لگی نجانے جواد بھائی کہاں چلے گئے۔ انہیں ہماری پریشانی کا ذرا احساس نہیں وہ جانتے ہیں کہ ہم کتنے پریشان ہیں۔۔۔ کاش اس وقت ارمان ہمارے پاس ہوتے اُن کے جاتے ہی ہمیں کتنی بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کوئی ہمیں تسلی دینے والا نہیں سحر کے تصور میں ارمان کا چہرہ ابھرا اور وہ سسک پڑی۔

"یہ اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے کمرے میں" نیلم نے کمرے میں داخل ہو کر لائٹ جلاتے ہوئے کہا۔ لائٹ جلا کر سامنے دیکھا سحر اپنے بیڈ پر اوندھی لیٹی سسک رہی تھی۔

"باجی۔۔۔ باجی آپ یوں رو رو کر پاگل ہو جائیں گی" نیلم سحر کو چپ کرانے لگی۔ "انشاء اللہ آج رضوان ضرور مل جائے گا۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے نیلم میرا بیٹا مجھے مل جائے اگر وہ آج بھی نہ ملا تو میں مر جاؤں گی۔ نیلی میں رضوان کے بغیر مر جاؤں گی" "ایسا مت کہیئے باجی حضور مجھے نجانے کیوں یقین ہے کہ آج رضوان ضرور مل جائے گا۔ اُٹھیئے منہ ہاتھ دھو لیجئے نو بجنے والے ہیں۔"

"اوہ۔ ٹائم کا پتہ ہی نہ چلا یہ جواد بھائی کہاں ہیں۔"

"مجھے تو علم نہیں کہاں ہیں صبح سے کہیں گئے ہیں" نیلم نے بے زاری سے جواب دیا۔

"میں حاضر ہوں جناب" دونوں نے بیک وقت دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں جواد کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"چلئے گاڑی تیار ہے"

"نیلم ذرا منشی جی سے کہو بریف کیس دے جائے" سحر اُٹھتے ہوئے بولی۔

"جی اچھا" نیلم باہر چلی گئی تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ جواد نے آگے بڑھ کر وہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

"روپے پورے ہیں" جواد نے سحر سے پوچھا۔

"جی ہاں! مگر آپ تو یوں پوچھ رہے ہیں جیسے روپے آپ نے لینے ہیں" نیلم نے نفرت سے جواد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کرو میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں" جواد نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا وہ نیلم کے جواب پر سُن ہو کر رہ گیا تھا

"تم دونوں آپس میں کیوں لڑتے ہو۔ میرے لئے اس رقم کی کوئی وقعت نہیں۔ دعا کرو میرا بیٹا مجھے مل جائے۔ آؤ جواد" سحر نے جواد سے کہا۔

"تم سے میں بعد میں بات کروں گا" جواد سحر کے پیچھے ہی باہر نکل گیا سحر اور جواد پھر اسی جنگل میں پہنچ گئے چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔ مختلف جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

کار رک گئی سامنے وہی مخصوص کالے رنگ کی گاڑی کھڑی تھی چار نقاب پوشوں نے رضوان کو پکڑا ہوا تھا وہ ذرا فاصلے پر کھڑے تھے اُن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

"ہوں۔ تم لوگ آگئے" ایک نقاب پوش جو اُن کا سردار لگتا تھا آگے بڑھا اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

"جی ہاں" جواد ذرا آگے بڑھا۔

"رقم لے آئے؟" ذرا کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔ جواب میں جواد نے بریف کیس آگے بڑھا دیا۔

"رقم پوری ہے کسی قسم کا دھوکا تو نہیں" دوبارہ پھر وہی آواز اُبھری۔

"رقم گن لو تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا" جواد مسکرا کر بولا۔ اور ساتھ ہی انور کو آنکھ کا اشارہ کر دیا۔

انور نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا پھر پستول کو جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"مگر باس میرا ریوالور خالی ہے"

"انور" جواد اپنا پول کھل جانے پر چیخ پڑا۔

"نمک حرام میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا" جواد نے جلدی سے ریوالور جیب سے نکالنا چاہا پہلے میں ورا اس نے

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

کا قصہ پاک کردوں۔"

"جواد بھائی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" سحر جواد کے قدموں سے لپٹ گئی "خدا کے لئے میرا بیٹا مجھے دے دو۔"

"کس کا بھائی اور کونسا بھائی۔" جواد نے قدموں سے چمٹی سحر کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری ریاست میں صرف اور صرف انتقام لینے کیلئے آیا تھا۔ آج میرے انتقام کا دن ہے آج میں تیرے بیٹے کے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھاؤں گا میں تجھے ختم نہیں کروں گا تاکہ تو سسک سسک کر خود ہی دم توڑ دے۔"

"خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔" سحر دونوں ہاتھ جوڑے جواد کے راستے میں حائل ہو گئی۔

"ہا ہا ہا۔ رحم کس بلا کا نام ہے یہ میں نہیں جانتا آگے سے ہٹ جاؤ۔" جواد نے بھرپور تھپڑ سحر کے رخسار پر دے مارا اور سحر انور کے قدموں میں جا گری۔

"خدا کے لئے ابھی سحر نے لفظ ادا نہ کئے تھے کہ ایک فائر کا دھماکہ ہوا اور سحر تڑپ کر چیخ اٹھی میرا بیٹا۔"

گولی جواد کی ٹانگ میں لگی تھی اور وہ چیخ پڑا تھا۔

"انور......

"یس باس...... ابھی تو آغاز ہے استاد پہلے میں انتقام لوں گا۔ انتقام تجھ سے اپنی بہن کا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر فائر کیا۔ دوسری گولی اس کے شانے میں لگی جواد بازو پکڑے پکڑے اوندھا ہو گیا۔

"یہ دوسری گولی ثمینہ کے دوپٹہ اتارنے کی سزا ہے تم نے اپنے ان ناپاک ہاتھوں سے اس کا دوپٹہ اتارا تھا۔"

"تو کیا تم...... تم ثمینہ کے بھائی ہو۔" جواد خوف سے پیلا ہو گیا۔

"ہاں! میں اسی بدقسمت کا بھائی ہوں جس کی عزت تم نے لوٹی تھی۔" یہ کہتے ہوئے انور نے پھر فائر کیا یہ گولی اس کے سینے میں لگی جواد کی شرٹ خون سے لت پت ہو گئی۔

"آج میں نے اپنا بدلہ لے لیا باس میں نے بہن کا جنازہ اٹھاتے ہوئے قسم کھائی تھی کہ میں اس کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔ آج میں سرخرو ہو گیا استاد اپنی بہن کے آگے اب حشر کے روز میں آنکھیں نیچی کر کے نہیں ملوں گا اس کی روح کو سکون آ گیا ہو گا۔ کتنی خوش ہو گی ثمینہ آج میں صرف اسی لئے تمہارے گروہ میں شامل ہوا تھا آج میرا مشن پورا ہو گیا۔" انور دیوانگی میں بولے جا رہا تھا۔ مگر جواد تو کبھی کا مر چکا تھا۔ وہاں کوئی نہیں سن رہا تھا انور سرخ سرخ آنکھوں سے رضوان کی طرف بڑھا تو سحر جیسے ہوش میں آ گئی۔

"خدا کے لئے بھیا میرے بچے کو مت مارنا۔" سحر تڑپ کر آگے بڑھی انور نے آگے بڑھ کر رضوان کا ہاتھ پکڑا اور سحر کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ لو بہن اپنا بیٹا سنبھالو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا انور۔" شوکت آگے بڑھتا ہوا بولا۔

"ہم نے باس سے بچے کے مارنے کا وعدہ کیا تھا تم نے صرف باس کو مارنے کا ارادہ کیا تھا ہم تمہارے ساتھ تھے ہم نے تمہارا ساتھ اسی وجہ سے دیا کہ ہم خود بہنوں والے ہیں ہم نے آج تک کسی کی بہن کی عزت پہ ہاتھ نہیں ڈالا ڈاکے ڈالے چوریاں کیں مگر عزت۔ کسی کی نہیں لوٹی اسی لئے جب تو نے بہن کا بدلہ لیا تو ہم خاموش رہے مگر اب خاموش نہیں رہیں گے۔"

"یہ کام مت کروا انور ورنہ پھڈا ہو جائے گا۔" ایک اور آدمی آگے بڑھتا ہوا بولا ابھی اس نے اپنی بات پوری ہی کی تھی کہ انور نے ایک ایسا تھپڑ اس کی گردن پر مارا کہ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرا شوکت نے یہ دیکھ کر ریوالور نکال لیا۔

"ہم مجبور ہیں انور جو کام تم نہیں کر سکے وہ ہم کر رہے ہیں یہ کہہ کر اس نے اپنا رخ رضوان کی جانب موڑ لیا۔ مگر سحر فوراً آگے آ گئی۔

"میرے بیٹے سے پہلے تمہیں مجھے گولی مارنا ہو گی۔"

"آگے سے ہٹ جاؤ۔"

"نہیں۔" سحر چیخی۔

"آخری وارننگ دے رہے ہیں۔"

"میں رضوان کے لئے ایک دفعہ نہیں ہزار مرتبہ مر سکتی ہوں ظالمو تم نہیں جانتے کہ ممتا کیا چیز ہوتی ہے اور میں بھی ایک ماں ہوں ماں جس کے لئے اپنا بچہ ایک انمول اور نایاب شئے ہوتا ہے چلاؤ گولی میں اپنے بچے سے پہلے مروں گی۔"

شوکت نے ریوالور کا رخ سیدھا کر دیا کہ اسی اثنا میں کہیں سے فائر ہوا اور شوکت کا ریوالور کہیں دور جا گرا اسی کے ساتھ چاروں طرف سے سرچ لائٹوں کی روشنی نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔

"خبردار کوئی حرکت نہ کرے اور کسی نے بھی کوئی معمولی سی حرکت کی یا صاحبزادی حضور اور چھوٹے نواب میں سے کسی کو

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

بھی کوئی معمولی سا نقصان پہنچا تو تمہارا نام و نشان مٹا دیا جائیگا لپنے اپنے ہتھیار پھینک دو ہاتھ اُوپر اُٹھا دو۔"

اِس کے ساتھ ہی سب نقاب پوشوں نے ہتھیار پھینک دیئے ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔

ارمان بھاگ کر آیا اور رضوان سے لپٹ گیا۔

"رضوان میرے بیٹے میری جان اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔" سحر آنسو بھری آنکھوں سے باپ بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

تمام ملزموں کو فوج نے اپنی حراست میں لے لیا۔

ارمان رضوان کو گود میں اُٹھا کر سحر سے مخاطب ہوئے۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہی تشریف لے چلیں۔"

اور سحر بغیر کچھ بولے ارمان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

☆

محل واپس پہنچنے کے بعد ارمان نے رضوان اور سحر کو اتارا اور واپس جانے لگے تو رضوان رونے لگا۔

"ڈیڈی میں آپ کو نہیں جانے دوں گا آپ یہیں رہیں گے۔"

"نہیں بیٹے میں یہاں نہیں رہ سکتا ویسے آپ سے ملنے ہر روز آیا کروں گا۔" ارمان اُسے چومتے ہوئے بولے۔

"ممی آپ ڈیڈی سے کہیئے۔"

سحر ارمان کے جانے کا سُن کر پریشان سی کھڑی تھی رضوان کی آواز پر چونک پڑی۔

"آپ نہیں جائیں گے آپ کو ہماری قسم۔" یہ کہتے ہوئے وہ اندر کی جانب بھاگ گئی۔

"بس ڈیڈی اب تو نہیں جائیں گے۔"

"نہیں بیٹا اب کبھی نہیں جائیں گے چلیئے۔" ارمان کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔

رات کو ایک بجے کے قریب تھک کر ارمان اپنے بیڈ روم میں پہنچے۔

تو تمام کمرہ ویسے ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئے تھے کپڑے بدلنے کے بعد وہ اپنے مخصوص دریچے میں آ کر کھڑے ہو گئے جہاں سے باہر لان کا سارا منظر سامنے تھا تمام لان برقی بلبوں سے جگمگا رہا تھا اور ارمان کے کانوں میں سحر کی آواز گونج رہی تھی۔ "آپ نہیں جائیں گے آپ کو ہماری قسم" ارمان اِن الفاظ کے یاد آتے ہی مسکرا دیئے اچانک انہیں اپنے کندھے پر دباؤ کا احساس ہوا انہوں نے پلٹ کر دیکھا سحر گلابی رنگ کے خوبصورت نائٹ گاؤن میں ملبوس اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھے مسکرا رہی تھی ارمان نے بے یقینی کے عالم میں آنکھیں مل مل کر دیکھا یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ سحر اُن کی حیرانی پر زور سے ہنس دی۔ کمرے میں جیسے جلترنگ بج اُٹھا۔

"سحر تم... تم یہاں۔" ارمان کچھ نہ کہہ سکے۔

"جی ہاں... میں کیا میں یہاں نہیں آ سکتی۔" سحر ارمان کے سینے سے لگ گئی۔

"ارمان آج ہم اپنی ساری اُنا ساری خودداری ختم کر کے آپ کے پاس آ گئے ہیں ہمیں آپ کی ضرورت ہے آپ کی پناہ کی ضرورت ہے آپ کے جانے کے بعد محسوس ہوا ارمان آپ کے بغیر ہم کچھ نہیں ہمارا وجود کچھ نہیں کہیئے آپ نے ہمیں معاف کر دیا۔" وہ اُن کے سینے سے ایسی چمٹی ہوئی کھڑی تھی جیسے اب جدا نہ ہو گی۔

اُدھر ارمان سوچ رہا تھا سحر نے مجھے کتنا تنگ کیا ہے کتنا ستایا ہے اب میں بھی اسے ذرا سا ستاؤں گا۔ پرسوں ہماری شادی کی سالگرہ ہے وہ ہم دھوم دھام سے منائیں گے اسی رات کو میں سحر کو سرپرائز دوں گا فی الحال ذرا تنگ کرنا چاہیئے۔ یہ سوچتے ہی ارمان بولے۔

"تم نے بہت دیر کر دی سحر اب ہم نے اپنا راستہ بدل لیا ہے تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی اس لیئے ہم نے اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے۔"

سحر کے سر پر جیسے دھماکہ ہوا "کیا... کیا"

"میں پرسوں شادی کر رہا ہوں۔"

"ارمان! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں سحر بالکل سچ کہہ رہا ہوں پرسوں میری دلہن پیاری سی چاند سی دلہن یہاں میری خوابگاہ میں ہو گی کتنا خوش نصیب ہو گا وہ دن اور کتنی نصیبوں والی رات ہو گی جب وہ میرے پہلو میں ہو گی۔" ارمان کے تصور ہی میں سحر کا دلہن بنا ہوا چہرہ چمک اٹھا

"ارمان ہم مر جائیں گے۔" وہ سسک پڑی۔

"کوئی نہیں مرتا سحر سب فضول باتیں ہیں یہ دیکھو سب لباس جو میں نے بڑے شوق سے خریدے تھے۔" وہ پہنے گی انہوں نے وارڈروب کھول دی جو بے شمار زرق برق کپڑوں سے لدی ہوئی تھی اور یہ غرارہ" یہ کہتے ہوئے انہوں نے سرخ رنگ کا کمخواب کا غرارہ باہر نکال لیا۔

"یہ غرارہ وہ... پرسوں رات کو پہنے گی میری دلہن کتنی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

پیاری لگے گی اور یہ زیور انہوں نے ایک خانے میں رکھے ہوئے ڈبوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ وہ پرسوں پہنے گی۔ سحر تم اُسے اس روپ میں نہیں دیکھ سکو گی وہ اتنی حسین لگے گی خود میں نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ سحر کی حالت سے بے خبر بولے جا رہے تھے اُن کے تصوّر میں سحر کا حسین چہرہ تھا وہ دلہن بنی شرما رہی تھی کہیں مسکرا رہی تھی وہ آنکھیں بند کئے تصوّر میں کھو گئے اچانک چونک کر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ کمرہ خالی تھا سحر نجانے کب چلی گئی تھی۔

"پگلی کتنا خوش ہو گی پرسوں جب میں اُسے دلہن کے روپ میں دیکھ کر مسکراؤں گا۔ ابھی شاید روٹھ کر گئی ہے۔ میں اُسے ایک منٹ میں مناؤں گا صرف کل کا دن درمیان میں ہے پھر میں ہوں گا۔ اور سحر میری جان میری زندگی خدا کرے پرسوں کا دن جلد آ جائے ارمان کی آنکھیں سہانے خواب دیکھنے لگیں

آج شادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ ارمان نے کئی بار سحر کو تیار ہونے کو کہلوایا مگر وہ کمرہ بند کر کے لیٹی ہوئی تھی بڑی مشکلوں سے دروازہ کھلوایا گیا ارمان نے بڑی منتیں کیں۔

"خدا کے لئے سحر میری عزت کا سوال ہے"

سب سوالوں کے جواب میں وہ بالکل خاموش تھی۔

پھر نجانے کیا سوچ کر بولی۔

"ٹھیک ہے آپ چلیں میں آتی ہوں"

ارمان رضوان کو لے کر چلے گئے۔

سب مہمان آ چکے تھے صرف سحر کا انتظار تھا ارمان بے چینی سے دروازے کی جانب دیکھ رہے تھے جب بھی پتہ کرواتے یہی جواب ملتا تیار ہو رہی ہیں بس ابھی آ ہی رہی ہیں

اُدھر سحر اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی اپنی تیاری کے لئے اس نے بیوٹی کلینک سے دو ماہر میک اَپ کو بھی بلوا لیا تھا۔

وہ دونوں خواتین بہت محنت اور توجہ سے سحر کا میک اَپ کر رہی تھیں سحر بار بار انہیں کہتی۔

"بس آج اتنا خوبصورت آپ لوگ میرا میک اَپ کریں کہ لوگ دیکھتے ہی رہ جائیں ہم آپ کو اس کا بہت بھاری انعام دیں گے"

"آپ دیکھتی جایئے صاحبزادی حضور ہم اپنا سارا تجربہ آج آپ پر محنت کر کے صرف کر رہے ہیں لوگوں نے آج تک اتنا خوبصورت اور حسین چہرہ کہیں نہیں دیکھا ہو گا۔"

آخر چار گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد سحر مکمل طور پر تیار ہو گئی۔ قدِ آدم شیشے میں بار بار اپنا سراپا دیکھا کہیں بھی تو کوئی خامی نہ تھی کہیں بھی کوئی جھول نہ تھا سحر آتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ خود اُس کی نگاہیں بار بار جھک جاتیں وہ اپنے ہی نظارے کی اپنے ہی جلوے کی تاب نہ لا سکی اور باہر نکل آئی جس وقت سحر نے ہال کمرے کے دروازے میں قدم رکھا سب لوگ اُس کے حُسن کے جلوے کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے پہلے بھی انہوں نے صاحبزادی حضور کو اپنی آن بان اور شان و شوکت کے ساتھ دیکھا تھا مگر آج روپ ہی نرالا تھا۔

ارمان نے دیکھا سحر اُسی کمخواب کے غرارہ میں ملبوس تھی، جو ارمان نے کہا تھا کہ اُس کی دلہن پہنے گی زیور بھی وہی تھا بار بار ارمان کا دل بارگاہِ حسن میں سجدے کر رہا تھا سحر کے پاس گیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر ٹیبل کے پاس لے آیا جہاں شادی کا خوبصورت اور اونچا سا کیک رکھا تھا دونوں نے ایک ساتھ چھری پکڑ کر کیک کاٹا تالیاں بجائیں اور سحر ارمان کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے کانپ اُٹھی، یہ ہاتھ اب کسی اور کے ہو جائیں گے۔ میں نے تو اس مضبوط ہاتھ کا اب سہارا چاہا تھا اور اب اسی ہاتھ نے میرے ہاتھوں کو جھٹک دیا ہے میں اپنی آنکھوں سے کیسے ارمان کو کسی اور کے ساتھ دیکھ سکوں گی میں مر جاؤں گی مگر یہ سب کچھ نہیں سہہ سکوں گی میں یہ سب نہیں دیکھ سکوں گی۔ آج کی رات میرے ساتھ ارمان کی آخری رات ہو گی مگر میں آج کی رات اپنی زندگی کی آخری رات بنا لوں گی اس بے عزتی سے بہتر ہے سحر مر جا خود کو ختم کر لے۔ ارمان کی خوشی کی خاطر اُس کے راستے سے خود ہی ہٹ جا۔ حضور نے کتنے شوق اور چاہت سے ارمان کو میرا سہارا بنایا تھا۔ مگر یہ سہارا بھی کتنا کھوکھلا اور ناپائیدار ثابت ہوا میں نے رضوان کی خاطر ارمان سے دل لگا لیا تھا۔ کاش میں اب بھی اُس سے نفرت کر سکتی وہ نجانے کیوں اب مجھے اتنا پیارا لگنے لگا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اب ارمان کے بنا جی نہیں سکوں گی اُس کے بغیر یہ جیون کچھ نہیں یہ زندگی کچھ نہیں میں اُسے کھو کر کیسے جی سکتی ہوں میں اُس کی چاہت میں خود کو ختم کر لوں گی خود کو مٹا ڈالوں گی۔ دل و دماغ کی آوازیں یکساں ہو کر کہہ رہی تھیں سحر اس سے پہلے کہ ارمان آج رات اپنی دلہن لے آئے خود کو ختم کر ڈالو مر جاؤ اور پیار میں اپنا نام امر کر دو ہاں ایسا ہی ہو گا۔ سحر نے فیصلہ کر کے اِدھر اُدھر دیکھا سب لوگ کھانے میں مشغول تھے اور ارمان دوستوں میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے سحر نے اپنے حنائی خوبصورت ہاتھوں کو دیکھا جن میں یاقوت زمرد اور ہیرے کا

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

کی کئی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں نظر ایک بڑے سے سُرخ ہیرے سے مزین انگوٹھی پر جم گئی۔ ارمان کی نظر سحر پر پڑی وہ لپک کر اودھر آئے۔

"ارے آپ کچھ نہیں کھا رہیں چلیئے آیئے میرے ساتھ"۔ مگر سحر خاموش تھی چہرے کا رنگ نجانے کیوں پیلا پیلا سا تھا ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"کچھ طبیعت خراب ہے سحر چلو تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آؤں" ارمان نے اُس کا بازو تھام لیا اور سحر چپ چاپ ساتھ چل دی۔

سامنے ہی ارمان کا بیڈ روم تھا سحر نے اُسے دیکھتے ہی کہا مجھے اپنے کمرے میں لے چلیے۔"

"چلیے حضور وہ میرا ہی نہیں آپ کا بھی کمرہ ہے" ارمان نے دروازہ کھولا سحر نے اندر قدم رکھا مگر وہیں رک گئی سارا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ یہ ارمان کا بیڈ روم نہیں بلکہ کسی دولہا اور دولہن کا حجلہ عروسی دکھائی دے رہا تھا زرتار پردے ہوا سے لہرا رہے تھے اور ساری فضا خوشبو سے معطر تھی ارمان نے آہستگی سحر کو پھولوں سے سجے خوبصورت بیڈ پر لٹا دیا۔

"جانتی ہو سحر یہ سب کس لیے کیا ہے آج میری دلہن نے جو آنا تھا۔"

"ارمان" سحر کا رنگ دلہن کے نام پر پیلا پڑ گیا۔

"ہاں جانِ ارمان" ارمان کے لہجے میں دنیا جہان کا پیار سمایا ہوا تھا۔

"میں اگر مر گئی تو بھی یاد کرو گے" سحر نے ارمان کا ہاتھ تھام لیا۔

"ارے اتنی جلدی تم نہیں مرو گی" بڑی لمبی عمر ہے تمہاری اور پھر ابھی تو تم نے میری دلہن کو دیکھنا ہے" ارمان بڑے خوش تھے

"نہیں ارمان نہیں میں تمہاری دلہن نہیں دیکھ سکتی" وہ بڑے کرب سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"وہ تو مجھے پہلے ہی پتہ ہے اُس کا حُسن دیکھ کر جل جاؤ گی" ارمان نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "وہ آج اتنی پیاری لگ رہی تھی... جی چاہتا تھا کہ آج ایسے ہی بیٹھا ساری عمر دیکھتا رہوں"

"تو کیا... تم... تت تم" سحر سے بات پوری نہ ہو سکی۔

"ہاں سحر آج میں نے اپنی دلہن کا بھرپور جلوہ دیکھا بس تھوڑی دیر بعد تمہیں بھی دکھاؤں گا۔

"نہیں نہیں میں نہیں دیکھوں گی تم اتنے سنگدل کیوں ہو گئے ہو ارمان۔ میں اتنی بڑی سزا کی مستحق نہ تھی۔" سحر کا ہاتھ تیزی سے منہ کی جانب بڑھا اور اُس نے ہیرا چبانا چاہا ارمان نے تیزی سے ہاتھ مار کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"پاگل ہو گئی ہو سحر دیکھو میری یہ دلہن ہے جان" ارمان نے بیڈ کے پاس کی دیوار کا پردہ ہٹایا پردے کے پیچھے سحر کی بڑی سی قدآدم تصویر مسکرا رہی تھی۔

"ارمان میری جان" سحر نے اُس کے سینے میں منہ چھپا لیا آسمان پر تارے اِس ملن کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

شفیع عقیل
کی تین نئی کتابیں
زہر پیالہ — قیمت ۲۵ روپے
پنجابی نظمیں اردو ترجمہ کے ساتھ
سیر و سفر — قیمت ۲۵ روپے
مغربی جرمنی کا باتصویر سفرنامہ
جاپانی لوک کہانیاں — قیمت ۲۵ روپے
پتہ: تھری آرٹس اکیڈمی ۱-۱ اسٹار چیمبرز
ایس آر کیپٹن روڈ۔ نیو چالی کراچی

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

یہ کس انداز سے بہار آئی

مہناز عرفان

"اے بوا دیکھا تم نے یہ جہیز ہے۔ اے جہیز کے نام پر دھبہ ہے دھبہ!"

دولہا میاں کی اماں ناک پر انگلی جما کر اپنے برابر میں کھڑی خاتون سے گویا ہوئیں۔

"اے ہاں بہن۔ کُل سادے جوڑے اور چند برتن!" ایک نے طنز کیا۔

"جوتا مارا ہے ہماری چاند پر گھر بُلا کر بے عزتی۔ اے میں کہتی ہوں میرا بیٹا چودہ پاس ہے چودہ۔ سمجھا کیا ہے انھوں نے!" دولہا کی اماں مزید پھیل گئیں۔

"رشیدن اے رشیدن! ذرا سوچ سمجھ کر بول۔ عزت کا معاملہ ہے۔" کسی نے انہیں احساس دلایا۔

"آپا تم ہی دیکھو۔ میرا بیٹا کوئی ایسا گرا پڑا تھا موا کہ جہیز کے نام پر دو جوڑے دو برتن ساتھ کر دیئے ہیں نہ بھئی ذرا بلاؤ تو دلہن کی میّا کو!"

"اے لو دلہن کی اماں خود ہی آرہی ہیں!" ایک آواز آئی۔

"اے کیا ہوا بہن؟" دُلہن کی اماں نے پوچھا۔

"لو پوچھتی ہو کیا ہوا؟ یہ دیکھ رہی ہو یہ؟" انھوں نے جہیز کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا دکھانا چاہ رہی ہو بہن؟"

"اے لو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ اے بہن کیا تمھاری بیٹی تم پر اتنی ہی بھاری تھی کہ تم کچھ دے ہی نہ سکیں۔" دولہا کی اماں نے ہاتھ نچایا۔

"اے واہ کیوں بھاری ہوتی ہم پر۔ تم نے ہی سو دفعہ جوتیاں چٹخائیں تھیں پھر رضامندی دی تھی۔ ہم نے!" دلہن کی ماں فخر سے بولیں۔

"کیوں جھوٹ بولتی ہو۔ پہلی دفعہ میں ہی تمہاری تو باچھیں کھل گئیں تھیں۔ ایسا داماد کہاں ملتا۔ چودہ پاس ہے چودہ!"

"دیکھو بہن بات نہ بڑھاؤ۔ جتنی ہماری حیثیت تھی دے دیا۔ اب تم تو شکوہ کرنے لگیں۔"

"اے جان جلی تو شکوہ بھی کیا ہے!"

"جان جلنے کی بات کرتی ہو تو کیا تم نے کم جان جلائی ہے ہماری۔ ذرا یہ ہی دیکھو۔ نکاح کا جوڑا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو کہوں گی اُترن لگے ہے مجھے تو۔"

"اے نور جان۔ اللہ سے ڈرو۔ کیا بہتان لگا رہی ہو۔ اللہ قسم منہ مانگی قیمت پر سلوایا تھا شکورن سے!"

"اور سلوایا کب تھا۔ دس سال پہلے!"

"اے دس سال کیوں ہوتے۔ نو سال ہوئے ہیں پورے!" دولہا کی ماں اکڑ کر بولیں۔

"لو۔ نو سال پہلے کا جوڑا لائی ہو میری بیٹی کے لئے!"

"اوہو وہ تو بڑی ملکہ نواب زادی ہے کہیں کی۔ ماں باپ کے گھر گدڑیوں میں ہے اور اتنا مہنگا جوڑا پسند ہی نہیں آرہا۔"

"دیکھو بی رشیدن تم زیادہ بک بک تو کرو نہ۔ اے اب ہم غریب ہو گئے تو کیا۔ یہ تو قسمت کا پھیر ہے۔ ہمارے اماں باوا تو سونے میں کھیلتے تھے۔"

اے لو ایسے کہہ رہی ہو جیسے ہم جانتے ہی نہیں ہیں۔ اے خدا بخشے رحیمن خالہ کو جب بھی میں تمہاری اماں کے گھر گئی بچپن میں توبہ اتنا ریت کہ پاؤں دھنس جائیں۔ پان کی پچکاریاں الگ۔ ایک کپڑا اُدھر پڑا ہے تو ایک اُدھر۔ ہنہہ سونے میں تو نہیں گند میں ضرور کھیلتی تھیں۔" دولہا کی ماں نے چڑایا۔

"اے تو تمہاری اماں کونسی محلوں میں رہتی تھیں۔ ایک کٹھریا میں رہتی تھیں جس میں روشنی تک نہ آوے تھی۔"

"پر تمہاری طرح گندا نہ رہتا تھا۔ اب اسی کو دیکھ لو کیسا گندا گھر ہو رہا ہے۔ اے دو پیسوں کا چونا نہ کرا سکیں۔ ایسی بھی کیا کنجوسی!"

"اے کنجوس تو تم ہی ہو۔ بیٹے کے مانجھے میں چار چار لڈو دینا تو نصیب نہ ہوئے۔ دو دو میں ہی ٹرخا دیا!"

اے چار چار کیسے دے دیتی۔ باقی کو کیا اپنا سر دیتی۔ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کے نہیں دیکھتیں۔ یہی دیکھ لو آج کا سالن

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اے وہ دیغ (دیگ) کا لگے کا شروا (شوربہ) ڈھب ڈھب۔ اے چاہے چار آدمیوں کو کھلائیں پر ذرا ڈھنگ کا۔ یہ کیا پانچ سیر گوشت میں کنستر بھر پانی ڈال دیا۔ توبہ نہ رنگ نہ مزا۔ اللہ قسم جی مالش ہو رہا ہے اب تک۔" دولھا کی ماں کلیجہ پکڑ کر بولیں۔

"ہو بھئی کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" ایک مردانہ آواز آئی۔

"اے بنّے بھائی ذرا دیکھو تو کیا فیل مچا رہی ہیں بی رشیدن۔ لگتا ہے بیٹے کا نکاح کرنے نہیں لڑنے کو آئی ہیں۔"

"اے تم کہاں کی شریف زادی ہو۔ جو ہاتھ آگے ہے تمہاری زبان مجھ سے لڑنے میں۔" دولھا کی ماں غرائیں۔

"اے خدا نہ کرے جو میں ایسی ہوں۔ تم ایسی تمہاری اماں بھی ایسی۔ کیسے کیسے جھگڑے کرتی تھیں محلے میں، وہ تو ہماری اماں ہی تھیں جو بیچ بچاؤ کرا دیتی تھیں۔"

"ہاں بیچ بچاؤ کرا دیتی تھیں۔ اے بی جا لو تو وہ خود تھیں۔ جانے قبر میں بھی کیسے چین آرہا ہوگا۔"

WaqarAzeem Pakistanipoint.Com

"اے میری مری ہوئی ماں کو کچھ نہ کہنا۔ جنتی تھیں وہ۔ تمہاری ماں کی قبر میں ہی کیڑے کاٹ رہے ہوں گے۔" دُلہن کی اماں نے دل کی بھڑاس نکالی۔

تب ہی کچھ مرد اندر آ گئے۔

"کیا ہنگامہ ہے یہ؟" دُلہن کے ابا میاں غصے سے بولے۔

"اے بیٹے کو بیاہنے نہیں لڑنے آئی ہے یہ چڑیل۔"

"چڑیل ہوں گی تیری سات پشتیں۔ میں کیوں ہوتی۔ اسکو دیکھو اچھّن کو کیسا سینہ تان کر آیا ہے لڑنے کو۔"

"میں لڑنے تو نہیں آیا۔ اے سلو بھائی سمجھاؤ بی رشیدن کو۔" دُلہن کے ابا نے دولہا کے ابا سے کہا۔

"اے یہ کیا سمجھائیں گے۔ یہ تو خود جورو کے غلام ہیں۔" دُلہن کی اماں نے انہیں غیرت دلائی۔

"دیکھو بی نصیرن۔ ہم کیوں ہونے جورو کے غلام۔ وہ تو تمہارے ابا مشہور تھے اس معاملے میں۔"

"تمہیں جرأت کیسے ہوئی میرے ابا میاں تک پہنچنے کی، ہیں نا ذات کے نائی۔ ایسی باتیں تو کریں گے ہی۔" دُلہن کی ماں بگڑ کر بولیں۔

"اب ذات پر مت آنا نصیرن۔ تم کہیں کی نوابزادی نہیں ہو۔ تمہارے چچا دادا مصیبت کے وقت ہمارے در و ٹے پر ہی آیا کرتے تھے۔"

"اے خدا کی مار۔ کونسی گھڑی تھی جو یہاں آئی۔ میرے فطو کو تو ہزاروں لڑکیاں مل رہی تھیں۔" دولہا کی ماں سر پہ ہاتھ مار کر بولیں۔

"اے میری بیٹی کو بھی کھڑے کھڑے دس رشتے موجود ہیں۔ ابھی نہ کر کے دکھایا دوسرا نکاح تو جب کہنا۔ بلاؤ اپنے فطو کو میری بیٹی کو ابھی دے طلاق۔" دُلہن کی ماں چنگھاڑیں۔

ادھر دولہا فتح علی عرف فطو میاں یہ ساری ہنگامہ آرائیاں سن رہے تھے۔ ان ہنگاموں میں ان کا بڑا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ ٹھہرے شہر کے رہنے والے مہذب۔ کہاں یہ غیر مہذب ماحول، لگ رہا تھا جیسے وہ شادی کرنے نہیں کسی طوفانِ بدتمیزی کا مقابلہ دیکھنے آئے ہوں۔ وہ چاہ رہے تھے سب خاموش ہو جائیں لیکن دولہا بنے ہوئے تھے۔ کچھ شرم مانع تھی کچھ یوں بھی کہ اماں ابا کی پہلی حسرت تھی۔ وہ جس طرح حسرت نکال رہے تھے نکال لیتے لڑ بھڑ کر ہی سہی کیونکہ فطو میاں ساری عمر ان سے دور رہے تھے۔

کیونکہ جب فطو میاں اپنے والدین کے گھر پیدا ہوئے تو ان سے بڑے ایک بھائی ایک سالہ حامد علی موجود تھے۔ فطو میاں کی پیدائش پر ان کی اماں چارپائی سے ایسی لگیں کہ ڈھیروں علاج پر بھی سنبھلنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ اس دوران فطو میاں کے والد کے ایک لاولد دوست غلام حسین کی بیوی نے فطو میاں کو سنبھالا۔ دو ماہ بعد جب فطو میاں کی اماں ٹھیک ہو گئیں تو انہیں بچے کا خیال آیا۔ اس دوران بچہ غلام حسین کی بیوی سے مانوس ہو گیا تھا۔

بے اولاد ممتا کی ماری عورت نے جب یہ دیکھا کہ اب بچہ ماں کے پاس چلا جائے گا تو مرجھا کر رہ گئی۔ ان کے میاں، بیوی کی حالت پر خود بھی افسردہ تھے۔ فطو میاں کے ابا نے جو دوست... کی بیوی کی یہ حالت دیکھی تو اسی لمحے اپنا جگر گوشہ انہیں بخشنے کا فیصلہ کر لیا۔ فطو میاں کی اماں روئیں پیٹیں لیکن میاں کے آگے نہ چلی، یوں فطو میاں غلام حسین کی اولاد بن کر آ گئے۔

دینے کو تو رحمت علی نے اپنا بیٹا دوست کے حوالے کر دیا۔ لیکن جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اولاد کوئی بانٹنے والی چیز نہیں۔ دوسرے یہ کہ چند ماہ بعد پہلوٹی کا بیٹا انتقال کر گیا۔ اب فطو میاں کی ماں کی گود ویران ہو گئی۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی ان کے یہاں لڑکی ہوئی پھر تو لائن لگ گئی۔ یکے بعد دیگرے چار لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔

گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر شہری حدود تھیں جہاں فطو کے منہ بولے ماں باپ غلام حسین اور ان کی بیوی رہتے تھے۔ اب ان کے درمیان فطو میاں بڑے ناز و نعم سے پرورش پانے لگے۔ ممتا کی ماری فطو کی ماں ہر ہفتے ان سے ملنے آتیں اور ہر مرتبہ بیٹے کے لئے اور زیادہ تڑپ جاتیں۔ فطو میاں اچھے اسکول میں پڑھتے تھے صاف ستھرے نفیس لباس میں ملبوس رہتے۔ صاف ستھرے گھر میں رہتے۔

جب ان کی اماں اپنی چاروں بیٹیوں کے ساتھ ان سے ملنے آتیں تو اپنی گندی گندی بہنوں کو دیکھ کر فطو میاں ناک بھوں چڑھا لیتے۔ اماں کی گود میں بیٹھ کر منہ بناتے رہتے کہ ان کے کپڑوں سے انہیں بو آتی تھی۔ ماں بیٹے کی اس حرکت پر شرمندہ ہو جاتی اور پھر اگلے سال جب فطو میاں دس گیارہ سال کے تھے فطو میاں کی ماں کے گھر ان کا دوسرا بھائی آ گیا۔ یوں فطو میاں کی ماں کا آنا جانا کم ہو گیا۔ کیونکہ بیٹے کو ترسی ہوئی ماں کو کھلونا ہاتھ آ گیا تھا۔

فطو میاں میٹرک میں پہنچے تو ان کی چہیتی منہ بولی ماں کا انتقال ہو گیا۔ تب وہ افسردہ ہو گئے۔ اتنی چاہنے والی ماں کو کہاں سے لاتے جو ہر طرح سے ان کا خیال رکھتی تھیں۔ تب ان کے منہ بولے ابا نے ماں کی جگہ بھی سنبھال لی۔ یوں فطو میاں نے کالج کی حدود میں قدم رکھا جہاں ہر طرح کے لڑکے تھے لیکن ان کی فطرت سادگی پسند تھی، لڑکیوں سے دور دور رہتے۔ اس پر انہیں مغرور

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کا خطاب بھی ملا۔ حالانکہ ایک لڑکی انہیں بہت پسند تھی۔ لیکن چاہنے کے باوجود وہ حالِ دل اس سے نہ کہہ سکے۔ کیونکہ وہ کچھ شرمیلے بھی تھے۔ یوں وہ کالج سے بخیر و خوبی واپس ہوئے۔ ابھی ان کا آخری پرچہ ختم ہوتے چند دن ہوئے تھے کہ انکے ابا میاں بھی انہیں اکیلا چھوڑ گئے۔

اب فطو میاں اکیلے تھے چار کمروں والے گھر میں۔ انھوں نے باپ کی کپڑے کی دوکان سنبھال لی۔ ایسے میں فطو میاں کے حقیقی والدین انہیں لینے آگئے۔ وہ انکار نہ کر سکے۔ ان کے گھر آگئے لیکن یہاں ان کا دل قطعی نہ لگا۔ ہر سو گندگی، کوڑا کرکٹ، پورا گھر کباڑ خانہ لگتا۔ ہر سو مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ لہٰذا وہ مہینے میں کچھ عرصہ اپنے گھر میں رہتے، کچھ عرصہ ماں کے گھر۔ ان کی دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔

اب ماں کو ان کے سہرا سجانے کا خیال آیا۔ لہٰذا فطو میاں نے بھی گردن جھکا کر رضامندی دے دی۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنی دُلہن کے ساتھ مستقل اپنے گھر میں شفٹ ہو جاتے۔ لڑکی کا مسئلہ تھا جانے کیسی ہو گی۔ کوئی دیہاتی بدصورت۔ لیکن ان کی بہنوں نے بتایا کہ وہ لڑکی دس جماعت پاس ہے اور خوبصورت ہے۔ فطو میاں خاصے حیران ہوئے تھے کہ گاؤں کی لڑکی اور دس جماعت پاس! لیکن قدرت نے شاید اس لڑکی کو ان کے لئے ہی بنایا تھا جب ہی تو اس قابل کر دیا تھا۔

ان کی رضا پا کر اماں خوشی خوشی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔ مختلف رسمیں انجام دی جانے لگیں اور یوں آج وہ دن آگیا کہ جب وہ سہرا سجائے سسرال میں بیٹھے تھے۔ نکاح ہو چکا تھا۔ وہ مطمئن تھے لیکن اچانک ہی ہنگامہ شروع ہو گیا۔ وہ یہ بھی سن رہے تھے کہ ان کی اماں برات واپس لے چلنے کو کہہ رہی ہیں۔ وہ بے حد پریشان ہو گئے وہ ٹہلتے ہوئے شامیانے سے باہر نکل آئے کیونکہ کوئی ان کی طرف متوجہ نہ تھا۔ سب لڑائی کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ پریشان سے ٹہل رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ ہنگامہ ختم ہو اور رخصتی کی رسم ساتھ خیریت کے ہو جائے۔ لیکن ناممکن نظر آ رہی تھی کیونکہ اماں برات واپس لے جانے کا کہہ رہی تھیں۔

"افوہ تو کیا ابھی نکاح ابھی طلاق ہو جائے گی؟" اسی پریشانی میں ان کی نگاہ سامنے کھڑکی پر پڑی۔

دس قدم کے فاصلے پر ایک کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آ رہا تھا۔ سرخ زرتار دوپٹے کے ہالے میں زیورات سے مزین۔

"دُلہن میری دُلہن!" ان کے دل نے سرگوشی کی۔

اور پھر ان کے قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ وہ بے خودی میں دُلہن کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ دُلہن ان کو دیکھ کر سٹپٹا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی معتبر، زندہ، دلکش اور کم قیمت کتابوں کی اشاعت کا

عظیم سلسلہ

ہمارے پیغمبر (مصوّر)

"ہمارے پیغمبر" حضرت آدم سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی سوانح کا ایسا گلدستہ ہے جس میں چوبیس سے زائد پیغمبر اور نبیوں کے حالات شامل ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اُن مقدس ہستیوں کے حالات پر وہی مضامین جمع کیے گئے ہیں جن کی صداقت پر اللہ کی کتاب معتبر "قرآن حکیم" کی مہر ثبت ہے۔ مقامات مقدسہ کی درجنوں تصاویر سے مزین، فوٹو آفسٹ پر طباعت، چار رنگا ٹائٹل، مضبوط جلد، سفید چکنا کاغذ، ڈھائی سو سے زائد صفحات

قیمت صرف پندرہ روپے

ہمارے ولی (مصوّر)

اس کتاب میں حضرت حسن بصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت میاں میرؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے علاوہ دوسرے درجنوں اولیاء اللہ کا تذکرہ اس انداز میں درج ہے کہ جس کو پڑھ کر آپ ان کی محبت میں ڈوب جائیں گے۔ مزارات مقدسہ کی درجنوں تصاویر سے مزین۔ فوٹو آفسٹ پر طباعت، چار رنگا ٹائٹل، مضبوط جلد، سفید چکنا کاغذ، دو سو کے لگ بھگ صفحات۔

قیمت صرف بارہ روپے

مسلمان فاتحین (مصوّر)

جن دس مسلمان فاتحین کے کارناموں کا اس کتاب میں تذکرہ ہے۔ وہ ہیں حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت طارق بن زیادؒ، حضرت محمد بن قاسمؒ، سلطان محمود غزنویؒ، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، سلطان شہاب الدین غوریؒ اور سلطان محمد فاتحؒ تاریخی تصاویر سے مزین، فوٹو آفسٹ پر طباعت، چار رنگا ٹائٹل، مضبوط جلد، سفید چکنا کاغذ، ڈھائی سو صفحات۔

قیمت صرف پندرہ روپے

اپنے قریبی بک سٹال یا ہم سے طلب فرمائیے

خیام پبلشرز

دوکان نمبر ۲۱۔ جلال دین (وقف) ہسپتال چوک اردو بازار، لاہور۔

گئی۔ لمبی لمبی سرمے سے سجی آنکھیں بند ہونا بھول گئیں۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ فطو میاں کا عروسی لباس اور سہرا دیکھ کر دلہن کو سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ وہ کون ہیں۔ لڑائی کا سن کر ساری لڑکیاں اسے چھوڑ کر لڑائی دیکھنے جا چکی تھیں۔

اور وہ گھبرا کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اب اچانک غیر متوقع طور پر وہ دولہا کو دیکھ کر شپٹا گئی۔ بارات واپس جانے کی آوازیں اس کے کانوں میں بھی پہنچ رہی تھیں۔ خود فطو میاں اس بات سے بہت پریشان تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ گاؤں کے یہ سیدھے سادے لوگ اگر اپنی بات پر اڑ جائیں تو اسے پوری کر کے چھوڑتے ہیں۔

اور اب ماں جو برات کی واپسی کی بات کر رہی تھیں تو وہ اسے کبھی دکھانا تھا۔ یہاں فطو میاں دلہن کو دیکھ کر دل ہی ہار بیٹھے۔ ایسے میں اچانک نہ جانے کہاں سے بہت سی جرأتیں ان میں بیدار ہو گئیں۔ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر وہ بالکل کھڑکی سے چپک گئے۔

"سنیئے۔ وہاں پر بارات واپس لے جانے کی باتیں ہو رہی ہیں جبکہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔ اگر ان کے کہنے پر عمل کیا تو مجھے آپ کو طلاق دینا پڑے گی۔ اور آپ اگر ایسا نہیں چاہتی ہیں تو ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔"

ان کے منہ سے بڑی روانی کے ساتھ یکے بعد دیگرے بڑی روانی کے ساتھ الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ دلہن کی حالت عجیب تھی جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہو۔ وہ پریشان بھی تھی اور الجھی ہوئی بھی جیسے کوئی راہ نہ سوجھ رہی ہو۔

"دیکھیں پلیز جلدی کریں ورنہ یوں سمجھ لیں کہ ایک منٹ کی دیر ہوئی تو طلاق کا داغ آپ کے ماتھے پر لگ جائے گا۔" فطو نے یوں کہا کہ جیسے دلہن چلنے پر راضی ہو۔

اور پھر وہ راضی ہو بھی گئی۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی پھر پتہ نہیں کیا چیز فرش پر کھڑکی کے نیچے رکھی اور کھڑکی پر چڑھ گئی۔ تب فطو میاں نے اس نازک سے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں نیچے اتار لیا۔

دوسری جانب ابھی تک گھمسان کا رن پڑا تھا۔ عجیب چیخ و پکار تھی۔ لوگ بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

"اے کلن۔ ارے چل بری سنبھال۔ او شکورا چل ذرا عورتوں کو اکٹھا کر چلنے کے لئے۔ اے تم کیا میرا منہ دیکھ رہے ہو۔ چلو مردوں سے کہو تیاری کریں واپسی کی۔"

دولہا کی اماں ہدایتیں دے رہی تھیں۔

"ہاں ہاں جاؤ۔ تمہیں روکنے کے نہیں ہیں ہم۔"

دلہن کی اماں بھی اکڑ گئیں۔ کچھ لوگ صلح صفائی کرانے لگے لیکن دونوں فریقین ضد میں آ چکے تھے۔

"ارے او شادو۔ چل فطو کو بلا۔ ابھی سب کے بیچ کھڑے ہو کر طلاق دے گا۔"

دولہا کی اماں نے کہا۔ تب ہی ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔

"خالہ۔ خالہ۔ دلہن غائب ہے۔"

"غائب ہے؟"

کئی آوازیں ابھریں۔ تب ہی دوسری جانب سے یہی پکار ہوئی کہ دولہا بھی غائب ہے۔ یوں لڑائی جھگڑا چھوڑ دلہن دولہا کی تلاش ہوئی۔ وہ ہوتے تو ملتے بھی۔ ناکامی کے بعد دلہن کی ماں کو غش پہ غش آنے لگے۔ دولہا کی اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ ہر طرف سے کھسر پھسر تھی۔ کافی دیر رو چکنے کے بعد دولہا کی ماں اٹھیں۔ دلہن کی ماں کے پاس آئیں جو ہوش میں آنے کے بعد آنکھوں پر دوپٹہ رکھے سٹر سٹر رو رہی تھیں۔ دولہا کی ماں نے ان کے گلے میں بازو ڈال دیا۔

"نہ رو بہن!"

"اے کیسے نہ روؤں میری تو عزت خاک میں مل گئی۔"

"نہ بہن ایسا نہ کہو۔ نکاح کے بعد گئے ہیں۔ وہ بھاگے تھوڑی ہیں۔" ناک سڑکتے ہوئے دولہا کی اماں نے سمجھایا۔

"اب کیا ہوگا؟" دلہن کی اماں کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"ہوگا کیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی!"

"مگر.....؟"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ بس دعا کرو ساتھ خیریت کے رہیں۔ فطو دلہن کو اپنے گھر لے گیا ہوگا۔"

"ہائے بہن مجھے معاف کر دے۔" دلہن کی ماں سسک کر بولیں۔

"تو بھی معاف کر دے مجھے بہن۔" دولہا کی ماں نے کہا۔

"اے چلو اچھا ہوا چلے گئے ورنہ تو یہاں کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ کتنے عقل مند نکلے ہمارے بچے۔ ہمیں سبق دے گئے۔"

دولہا کی ماں نے دلہن کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور دونوں روتے روتے ہنس دیں۔

بدل گئے رتوں کے چہرے

ناہید نذر

Wadar Azeem
PakistanPoint.com

آس خاردار جھاڑیاں تھیں۔ مگر ان سے دامن بچانا سہل نہ تھا۔ کہ یہی تو ایک راستہ تھا جو آگے جاتا تھا۔ باقی راستوں کے سرے بند تھے۔ بڑی طویل مسافت طے ہو چکی تھی۔ مگر راستہ ختم ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔

دامن خاردار جھاڑیوں سے بار بار پھٹ جاتا اور اب رفو کرتے کرتے پیوند لگاتے لگاتے دامن کی پہچان مشکل ہو گئی تھی۔ وہ کئی بار ٹھہری۔ ذرا دیر کو دم لیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کتنی راہوں، کتنی پگڈنڈیوں کو طے کرنے کے بعد یہ راستہ آنکلا تھا۔

مگر وہ بھی بہت مضبوط اور پرسکون لڑکی۔ وہ زندگی کے اونچے نیچے پتھریلے راستوں سے بڑی سبک رفتاری سے گزر آئی تھی۔ اور گزر رہی تھی۔

اور اب اس ہوسٹل میں نوکری کرتے ہوئے وہ مزید پُراعتماد ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کا بیٹا، مضبوط شانوں اور لمبے سے قد والا بیٹا اس کے بالکل نزدیک تھا۔ اگرچہ اس میں اور اس کے بیٹے میں اب بھی اتنا فاصلہ تھا جتنا اس ہوسٹل اور اس سرخ پتھروں والی عمارت میں جس کے اوپر "پرچھائیاں" درج تھا۔

اپنے سیاہ بالوں کو کنگھا کرنے کے بعد اس نے ساڑھی کا پلو درست کیا اور باورچی خانے میں چلی آئی۔ تینوں باورچی اپنے اپنے کام میں منہمک تھے۔

"ماما" خالد ٹینس کے ریکٹ کو گھماتا ہوا آپہنچا۔

"ہاں" وہ پلٹی اور چونک گئی۔ خالد کے ہمراہ منصور بھی تھا۔ بڑا سنجیدہ، کم گو اور جھکی جھکی نظروں والا منصور۔

"ماما، منصور کے سر میں درد ہے۔ اگر آپ ہمیں کافی بنا دیں تو ایڈوانس تھینکس ابھی وصول کیجئے اور باقی کا اُدھار کر لیجئے" خالد نے کہا۔

"شریر" وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

اور تب سُتے ہوئے چہرے والے منصور کو دیکھ کر اس کا دل دھڑک کر رہ گیا۔ پہلو میں کوئی چیز سنسنائی اور ممتا کا لاوا سا اُبلنے لگا۔

"کافی لائے ہو تم لوگ"

"ہاں یہ ہے۔ دیکھئے کتنی زبردست ہے۔ ہمارا ایک دوست انڈیا سے لایا ہے اور جناب یہ انتہائی لاجواب اور لذیذ کافی ہے"

"خالد۔ باتیں کم بنایا کرو" اس نے خالد کو ٹوکا۔

"کیا کروں ماما مجبوری ہے"

"کیا مجبوری ہے؟" وہ دلچسپی سے بولی۔

"یہ میرا دوست ہے نا منصور۔ جب میں نے پہلی بار دوستی کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے معذرت کر لی تھی۔ پتہ ہے کیوں؟" وہ اس کے شانے سے آلگا

"کیوں؟"

"یہ کہہ رہا تھا کہ اسے بولنا بالکل نہیں آتا ہے"

"تو پھر تم نے کیا کیا؟" وہ مسکرا دی۔

"میں نے اس سے کہا کہ آئندہ سے اس کے حصے کی باتیں بھی میں ہی کیا کروں گا۔ اور ماما پہلے میری زبان تیس میل فی گھنٹہ چلتی تھی اور اب ساٹھ میل چل پڑتی ہے۔

"بہت خوب" وہ بے تحاشا ہنس دی۔ اور جب اس نے کافی بنوا کر ان لوگوں کے سامنے رکھی تو وہ بے اختیار ہو گئی اور منصور کے قریب آگئی۔ اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے شانوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے وہ کانپ کر رہ گئی۔

"منصور۔ میرے بیٹے۔ تم بھی کچھ ہنسا بولا کرو نا۔ دیکھو بیٹے جو لوگ اتنے سنجیدہ اور شکستہ رہتے ہیں، زندگی انہیں کبھی اُبھرنے کا موقع نہیں دیتی اور پھر تمہاری عمر ہی کتنی ہے۔ اس عمر میں تو خوب ہنستے بولتے ہیں" وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھانے لگی۔

"ماما" اس نے اپنی گھنیری پلکیں اُٹھائیں۔

"اُف خداوند" وہ ایک بار پھر کانپ گئی۔ وہی آنکھیں دوسروں کے دلوں میں اُتر جانے والی آنکھیں۔ ارے منصور بیٹے میں بھی تو تھی تمہاری تخلیق میں۔ میں بھی تو تھی۔ پھر تم بالکل اس پر کیوں ہو۔ وہی آنکھیں، وہی ناک، وہی چہرے کی بناوٹ اور وہی چوڑے چوڑے شانے۔ ارے پگلے وہ نو ماہ میں نے کتنی اذیتیں اٹھائی تھیں۔

اور وہ کٹھن مرحلہ۔ موت اور زندگی کے درمیان ساحل پر کھڑے ہو کر چلنے کا مرحلہ۔ وہ لمحہ۔ وہ اذیت ناک اور قیامت خیز لمحہ۔ وہ لمحہ تو مجھ پر گزرا تھا منصور جب تم دنیا میں آئے تھے مگر تم اُس پر کیوں ہو" اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر رو دے

"ماما ویری گڈ۔ دیکھئے کتنا سعادت مند ہو جاتا ہے یہ آپ کے سامنے۔ خدارا آپ کچھ اور فرمایئے نا" خالد نے شرارت سے کہا تو وہ چونک گئی۔

"بس اتنا کافی ہے خالد۔ اس نے تو آگے سے کچھ بھی نہیں کہا" اس نے کہا۔

"میں کوشش کروں گا ماما" منصور شرما دیا۔

"ہائے میری بنّو" خالد اپنی شہادت کی انگلی منہ میں دبا

Nayab Azeem
Pakistanipoint.com

کر اس پر جھک گیا۔

"ارے بھئی خالد تم اسے تنگ نہ کیا کرو۔" وہ خالد سے بولی۔

"دیکھئے ماما۔ آپ اس کی اتنی سائیڈ نہ لیا کریں۔ میں جیلس ہونے لگتا ہوں۔ خالد نے کہا۔

"چل شریر۔"

وہ ہنس پڑی۔ اور تب وارڈن کے قدموں کی آواز پہ وہ دونوں بھاگ لیے۔

اس روز وہ دوپہر کے کام سے فارغ ہونے کے بعد حسن کے پاس سے ہو کر واپس آئی تو ابھی شام کی چائے میں دیر تھی۔ وہ ہوسٹل کے لان میں آ گئی جہاں کی گرم گرم دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس نے ایک درخت کے نیچے پاؤں پھیلا لیے اور ہاتھ میں پکڑا میگزین دیکھنے لگی۔ وہ چونکہ نہا کر آ رہی تھی۔ اس لئے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ بالوں کو کھول کر اس نے شانوں پر پھیلا لیا۔ رسٹ واچ پر نظر پڑتے ہی وہ رسالہ بند کرنے لگی ہی تھی کہ چند قدم قریب کھڑے منصور کو دیکھ کر چونک گئی۔

"ارے منصور کیا بات ہے۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ماما آپ کے بال کس قدر خوبصورت اور لمبے ہیں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"بہت شکریہ منصور۔ شکر ہے تم نے آج میری ذات کے بارے میں کوئی بات کی۔" وہ خوش سی ہو گئی۔

"ماما۔ ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گی؟"

"کہو۔" اس کا دل دھڑک کر رہ گیا۔

"ماما میں اگر کبھی کبھی آپ سے باتیں کر لیا کروں تو آپ برا تو نہیں منائیں گی نا؟"

"سارے۔" وہ ہنس پڑی۔

"ارے پگلے۔ تجھ سے بات کرنے کے لئے تو اتنی ریاضتیں کی ہیں۔ گھر بار چھوڑ کر تیرے لئے یہاں آئی ہوں۔ وہ سوچنے لگی۔

"ماما بتاؤں ابھی میں کیا سوچ رہا تھا؟"

"کیا سوچ رہے تھے؟"

"میں سوچ رہا تھا ماما کہ اگر میں شاعر ہوتا تو آج آپ کی زلفوں پر دو چار شعر ضرور کہہ بیٹھتا۔"

"واہ بھئی یہ بھی خوب رہی۔" وہ ہنس دی۔ زندگی سے بھرپور ہنسی۔ اس کا بیٹا، اس کا لخت جگر، اس کا لہو کیسے چپکے چپکے خود بخود اس کی زندگی میں داخل ہو رہا تھا۔

"ماما میری ممی کے بال بھی شاید ایسے ہی ہوں گے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔" وہ دکھ سے بولی۔

"ارے منصور۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ وہاں مجھے کتابوں کے ڈھیر میں ڈال آئے۔" خالد نے پکارا۔ تب اس نے اپنے بال سمیٹ لئے اور کندھوں پر پڑی شال کو درست کیا۔

"اوہ ماما۔" خالد نزدیک آ گیا۔

"یو آر لوکنگ ویری اسمارٹ ماما۔ ہائے کاش میری ممی بھی اتنی اسمارٹ ہوتیں۔" خالد نے اپنا دل پکڑ لیا۔

"خالد ڈونٹ ٹاک لائیک دس۔ ماما سے ایسے جوک نہیں کیا کرو۔ منصور نے کہا۔

"ارے واہ۔ کیوں نہ کیا کروں۔ ماما مجھے اپنی ممی کی طرح عزیز ہیں اور ممی کے ساتھ میں اس سے بھی بڑے جوک کر لیتا ہوں۔"

"مگر دیکھو ماما کے ساتھ نہ کیا کرو۔" منصور سنجیدگی سے بولا۔

"کیوں؟" خالد نے کندھے اچکائے۔

"بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔ دیکھو ماما کتنی ڈیسنٹ اور سوئیٹ ہیں۔ ایسے جوک ان کے ساتھ سوٹ نہیں کرتے۔"

"اچھا بھئی بچو سی یو آن ڈنر ٹیبل۔" وہ وہاں سے چل دی۔

"سی یو ماما۔" خالد نے ہاتھ ہلایا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

شام کو وہ گھر لوٹی تو حسن ڈیلی نیوز کے پیچھے چھپے بیٹھے تھے۔ اس نے جاتے ہی حسب عادت انہیں چائے بنا کر دی اور ان کے پاس لحاف میں آ بیٹھی۔

"اب آپ کیسا فیل کر رہے ہیں حسن۔ درد کم ہوا یا نہیں؟"

"بیگم ہم نے بارہا آپ کو بتایا ہے۔ جب آپ سامنے آ جاتی ہیں تو ہم ایک دم سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

"آج آپ نے کس بات نہیں لیا؟" اس نے ان کی بات اڑا کر پوچھا۔

"نہ موڈ ہی نہ بنا۔" انھوں نے بائیں ہاتھ کو اس کی گردن کے گرد حمائل کر دیا۔

"آج کی خاص نیوز؟" ڈیلی نیوز پر نظر پڑتے ہی اس نے حسب عادت پوچھا۔ روزانہ وہ اسے خاص نیوز بتا دیتے تھے۔

"بیگم کرن جب غسل کر کے نکلیں تو سیاہ شال اور چیک کی ساڑھی میں بے حد بھلی لگ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کلیوں نے جل کر آنکھیں موند لیں اور پھولوں نے ٹہنیوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور حسن علی دل تھام کر رہ گئے۔"

"حسن۔" وہ گلابی ہو گئی۔

"حسن کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ بچیاں جوان ہو رہی

ہیں اور آپ؟"

"ہم بھی ابھی کون سے بوڑھے ہو گئے ہیں کرن۔ اور پھر محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی کرن یہ سدا جوان رہتی ہے۔" حسن بڑے موڈ میں تھے۔

"حسن یہ سب تو گزرے زمانے کی باتیں ہیں جب یہ باتیں سن کر دل دھڑک جایا کرتا تھا۔ اب تو یہ باتیں بھی سراب لگتی ہیں۔" اس نے دھیرے سے سوچا۔ تب ہی منصور اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

ایک آہ اس کی زبان پر لرز کر رہ گئی۔ حسن نے اپنے بازو کے نیچے دبی اس کی گردن پر اس لرزنے کی کیفیت کو محسوس کیا۔

"تمہاری کیسی طبیعت ہے کرن؟"

"ٹھیک ہوں۔ بس ذرا آج جلد نیند آ رہی ہے۔"

"اوہ تو سو جاؤ نا کرن۔" حسن نے کہا تو وہ واقعی کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

جب وہ دنیا میں آئی تو پورے دس روز بعد اس کی ممی مر گئی تھیں۔ اس کے پاپا بہت سنجیدہ اور حساس آدمی تھے۔ وہ اس کی ممی سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ لوگوں نے کتنا سمجھایا کہ دوسری شادی کر لو۔ مگر انہوں نے کسی کی نہ سنی اور خود کو غموں میں ڈبو دیا... وہ آیا کی گود میں بھٹکتی رہ گئی۔

وہ آفس سے تھکے ہارے آتے تو وہ بھاگ کر ان کی باہوں میں سمٹ جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ پاپا اسے یونہی چمٹائے رہیں کہ یہ قربت یہ لمس کتنا اچھا تھا۔ مگر چند لمحوں بعد تھکے ہارے پاپا کھانے کے لیے چلے جاتے اور پھر بوتل پی کر اپنے بستر پر گر جاتے۔ وہ ان کو تلاش کرتی وہاں جاتی تو وہ بے سدھ ہوتے۔ رفتہ رفتہ اس نے ان کو تلاش کرنا چھوڑ دیا۔

بلکہ خود اپنی تلاش میں نکل گئی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا جب پاپا اسے کونوینٹ داخلے کے لیے لے کر گئے تھے تو وہ کتنی خوش تھی۔ لمبی لمبی راہداریاں اور برآمدے کراس کرنے کے بعد وہ آفس میں پہنچے تو سفید مقدس لباس میں لپٹی مدر اسے بے حد بھلی لگی۔ پاپا فارم بھر رہے تھے اور وہ ان کا ہاتھ چھڑا کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی تھی۔ چناروں، سرو، لیموں اور کھٹوں کے درختوں سے بھری عمارت میں حد درجہ خاموشی تھی کیونکہ چھٹیاں تھیں۔

"ہم بچوں کو بے حد محبت سے پڑھاتے ہیں۔" مدر کی آواز پر وہ چونک گئی۔

"محبت" یہ لفظ چھناکے سے اس کی سماعت سے ٹکرایا اور اس نے سوچا۔

آیا بی جب گود میں لیتی ہیں تو کہتی ہیں میں تجھ سے بڑی محبت کرتی ہوں۔ پاپا جب لمحہ بھر کو اسے اپنی باہوں میں بھرتے تو اس کے رخسار چومتے ہوئے کہتے کرن بیٹا تو کیا جانے میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

اور ممی کا وہ لمبا سا پورٹریٹ جو برآمدے میں لگا ہوا تھا، ایک بار اس نے پاپا سے پوچھا تھا کہ پاپا یہ کون ہیں؟"

تو پاپا نے جواباً کہا تھا "یہ محبت کا سمبل ہے۔"

اور اب مدر بھی محبت کا ذکر کر رہی تھیں۔

یہ محبت کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

یہ مفہوم بہت دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا۔ جب وہ سینیئر کیمبرج کر کے آگے پڑھائی کا پروگرام بنا رہی تھی۔ تبھی ایک روز جولی جو اس کی بے حد اچھی اور اکلوتی دوست تھی اس نے کیک کاٹنے کے بعد اسے گانا سنانے کو کہا تھا۔ جولی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پورے آٹھ ماہ بعد اپنی سالگرہ منا رہی تھی۔

"ارے جولی ہرگز نہیں میں اتنے زیادہ لوگوں کو قطعاً فیس نہیں کر سکوں گی۔" اس نے انکار کر دیا۔

"دیکھو کرن پلیز۔" جولی نے ہاتھ جوڑے۔

"اف وہ جولی بعض اوقات قطعی احمق ہو جاتی ہو۔ ضرور فلمی جیسی سچویشن پیدا کرنا چاہتی ہو۔"

"ہاں یہی سمجھ لو۔" جولی نے کہا۔

"مگر ایسے موقعوں پر تو ہیرو بھی ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہیرو بھی ہے۔"

"کون ہے؟ کہاں ہے؟" وہ اچھل پڑی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ مگر جولی کا منگیتر ایڈورڈ نظر نہ آیا۔

"بعد میں ملواؤں گی۔ پہلے جلدی سے "جب گھور اندھیرے چھائے ہوں" سنا دو۔"

"اتنا ٹریجڈی نغمہ سنو گی!"

"ہاں۔" جولی نے کہا۔

"چلو تو میرا کیا جاتا ہے۔ اچھا ہے تمہارے مہمان روتے ہوئے جائیں گے اور اگلی بار ہرگز نہیں آئیں گے۔ پھر تمہاری یہ ہر سال تحفے جمع کرنے کی خواہش ادھوری رہ جائے گی۔"

"پرواہ نہیں۔" جولی نے کہا۔

"گویا نہیں مانو گی۔"

"نہیں۔" جولی نے ہنس کر کہا اور تب اس نے اپنے مہمانوں سے ٹریجڈی سانگ پر معذرت کرنے کے بعد "جب گھور اندھیر

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

.... سنایا۔ اور جب وہ ہزاروں تالیوں کی گونج میں بیٹھی تو خواہ مخواہ ہی گلابی ہو گئی ۔ اور ریفریشمنٹ کے وقت جولی نے اسے گھسیٹا۔

"کہاں؟" وہ تنک کر بولی۔

"آؤ نا تمہیں ہیرو سے ملواؤں۔" وہ اس کا ہاتھ گھسیٹتی ہوئی بولی اور ایک میز پر لے گئی۔ لمبے سے چوڑے شانوں والے زین سے وہ بڑی بے دلی سے ملی۔ اس طرح کے سنتو لے سلیے لوگ اسے کبھی بھی پسند نہ آئے تھے۔

"یہ زین ہیں بھئی بڑے اونچے اونچے چھکے لگاتے ہیں۔"

اس کے کندھے تھپکانے پر جولی نے دوبارہ تعارف کرایا۔

"اوہ زین!" اسے کرکٹ کا یہ پلیئر اپنی تصویروں کے مقابلے میں خاصا یونگا لگا۔ مگر چونکہ وہ خاصا مشہور پلیئر تھا اس لئے وہ لحظہ بھر کو اس سے مرعوب سی ہو گئی۔

"اور یہ میری دوست ہیں کرن۔" جولی نے کہا اور لڑکوں میں گھس گئی۔

"کرن۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"روشنی کی کرن ہو نا؟" وہ ایکدم ہی بے باک ہو گیا تھا۔

"کیا اندھیرے کی بھی کرن ہو سکتی ہے؟" وہ تنک کر بولی

اس پہلی ملاقات میں اس نے ....

اتنی خوبصورت باتیں کیں کہ اس شام جب وہ لوٹ رہی تھی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی کوئی چیز زین کو دے آئی ہو۔

دوسری بار وہ اسے پلے گراؤنڈ میں ملا۔ جہاں اس کا ٹیسٹ میچ تھا اور جولی جو اس کی بہت بڑی فین تھی اسے بھی ہمراہ گھسیٹ کر لے گئی۔

جب میچ جیتنے کے بعد وہ سینکڑوں لڑکیوں کے ہجوم میں کھڑا تھا اور انہیں آٹوگراف دے رہا تھا تو اس کے پہلو میں کھڑے کھڑے وہ بے حد مغرور ہو گئی۔

آہستہ آہستہ وہ زین کے قریب آتی گئی۔

جولی اسے زین کے قریب پاکر بڑی حیران رہ جاتی۔ وہ خود بھی زین کی دیوانی تھی وہ اسے کہا کرتی۔

"یو آر ویری لکی کرن دیکھا میں نہ تمہیں کہتی تھی کہ تمہارا نام اتنا اچھا ہے کہ تمہاری زندگی میں روشنی کی کرنیں ضرور بکھریں گی۔"

"او جولی۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ روشنی کی کرن اندھیرے میں نہ بدل جائے۔"

"زین کی بات کرو۔ اس کا مستقبل بہت برائیٹ ہے۔"

جولی بات بدلتی۔

"ہاں ہے تو۔" وہ ہنس دی۔

"وہ اتنے اونچے اونچے چھکے لگاتا ہے کہ گیند باؤنڈری وال سے کہیں دور جاکر گرتی ہے اور واپس ملتی ہی نہیں۔" جولی نے کہا۔

"مجھے اسی لئے تو اس سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟" جولی چونکی۔

"کسی دن کہیں اتنی ہی اونچی ہٹ وہ مجھے نہ لگا دے کہ میں واپس باہر میدان میں آ ہی نہ سکوں۔"

ادھر سیاہ گہری آنکھوں والا زین اس کی روح میں اترتا چلا جا رہا تھا اور اس لمبے اور بے ترتیب سے انسان کے ہمراہ گھومتے ہوئے وہ ہمیشہ بے حد مغرور ہو جایا کرتی۔ زندگی کا آدرش تکمیل پا گیا تھا۔ وہ روشنیوں کی متلاشی تھی۔ زین کے ہمراہ روشنیاں ہی روشنیاں تھیں تابناک مستقبل تھا۔ امریکہ، کینیڈا اور ایسے ہی بہت سے خوبصورت ملکوں کے ٹور کا پروگرام تھا۔ پہلے وہ ہمیشہ پاپا سے لڑا کرتی کہ انھوں نے کیا سوچ کر اس کا نام کرن رکھا تھا۔ پاپا اپنی مچی مچی اور نشے سے بوجھل آنکھیں بمشکل کھول کر اسے دیکھتے اور اسے بتاتے۔

"میری زندگی سائرہ کی موت کے بعد بالکل تاریک ہو گئی تھی، اس وقت میں زندگی کی ساری بازیاں ہار گیا تھا۔ تب تمہارے ننھے منّے وجود نے ایک روز مجھے چونکا دیا۔"

"پھر پاپا۔" وہ ان کے زانو پر سر رکھتی۔

"پھر۔" وہ گہری سانس لیتے۔ "آیا نے کہا تھا کہ صاب آپ ہوش بھلائے بیٹھے ہیں۔ یہ دیکھئے چھوٹی سی سائرہ آپ کی محبت مانگ رہی ہے۔ آپ نے ابھی تک اس کا نام بھی نہیں رکھا۔"

"تب آپ نے میرا نام کرن رکھ دیا ہو گا۔"

"ہاں۔ مگر تجھے کس نے بتایا؟" پاپا شرارت سے پوچھتے۔

"بھئی آپ نے ہی تو بتایا تھا۔" وہ ہنس دیتی۔ مگر اب اس نے پاپا سے لڑنا چھوڑ دیا تھا کہ انھوں نے اس کا نام کرن کیوں رکھا۔ اسے اچانک ہی اپنا نام بہت اچھا لگنے لگا۔ اسی لئے جب زین کسی میچ میں آؤٹ ہو جاتا اور منہ بسورتا ہوا آتا تو وہ اس پر خوب ہنستی۔

"ارے واہ یہ وکٹ اتنی کمزور تو بظاہر معلوم نہیں دیتی مگر گری کیسے۔"

"دیکھو کرن پلیز جوک نہ کرو۔" وہ بے دلی سے بولا۔

"کیوں نہ جوک کروں۔ تم اتنے بروکن ہارٹڈ ہو رہے ہو میں بھی ہمراہ رونا شروع کر دوں گی تو؟"

"کرن۔" وہ واقعی بڑا سیریس تھا۔

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

"جی فرمائیے۔" وہ اس کے سامنے جھک جاتی۔

"کرن۔ ایمان سے سخت بیزاری ہو رہی ہے۔ چلو کہیں آؤٹنگ کے لئے چلیں۔"

"پہلے اپنا موڈ ٹھیک کرو۔"

"یہ تم پر چھوڑا۔" وہ ہنس دیا۔

"دیکھو زین اس طرح دل نہ چھوٹا کرو۔ میرے نام کا مطلب جانتے ہو؟"

"ہاں بخوبی۔"

"جب روشنیاں تمہارے ساتھ ہیں زین تو پھر کاہے کو گھبرانا۔ اب تو کامیابیاں تمہارے قدم چومیں گی اور ایک دن تم قومی ٹیم میں سلیکٹ ہو جاؤ گے۔" اس نے ایک دم سے اکڑ کر کہا۔

"واہ۔" زین ہنس دیا۔ مگر تب وہ ایک لمحے کو گھبرا گئی۔ ڈر گئی کہ یہ لاابالی اور جذباتی انسان کہیں اسے چھوڑ نہ جائے کیونکہ اس نے سنا تھا کہ ایسے لوگوں کو جب ترقیاں اور کامیابیاں ملتی ہیں تو وہ بڑا اونچا اڑنے لگتے ہیں۔ اسے ہمیشہ سے زین سے اس نکتے پر خوف سا محسوس ہوتا تھا۔

ایک دن جب وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے ہوسٹل پہنچی تو وہ سوئمنگ کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ پانی سے نکل آیا۔ اور جلدی سے کپڑے پہن آیا۔ اس نے دیکھا نیوی بلیو سوٹ اور آسمانی ٹائی میں وہ کافی نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ کپڑوں کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے بے حد بے ڈھنگا اور بے ترتیب رہا تھا۔ اُلٹے سیدھے اور اَن میچنگ کپڑے پہن کر اس سے تعریف کروایا کرتا تھا۔ وہ زبردستی تعریف کرنے کے بعد ہمیشہ اس کی خامی نکالتی۔ مگر آج وہ اس سُوٹ میں کافی جچ رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا نظر لگاؤ گی؟"

"ہاں۔" وہ بڑے پیار سے بولی۔

"کوئی خامی نہیں نکالو گی؟"

"نہیں تم واقعی آج بے حد اسمارٹ لگ رہے ہو۔" اس نے چپکے سے کہا اور پھر وہ دونوں ریلنگ کے پاس کھڑے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

"سنو کرن۔ میں نے آج کل پریکٹس زیادہ کر دی ہے۔"

"بہت اچھا ہے۔ اسی لئے اسمارٹ ہو رہے ہو۔" اس نے کہا۔

"اب کی بار انشاءاللہ بہت اچھے کھیل کا مظاہرہ کروں گا اور پھر تم دیکھنا میرا نام پورے پاکستان میں لوگ فخر سے لیں گے۔" اس نے سینہ تان کر کہا۔

"پھر۔" وہ دلچسپی سے بولی۔

"پھر ایسے ٹھاٹ کھیلوں گا کہ ۔۔۔" وہ ہنس دیا۔

"کسی دن مجھے نہ آؤٹ کر دینا زین۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہیں یہ کیا بکواس ہے۔" وہ بے حد فکری ہو رہا تھا۔

"بکواس نہیں حقیقت ہے۔ زین تمہارا فیوچر واقعی بڑا تابناک ہے۔ مجھے جانے کیوں ڈر سا لگتا ہے۔ کل کبھی بلندیوں پر پہنچ کر تم مجھے جھٹک کر دیکھو بھی نہ۔" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"اوہ کم آن کرن کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔ پھر میں ممی سے جا کر بات کروں گا۔ اچھا خاصا موڈ ستیاناس کر دیا۔ چلو چائے پیتے ہیں مگر بل تمہاری طرف کہ اپنی جیب خالی ہے۔"

"اور وہ پانچ سو روپے کہاں گئے؟" وہ زور سے بولی۔

"کون سے والے؟"

"وہ جو تمہارے پاپا نے چیک بھیجا تھا۔"

"وہ تو ہفتہ ہوا خرچ ہو گئے۔ آج کل تو ادھار پہ گزارہ ہے۔"

"ہائے فیوچر کے مشہور کرکٹر کا آجکل کیا بُرا حال ہے۔" وہ ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"چلو پلائے دیتی ہوں مگر تم پلیز سنجیدہ ہو جاؤ۔ بالکل ٹین ایجرز کی سی حرکتیں کرتے ہو۔" اس نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھایا۔

"اچھا جی۔" وہ جھک گیا اور وہ ہنس پڑی۔

○

اور اس روز ریلنگ کے سہارے کھڑے ہو کر وہ بہت لمبے لمبے ڈائیلاگ بول کر اس سے اظہارِ عشق کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ آج کراچی جا رہا تھا۔ اس کی جذباتی باتیں سن کر وہ جلی جا رہی تھی کہ بھلا اس کی کیا تُک ہے۔

"تم تو مجھے بھی بینڈ کئے دے رہے ہو زین۔ بھلا پندرہ بیس روز کی تو بات ہے۔ پھر تم آ جاؤ گے۔" اس نے کہا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں کرن۔ آخر تم میرے دل کی حالت کیوں نہیں سمجھ رہی ہو؟"

"زین۔" وہ چونک گئی۔ محبت اس کو کہتے ہیں۔ محبت کا مفہوم آج سمجھ میں آیا تھا۔ جب یہ البیلا اور پاکیزہ جذبہ اس میں سرایت کر چکا تھا۔

مگر محبت کا مفہوم سمجھانے والا یہ جذباتی اور لاپرواہ لڑکا سراب نکلا۔ جو اس کی زندگی کے سارے رنگ چرا کر لے گیا تھا۔ جو اس پر اپنی محبتیں لٹاتا تھا اور کرتے کرتے اس کا سب کچھ لوٹ لے گیا تھا۔ مگر وہ پُراعتماد اور پُرسکون تھی۔ ایک نہ ایک دن تو ضرور اس کا ہونا ہی ہے۔

وہ کراچی چلا گیا اور پھر کبھی نہ لوٹا۔ اس نے اس کا کتنا ہی

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

انتظار کیا۔ اخباروں میں اس کے بارے میں پڑھتی۔ اسے اس سے اس طرح کی لاپرواہی کی امید نہ تھی۔ وہ جو روشنیوں میں گھر گئی تھی واپس اندھیروں میں بھٹک گئی۔ واپسی بہت جلدی ہو گئی تھی۔

مگر ان تھوڑے سے لمحوں نے اس کا سب کچھ چھڑا لیا تھا۔

اسے جب پتہ چلا جب وہ ڈاکٹر کے پاس اپنی گرتی ہوئی صحت لے کر گئی۔ ڈاکٹر نے اسے ماں بننے کی خبر سنائی تھی۔ ڈاکٹر کے لب بڑے مدھم تھے۔ دھماکا بہر حال ہو گیا تھا۔

اس نے فوراً ہی زین کو تار دیا اور نام کی جگہ صرف "K" لکھ دیا۔ ایک ویو کارڈ جواب میں ملا جس پر لکھا تھا آئی ایم سوری کرن میں نے یہاں آکر اپنی ٹیم کے منیجر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی تم نے غائبانہ خبر نہیں سنی ورنہ تار کے پیسے خرچ نہ ہوتے۔ تمہیں پتا ہے مجھے اپنے کھیل سے جنون کی حد تک پیار ہے۔ وہ لڑکی کیسی ہے یہ کیا لکھوں کہ یہاں بھی کھیل آڑے آگیا۔ فیوچر کو چمکانے کے لیے مجھے بہر حال کوئی نہ کوئی قدم تو اٹھانا ہی تھا نا۔ مجھے امید ہے تم مجھے معاف کر دو گی۔ اور رہی بچے کی بات تو کسی اچھی سی لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرو۔ آسانی سے بچ جاؤ گی۔ — سی یو۔"

"اوہ" وہ زور سے چیخی اور اپنے بیڈ پر اوندھے منہ گر پڑی۔ اتنی بلندیوں سے گرنے کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ ویو کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس نے آتش میں پھینک دیئے۔

اندھیرے، سیاہ اندھیرے سایوں کی طرح اس کی طرف لپک رہے تھے مگر روشنی کی کوئی کرن نہ مل پا رہی تھی۔ تب حالات سنبھالنے کے لئے اس نے آپا بی کو اعتماد میں لے لیا۔ وہ کسی دائی کے پاس لے گئیں مگر ٹوٹنے ٹوٹکے کسی کام نہ آئے اور وقت بہت تیزی سے گزر گیا۔

چلچلاتی گرمیوں کی ایک دوپہر میں آپا بی اسے لے کر پہاڑوں پر آگئیں کہ پاپا نے بخوشی انہیں دو ماہ رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ اور تب وہ اذیت ناک لمحہ بھی گزر گیا۔ اس نے طوفان کے بعد گہری سانس لینے کے بعد آنکھیں کھولیں تو سفید لباس والی نرس مسکرا دی۔

"بیٹا مبارک ہو مادام!"

"بیٹا۔!" اس نے آنکھیں میچ لیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لمبی لمبی قطاریں دامن کو بھگو رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر اس بچے کو بھی نہ دیکھا جو اس کے پہلو میں پڑا مچل رہا تھا۔ ممتا کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ مگر وہ اس وقت بہت جابر ہو گئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کو بھی اسے نہ دیکھا اور سو گئی۔

آنکھ کھلی تو آپا بی نے بتایا کہ وہ اس کو ایک لاوارث بچوں کے ادارے کے سپرد کر آئی ہیں۔ پہلو میں ممتا تڑپ کر رہ گئی۔ نو ماہ تو صدیاں بن کر گزرے تھے۔ اور اب ان صدیوں کو بتانے کے بعد اذیتوں سے گزرنے کے بعد یہ صلہ ملا تھا کہ اس نے اپنے خون سے سینچا ہوا وہ ننھا منا بچہ کسی اور کے دامن میں ڈال دیا تھا۔

وہ واپس لوٹی تو نڈھال تھی۔ جولی نے نیوز میں زین کی شادی کا پڑھ لیا تھا۔ اس کی شکستہ حالت پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی مگر وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی خاموش تھی۔

اس نے اپنی آنکھوں کے سوتے خشک کر ڈالے تھے۔

کہ اب دیکھنے کو اور کیا تھا۔

ساری اذیتیں، سارے دکھ گزر گئے تھے۔

بچے کی بات اس نے جولی کو بھی نہیں بتائی تھی کہ بدنامی کا کلنک تو لگ ہی چکا تھا مگر اسے مشتہر کیا کرنا۔

تب ایک دن اس نے اخبار میں پڑھا کہ زین کسی حادثے کا شکار ہو کر اچانک مر گیا۔ اخبار میں اس کی بہت بڑی تصویر تھی اور نیچے حادثے کا حال۔

ایک عجیب سی کیفیت اس پر گزر گئی۔

دکھ و رنج کی کیفیت یا شاید خوشی کی کیفیت۔

"تو گویا کسی کو دکھ دینے والے خود بھی خوش نہیں رہتے!"

اس کے شکستہ وجود کو جیسے کسی نے جوڑ دیا

اس نے بڑی لاپرواہی سے یہ خبر پڑھی اور دھیرے سے مسکرا دی۔

"اوہ ویری سیڈ کرن!" جولی نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے حیرت سے جولی سے کہا۔

"تمہیں نہیں پتا کرن وہ زین" جولی رو دی۔

"ہاں میں نے خبر پڑھی ہے!" اس نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ اس نے تم سے بے وفائی کی ہے کرن مگر وہ کتنا اسٹرونگ کتنا جوان تھا!" جولی بڑی افسردہ تھی۔

"تم نہیں جانتیں وہ شخص کتنا عجیب تھا!" اس نے کہا۔

"تم اب بھی اس سے متنفر ہو کرن۔ دیکھو اسے معاف کر دو۔ ہولی کرائسٹ اس پر رحم کرے۔ اسے اپنے کیے کی کتنی بڑی سزا مل چکی ہے!" جولی نے سینے پر کراس بنا کر کہا۔

"نہیں۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میرا اور اس کا معاملہ تو اب قیامت کے دن خداوند کے حضور طے ہو گا۔ اس نے سختی سے کہا۔

"اوہ!" جولی نے سر جھکا دیا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

اور یوں وہ اور مضبوط ہو گئی۔ پرانی ڈگر پر چلنے کی عادی تو تھی ہی۔ بڑی آسانی سے وقت گزر رہا تھا۔ اسے دنیا کے ہر مرد سے نفرت ہو گئی تھی۔ پاپا سے اس نے صاف کہہ دیا تھا وہ شادی نہیں کرے گی اور اگر کرے گی تو بہت بعد میں۔

مگر یہ محبت کا مفہوم بڑا مہنگا پڑا کہ کسی بھی ننھے منے بچے کو دیکھ کر اسے وہ یاد آجاتا۔ جانے کتنا بڑا ہو گیا ہوگا۔ کوئی اسے پیار بھی کرتا ہوگا کہ نہیں۔

اذیت ناک سوچیں عموماً اسے چونکایا کرتیں۔ وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی مگر پھر سنبھل جاتی کہ اس بچے کے ساتھ وہ بھی تو منسلک تھا۔

وہ جو اونچے چھکے لگا کر گیند کو باؤنڈری وال سے نکال باہر کرتا تھا۔۔۔ اس نے ایک ہی ہٹ میں اسے اتنی بلندیوں سے نیچے پھینک دیا تھا اور

ا وہ زندگی کے میدان سے بہت دور پڑی سسک رہی تھی مگر اسی وقت جولی نے اس کڑے وقت میں اسے سنبھال لیا۔ وہ ہر لحظہ اسے اپنے قریب رکھتی۔ اسے گھماتی پھراتی اور دن بھر ہنسی سے بھرپور کومک سناتی۔ مگر وہ بالکل بدل چکی تھی۔ جولی عموماً چڑ جاتی تو کہتی

”تم یونہی اندھیروں کی شائق رہو گی کرن تو تمہاری زندگی میں روشنی کبھی نہیں ہو گی۔“

”مجھے پتہ ہے جولی۔ ویسے بھی اگر میں روشنیاں کہیں سے قرض مانگ بھی لوں تو میری زندگی میں روشنی کبھی نہیں ہو گی۔“ وہ مسکرائی۔

”پلیز کرن۔ اجالوں کی طرف لپکو۔ قدم قدم پر روشنیاں تمہیں تھام لینے کو کھڑی ہیں۔“

”سب سراب ہے جولی۔ اور پھر میں یونہی تو اندھیروں سے پیار نہیں کرتی۔ اصل میں بتاؤں کیا بات ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ جمائے آگے جھکی۔

”کیا بات ہے؟“ جولی ایک دم ہی آگے کی طرف جھکی کہ شاید وہ کوئی نئی بات بتانے والی ہے۔“

اصل میں پاپا بتاتے ہیں کہ اسی شام گھر کا فیوز عین اس وقت اڑ گیا تھا جب میں نے دنیا میں قدم رکھے۔ پاپا کہتے ہیں اسی سمے ممی کے کمرے کے چاروں اور بڑا گھور اندھیرا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر اور نرس بھی سخت نروس ہو گئی تھیں۔“

”پلیز کرن۔“ جولی اکتا گئی۔

”تمہیں پتہ ہے کرن یہ بات تم نے مجھے پہلے کتنی بار بتائی ہے؟“ جولی نے کہا۔

”یہی کوئی دس پندرہ دفعہ۔“ اس نے لاپروائی سے کہا۔

”یہ بات مجھے زبانی یاد ہو گئی ہے۔ بھئی گھر کا فیوز ہی اڑا تھا نا کوئی قیامت تو نہیں آئی تھی۔“

”ہاں قیامت اس کے بعد آئی تھی۔“

”کیا؟“ جولی پھر چونک گئی۔

”اس کے بعد دس دن ہی گزرے تھے کہ ممی مر گئی تھیں جولی۔“ وہ بولی۔

”کرن مائی ڈیر کرن۔ یہ تم نے اس حادثے کو اپنے اوپر اس قدر کیوں مسلط کر لیا ہے۔ دنیا میں تمہیں ایسے بہت سے بچے ملیں گے جن کے ماں باپ دونوں انہیں ان کی پیدائش کے فوراً بعد ہی چھوڑ جاتے ہیں۔“

”تو یہ کیسے جیتے ہوں گے وہ لوگ؟“

”بڑے ٹھاٹ سے جیتے ہیں۔“ جولی نے کہا۔

”ہاں ہم بھی تو جی ہی رہے ہیں۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”کیا منگواؤں؟“ بیرے کو قریب پا کر جولی نے میز تلے اس کا پاؤں دبایا۔

”چائے منگوا لو۔“ وہ چونک گئی۔

”مگر میرا آئس کریم کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔“

”تو تم اپنے لئے منگوا لو۔ کیونکہ میں نزلہ، زکام و انفلوئنزا کی بیک وقت شکار ہو رہی ہوں اس لئے میرے لئے چائے۔“

”ارے چھوڑو نزلے کو۔ تم بھی آئس کریم کھاؤ۔“ جولی نے کہا۔

”پاپا چٹیا سے پکڑ کر باہر کر دیں گے۔ میری صحت کے معاملے میں وہ بہت سخت ہیں۔“

”گویا پاپا سے ڈرنے لگی ہو۔“

”وہ تو ہمیشہ سے ڈرتی ہوں۔ آپا جی تو تھر تھر کانپتی ہیں۔“

”ہوں۔“ جولی ہنس پڑی اور چائے کا آرڈر دے دیا۔

اس شام وہ ووڈ ورک کی کلاس اٹینڈ کر کے لوٹی تو بہت فریش تھی۔ جولی نے راستے میں عین اختر کی کیسٹ سنائی تھی اور وہ دونوں اس کیسٹ سے بہت محظوظ ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے بیڈ پر اوندھے منہ گرتے ہوئے اس لفافے کو بالکل نہ دیکھا جو بستر پر پڑا تھا۔ آپا بی کو چائے کے لئے بلایا تو انہوں نے اسے اس لفافے کی طرف متوجہ کیا۔

”دیکھنا بیٹا یہ کس کا خط ہے؟“ آپا بی نے کہا تو لفافے پر آپا بی کا نام پڑھ کر وہ دھیرے سے ہنس دی۔

”بھئی کیا بات ہے آپا بی آج کل بڑی چٹھیاں آرہی ہیں۔ کل ہی تو آپ کی بیٹی کا خط آیا تھا۔ اس نے شرارت سے کہا۔ اور تب مسکراہٹ اس کے لبوں میں ہی دبی کی دبی رہ گئی۔ اندر سے نکلنے والے لیٹر پیڈ پر اس ادارے کا نام چھپا ہوا تھا جہاں وہ اپنا ماضی چھوڑ آئی تھی۔ اس نے بے حد شکستہ لہجے میں دھیرے سے خط

پڑھا، منصور کو ان لوگوں نے کسی ایسے والدین کے سپرد کر دیا تھا جن کے اولاد نہ تھی اور انھوں نے ان والدین کا پتہ بھیجا تھا۔

"کس کا خط ہے؟" آپا نے پوچھا۔ اس نے دھیرے سے پلکیں اُٹھائیں۔ نمی پلکوں تلے تیزی سے اُبھر رہی تھی۔ اس کا بچّہ منصور۔ وہ گول مٹول سا دس پونڈ کا بچّہ جس کی شکل بھی اس نے نہ دیکھی تھی۔ ہاں صرف ایک صدا، ایک آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونجتی تھی۔ جو اس نے دنیا میں آتے ہی اپنی آمد کے اعلان کے لئے لگائی تھی۔

"کس کا خط ہے، بتاتیں کیوں نہیں؟" آپا نے اس کے کانپتے وجود پر نظر ڈال کر گھبرا کر کہا مگر وہ کچھ نہ بولی۔ جانے کیسے آپا جان گئی۔

"ان لوگوں کا خط ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے؟" آپا اس کی روح میں جانے کیسے اندر تک چلی گئی تھی۔

"وہ ٹھیک ہے۔ انھوں نے اطلاع دی ہے کہ انھوں نے اسے کسی کو دے دیا ہے۔ وہ تڑپ تڑپ گئی۔

آپا دبے پاؤں باہر نکل گئیں۔ اب بے جان اور بوجھل وجود کو...... سمیٹتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پرچے کو پڑھا اور منصور کے نام کو غور سے دیکھنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی بچّہ باہیں پھیلائے ہمک ہمک کر اس کی طرف بڑھ رہا ہو۔

"منصور، میرے بچّے۔" وہ اس کے نام پر لب جما کر سسک پڑی۔

اور پھر۔ ایک بار پھر ہلچل مچ گئی۔ تلاطم پھر زور مارنے لگا۔ مگر وہ اتنی پُراعتماد اور مضبوط لڑکی تھی کہ اس نے خود کو کرچی کرچی نہ ہونے دیا۔ اس نے ضبط کے تمام پل صراط بڑی آسانی سے طے کر لئے۔ وہ دن بھر جولی کے ہمراہ مگن رہتی اور رات کو اپنے بچے سے باتیں کیا کرتی۔ اور پھر پاپا بھی ایک روز ساتھ چھوڑ گئے۔ اس روز وہ جولی کے ساتھ شاپنگ کرنے آئی تھی۔ دل تھا کہ خواہ مخواہ ہی مچل رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید.... اس کا بچّہ ضرور بے چین ہے۔ وہ رو رہا ہو گا۔ تبھی اس کی ممتا تڑپ رہی ہے۔ اس نے جولی کی پرواہ کئے بغیر کئی چھوٹے چھوٹے ننھے منّے کپڑے خرید لئے۔

"ایڈوانس بکنگ سمجھ میں نہیں آئی۔" جولی نے کہا۔

"پھر کبھی بتاؤں گی۔" اس نے گاڑی کی پشت سے سر ٹکا دیا اور جب وہ اُتری تو گھر میں انتہا سے زیادہ خاموشی تھی۔ تب اسے آپا نے بتایا کہ پاپا کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ وہ تقریباً بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو پتہ چلا کہ پاپا مر گئے ہیں۔ اس آخری اور واحد سہارے کے چھن جانے پر وہ تنہا کھڑی سوچ رہی تھی۔ "کیا اندھیارے اتنے دبیز اور گہرے ہوتے ہیں؟" مگر جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ ہاں جینے کی آس رہ گئی تھی۔

زہر لگتے ہوئے لمحات اُسے ڈس رہے تھے۔

چاروں اور جیسے آگ بھڑک آئی تھی اور اب تلوے چاٹ رہی تھی۔

صحرا کی ریت آنکھوں میں دھنس رہی تھی۔

مگر سکون کی منزل کی اب بھی تلاش تھی۔ اس روز پاپا کے سانولے سلونے سنجیدہ سے سیکریٹری سے حساب کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ خود بھی رو دیا۔

"حسن صاحب کمال ہے مرد بھی روتے ہیں۔ آپ کو تو مجھے سنبھالنا چاہیئے۔" اس نے کہا۔

"میں خود بہت شکستہ ہوں بیگم صاحبہ! میری والدہ، بہن بھائی اور پیار کرنے والی بیوی سب ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔"

"ہیں!" وہ چونک گئی۔

"ہاں میں بہت دُکھی ہوں۔ آپ کو اس گھر میں تنہا دیکھا تو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ میں بھی یونہی تنہا ہوں۔"

"آپ کی والدہ وغیرہ کو کیا ہوا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ لوگ پچھلے سال جو یہاں مارکیٹ میں بارود پھٹا تھا اس کا شکار ہو گئے تھے۔"

"اوہ ویری سیڈ۔" وہ غمگین ہو گئی۔

پاپا کا سیکریٹری کئی بار آیا۔ دبلا پتلا مختصر سا حسن اپنی پلکوں تلے دُکھوں کے بے پناہ سمندر لئے بے حد مطمئن اور پُرسکون سا پھرا کرتا۔ اس نے جانے کیسے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ بڑھانے والا بھی تو وہی تھا۔ جانے اس نے کیسے ایسی جرأت کر لی تھی۔ جولی کتنا روئی چیخی چلّائی کہ وہ آٹھ سو روپے کمانے والا ایف۔ اے پاس کسی طور بھی اس کے قابل نہیں۔ مگر وہ نہیں مانی۔ حسن نے جب اسے شادی کی پیشکش کی تو وہ بھونچکی رہ گئی۔ اس نے اس دُبلے سے چھوٹے سے انسان کو دیکھا جس کی آنکھوں میں اعتماد تھا۔

"میں لڑکی نہیں عورت ہوں۔ حسن سوچ لو۔" اس نے کہا۔

"تمہارے ماضی سے میرا کوئی واسطہ نہیں کرن! ہم دونوں کو اس حال سے اپنا جیون شروع کرنا ہے اور مستقبل ہمارے ہاتھ میں ہے۔" اس نے اس کا سرد اور نازک ہاتھ تھام لیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولی۔

"پھر بھی حسن ہم کوئی بچّے نہیں ہیں کہ کسی جذباتی لمحے کی زد میں آ کر ہمدردی کے جذبے دل میں اجاگر کر کے ایک دوسرے

Nadar Azeem Pakistanipoint.com

کو اپنا لیں۔"

"میں تمہیں پانا چاہتا ہوں کرن۔"

"اوہ تھینک یو۔" اس نے گہری سی سانس لی اور اپنا ہاتھ اپنا وجود، اپنی روح اس کے حوالے کر دی۔

اسے واقعی اس سے ہمدردی نہ تھی۔

کہ وہ اسے پانا چاہتا تھا۔

اس نے اس پر اتنی محبتیں نچھاور کیں کہ وہ اپنا سب کچھ بھول گئی۔ زندگی کی ڈگر نے رُخ بدل لیا تھا۔ مگر پھر بھی پہلو میں کوئی چیز مچلا کرتی۔ وہ کوئی پانچ سال کا بچہ دیکھتی تو پاگلوں کی طرح اسے دیکھتی رہتی۔ تب حسن اس کا بازو دبا کر شرارت سے کہتے۔

"ارے فکر کیوں کرتی ہو لائن لگا دیں گے۔ بتاؤ چھ بچے چاہئیں یا دس؟"

"آپ پالیں گے انہیں؟"

"وہ بھی ان کے ہمراہ ان کا جوک شیئر کرتی۔

"ہاں کوشش کریں گے۔ چھٹی کے بعد جتنی مدد ہو سکی، کریں گے۔" وہ ہنس دیتے۔

"ٹھیک ہے وعدہ۔"

"ہاں وعدہ۔" وہ اس کا ہاتھ تھام لیتے اور پیار سے دبا دیتے اور پھر چپکے سے ہی رابعہ اس کی زندگی میں آگئی۔ ننھی منی کمزور سی رابعہ کو دیکھ کر وہ پھر پاپا یاد آ گیا۔ حسن ان دنوں بڑے خوش تھے۔ وہ اس کی اس طرح ناز برداریاں کرتے کہ وہ پشیمان سی ہو جاتی۔ ان کی آمدنی بڑی قلیل تھی۔ وہ بہت سی آسائشوں سے محروم ہو چکی تھی۔ ماضی کی ایک یادگار "پرچھائیاں" تھا۔ اس کا گھر۔ جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ آپا بھی بیٹے کے پاس چلی گئی تھیں۔ پاپا نے ترکے میں کچھ بھی نہ چھوڑا تھا کہ شراب نے ساری جمع پونجی ختم کرا دی تھی۔ اور جو کماتے وہ اس کے نازوں اور گھر پر خرچ کر دیتے جولی اس کی شادی کو دنیا کی سب سے بڑی حماقت قرار دے کر اسے کبھی کی چھوڑ چکی تھی۔

حسن رابعہ کا کافی کام خود کرتے۔ کبھی اس کو گود میں لیکر بہلاتے تو کبھی اس کی فیڈر دھو کر اس کو دودھ بنا دیتے۔

وہ بظاہر مطمئن تھی۔

مگر پہلو کی تڑپ برقرار تھی — اتنے سکون کے باوجود بھی کبھی کبھی منصور کی عمر کا کوئی بچہ اس کے سکون میں ٹھہراؤ کر جاتا اور تب وہ بالکل دیوانی ہو جاتی۔ اسے اپنی انگریزی کی کتاب میں دبا پرچہ یاد آ جاتا جس پر دادا نے لیے منصور کے ہونے والے والدین کا پتہ لکھا تھا

مگر اس نے دوبارہ اسے نہیں کھولا۔ اس نے صرف سرسری نظروں سے اس وقت اتنا ضرور پڑھا تھا کہ وہ اس کے شہر سے کافی دور چلا گیا ہے۔ رابعہ کی مصروفیات نے اسے تھکا دیا۔ پورے دن کا کام کرتے کرتے وہ تھک جاتی تھی۔ پاپا کے زمانے میں اُٹھ کر پانی بھی نہ پیتی تھی اور پورے دن ہوٹلوں میں پچاس پچاس روپے صرف چائے پر ہی کھوآتی تھی۔

مگر اس غربت میں اس سکون کی فضا میں جینے کا بھی ایک عجیب لطف تھا۔ رابعہ کے بعد عائشہ آ گئی۔ حسن عائشہ کو دیکھنے اندر آئے تو اس نے گلابی ہو کر اپنے دائیں بازو سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں۔

"دیکھا ہم نہ کہتے تھے کرن لائن لگا دیں گے۔" حسن نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ایک اور نمونہ آ گیا۔ اب اٹھائیے گا اس کی ناز برداریاں۔"

"آپ کی ناز برداریاں اٹھا اٹھا کر کبھی تھکے ہیں جو اب تھکیں گے۔" وہ اس پر جھک آئے۔ ان کے گرم لبوں کو اپنے ماتھے پر محسوس کر کے شانتی اور سکھ کا احساس اس کی رُوح میں اُترتا چلا گیا۔

"حسن۔ سوپ بے حد مزیدار ہونا چاہیئے۔ سیاہ مرچوں والا۔" اس نے حسن کو جاتے دیکھ کر کہا۔

"ہم خود بنائیں گے۔ لذیذ کیسے نہیں ہو گا۔"

"نہیں بھئی وہ صبح والا بڑا بدذائقہ تھا۔

"وہ بی پڑوسن نے بنایا تھا۔ اب ہم خود بنائیں گے۔ اگر ذائقے میں کمی رہی تو اپنی محبتیں بھی گھول دیں گے۔"

"افوہ۔" وہ ہنس دی۔

"یو آر ویری گریٹ حسن۔ کم از کم تم نے مجھے زندہ تو رکھا ہوا ہے نا۔ پاپا کے بعد میرے جینے کے چانسز بہت کم تھے۔" اس نے دل میں سوچا۔

رابعہ اور عائشہ کے بعد پھر کوئی بچہ نہیں آیا۔ نہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس گئی اور نہ حسن نے کبھی بیٹے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ سوچا کرتی یہ شخص کیا چیز ہے۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ اسکی ننھی ننھی خواہشوں پر جان دیتا۔ رات بھر جاگ کر رابعہ اور عائشہ کو سُلاتا اور اسے نہ جگاتا۔ اس سے بے حد میٹھے مذاق کرتا اور یوں رابعہ اور عائشہ بڑی ہوتی چلی گئیں۔ ادھر دن بدن اس کی بیتابیاں بھی بڑھ گئیں۔ منصور کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش جڑ پکڑ رہی تھی۔ مگر وہ اس اتنے مخلص اور پُراعتماد انسان کو دھوکہ نہیں دینا چاہتی تھی اس کے خلوص پر شک کے سائے نہ ڈالنا چاہتی تھی۔

Waqar Azeem pakistanipoint.com

اسی لیے اس نے اس خواہش کو سینے میں ہی دبائے رکھا۔
بقول حسن کے
"کم بچے خوش حال گھرانہ" کا سمبل "پرچھائیاں" جنت کی فوٹو اسٹیٹ تھا۔
آج تک ایک معمولی جھڑپ بھی تو ان کے درمیان نہ ہوئی تھی۔
وہ انھیں شام کو لان میں لے آتا۔ کرن بچیوں کے سوئٹر بنا کرتی اور وہ ان سے کھیلتا۔ کبھی کبھی بے حد موڈ میں ہوتا تو اس کے قریب کھسک آتا۔
"رابعہ آؤ آنکھ مچولی کھیلیں۔"
"ہاں پاپا۔" رابعہ کہتی۔
"آپ بھی کھیلیں گی۔" وہ اس پر جھک آتا۔
"کیا؟" وہ دور تک لڑھکتے ہوئے اون کے گولے کو دیکھ کر کہتی۔
"آنکھ مچولی کھیلیں گے۔ وہ ایک آنکھ دبا کر شرارت سے کہتا۔
"چلیں ہٹیں۔" وہ گلابی ہو جاتی۔
"رابعہ بیٹی۔ چھوڑو ہم تھک گئے۔" وہ اس کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاتا۔ بچیاں کھیلتی رہتیں اور وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کیسے کیسے لطیفے اور نیم رومانٹک شعر سنایا کرتا۔
"حسن۔ بعض اوقات بالکل باؤلے ہو جاتے ہیں آپ۔"
کبھی کبھی وہ انھیں ناراض ہو کر کہتی۔
"باؤلا تو تم نے کیا ہے ہمیں۔"
"کیا؟" وہ چیختی۔
"ہاں دیکھو ہم لنڈورے اچھے بھلے تھے۔ کیسے اس زمانے میں پورا پورا دن لڑکیوں کو چھیڑتے پھرتے تھے۔"
"اب کس نے منع کیا ہے، اب بھی چھیڑ لیا کریں۔"
"اب تو تم نے قید کر لیا ہے۔" وہ شرارت سے کہتا۔
"کہاں؟"
"اپنی ان گھنیری اور لمبی زلفوں میں۔" وہ اس کے بالوں کا دیوانہ تھا۔ جلدی سے اس کے بالوں میں منہ چھپا لیتا۔
"جائیے آزاد کیا۔" وہ بال کھینچ لیتی۔
"مجبوری ہے۔ لوٹنے کو دل نہیں چاہتا۔ وہ اس کی کمر کے گرد بازو لا کر اسے قریب کرتا۔
"بے ایمان۔" وہ ہنس دیتی۔
"یوں ہی ہنستے کھیلتے بہت سے دن گزر گئے۔ حسن کا ٹرانسفر ہوا تو وہ بے چین ہو گئی۔ وہ اس شہر میں آگئی تھی جہاں اس کا بیٹا اس کا لختِ جگر کسی دوسرے کے گھر میں روشنیاں پھیلا رہا تھا۔
وہ ان دو تین دنوں بڑی بے چین رہی۔
رات کو حسن کے قریب لیٹتے ہوئے اس نے بے حد کروٹیں بدلیں۔
"کیا بات ہے کرن۔ نیند نہیں آ رہی ہے۔" حسن نے کہا۔
"پتہ نہیں کیا بات ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
"چلو سو جاؤ۔" حسن کے ہاتھ اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگے۔
مگر وہ یہاں سے کہیں نزدیک ہی اپنے بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جانے کیسا ہوگا۔ زین کی طرح لمبا سا یا اس کی طرح چھوٹے قد کا۔ پتہ نہیں میرے بارے میں بھی اس نے کبھی سوچا ہوگا کہ نہیں حسن جیسے قریب سے اس کے جذبات پڑھ رہے تھے۔
"تم یہاں پہلے بھی کبھی آئی تھیں کرن؟" حسن نے پوچھا۔
"نہیں تو۔" وہ بولی۔
"تو پھر کیا بات ہے۔ کیا بابا آگیا جو تم اتنا کانپ رہی ہو کرن۔"
دیکھو بی ایزی میں تمہارے قریب ہوں۔" اس نے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ حسن کی مضبوط گرفت میں اسے کافی سکون سا ملا اور وہ سو گئی۔
وہ دو چار دن تک بڑی بے سکون رہی۔ حسن سمجھے کہ شاید اسے "پرچھائیاں" کو چھوڑنے کا غم ہے۔ انھوں نے اسے خوب بہلایا۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے۔ رابعہ اور عالیہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھتے۔
ایک دن جب رابعہ اسکول سے لوٹی تو حسن اسے ہنسا رہے تھے۔
"پاپا میرے سوئٹ پاپا۔" رابعہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے حسن کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔
"میرا بیٹا۔" حسن نے رابعہ کو چوم لیا۔
"پاپا ایک بات تو بتائیں۔" رابعہ نے کہا۔
"فرمائیے حضور۔" وہ پیار سے اس کے آگے جھک گئے۔
"پاپا۔ آپ کی اور ممی کی کبھی لڑائی نہیں ہوتی؟"
"نہیں بیٹا۔" انھوں نے گردن ہلائی۔
"کیوں پاپا؟" رابعہ نے پوچھا۔
"کیوں؟" وہ سٹپٹا گئے۔
"کبھی آپ بتائیے نا کرن۔" انھوں نے گھبرا کر کہا۔
"میں کیا بتاؤں؟" اس نے بھی گھبرانے کی ایکٹنگ کی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

"پاپا! میری تو تمام فرینڈز کے پاپا اور ممی آپس میں لڑتے ہیں اور میری فرینڈ نادیہ ہے نا وہ آج بتا رہی تھی کہ جب اس کے ممی پاپا لڑتے ہیں تو پاپا گھر کے برتن توڑ دیتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"افوہ یہ تو بہت بری بات ہے۔" حسن نے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ پتہ ہے ممی سے کیوں نہیں لڑتے؟"

"کیوں؟" وہ ہنس دیئے۔

"آپ ممی سے ڈرتے ہیں شاید۔" رابعہ نے سر ہلایا۔

"جی نہیں۔" کرن آگے بڑھی۔

"ہم اور پاپا اس لئے نہیں لڑتے ہیں رابعہ کہ جس گھر میں لڑائی ہوتی ہو اس گھر کے ممی پاپا سے اللہ میاں ناراض ہو جاتے ہیں۔"

کرن نے اسے کتنا سمجھایا اور رابعہ جانے سمجھی یا نہیں سمجھی البتہ حسن اسے لڑائی کی اتنی برائیاں بتا سکے تھے کہ وہ سمجھ گئی تھی کہ لڑائی بہت بری چیز ہوتی ہے۔ رابعہ اندر جا چکی تھی وہ اپنے اتنے پرخلوص اور کھرے ساتھی کی سنگت میں کھڑی خیالات میں بھٹک رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو کرن؟" حسن نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

"سوچ رہی ہوں حسن واقعی آپ مجھ سے کیوں نہیں لڑتے میں تو بعض اوقات بہت بڑی بڑی کوتاہیاں کر جاتی ہوں۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"کوتاہی ہر انسان سے سرزد ہوتی ہے کرن۔ اور پھر تم اتنی اچھی ہو کہ سوچو تم نے مجھے اپنا کر کیا کچھ نہیں چھوڑا۔ تم میرے پاس کی جیتی تھیں۔ میں جانتا ہوں تمہارے پاپا نے تمہیں کس قدر نازوں سے پالا تھا۔ تم نے بھی تو میری اتنی قلیل آمدنی میں مجھ سے کو آپریٹ کیا ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے؟" وہ بیحد اعتماد اور خلوص کے ساتھ کہہ رہے تھے۔

"شاباش ہے ان لوگوں پر جو اس طرح اپنے خلوص اور محبت سے زمانے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو جیت لیتے ہیں۔" اس نے سوچا۔

"اچھا چلو بچے اسکول سے آ گئے ہیں کھانا لگواؤ۔" حسن نے اسے سنجیدہ دیکھ کر اس کو ہلایا۔

"جی چلیں۔" وہ آگے بڑھ گئی اور پھر حسن کی مدد سے اس نے ٹیبل پر کھانا لگایا۔ رابعہ اور عائشہ کپڑے بدل کر آ چکی تھیں۔

ان دنوں حسن کی اچانک ہی طبیعت خراب ہو گئی۔ ٹانگوں میں پہلے ہلکا ہلکا درد اٹھا اور پھر بڑھتے بڑھتے شدید ہو گیا یہاں تک کہ چلنے تک میں مشکل ہو گئی۔ وہ بول گئی۔ حسن اس کا جیون ساتھی جس نے اسے ایک گھر دیا تھا۔ بچے دیئے تھے، سکون دیا تھا۔ خوشیاں دی تھیں اور روشنیوں کا راستہ دکھایا تھا وہ اس پر مر بھی جاتی تو یہ احسانات اتنے زیادہ تھے کہ چکتے ہی نا۔

اس نے انتہائی بھاگ دوڑ کر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا۔ وہ ان دنوں بالکل باؤلی سی ہو گئی تھی۔ حسن نہ نہ کرتے رہ جاتے۔ مگر وہ نہ مانتی۔

"پرچھائیاں" کو اس نے یہاں آتے ہی کرائے پر دے دیا تھا۔ وہ روپیہ بڑے وقت میں بڑا کام آیا۔

اسی دن اسے پتہ چلا کہ یہاں کا ایک ڈاکٹر ابھی دنوں امریکہ سے مزید تعلیم حاصل کر کے آیا ہے۔ بہت قابل اور مشہور ڈاکٹر تھا۔ اس کی فیس بھی اس کی قابلیت کے عین مطابق تھی۔ حسن نے اسے کتنا سمجھایا کہ وہ ڈاکٹر بہت مہنگا ہے۔ اس کا علاج کرانا مشکل ہوگا مگر وہ نہ مانی۔

یہی تو وقت تھا محبتوں کے امتحان کا۔ وہ ڈاکٹر کی گرانقدر فیس کے باوجود اسے گھر لے آئی۔ اس کے علاج سے کافی افاقہ ہوا مگر جس تیزی سے وہ روبہ صحت ہو رہا تھا اسی تیزی سے پیسہ خرچ ہو رہا تھا۔ ایک ایک کر کے اس نے سارے زیور بیچ دیئے۔ "پرچھائیاں" کا تین سال کا ایڈوانس کرایہ بھی نکل گیا۔ مگر وہ مگن تھی کہ حسن تقریباً ٹھیک ہو رہے تھے۔ بے جان ٹانگیں اب حرکت کرنے لگی تھیں۔

اور اس دن جبکہ ڈاکٹر صاحب بڑے فرینک انداز میں حسن سے باتیں کر رہے تھے، وہ چائے کا کپ سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ کھڑے نوعمر لڑکے کو دیکھ کر چونک گئی۔ اور پھر وہ تو ڈاکٹر صاحب کے لئے صرف ایک کپ چائے لے کر آئی تھی۔ حسن کا اسے پتہ تھا کہ وہ اس وقت چائے نہیں پیتے۔

"اوہ آئی ایم ساری ڈاکٹر صاحب! میں ابھی ایک کپ اور لاتی ہوں۔" وہ بے حد شرمندہ ہو گئی۔

"نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ منصور چائے نہیں پیتا۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔

"منصور۔" کوئی چیز قریب ہی چھناکے سے ٹوٹی تو اس نے دروازے سے جاتے جاتے پلٹ کر اب کی بار بڑے غور سے اسکو دیکھا۔ لمبے قد والا۔ چوڑے چوڑے شانوں والا۔

"وہ۔" ایک چیخ اس کے لبوں میں دبی کی دبی رہ گئی۔ وہ پسینے پسینے ہو گئی۔ ساکت نظروں سے اسے وہ دیکھ رہی تھی۔ پلکیں ایک ہی جگہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ وہیں ایک کرسی پر ٹک کر اسے دیکھتی رہی جو بڑا لاپرواہ سا اپنے جوتے سے فرش کو کھرچ رہا تھا۔ اس کے دل نے کہہ دیا تھا یہ وہی ہے۔ اس لئے اس نے ڈاکٹر صاحب سے

Nagar Azeem
Pakistanipoint.com

تعارف بھی کروانا مناسب نہ سمجھا۔
"اچھا میں چلتا ہوں مسز حسن مٹھائی تیار رکھئے گا ہماری۔ حسن صاحب اب تقریباً ٹھیک ہو چکے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب اٹھ گئے اپنے پہلو میں مچلتی ممتا کو سنبھالتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے قریب سے گزر گیا۔ لاتعلق اور لاپرواہ سا۔

"ارے پگلے اک نظر تو ڈال لینی تھی۔ اس کے اندر کی ماں تڑپ اٹھی۔ اس کے قدموں میں کیسی غیر اعتمادی تھی۔ چال کیسی شکستہ شکستہ تھی۔ تو کیا وہ بھی اس کے بغیر ادھورا ہے۔ اس نے سوچا۔

"کرن!" حسن نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بڑے قریب محسوس کیا۔

"ہاں!" وہ ان کے پاس آ گئی اور تب ان کے بازو پر سر رکھ کر اس کا جی چاہا خوب روئے مگر وہ رو نہ سکی۔ البتہ یہاں ان بانہوں نے ہمیشہ کی طرح اسے فوراً سنبھال لیا تھا۔ اس کی روح میں شانتی اتار دی تھی۔

یہ حادثہ ایسا تھا کہ وہ بالکل بدل گئی۔ گم سم اور خاموش خاموش رہنے لگی۔ وہ کیسا کبھر و جوان تھا لمبے سے قد والا۔ اس سے کہیں اونچا۔ اس کی چال۔ اس کی جھکی جھکی آنکھیں ہر وقت اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ وہ زندگی میں پہلی بار بے حد بے چین اور بے سکون ہو گئی تھی۔ حسن کو ڈاکٹر صاحب نے پورے سال کا ریسٹ بتایا تھا کہ وہ ایک سال تک نوکری پر نہیں جا سکتے۔ انہیں صرف تھوڑا بہت چلنے کی اجازت ہے۔ کیونکہ یہ فالج کا اثر تھا اور حسن خوش نصیب تھے کہ ہمیشہ کے لئے معذور ہونے سے بچ گئے تھے۔

ڈاکٹر اس بار حسن کا آخری بار چیک اپ کرنے آئے تھے وہ تب اپنے آپ کو روک نہ سکی۔

"آپ کے بیٹے کا کیا حال ہے۔ کونسی جماعت میں پڑھتا ہے؟" اس نے کہا۔

"سینئر کیمبرج کر رہا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"آپ پھر کبھی اسے نہیں لائے۔ بڑا پیارا بچہ ہے۔"

"وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہے۔ وہیں پڑھتا ہے۔"

"بورڈنگ ہاؤس میں!" وہ حیران رہ گئی۔

"مگر آپ تو بتا رہے تھے کہ آپ کی فیملی یہیں رہتی ہے۔ پھر وہ بورڈنگ میں کیوں ہے؟"

اس کا دل مچل کر رہ گیا۔

"وہ میرا بچہ نہیں ہے۔ ہم نے اسے پالا تھا۔ مگر جب سے ہمارے اور بچے ہو گئے ہیں میری بیگم کا سلوک اس سے کچھ اچھا نہیں رہا۔ اس لئے میں نے اسے بورڈنگ میں داخل کر دیا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب اور نہ جانے کیا کچھ بتاتے رہے۔ ان کی اتنی بار یہاں آمد ہوئی تھی کہ وہ حسن کو دیکھنے کے بعد کافی دیر حسن سے ادھر ادھر کی گپ شپ کرتے رہتے تھے۔ مگر آج یہ سب کیا بتا دیا تھا انھوں نے۔

"کرن!" حسن نے اس کا ہاتھ اپنے گرم ہاتھ میں لے کر ہولے سے دبایا تو وہ چونک گئی۔ اس نے محسوس کیا اس کا پورا وجود ٹھنڈا برف ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو گئے جانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔

"کرن۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بی ایزی کرن!"

حسن کی بات پر چونک کر اس نے وحشت سے ان کی طرف دیکھا۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔

"تو کیا حسن۔ کیا حسن!" وہ سہم سہم گئی۔

"مگر اس وقت سنبھلنا بھی کتنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ اتنی پراعتماد اور مضبوط لڑکی جو چٹان تھی۔ ایک لمحے میں ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔

اور اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ممتا واقعی دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے جو اس کی چٹان سی شخصیت یوں ادھر ادھر بکھر رہی ہے۔

"بی ایزی کرن!" حسن نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"کیا!" اس کی سانسیں رکنے لگیں۔

"میں جلدی ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا ڈاکٹر صاحب کو کہنے دو۔ بھلا ایک سال تک کون ریسٹ کرے گا۔" حسن نے کہا۔

"اوہ حسن!" اس کی جان میں جان آ گئی۔

"ہاں بھلا دیکھو اب تو گھر میں بہت کم پیسے رہ گئے ہیں۔ رابعہ اور عائشہ کا خرچ۔ مکان کا کرایہ۔ میں کمپنی کو اپنی واپسی کے لئے جلد ہی انفارم کروں گا۔"

"جی نہیں!" وہ ایکدم ہی فرینش ہو گئی۔ یہ شخص جو میری ایک ایک کیفیت کو میری روح میں جھانک کر پڑھ لیتا ہے۔ یہ کس طرح سے ہمیشہ عین وقت پر بات سنبھال لیتا ہے۔

اے خداوند یہ کیسا جادوگر ہے۔

کیسا مخلص اور معصوم ہے۔

"تو بھلا جی نہیں کیوں؟" وہ بہت دنوں بعد آج پھر موڈ میں تھے۔

"دیکھیے حسن بے ایمانی نہیں چلے گی۔ کل ہی تو آپ نے وعدہ کیا تھا سروس کے معاملے میں آپ میری مانیں گے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھیک ہے جو جی میں آئے کیجیے۔ مگر پہلے پلیز ذرا منہ ہاتھ دھو کر اچھی سی ساڑھی باندھ کر عمدہ سی چائے اور پکوڑے بنایئے۔ ہم چاروں آج باہر برآمدے میں بیٹھ کر چائے پئیں گے!"

"ہیں کیا واقعی!" ان کے برآمدے تک چل کر جانے کی خواہش سن کر وہ اچھل پڑی۔ اس نے ہنستے ہوئے ان کے بال بکھیر دیئے اور

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

پھر رابعہ اور عائشہ کو آواز دینے لگی۔

دھیرے دھیرے سرکتے لمحوں میں ایک روز وہ ... اخبار میں اس اشتہار کو انڈر لائن کیے جانے کیا سوچ رہی تھی جو بورڈنگ ہاؤس کی طرف سے تھا جس میں بورڈنگ ہاؤس کے لئے باورچی خانے کے انچارج کی ضرورت تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ کام بہرحال کچھ نہ تھا۔ صرف چار باورچیوں پر نظر رکھنی تھی۔ مگر کیا اسے اس اتنے عجیب کام کے لئے حسن اجازت دیں گے۔ بورڈنگ ہاؤس صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر تو تھا ہی۔

اس نے اپنے گھر کے چمن میں کھڑے ہو کر ہمیشہ بے بسی سے اس پرانی ہوسٹل کی عمارت کو دیکھا تھا جہاں اس کا لختِ جگر کسی کمرے میں مقیم تھا۔ مگر اس میں اور منصور میں ایک فرلانگ نہیں ایک صدی کا فاصلہ تھا اور وہ اس فاصلے کو پاٹنے کے لئے تیار نہ تھی۔

کیونکہ اس کے گھر میں بہت شانتی تھی۔

بہت روشنیاں تھیں۔

رابعہ اور عائشہ کے ننھے منّے قہقہے تھے۔

اور حسن کی محبتیں تھیں۔

یہ ایک مکمل گھر تھا۔ اس گھر کی کسی بھی جگہ ذرا بھی جھول نہ تھا کہ وہ کچھ کرتی۔ مگر یہ اشتہار اسے چیخ چیخ کر پکار رہا تھا کہ یہ ایک موقع ہے اپنے بچّے کے نزدیک جانے کا۔ پھر وہ ہمت کر کے حسن کے پاس آگئی۔

"آئیے کرن بیگم۔ ہم ابھی آپ کو بلانے ہی والے تھے۔ کمرے میں بڑا اندھیرا ہو رہا تھا۔ وہ چہکے۔

"حسن" وہ دھیرے سے مسکرادی۔

"ادھر آئیے بھئی ہمارے پاس" انھوں نے بڑے پیار سے کہا تو وہ کرسی ان کے اور نزدیک لے گئی۔

"حسن ایک بات کہوں" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ایک بات کہنے کے لئے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے" وہ کچھ زیادہ ہی شوخ ہو رہے تھے۔

"حسن میں سروس کرلوں! میں نے ابھی اخبار میں باورچی خانے کی انچارج کا ایک اشتہار پڑھا ہے۔ بہت معمولی کام ہے اور ڈیوٹی بھی زیادہ لمبی نہیں۔ جب وقفہ ہوگا تو گھر آجایا کروں گی۔"

"کرن!" حسن چیخ اٹھے۔ اس نے دیکھا ان کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو کرن۔ میں ہمیشہ کے لئے معذور نہیں ہو گیا ہوں۔ مجھے بتاؤ کرن۔ تم نے ایسی بات سوچی بھی کیوں؟" وہ آج زندگی میں پہلی بار سخت غصّے میں تھے۔

"تم جانتی ہو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرسکوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم کتنے نازوں میں پلی ہوئی ہو۔ تم نے میرے لئے اپنے تمام زیور بیچ دیئے۔ اپنے گھر کا کرایہ میرے اوپر خرچ کردیا۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کرن کہ اب ..." وہ تقریباً رو دینے والے تھے۔

"میرے کمرے سے فوراً نکل جاؤ کرن۔ ایسا نہ ہو اس وقت میں تمہیں کوئی ایسی بات کہہ دوں جس پر مجھے بعد میں پشیمانی ہو۔" وہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ وہ چپکے سے باہر آگئی۔ دل رو دینے کو تھا۔

جانے کیوں وہ حسن سے ناراض ہوگئی۔

اس نے کوئی ایسی بُری بات تو نہیں کہی تھی کہ حسن اتنے غصّے میں آگئے تھے۔ یا شاید اس نے اس لئے بھی محسوس کیا وہ آج تک کبھی اونچی آواز میں نہ بولے تھے۔

وہ شام کو انہیں کھانا تک نہ دینے گئی۔ رابعہ کے ہاتھ بھجوا دیا اور خود بچیوں کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ تاکہ وہ لوگ سو جائیں تو پھر ان کے قریب ہی سو جائے۔ اگر ان کے سونے سے پہلے ان کے پاس بیٹھتی تو وہ اس سے اتنے سوال پوچھتیں کہ جواب دینا مشکل ہو جاتا کیونکہ اپنے باپ کی طرح وہ بھی بے حد ذہین اور سمجھدار لڑکیاں تھیں۔

تب ہی رابعہ نے اسے کہا کہ ابّو بُلا رہے ہیں۔ وہ چونک گئی لاشعوری طور پر وہ اس دستک کی منتظر تھی۔

"جی فرمائیے" وہ ناراض ناراض سی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"پہلے آنکھیں اٹھاؤ" وہ شوخی سے بولے۔ ان کے لہجے کی نرمی اور شوخی پر وہ چونک گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ ان کی آنکھوں میں محبتیں موجزن تھیں۔

"بی ایزی" انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"اچھا تو پھر سروس کے بارے میں کیا خیال ہے"

"ہیں!" وہ اچھل گئی۔ اس نے دیکھا نیوز پیپر ان کے ہاتھوں میں تھا اور انھوں نے سرخ مارکر سے اس اشتہار کو انڈر لائن کردیا تھا۔

"سروس بڑی بے تکی ہے مگر تمہاری خواہش اس سے بھی زیادہ بے تکی، لہٰذا ہم ہارتے ہیں" انھوں نے سر جھکا دیا۔

"حسن" وہ تقریباً رو دینے کو تھی۔

"حسن آپ اتنے عظیم کیوں ہیں" اس کا جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

"اب تو دوستی کرلو" حسن نے اس کا ہاتھ گھسیٹا۔

"بے ایمانی۔" وہ شرارت سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرادی۔ اور یوں وہ ہوسٹل میں ملازم ہوگئی۔ اس نے صرف دوپہر

کے کھانے اور شام کے کھانے کے انتظام کی ڈیوٹی لی تھی۔ مگر وہ اپنے کام میں اتنی پرخلوص تھی کہ کھانے کا انتظام ایک دم فرسٹ کلاس ہو گیا تھا۔ باورچی بھی کہنا مان جاتے تھے۔ سارے اسٹوڈنٹس اس کے آنے سے بہت خوش تھے۔ وہ جب ماما کہہ کر اسے پکارتے تو اسے بڑا عجیب سا لگتا۔

کھانے میں مرچیں زیادہ ہوتیں تو اس سے شکایت۔ دودھ میں پانی زیادہ ہوتا تو اس کے پاس دوڑتے۔ تنورچی روٹیاں جلا دیتا تو وہ ننھے منے لڑکے لڑکیاں ان روٹیوں سمیت اس کی طرف دوڑتے اور وہ ان کے سامنے ایسے مزے سے تنورچی اور باورچی کو ڈانٹتی کہ وہ خوش ہو جاتے۔

یہ سروس اگرچہ بڑی عجیب تھی۔ وہ اپنے ماضی پر نظر ڈالتی۔ چوہدری دلاور کی بیٹی۔ "پرچھائیاں" میں رہنے والی، آپا کی گود میں چمکنے والی اور وہ کانونٹ میں پڑھنے والی لڑکی ایک بورڈنگ ہاؤس میں باورچی خانے کی انچارج تھی۔ سب لوگ ہی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔

مگر ــــ

ہاں ان ریاضتوں کا صلہ مل رہا تھا اسے۔ وہ اپنے بچے اپنے منصور کے نزدیک آ گئی تھی۔ گم گو اور گم صم سے منصور کو نزدیک لانے کے لئے اس نے اس کے دوست خالد کو سر چڑھا لیا تھا جو منصور ہی کی طرح تھا مگر بے حد شریر اور حاضر جواب۔

ان دنوں چھٹیاں تھیں اور وہ ان چھٹیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اس نے سارا گھر صاف کر دیا تھا۔ رابعہ عائشہ اور حسن کے کپڑوں کی مرمت کی تھی۔ حسن کا پٹیل اوور بنایا تھا۔ اور پھر روزانہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق وہ حسن کو لے کر بورڈنگ ہاؤس کے پارک میں آ جاتی۔ رابعہ اور عائشہ بھی ساتھ ہوتیں۔ حسن دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ اس کے کندھوں کا سہارا لئے پارک میں گھوما کرتے اور عموماً اس سے کہا کرتے

"میں جلد ہی سروس جوائن کروں گا کرن۔ میری پرموشن بھی رکی ہوئی ہے اس کے لئے بھی باس کو کہنا ہے۔ پھر ہم واپس اپنے گھر لوٹ جائیں گے۔"

"کہاں؟" وہ ڈر جاتی۔ منصور سے دور جانے کا خیال ہی کتنا عجیب تھا۔

"پرچھائیاں میں، میں وہاں لالہ کے ایسے ہی سرخ پودے لگواؤں گا۔ اور پھر پتہ ہے کیا ہوگا۔"

"کیا ہوگا؟" وہ چونکتی۔

"پھر ان پھولوں کے پاس بیٹھ کر تمہاری زلفوں پر شعر کہوں گا۔"

"پھر رومانس۔" وہ انگلی اٹھا کر کہتی

"رابعہ اور عائشہ کافی دور ہیں۔" وہ اسے ایکدم ٹوکتے۔

"ویسے آپ کب سنجیدہ ہوں گے؟"

"جب آپ بوڑھی ہو جائیں گی۔"

"یہ دیکھئے اب بھی بوڑھا ہونے میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔" وہ اپنے بال کھول کر ان میں سے جھانکتے سفید چاندی کے تار دکھاتی۔

"نہیں یہ بے ایمانی ہے! ابھی تو میں جوان ہوں۔" وہ گانا شروع کر دیتے۔ اور وہ ہنستے ہنستے لوٹ جاتی۔

چھٹیوں کے بعد بورڈنگ ہاؤس میں بہت چہل پہل تھی لنچ کے ٹائم اس کی نظریں منصور کو ڈھونڈتی رہیں۔ تب جبکہ تمام اسٹوڈنٹ فارغ ہو کر جا چکے تھے منصور اور خالد ایک ٹیبل پہ بیٹھے تھے۔ وہ پریشان اور بے چین ہو کر ان کی طرف لپکی۔ وہ کیسا زرد زرد سا ہو رہا تھا۔

"اُفوہ ماما۔" خالد چہکا۔

"ہیلو ماما۔" منصور کی ٹوٹی ہوئی آواز پر اس کا دل جیسے کسی نے جکڑ لیا۔

"ہیلو۔" وہ بھی چپ سی ہو گئی۔

"کیسی رہیں آپ! میں نے آپ کو ان چھٹیوں پہ بے حد مس کیا۔" خالد کی زبان اسپیڈ پکڑ رہی تھی۔

"مجھے ابھی سے ہی مکھن نہ لگانا شروع کرو۔" وہ خالد سے بولی۔

"نہیں ماما۔ ہم آپ کو بالکل مکھن نہیں لگاتے۔ ایمان سے ہماری باتیں سو فیصد سچ ہوتی ہیں۔ کیونکہ آپ سے جھوٹ بولنے کو دل نہیں چاہتا۔" خالد نے کہا۔

"تم اپنی سناؤ منصور تم نے بھی مجھے مس کیا۔" وہ منصور سے بولی۔

"ہاں بہت زیادہ ماما۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اور میں نہیں بتاؤں۔ ذرا قریب آ کر کان میں سنو راز کی بات ہے۔"

اس نے دونوں پہ جھک کر کہا تو وہ آگے کو ہو گئے۔

"میں نے بھی تم دونوں کو بے حد مس کیا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی بھی یاد نہیں آیا۔" اس نے کہا۔

"پاپا!" وہ دونوں خوش ہو کر اچھل پڑے۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم لوگ آج کھانے کے لئے کیوں دیر

Wafar Azeem
Pakistanipoint.Com

سے آئے ہو۔ میں کافی دیر سے سب لوگوں میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔"

"یہ اس منصور کے بچے سے پوچھئے جس نے مجھے ملتے ہی سیڈ کر دیا ہے۔"

"کیا ہوا؟" وہ چونک گئی۔

"بھئی اپنے والدین سے زبردست فائیٹ کر آیا ہے یہ لڑکا۔" خالد نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" وہ گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں ماما۔ یہ بک رہا ہے۔" منصور اٹھ کھڑا ہوا۔

تب وہ منصور کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔ خالد کو اس نے کھسکنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ جان گئی تھی ضرور کوئی بات ہوئی ہے جو منصور اسے بتانا نہیں چاہ رہا ہے اور خالد کو بھی روک رہا ہے۔

"ماما مجھے جانے دیجیے۔ یہ خالد تو ہمیشہ الٹی سیدھی ہانکتا رہتا ہے۔"

"منصور۔" اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا پورا وجود کانپ کر رہ گیا۔

"منصور۔ میرے بیٹے۔ بی ایزی۔" اس نے حسن کے انداز میں کہا۔

"ہاں تو مجھے کانفیڈنس میں لے کر سب کچھ بتا دو۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھتی ہوں۔ کیا صرف چند لمحوں کو تم بھی مجھے ماں سمجھو گے؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ماما۔" وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اس کے چاروں طرف جیسے کسی نے آگ لگا دی۔ اس کے سامنے یہ رونے والا کون تھا۔ اس کا اپنا جگر گوشہ۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کے آنسو اس کے سینے پر انگارے بن کر گر رہے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ کانپتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ ماما میرا کوئی نہیں۔ وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔

"نہیں۔ تم تنہا نہیں منصور۔" وہ خود آبدیدہ ہو گئی۔ "تم تنہا نہیں ہو۔ میں بھی ہوں تمہاری ماں جس نے تمہیں اپنے لہو سے سینچا تھا مگر تمہیں اپنا نہیں سکی۔"

"آپ نہیں جانتیں نا... یہ جو میرے پاپا ہیں نا۔ انھوں نے مجھے کسی لاوارث بچوں کے ادارے سے لے کر پالا تھا۔ اس کے بعد ان کے اپنے بچے ہوئے تو مجھے اگنور کر دیا گیا۔ اور اب میں بالکل فالتو ہوں ان کے لئے۔ پاپا کو مجھ سے ہمدردی ہے۔ باقی سب گھر والوں کا بس چلے تو مجھے آج ہی باہر پھینک دیں۔"

"مگر... وہ آگے کچھ بھی نہ بول سکی اور اس کے لئے اس موڑ پر کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ وہ اتنی تہی دامن تھی کہ اس کے پاس اپنے بچے کو تسلی دینے کے لئے چند الفاظ بھی نہ تھے۔

میں نے پاپا سے اس ادارے کا ایڈریس مانگا تو گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ پاپا بھی مجھ سے بدظن ہو گئے ہیں۔ ماما کیا میرے ماں باپ زندہ ہوں گے؟"

"خدا سے امید کرو بیٹے۔ وہ مدد کرنے والا ہے۔"

"مگر نہیں ماما۔ اگر ماں باپ زندہ ہوتے تو میں لاوارثوں کے ادارے میں کیوں جمع کرایا جاتا۔" وہ سوچ کر بولا۔

"تم ان سے کوآپریٹ کرنے کی کوشش کرو۔ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔"

"پاپا نے مجھے امتحان کے بعد اپنا بندوبست کر لینے کا حکم دے دیا ہے ماما مجھے بتایئے میں کہاں جاؤں۔"

"اوہ خداوندا! اتنا بڑا امتحان۔ اتنی بڑی سزا۔ یہ سزا کب معاف ہوگی۔ اے خداوند بھٹکی تو میں تھی۔ بہکانے والا تو زین تھا۔ اس میں منصور کی کوئی خطا نہیں ہے۔ میں نے اپنی اس لغزش کی بہت سزا پائی ہے۔ میرا ضمیر آج بھی مجھے نہیں بخشتا ہے مگر اس معصوم کی کیا خطا ہے۔"

وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے منصور کو بڑی تسلیاں دیں۔ مگر الفاظ بڑے کھوکھلے اور بے معنی تھے۔ ان ہی الفاظ سے خالد نے بھی تسلی دی تھی اور باقی لوگوں نے بھی جو اس کی کہانی جانتے تھے اس نے کوئی نئی بات نہیں سمجھائی تھی۔ اور وہ منصور اتنا سمجھدار اجلا اور ذہین بچہ اس وقت سوچ رہا تھا۔ بس سب لوگ اس بات کے پیچھے کیوں پڑے ہیں کہ میں ان لوگوں سے کوآپریٹ کروں۔

اور اس دن وہ شام ہونے سے پہلے ہی بورڈنگ ہاؤس کو استعفیٰ دے آئی۔ اسٹوڈینٹس تک یہ بات نہ پہنچ پائی اور شام کو ڈنر ٹیبل پر دیر سے پہنچنے والے اسٹوڈنٹس جو چھٹیوں کے بعد اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہیلو اور ہاؤ ہو نے اسے کچھ سوچنے ہی نہ دیا۔

"ماما آپ بڑی کمزور ہو گئی ہیں۔ ماما آپ چھٹیوں میں بڑا یاد آئیں۔"

"ماما۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟" مختلف آوازیں آ رہی تھیں خاص طور پر جونیئر کلاسز کے بچے بڑی معصومیت سے اس سے اس کا حال پوچھ رہے تھے۔

"ماما سچی آپ بڑا یاد آئیں۔" ننھے سلیم نے کہا۔

"میں نے بھی تمہیں بڑا یاد کیا بیٹا۔ وہ رو دینے کو تھی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

ایک انسیت سی ہوگئی تھی ان لوگوں سے۔

"یہاں آپ بے ایمانی کر گئی ہیں ماما۔"

منصور نے اس کے کان میں کہا۔

"اوہ ساری۔ دراصل بعض اوقات دوسروں کا دل رکھنے کے لئے جھوٹ بھی تو بولنا پڑ جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تمہارے علاوہ ان چھٹیوں میں کسی بھی بچے کو یاد نہیں کیا۔

"اور خالد کو؟" منصور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"خالد کو تو تمہارے چونکے میں یاد کرنا پڑا۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"سچ ماما۔"

"ہاں بالکل سچ۔" وہ ہنس سی دی مگر آنسوؤں کی قطار زیادہ لمبی تھی۔ اسے ٹشو پیپر کا سہارا لینا پڑا اور پھر وہ چپ چاپ ہی واپس چلی آئی۔ اس کے استعفے کی بات واقعی ابھی تک ٹوٹ نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر پہنچی تو حسن کو اپنا منتظر پایا۔

"یو آر سولیٹ ٹوڈے۔" حسن نے رسٹ واچ آگے کی۔

"آئی ایم ساری حسن صاحب۔" اس نے بڑے مؤدب انداز میں کہا۔

"کیا بات ہے۔ بے حد تھکی تھکی لگ رہی ہو۔"

"ہاں واقعی۔" اپنے دھواں دھواں ہوتے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ٹی ایزی کرن۔" حسن نے ہمیشہ کی طرح اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں نے وہ سروس چھوڑ دی ہے۔"

"چلو اچھا کیا۔ اب ہمیں راہ تو نہیں دیکھنی پڑے گی۔ مگر اس میں بسورنے کی کیا بات ہے؟"

"انسان کہیں پر اپنا وقت چاہے تھوڑا سا وقت ہی کیوں نہ ہو گزارے تو اس جگہ کو، ان ساتھیوں کو چھوڑتے ہوئے دکھی ہو جاتا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو یوں کہئے نا۔" حسن ہنس دیئے اور تھوڑی دیر بعد ہی چائے بنا لائے۔ اسے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ اور حسن جانے کیسے ہمیشہ اس کا اندر پڑھ لیتے تھے۔

چار پانچ روز انتہائی کرب کی نذر ہو گئے۔ حسن بھی ٹرانسفر کے چکر میں پورے پورے دن جانے کہاں غائب رہتے اور وہ پورے دن خلاؤں میں منصور کی پرچھائیاں دیکھتی رہتی۔ اس روز حسن واپس آئے تو انھوں نے اسے آتے ہی سامان پیک کرنے کو کہا۔

"مگر کیوں؟" وہ حیران رہ گئی۔

"پہلے آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ پورا مٹھائی کا ڈبہ کھا کر دکھائیں۔" حسن نے بریف کیس میں سے مٹھائی کا ڈبہ نکال کر آگے کیا۔

"یہ تو بڑی مشکل ہے۔" وہ ڈبہ ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

"تو پھر ہم آپ کو وہ تین عدد خوشخبریاں بھی نہیں بتائیں گے جو آج ہمیں ملی ہیں۔"

"اور یہ مٹھائی ان تین خوشخبریوں کی ہے یا ایک کی"

"فی الحال تینوں کی۔ باقی ادھار۔"

تب وہ چونک گئی۔ آج بہت دنوں بعد حسن موڈ میں تھے۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرہ بے حد شگفتہ ہو رہا تھا۔

"بھئی یہ پوری آدھ سیر مٹھائی کھانی مشکل ہے۔"

"چلو آدھی کر لو۔ اس سے کم نہیں ہو سکتی۔" حسن نے مٹھائی آدھی کر کے اسے پکڑا دی۔

"میں غسل کرنے جا رہا ہوں۔ اتنی دیر میں اگر مٹھائی ختم ہو گئی تو آپ کو خوشخبریاں بتا دی جائیں گی ورنہ صرف ایک خبر سنائی جائے گی۔" وہ یہ کہہ کر باتھ روم میں گھس گئے۔

"ممی پلیز کھالیں نا۔"

رابعہ کو وہ خبریں جاننے کی زیادہ ہی جلدی تھی۔ تب رابعہ اور عائشہ نے چپکے سے اس کا ساتھ دیا اور ان تینوں نے حسن کے باہر آنے سے پہلے ہی مٹھائی چٹ کر لی۔ اگرچہ اتنی مٹھائی کھانی بھی قدرے مشکل ہو گئی تھی۔

"ارے کمال کر دیا۔" حسن باہر نکلے تو حیران رہ گئے۔

"کہیں چھپا تو نہیں دی؟"

"نہیں ایمان سے۔" عائشہ نے جلدی سے قسم کھائی۔

"نمبر ون سنو۔ ہمارا ٹرانسفر ہو گیا ہے اور ہم کل ہی اپنے گھر جائیں گے۔ میں نے کرایہ دار سے خالی کرا لیا ہے۔ نمبر دو یہ کہ میری پروموشن ہو گئی ہے۔ اور نمبر تین ادھار۔"

"پاپا۔ یہ آپ کو ادھار رکھنے کی عادت کب سے پڑ گئی ہے۔" رابعہ نمبر تین بھی سننے کو بے قرار تھی۔

"ادھار محبت کی قینچی ہے۔" عائشہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہوا جملہ سنایا۔

"چلو بھئی جلدی جلدی سامان کی پیکنگ کرو۔" حسن نے بات ٹالی۔

اس کی جان نکل کر رہ گئی۔ اب کیا پھر وہ کبھی منصور کو نہ دیکھ سکے گی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"یا اللہ یہ امتحان، یہ آزمائشیں، یہ سزائیں۔ یہ کب ختم ہوں گی، میں بجھ چکی ہوں، میں بجھ رہی ہوں۔"

آخر کب تک — کب تک ایندھن کام دے گا۔ کب تک ہمتیں ساتھ دیں گی۔ منصور میرے بیٹے، میرے بچے تیرا کوئی قصور نہیں۔ میں خداوند سے دعا کرتی ہوں کہ وہ تیرے دکھ بھی مجھے دے دے اور میرے سارے سکھ اس کے بدلے لے لے۔

وہ ادھر ادھر بولائی پھر رہی تھی۔ لمحے سرکتے رہے اور ٹھہرے تو کہاں آکر جب سامان اسٹیشن چلا گیا اور حسن دو گھنٹے تک رابعہ اور عائشہ سے لان میں جانے کیا کیا باتیں کر کے کسی دوست سے ملنے کا کہہ کر گئے ہوئے تھے۔ وہ اس گھر کو دیکھ رہی تھی جہاں اس نے اپنی زندگی کا اہم وقت گزارا تھا۔

"ممی آپ اتنی اداس کیوں ہو رہی ہیں؟" رابعہ نے اسے سنجیدہ دیکھ کر کہا۔

"ہاں آپ اداس نہ ہوں۔ پاپا کہہ رہے تھے۔ وہ نمبر ون والی خوش خبری لینے جا رہے ہیں اور وہ خبر تو بڑی فنٹاسٹک ہے۔" عائشہ نے کہا۔

"تم لوگ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کون سی خبر ہے بتاؤ۔" اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں سرد مہری سے کہا۔

"باجی سے پوچھیں۔" عائشہ نے کہا۔

"نا بھئی پاپا ماریں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"لیجئے وہ پاپا آ گئے۔" عائشہ کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور تب اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حسن کے ہمراہ منصور بھی تھا۔

"ممی یہی تو نمبر ون خوش خبری ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"دیکھو کرن۔" حسن کی آواز میں بے حد شوخی تھی۔

"حسن۔" وہ بے دم سی ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ حسن نے تھام لیا۔

بیٹے کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئیں۔ حسن نے اسے سنبھالا "ماما۔ میری ممی۔ منصور اس کے سینے سے لگا بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ عجب عجب سی قیامتیں اس ایک پل میں گزر گئیں۔ بڑے زور کا طوفان آیا تھا۔ بے انتہا شور تھا۔ مگر جب طوفان تھما تو روپہلی دھوپ سامنے جھانک رہی تھی۔ اس نے لمحے بھر کو منصور سے جدا ہو کر حسن کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح چمک تھی اور بے انتہا اعتماد تھا۔ وہ ان کے سینے سے لگ گئی اور سارے آنسو بہا دیئے۔ اسے کتنی حسرت تھی کہ ان کے سینے سے لگ کر کسی روز بے حد روئے۔

"مگر حسن۔" اس کی آنکھوں میں بہت بڑا سوال تھا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ منصور کا اپنی بھی سنبھالو اور نکلو۔"

حسن نے بات وہیں روک دی اور وہ لوگ باہر کھڑی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ رابعہ اور عائشہ بھائی کو پا کر بے حد خوش تھیں اور چپکے چپکے منصور کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے دل میں موجزن خوشی ان کے چہروں سے ہویدا تھی۔

"پاپا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا یہ سب کیسے ہو گیا۔" منصور کی آواز میں لرزش تھی۔

"بھئی تمہیں پانے کے لئے ہم نے بڑی محنت کی ہے۔ زبردستی یہاں ٹرانسفر کرایا۔ تمہاری ممی کو نوکری کی اجازت دی جو ہم مر بھی جاتے تو کبھی نہ کرنے دیتے اور پھر تمہیں ڈھونڈنے کے لئے پورے شہر کو کنگھال دیا۔ آپا بی نے ہمیں تمہارے بارے میں بتا دیا تھا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بتا رہے تھے۔

"حسن یو آر ویری گریٹ۔ کاش میں اس وقت تمہارے پیروں میں گر کر تمہاری عظمت کو سلام کر سکتی۔" اس نے کھلی اور نکھری فضا میں سانس لے کر سوچا۔ اٹھارہ سال پرانا گلیشئر پانی بن کر ہوا ہو گیا تھا۔ وہ بے حد ہلکی ہلکی ہو گئی تھی۔

"ممی۔ آپ نے مجھے اس ادارے کے سپرد کیوں کیا تھا؟"

"بھئی اس میں تمہاری ممی کا قصور نہیں ہے۔ جب تمہارے نانا ابا کو پتہ چلا کہ تمہارے پاپا دوسری شادی کر رہے ہیں تو انہوں نے زبردستی تمہیں اس ادارے میں بھجوا دیا۔"

"اور پھر؟" منصور نے کہا۔

"تمہارے پاپا کی ڈیتھ ہو گئی۔ ہم لوگ تمہیں اٹھارہ سال سے تلاش کر رہے ہیں۔"

"آپ کتنے اچھے اور گریٹ مین ہیں۔" منصور نے کہا۔

"بھئی کرن سنبھالو اپنے بیٹے کو۔ اپنے باپ کو مکھن لگا رہا ہے۔" انھوں نے کہا تو وہ تمام لوگ ہنس دیئے۔ منصور شرمندہ سا ہو کر مسکرا دیا۔ اس نے گاڑی سے باہر دیکھا۔ شہر پیچھے جا رہا تھا اور وہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔

مگر اب خار دار جھاڑیاں راستے میں نہ رہی تھیں۔ جانے کیسے اچانک ہی راستہ صاف ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا منصور اس کے پہلو میں تھا۔ اس کا عظیم جیون ساتھی اس کے ہمراہ تھا۔ اور اس کی بچیاں، معصوم بچیاں مستقبل کے سنہرے سپنوں جیسی رنگت والی سنہری رابعہ اور عائشہ کے چہرے پر خوشیاں لہرا رہی تھیں۔

*

درد کا سورج

سیما یاسمین مجتبیٰ

دوسری اور آخری قسط

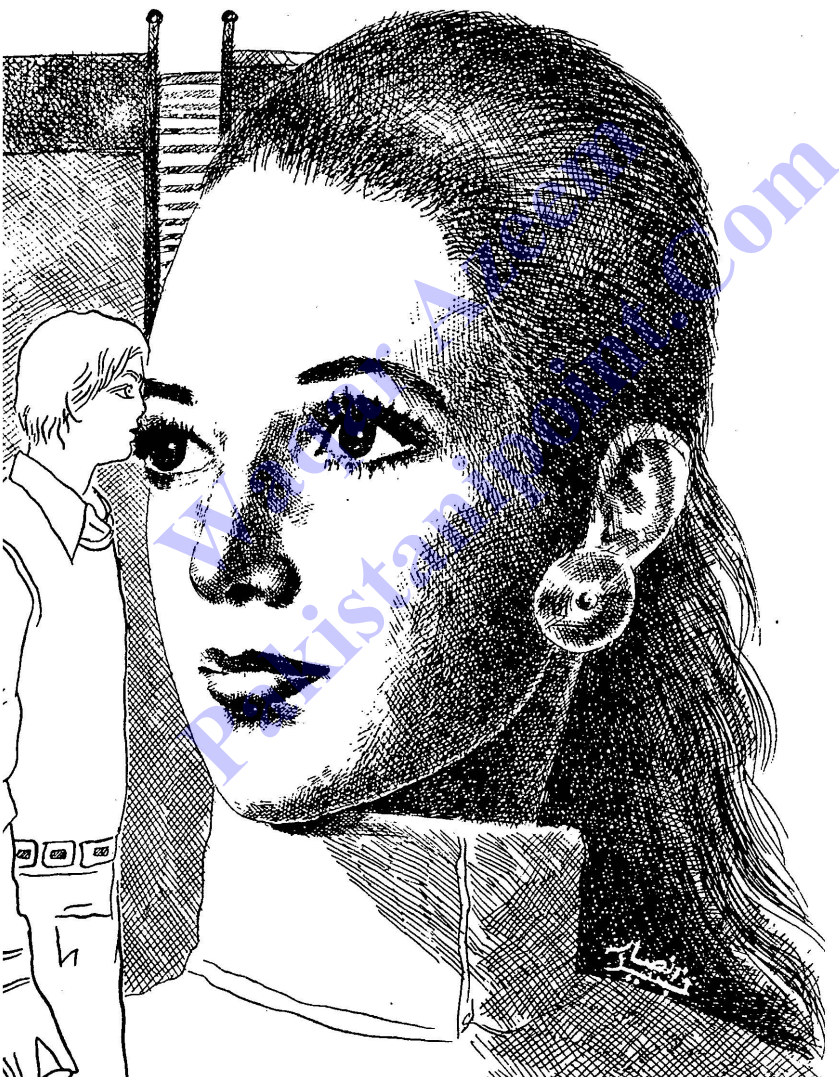

WaqarAzeem
Pakistanipoint.Com

آتف جلدی سے بولا۔
"اس میں کاشف کا کوئی دوش نہیں۔ وہ آپ کو دیکھ کر یکسر بدل چکا ہے۔"

ثمرین غصے سے بولی "چاہے کاشف صاحب ہماری خاطر فرشتہ ہی کیوں نہ بن جائیں تب بھی ہمارے دل میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں پیدا ہو سکتی۔"

آتف نے گہری نظروں سے ثمرین کے نازک چہرے کیطرف دیکھا اور دھیرے سے بولا
"لیکن کیوں؟ اس نے آپ کی خاطر ہی اپنے آپ کو یکسر بدل ڈالا۔ جبکہ اسے یہ احساس بھی ہے کہ آپ اس سے نفرت کرتی ہیں اور کبھی اس سے ملیں بھی نہیں۔ آپ ان باپ بیٹی کی خاطر اس سے بدستور نفرت کیوں کئے جا رہی ہیں؟"

ثمرین کاشف کی وکالت کرنے پر حیران نظروں سے آتف کو دیکھتے ہوئے تلخ ہوتے ہوئے بولی
"ٹھیک ہے کاشف نے ہماری خاطر اپنے آپ کو بدلا لیکن پھر ساتھ ہی ساتھ شیاما کو بھی بدلنا چاہا اور جب وہ نہیں بدلی، تب کاشف نے ہماری طرف جھکنا شروع کیا۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا ہماری طرف جھکاؤ محض غصے اور ضد کی بدولت ہو اور پھر جو شیاما نے کاشف کو حاصل کرنے کی خاطر اپنے آپ کو بدل ڈالا کاشف ہی کی طرح تو پھر کاشف صاحب واپس اس کی طرف پلٹ جائیں گے۔ آخر وہ ان کا پہلا پیار ہے۔"

آتف غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا
"کاشف نے کبھی شیاما سے محبت نہیں کی ورنہ وہ اس سے کب کا شادی کر چکا ہوتا۔ وہ تو بس انجانے میں اس کے قریب پہنچ گیا مگر پھر آپ نے دیکھا ہی کہ شیاما کا ماسک اترتے ہی اس نے شیاما سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اب کسی بھی قیمت پر اسے اپنانے پر تیار نہیں کیونکہ وہ اسے اچھی طرح پہچان چکا ہے۔"

ثمرین تیز نظروں سے آتف کو دیکھتے ہوئے بولی
"آپ کو کاشف کے بارے میں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

آتف اطمینان سے بولا
"آپ نے اب تک جو کاشف کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں ان سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں اور میرا یہ تجزیہ سو فیصد درست ہے چاہے آزما لیں۔"

ثمرین اسے تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی
"تعجب ہے کاشف کو اس کی تمام تر خامیوں کے باوجود آپ اچھا کہہ رہے ہیں اور شیاما کو جو کہ کاشف ہی کی طرح خود کو بدلنے پر تیار ہو گئی ہے آپ بدستور برا کہے جا رہے ہیں۔ آخر کیوں؟"

وہ لمحہ بھر کو بھی سوچے بنا بولا
"وہ اس لئے کہ کاشف، معاف کیجئے گا، آپ کو صدق دل سے چاہتا ہے آپ کی بے رخی کے باوجود آپ کے اور اسکے درمیان نفرت کے بندھن کے باوجود جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی یہ تبدیلی ظاہری نہیں ہے، بلکہ وہ فطری طور پر اچھا انسان ہے جسے وقتی طور پر آدم کی طرح بھٹکایا گیا تھا۔ مگر پھر نیکی کی راہ نظر آتے ہی بغیر کسی صلے کے اس نے صراطِ مستقیم پر چلنا شروع کر دیا۔ جبکہ شیاما کا کیس کاشف سے مختلف ہے۔ اس کی اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی خواہش منافقت پر مبنی ہے کیونکہ وہ صرف اس لئے اپنے آپ کو بدل دینا چاہتی ہے تاکہ کاشف اسے اپنا لے اور ظاہر ہے اس کے بعد وہ پوری طرح اپنی من مانی کر سکتی ہے۔ اگر سچے دل سے سیدھا راستہ اختیار کرتی تو کاشف کی نفرت کے باوجود اس پر قائم رہتی۔"

آتف گہری نظروں سے ثمرین کی نرم نگاہوں میں دیکھتے ہوئے بولا "لیکن اگر شیاما ایسی ہوتی تو کاشف اسے کب کا اپنا چکا ہوتا۔ اس کی خامیوں کو برداشت کر لیتا لیکن وہ اس کی فطرت کو بخوبی جانتا ہے اسی لئے اس نے دوستی کے باوجود کبھی شیاما سے شادی کی بات نہیں کی۔"

ثمرین الجھتے ہوئے بولی
"ہماری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

آتف ٹھوس لہجے میں بولا
"پہلے یہ بتایئے کہ میں نے کاشف اور شیاما کے بارے میں جو تجزیہ کیا ہے وہ آپ کی سمجھ میں بھی آیا؟"

ثمرین کی نگاہیں جھک گئیں اور کچھ دیر بعد سوچ کی پرچھائیوں کی اوٹ سے وہ آتف کی طرف دیکھتے ہوئے بولی
"سوچ کر بتائیں گے۔" اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ آتف اس کے موڈ پر کشمکش و پیچ میں پڑتے ہوئے گھبرا کر بولا
"پلیز ثمرین! میری باتیں سمجھنے کی کوشش کریں۔"

وہ جاتے جاتے پلٹ کر تلخ لہجے میں بولی۔ "ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ بڑے اعلیٰ ظرف کے انسان ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ تمام لڑائی جھگڑوں کا ایک ہی وقت میں بدلہ لینا چاہتے ہیں۔"

آتف کا چہرہ سفید پڑ گیا مگر ثمرین اس کی پرواہ کئے بغیر نفرت سے بولے گئی
"اس لئے آج سے ہماری آپ کی دوستی ختم۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے اور ہم اس سے خود نبٹ لیں گے۔ آپ کو اتنی بھی زحمت دینے کی معافی چاہتے ہیں۔"

اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ آتف کے ہاتھ پیر پھول

اور بدن پسینے پسینے ہو گیا۔ وہ لپک کر ثمرین کے قریب پہنچتے ہوئے پریشان آواز میں بولا

"پلیز ثمرین! اتنی سی بات پر ہمارا یہ مقدس دوستی کا بندھن تو نہ توڑو۔"

ثمرین اسکو اس طرح ایک دم موم کی طرح پگھلتے دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"یہ اچانک کیا ہو گیا آپ کو؟" وہ اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ کی زبان صرف قینچی کا کام ہی دیتی ہے مگر آج تو یہ سوئی دھاگا بنی ٹکڑے ہوتے رشتوں کی پیوند کاری کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ خیریت! یہ انقلاب کیسے؟"

آتف گلا صاف کرتے ہوئے بولا

"تم کیا سمجھتی ہو کہ میں جو تم سے لڑائی جھگڑا، بحث و تکرار کرتا ہوں، وہ نفرت کی بدولت ہے؟"

ثمرین نے چبھتی نگاہوں سے آتف کی آنکھوں میں دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولی

"جی نہیں۔ محبت کی بدولت ہے" اور شانے جھٹکتی تیزی سے باہر نکل گئی۔ آتف دم بخود سا اسے جاتا دیکھتا رہ گیا اور سوچ میں ڈوبا ڈوبا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

ادھر کار میں بیٹھتے ہی ثمرین نے ڈرائیور کے ہاتھ میں کاشف کا پتہ پکڑاتے ہوئے جو اسے کرنل نے فون پر لکھوایا تھا، کار کاشف کے بنگلے کی طرف موڑ لینے کو کہا۔

کاشف کا بنگلہ اس کے مکینوں کے اعلیٰ ذوق کی منہ بولتی تصویر تھا۔ قدرتی حسن سے جگمگاتا ہوا۔ انگوروں، سویٹ پی اور منی پلانٹ اور سفیدے کے پھولوں اور بیلوں سے لدے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے ثمرین کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی پھلواری میں آگئی ہو جہاں پھولوں اور ان کی مہک اور رنگ برنگے پرندوں اور انکی چہکار سے فضا میں عجیب سی دل کشی اور عجیب سا سہانا پن رچا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے کار پورٹیکو میں روکتے ہی ثمرین تیزی سے نیچے اتری اور لان میں رنگ برنگے ہزاروں اقسام کے پھولوں کو مہکتے اور سرو و پام کے لہلہاتے پیڑوں کو دیکھ کر اپنا مقصد، اپنا غصہ سب کچھ بھول گئی اور رات کی رانی سے ڈھکے آبنوسی دروازے کی بیل بجانے کے بجائے والہانہ انداز میں لان کو تکنے لگی جس کے درمیان سبز و سفید پتھروں کا بنا کیوپڈ کا پتھر تھامے مجسمہ فوارے کی صورت پانی اگلتا لان کے قدرتی حسن میں اور بھی اضافہ کر رہا تھا! وہ جانے کتنی دیر یوں ہی کھڑی رہتی کہ لکڑی کا آبنوسی دروازہ خود بخود کھلا اور سامنے اپنی من پسند ہستی کو دیکھ کر کاشف کو اپنی دھڑکنوں پر قابو پانا محال ہو گیا۔

وہ خوشی سے کانپتی آواز میں بولا "ثمرین آپ اور یہاں! خدا کا شکر ادا کروں یا اپنی قسمت پر رشک کروں۔"

ثمرین تیزی سے پلٹی اور کاشف کو اپنی طرف والہانہ انداز میں دیکھتا دیکھ کر بوکھلا سی گئی۔ اسے کچھ دیر پہلے کی آتف کی کاشف کے متعلق رائے ہیچ نظر آنے لگی اور پھر ایک دم اسے آج کا آتف یاد آ گیا جو اتنی دوستی کے باوجود اس سے یوں ملا تھا کہ جیسے وہ دو اجنبی ہوں اور بے اختیار اس کا جی چاہا تھا کہ آج کے بعد کبھی آتف کی شکل بھی نہ دیکھے! اپنے اسی ..... تجزیئے اور رنجش و رنج کی بدولت وہ کاشف کو کھری کھری سنانے کے بجائے، جیسا کہ وہ سوچ کر آئی تھی، بس ٹکر ٹکر دیکھے گئی

کاشف اس کے احساسات سمجھتے ہوئے مسکرا اٹھا اور ملائمت سے بولا:

"پہلے اندر تو آجایئے۔ پھر کچھ کہیے، سنیئے گا۔"

ثمرین کچھ کہے بنا چونک کر پلکیں جھپکتی اندر داخل ہوئی مگر سامنے پھولوں سے مہکتی لاؤنج میں ہی ٹھٹک کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی

"اس وقت آپ گھر میں تنہا ہیں۔"

کاشف اس کے چہرے کے تاثرات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا اٹھا اور ملائمت بھری مسکراہٹ سے بولا

"فکر مت کریں۔ میں نے باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے اور ڈرائیور سے اندر گیلری میں آکر بیٹھ جانے کو کہا ہے۔ امی، پپا باہر گئے ہوئے ہیں۔"

ثمرین نے سٹپٹا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ محظوظ مسکراہٹ سے اسے تکتے ہوئے بولا

"تشریف رکھئے۔"

وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتی جھٹ بیٹھ گئی اور اس لمحے کاشف کو وہ ایسی معصوم سی گڑیا لگی جو کسی دشت میں کھو گئی اور باہر نکلنے کا راستہ نہ پا رہی ہو۔ وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اسکے مقابل کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا

"خیریت! آج ہمارے آشیانے کا کیسے خیال آگیا آپ کو؟"

ثمرین نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی کہ کیسا شخص ہے یہ جو اتنے عرصے کے بعد ملنے کے بعد اور اپنے بارے میں اس کے خیالات جاننے کے باوجود کس قدر خلوص و

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

اپنائیت سے مل رہا ہے جس کا مظاہرہ آتف نے اچھی خاصی دوستی ہونے کے باوجود کبھی نہیں کیا اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ... اپنے احساسات پر قابو پاتے ہوئے نہایت صاف گوئی سے بولی۔

"کاشف صاحب! ہمیں انکل خرم سے اطلاع ملی ہے کہ آپ نے شیاما سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا ہے اور بقول ان کے ہماری وجہ سے۔" وہ ایک دم سے اس کی اپنے چہرے میں کھوئی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولی۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

کاشف اسی طرح محویت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا

"سو فیصدی!"

ثمرین جواب پر پل بھر کو ٹھٹکی مگر پھر فوراً ہی پُراعتماد لہجے میں بولی۔

"تو پھر صاف صاف سن لیجئے کہ آپ کو ہماری طرف سے کبھی محبت نہیں ملے گی! آپ چاہے جو بھی کر لیں ہمیں امپریس نہیں کر سکتے۔"

اس نے دیکھا کہ کاشف کا چہرہ اذیت ناک حد تک پیلا پڑ گیا۔ مگر وہ لوہے کو گرم دیکھ کر اس پر چوٹ لگائے گئی۔

"اس لئے بہتر ہے کہ آپ ہمارا خیال دل سے نکال دیں، اور شیاما کو اپنا لیں جو کہ آپ کی محبت میں بیمار تک پڑ گئی ہے۔"

کاشف چند لمحے ساکت نظروں سے ثمرین کو دیکھتا رہا پھر اداسی کی گونج لئے ٹھوس آواز میں بولا

"آپ نے ہمیشہ ہی مجھے غلط سمجھا۔ میں نے کبھی آپ کو امپریس نہیں کرنا چاہا! بلکہ آج تک اپنے آپ کو آپ کی نظروں سے روپوش رکھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ آپ میری صورت تک سے نفرت کرتی ہیں۔ بس اپنے کعبۂ دل میں ضرور آپ کے طواف کرتا رہا۔ مگر اس سے مجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ آپ بھی نہیں!"

وہ اس کی نرم حسین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تلخی سے بولا تو ثمرین کی نگاہیں بھی جھک گئیں۔ تب بکھرتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو لاحاصل سمجھنے کے باوجود میں نے آپ کی پرستش کی، کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اس وقت تک جب تک میری سانسوں میں دم ہے اور آپ آنکھوں کے سامنے ہیں۔"

ثمرین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اطمینان سے بولا۔ "جی ہاں! آپ ہر لمحے میری آنکھوں کے سامنے یوں موجود رہتی ہیں جیسے اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہیں۔"

ثمرین نے مضبوطی سے لب بھینچ لئے اور وہ سرخ چہرے سے کہنے لگا" اور اس سب سے آپ کا، کرنل یا شیاما کسی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" پھر ٹھہرے ہی خود سرانہ انداز میں بولا" اور ہاں یہ بھی سن لیجئے کہ آپ کو نہ پانے کے باوجود، لاحاصل سمجھنے کے باوجود میں شیاما سے شادی نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کے لئے آپ مجھے شوٹ ہی کیوں نہ کر دیں۔"

ثمرین غصے سے بولی" آج کے دن بھر کے تجربات نے ظاہر کر دیا ہے کہ مرد نہ صرف یہ کہ بے وقوف ہوتے ہیں بلکہ عورتوں سے بھی زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔"

کاشف خفیف مسکراہٹ سے بولا۔

"محبت بیوقوفی یا جذباتیت ہرگز نہیں ہے اور طنزیہ مگر مسکراتی نگاہیں ثمرین پر ڈالتے ہوئے بولا" اور یہ صرف بہادروں ہی کے بس کا کام ہے ورنہ بزدل تو محبت کے لفظ سے ہی دور بھاگتے ہیں..."

ثمرین نے یہ چوٹ برداشت کرتے ہوئے تیز نظروں سے کاشف کی طرف دیکھا تو وہ اس کی خوبصورت آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا

"شاید ڈوبنے سے ڈرتے ہیں، اسی لئے بحر بیکراں میں قدم نہیں رکھتے۔"

ثمرین پُرسکون لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔

"خودکشی کرنا کوئی دانشمندی نہیں۔"

کاشف نے پل بھر کو سوچا پھر خفیف مسکراہٹ سے بولا

"تعجب ہے آتف صاحب بھی آپ کو اس بحرِ بیکراں میں نہیں گھسیٹ سکے۔"

ثمرین بری طرح چونکتے ہوئے بولی

"آپ کو آتف کے بارے میں کس نے بتایا؟"

وہ محظوظ مسکراہٹ سے بولا

"ہم بھی اسی دنیا کے باسی ہیں جس میں آپ رہتی ہیں اور اپنے سے متعلق ہر بات کی خبر رکھتے ہیں۔"

ثمرین چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی

"تو پھر اس بات کی بھی جناب کو خبر ہوگی کہ شیاما نے آپ کے سوگ میں کھانا پینا ترک کر دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ اگر آپ نے اسے نہیں اپنایا تو وہ خودکشی کر لے گی۔"

کاشف کا موڈ ایکدم آف ہو گیا اور وہ کڑوے سے لہجے میں بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کیوں اس قدر شیاما کی وکالت کئے جا رہی ہیں؟"

ثمرین جھلا اٹھی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

"وہ اس لیے کہ آپ کی چہیتی دوست اور اس کے والد بزرگوار مجھے آپ کی شیاما کے سلسلے میں بے اتفاقی کا مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور یہ وارننگ دے چکے ہیں کہ اگر میں نے آپ کو شیاما سے شادی پر راضی نہیں کیا تو پھر وہ لوگ ایسا قدم اٹھائیں گے جس کی بدولت مجھے کلنک کے ٹیکے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

"واٹ؟" کاشف کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔

"اوہ گاڈ! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لوگ اس قدر اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئیں گے۔"

پھر نرم نگاہوں سے ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"میں اس بدتمیزی کے لئے آپ سے بہت شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔"

وہ نظریں جھکاتے ہوئے زیر لب بولا۔

آج پہلی بار ثمرین کاشف کے دل میں اپنے لئے اس بے پناہ چاہت و احترام کو دیکھ کر متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ مگر لہجے میں کوئی تاثر دیئے بغیر دھیرے سے بولی

"اگر آپ واقعی شرمندہ ہیں اور ہمارا احترام کرتے ہیں تو پھر آپ ہمیں اس مشکل سے چھٹکارا دلا دیں اور کرنل صاحب سے صاف صاف کہہ دیں کہ آپ کا اور شیاما کا جھگڑا آپس کی کسی رنجش کی بدولت ہے ہماری وجہ سے نہیں۔"

کاشف اس کی تیکھی سوالیہ نظروں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔

"آپ فکر نہ کریں میں صورت حال کو سنبھال لوں گا اور انشاءاللہ آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔"

ثمرین نے چند لمحے کو مسکراتی مطمئن نگاہوں سے دیکھا اور اٹھتے ہوئے دھیرے سے بولی

"شکریہ۔ آتف ٹھیک کہتے تھے، آپ واقعی دل کے نیک انسان ہیں۔"

کاشف بری طرح چونکتے ہوئے بولا "آتف نے آپ سے میرے بارے میں یہ کہا؟ مگر کب؟"

ثمرین اس کی بوکھلاہٹ پر پہلی بار مدھم مسکراہٹ سے بولی

"آپ کی طرح آتف بھی اسی دنیا میں رہتے ہیں اور آپ کے بارے میں غائبانہ طور پر سب کچھ جانتے ہیں۔"

کاشف کی نگاہیں جھک گئیں۔ ثمرین فوراً بولی

"آپ شرمندہ نہ ہوں۔ وہ آپ کو بڑا اچھا سمجھتے ہیں اور اسی بات پر کچھ دیر پہلے ہم دونوں کی سخت تکرار بھی ہوئی ہے۔"

کاشف نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور سوچتی نگاہوں سے ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟ آپ یہاں آنے سے پہلے آتف صاحب سے مل کر آ رہی ہیں؟"

ثمرین اطمینان سے صاف گوئی سے بولی

"جی ہاں! ان کا ہمارے گھر کافی آنا جانا ہے اور آپس کی لڑائی اور بحث و تکرار کے باوجود وہ ہمیں قابل اعتماد لگتے تھے۔"

کاشف کی نظریں ایک بار پھر جھک گئیں اور ثمرین کہتی گئی۔

"اسی لئے ہم نے سوچا تھا کہ یہ تمام صورت حال انہیں بتا کر ان سے اس سلسلے میں مشورہ لیں۔ مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟" کاشف نے بیتابی سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اداس مگر روکھے لہجے میں بولی

"لیکن وہ ہماری امیدوں کے برعکس نکلے اور اس طرح اجنبیت کے ساتھ گفتگو کی۔ اوپر سے صحیح مشورہ دینے کے بجائے الٹی آپ کی طرف داری کرنے لگے کہ ہمارا تو دل بھی نہیں چاہتا انکی شکل دوبارہ دیکھنے کو۔"

کاشف نے عجیب نظروں سے ثمرین کو دیکھتے ہوئے دانتوں تلے نچلا ہونٹ دبا لیا اور عجیب سی اداسی سے بولا۔

"میری طرح آتف بھی کتنا بدنصیب ہے کہ آپ کی چاہت کے بجائے نفرت مول لے بیٹھا۔"

ثمرین جلدی سے بولی

"آپ ان کی فکر نہ کریں۔ ان کے دل میں ہمارے لئے کبھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ تو شاید دادی اماں سے انسیت کی وجہ سے ہمارے ہاں آتے ہیں ورنہ ہم سے تو ہمیشہ لڑائی جھگڑا ہی کرتے رہتے ہیں۔"

کاشف اداس مسکراہٹ سے بولا

"ضروری تو نہیں ہر جھگڑے کے پیچھے نفرت ہی کا جذبہ چھپا ہو۔"

ثمرین ایک دم اٹھتے ہوئے بولی

"بہرحال آپ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں شیاما کے سلسلے میں تو جلد از جلد کیجئے اور بس۔"

کاشف بھی اٹھتے ہوئے بولا

"پلیز ایک بات بتاتی جائیے۔"

اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔ وہ مدھم مسکراہٹ سے [illegible]

"کیا آتف نے آپ کو مجھ سے ملنے کا مشورہ دیا تھا جو آپ یہاں تشریف لائیں؟"

ثمرین نے پر رعب نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں! بلکہ ان کی باتوں پر بیزار ہو کر ہم یہاں آئے۔"

کاشف ایک دم اداس مسکراہٹ سے بولا

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"مجھ جیسے بڑے آدمی کے گھر آتے آپ کو ڈر نہیں لگا؟"
ثمرین کی پلکوں میں ارتعاش پیدا ہوا اور وہ تیکھے لہجے میں بولی
"سچی بات تو یہ ہے کہ آتف نے آپ کا جو تجزیہ کیا وہ دل کو سچا لگا اور اسی لئے ہم بے خوف وخطر آپ سے خود بات کرنے چلے آئے"
کاشف کے لبوں پر پہلی بار بڑی دلنشین سی مسرور مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ دھیرے سے بولا
"بس آخری سوال"
ثمرین نے سپاٹ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ رکتے ہوئے بولا "اور مجھ کم ظرف سے مل کر کس نتیجے پر پہنچیں آپ؟"
ثمرین نے اس کی گہری اداس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے صاف گو لہجے میں کہا
"ہم آپ سے مل کر عجیب سا اطمینان محسوس کر رہے ہیں"
کاشف کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ ثمرین نے اس کے مسرور سے چہرے پر ایک نرم سی نگاہ ڈالی اور
"خدا حافظ!"
کہتی باہر نکل گئی۔ اور کاشف اس وقت تک مین گیٹ پر کھڑا دیکھتا رہا جب تک اس کی کار نظروں سے نقطے کی صورت میں بھی اوجھل نہ ہوگئی۔ ——— پھر وہ تیزی سے پلٹا اور اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے پلک جھپکتے میں ہاکس بے کی طرف روانہ ہوگیا ——— آتف سے ملنے۔ اسے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر آتف جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا
"یار! آج تو تم نے مروا ہی دیا تھا۔ تمہاری وہ ———"
کاشف سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بولا۔
"ہوں۔ جانتا ہوں ثمرین یہاں آئی تھی تم سے ملنے"
آتف جلدی سے بولا
"مجھ سے نہیں بلکہ تم سے"
کاشف سوچوں میں الجھا دھوئیں کے مرغولوں میں ابھرتی ڈوبتی ثمرین کی شبیہ میں ڈوبے ڈوبے بولا
"کاش! میں اس سے آتف بن کر نہیں ملتا رہتا!"
آتف اس کے جملے پر جھنجھلا اٹھا
"میں تو تمہیں پہلے ہی دن سے منع کر رہا تھا کہ یہ سوانگ مت بھرو۔ مگر نہ جانے کیوں اس روز اسے یہاں سیٹ میں دیکھ کر تم اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھے۔"
کاشف آنکھیں بند کئے مدھم لہجے میں بولا "سوچا تھا شاید اس سے دوری کی بدولت دل ہر وقت اس کے لئے بیتاب رہتا ہے اس لئے تمہارے نام سے ایک نئی شخصیت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آیا کہ اس طرح قرب سے دلِ بیتاب کو سکون آجائے گا" وہ بڑی بھاری سانس سے بولا
"اب تو جدائی کا تصور ہی موت لگتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں"
آتف کا دل چہیتے بھائی کی مضمحل حالت پر رو پڑا اور وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پیار سے اسکے سر کو سہلاتے ہوئے بولے
"تمہیں اس پہ یہ ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ تم آتف نہیں کاشف ہو۔ وہ تو تمہیں آتف کی حیثیت سے پسند کرتی ہے تو بس تم بھی آتف بن کر ہی اسے اپنا لو"
کاشف اداس سی زخمی نگاہوں سے آتف کو دیکھتے ہوئے بولا
"نہیں۔ اس کے ساتھ میں فراڈ نہیں کر سکتا"
وہ ایک دم چونکتے ہوئے بولا "اور ہاں آج تم سے ملنے کے بعد اس کا دل آتف یعنی میرے دوسرے روپ سے بھی برا ہو گیا ہے جبھی وہ تم سے ملنے کے بعد مجھ سے گھر ملنے آئی اور پہلی بار کاشف کی حیثیت سے میں نے اس کا سامنا کیا تو بڑا عجیب سا محسوس کیا اور وہ بھی نہ جانے کیوں آج عجیب ٹھہرے ہوئے انداز میں باتیں کرتی رہی"
آتف پر عقیدت مسکراہٹ سے بولا
"یہ بات تو ماننا پڑتی ہے کہ ثمرین لڑکی بے حد ذہین ہے کیونکہ اسے آج ہی آتف یعنی تم بہت بدلے بدلے لگے اور اس نے یہ بات میرے منہ پر بھی کہہ دی"
کاشف کے اداس مرجھائے چہرے کو دیکھتے ہوئے آتف دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا
"اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے تم ہی پسند ہو۔ تمہاری باتیں، تمہارے انداز ہی بھاتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے تم پر ایک انجانا سا اعتماد ہے جبھی وہ ایسی مشکل میں تم سے مشورہ کرنے دوڑی آئی اور اتفاق سے مجھ سے ٹکرا گئی"
کاشف اداس مسکراہٹ سے بولا۔
"کتنی عجیب بات ہے یہ۔ بحیثیت کاشف وہ مجھ سے شدید نفرت کرتی ہے اور بحیثیت آتف مجھ پر اعتماد رکھتی ہے سمجھ میں نہیں آتا اپنا کیا حشر کر لوں"
آتف جھنجھلا اٹھا
"ناموں میں کیا رکھا ہے! ایسے ہی پریشانی ہے تو بدل اپنا نام! آتف ہی رکھ لو۔ لیکن جب اس کے نام زندگی کر

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

ہو تو روح کی حیثیت سے اسے جسم و جاں میں شامل کیوں نہیں کر لیتے۔ اس طرح دونوں ہی خوش رہو گے ورنہ محض سلگنے سے تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

کاشف بے ساختہ ہنس پڑا "اونہہ! آج تم سے مل کر آتف بھی اس کی نظروں سے گر گیا ہے۔ وہ مستقبل میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

آتف سوچ سے دمکتی آنکھوں سے پُرجوش انداز میں کاشف کا شانہ دباتے ہوئے بولا

"ان باتوں سے بہت کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ ثمرین تک پہنچنے کے بہت سے بند دریچے کھلتے ہیں۔"

کاشف نے بے ساختہ سوالیہ بے قرار نظروں سے آتف کی طرف دیکھا تو وہ گہری نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے بولا

"آج کی تمام روداد سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ثمرین کوئی بے حس لڑکی نہیں بلکہ وہ محبت کے معاملے میں عام لڑکیوں سے زیادہ گہری سمجھ رکھتی ہے۔ وہ محبت کو..... روح کے دریچوں یعنی آنکھوں سے پہچان لیتی ہے اور چونکہ اسے میری آنکھوں میں بند دریچے نظر آئے، اس وجہ سے اسے مجھ میں اجنبیت محسوس ہوئی"

کاشف سوچتے ہوئے بولا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے جب کبھی بھی اس سے بات کی اس کی نگاہوں کو ایک تلاش کے روپ میں اپنی آنکھوں میں اترتے پایا۔"

آتف مدھم مسکراہٹ سے بولا

"یہ تو بڑا نیک شگون ہے۔"

کاشف اس کا مطلب بھانپتے ہوئے اداس مسکراہٹ سے بولا۔

"ذرا ثمرین کو میری حقیقت بتا دو۔ پھر دیکھنا کس طرح ان کی نگاہوں کی تلاش فنا ہوتی ہے۔ محبت کی پہچان کی صلاحیت دم توڑتی ہے۔"

آتف بھی شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ کاشف ثمرین کو کس قدر دیوانہ وار چاہتا ہے اور ثمرین کے رویے سے بھی واقف تھا۔ اس لئے اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا تھا کہ ثمرین پر کاشف کی حقیقت آشکارا کر دے۔ لیکن پھر امید کی ننھی سی کرن کا دامن تھامتے ہوئے بولا

"کاشی! مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خوف، کوئی ڈر ہے جو ثمرین کو محبت کے نام سے ہی خوف زدہ کئے ہوئے ہے اور اگر وہ دور کر دیا جائے تو پھر وہ کاشف یا آتف میں سے با آسانی انتخاب کر سکے گی اور اس طرح تمہاری مراد بھی پوری ہو جائے گی۔"

کاشف جھنجھلا اٹھا۔

"خدا کے واسطے اس ٹاپک کو یہیں ختم کر دو۔ تم ثمرین کو نہیں جانتے! البتہ یہ بتاؤ کہ کرنل اور شیاما کا کیا کیا جائے؟"

آتف گمبھیر لہجے میں بولا "ان کے بارے میں تمہیں سر دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان کے سلسلے میں فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟"

کاشف نے سوالیہ نظروں سے آتف کی طرف دیکھا تو آتف ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے بولا

"یہ تمہیں وقت بتائے گا۔"

کاشف نے تیزی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہٹ دھرمی سے بولا

"نہیں، وقت سے پہلے تمہیں بتانا پڑے گا کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

آتف پیار سے بھائی کے سر پہ دھپ رسید کرتے ہوئے بولا

"بہت ضدی ہو!"

کاشف نے مدھم مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوالیہ نگاہیں آتف کے چہرے پر گاڑ دیں۔ آتف نے بے حد اعتماد سے کاشف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

"میں نے شیاما سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے"

کاشف چلا اٹھا "نہیں میں تمہیں اس طرح سلو پوائزن کی موت مرتے نہیں دیکھ سکتا۔"

آتف منہ پھیر کر آنسو پیتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا

"تو کیا تم اپنے دکھی بھائی کو اس خوشی سے بھی محروم کر دینا چاہتے ہو کہ وہ اپنے کاشی کے دکھ سمیٹ لے۔"

کاشف نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "نہیں۔ میں تمہیں یوں موت نہیں مرنے دوں گا۔ کسی قیمت پر نہیں۔"

آتف دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا

"کیا خبر اسی طرح ممی ڈیڈی مجھے معاف کر کے دوبارہ اپنی دہلیز پر قدم رکھنے دیں اور میرے گھر چھوڑ کر مونا سے شادی کرنے سے جو دکھ انہیں پہنچا ہے، شاید اس کا مداوا اس سے ہو جائے کہ وہ اپنے چہیتے دوست کی بیٹی سے شادی کرنے کی خواہش پہ مجھے خوشی سے دوبارہ اپنے سینے سے لگا لیں۔"

یہ کہتے کہتے کاشف کی آواز بھرا گئی اور اس کے شانوں کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے ہٹ کی سائیڈ وال پر لگی مونا کی معصوم سی مسکراتی تصویر کو دیکھتے ہوئے کاشف نے خاموش لبوں سے کہا

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"بھابھی! تم میرے پیارے بھیا کو ننھا منا کھلونا لانے کا وعدہ کر کے گئی تھیں مگر واپسی کا راستہ کیوں بھول گئیں؟ دنیا سے ڈر کر آکاش کی بھول بھلیوں میں کیوں کھو گئیں۔ میرے بھائی نے تمہاری خاطر اپنا گھر بار، ماں باپ، رشتے ناطے، سوسائٹی، اس کے جھوٹے رواج سب کو چھوڑ دیا تھا مگر تم اس سے دامن چھڑا بیٹھیں۔ اب بتاؤ میں اسے تمہارے غم میں اپنی زندگی تباہ کرنے سے کیسے روکوں تم ہی کچھ کرو نا!"

آتف نے نظر اٹھا کر کاشف کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اداس سی مسکراہٹ سے بولا

"کاشی! انہیں مونا سے شکایت کر کے کچھ نہیں ملے گا۔ وہ معصوم روح تو بس ہمیشہ سے خاموشی سے مسکرانا جانتی ہے! اس وقت بھی جب وہ میری زندگی میں داخل ہوئی تھی تو اس کے لبوں پر یہی خاموش سی مسکراہٹ تھی۔ جس وقت اس نے اپنی زندگی کی تنہائیوں کی اپنی لاوارثی کی داستان مجھے سنائی تھی تب اس کے لبوں پر یہی مسکراہٹ تصویر کی طرح سجی ہوئی تھی۔ اور جب شادی کے بعد ممی پاپا نے اسے اپنانے سے انکار کر دیا اور میں نے گھر چھوڑ دیا تب بھی ایسی ہی خاموش سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر سجی تھی اور جب تم نے ہمیں چپکے سے سہارا دیا تب بھی اس کے لب اسی طرح خاموشی سے مسکراتے رہے"

وہ رکتے ہوئے بولا۔ "ہاں البتہ ان کی مسکراہٹ میں زندگی کی کرنیں بیدار ہونے لگی تھیں۔ اور جب وہ ہمارے پیار کی پہلی نشانی دیتے ہوئے جانے کیوں روٹھ کر موت کی ابدی وادیوں کی طرف نکل گئی تب بھی اس کے لبوں پر ایسی ہی خاموش مسکراہٹ سجی تھی! اور اس کی ان بے آواز مسکراہٹوں کو دیکھ کر میں ... ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ جیسے وہ اپنی مترنم آواز میں کہہ رہی ہو

"ہر مصیبت کا دیا اک تبسم سے جواب!
اس طرح گردشِ دوراں کو رلایا ہم نے"

کاشف نم آواز میں بولا "تبھی! دو سال گزر جانے کے باوجود مونا بھابھی کو تم فراموش نہیں کر سکے۔ پھر تم نے شیاما سے شادی کرنے کا تصور بھی کیسے کیا؟"

آتف ایک دم اسے محبت سے تھامتے ہوئے بولا

"اور پھر تم نے ہی تو کچھ عرصہ پہلے بتایا تھا کہ میرے حالات سننے کے بعد ممی پاپا نے کہا ہے کہ اگر میں ان کی مرضی کی شادی پر راضی ہو جاؤں تو پھر وہ مجھے معاف کر دیں گے۔"

وہ بڑی ہمت سے بولا "تو پھر میں ان کی پسند کی لڑکی یعنی شیاما سے شادی کے لئے خود ہی پیشکش کیوں نہ کر دوں جبکہ ان کی یہ دلی خواہش بھی ہے۔"

کاشف حقارت سے بولا "لیکن شیاما آپ کے قابل ہرگز نہیں۔"

آتف ہولے سے مسکراتے ہوئے بولا

"وہ اتنی بری بھی نہیں جتنا تم اسے سمجھتے ہو۔"

کاشف نے تیز نظروں سے آتف کی طرف دیکھا تو وہ نظریں جھکائے ہوئے جلدی سے بولا

"کسی بھٹکے ہوئے کو سیدھا راستہ دکھانا بھی تو ثواب ہے۔"

وہ ایکدم سے کاشف کی اداس نگاہوں میں دیکھتے ہوئے بولا "تم تو جانتے ہی ہو کہ میرے دل سے مونا کو کوئی نہیں چھین سکتا تو پھر کم از کم اس کھوکھلے جسم و روح کو ہی کارِ ثواب حاصل کرنے دو کہ یہ ایک بھٹکی ہوئی لڑکی کا بوجھ اٹھا لے۔ اسے مزید بھٹکنے سے بچا لے! شاید اسی جہاد کی بدولت میری زندگی اندھیاروں میں ڈوبنے سے بچ جائے۔"

کاشف نے لاجواب ہوتے ہوئے نم پلکوں کے ساتھ سر جھکا لیا۔ آتف اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا

"میں تو یہ معاملہ سنبھال لوں گا لیکن سچی خوشی اور سکون مجھے صرف اسی وقت حاصل ہو گا جب تم ثمرین کو اپنا بنا لو گے۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے رک کر بولا۔ "ورنہ میں سمجھوں گا کہ میری قربانی رائیگاں گئی اور پھر شاید مجھ میں زندہ رہنے کا بالکل ہی حوصلہ نہ رہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اور کاشف نے اداسی سے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

آتف اور کاشف سے ملاقات کے بعد کچھ روز تک تو ثمرین نتیجے کی منتظر رہی۔ لیکن جب دس پندرہ روز گزر جانے کے باوجود کوئی بات سامنے نہیں آئی اور نہ ہی کرنل خرم کا فون آیا اور نہ ہی آتف آیا تو ثمرین نے ان سب کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا البتہ کبھی کبھار آتف کا اجنبیت بھرا انداز اور کاشف کے رویے میں اپنائیت کا احساس اسے ضرور سوچنے پر مجبور کر دیتا اور وہ خیالات میں ڈوب جاتی کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ کاشف سے ہزار نفرت کے باوجود جب اس روز وہ پہلی بار اس سے تنہائی میں ملی اسکے گھر پر ملی تو کرنل کے ہاں پارٹی والے نفرت کے جذبے کے بجائے اسے یہ کیوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ اس پر اعتماد کر سکتی ہے۔ وہ اتنا برا انسان نہیں جتنا وہ اسے سمجھتی رہی۔ بلکہ آتف کے مقابلے میں اسے کاشف سے بات کرنے میں زیادہ آسانی ہوئی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اسے سمجھ رہا ہے اور کچھ عجیب سا ربط

اسے محسوس ہوا تھا اپنے دونوں کے درمیان جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ انہی سب گتھیوں کو وہ بار بار سلجھانے کی کوشش کرتی مگر ہر بار پہلے سے زیادہ الجھ جاتی۔ اور ابھی بھی وہ لان میں بیٹھی گود میں رکھی کتاب سے لاپروا ایک بار پھر اپنی پر پیچ سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ سامنے شیاما اور اس کے ساتھ کاشف کو ایک عرصے کے بعد وہ بھی ایک ساتھ دیکھ کر حیرت و خوشی سے دم بخود رہ گئی۔ شیاما تیزی سے بڑھ کر اس کے گلے سے لپٹتے ہوئے چپکے سے بولی۔

"پلیز ثمی! مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔"

وہ اطمینان سے شیاما کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولی

"کوئی بات نہیں! غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں اور ان کا احساس کرنے والا ہی عظیم اور اصل معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں سامنے کھڑے کاشف کی نگاہوں سے جا ٹکرائیں۔ وہ پل بھر کو چونکی، پھر کچھ سوچ کر مسکرائی اور دونوں کو لان چیئرز پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مالی سے دادی جان کو مہمانوں کی اطلاع دینے اور چائے وغیرہ کا کہہ کر بولی

"جتنی خوشی ہمیں آج آپ دونوں کو ساتھ دیکھ کر ہوئی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔"

کاشف بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

"دوسروں کی خوشی سے خوش ہونے والے بڑے عظیم لوگ ہوتے ہیں۔"

ثمرین اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے نرم مسکراہٹ سے بولی۔

"شیاما! تم نے نوٹ کیا کاشف صاحب کے اندر کتنی متانت آگئی ہے۔ طبیعت میں کیسا عجیب سا ٹھہراؤ، بردباری پیدا ہو گئی ہے جیسے...."

"جیسے کیا؟" کاشف نے حیرت زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے بولی۔

"جیسے کہ ایک دم ہی آپ ہم لوگوں سے سنجیدگی، بردباری میں کئی سال آگے نکل گئے ہوں!"

کاشف مسکرا دیا۔

"نہیں ابھی کیونکہ نئی نئی صلح ہوئی ہے اس لیے اس طرح پوز کر رہا ہے۔ جلد ہی لائن پر آجائے گا۔"

شیاما لاپرواہی سے ہنستی ہوئی بولی۔

"اب ان محترم کے پیروں میں عمر بھر کے لئے ہمارے نام کی بیڑیاں ڈالی جا رہی ہیں۔ اور یہ ہے ہمارا شادی کا کارڈ۔"

ثمرین خوشی سے کارڈ تھامتے ہوئے گرم جوشی سے بولی

"کیسی! آپ دونوں ہی کو مبارک ہو۔ یہ اچانک کیسے فیصلہ ہو گیا؟"

شیاما کاشف کی طرف پُرخمار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی

"دیر بھی ان ہی کی طرف سے ہوئی تھی اور اب جلدی بھی یہی کر رہے ہیں!"

کاشف پُراسرار سی مسکراہٹ سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اچانک نہ جانے کس خیال کے تحت کاشف ایک دم ہی بولا

"اور آصف صاحب کے کیا حال ہیں؟"

اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے شیاما ایکسائیٹڈ ہوتے ہوئے بولی۔ "ارے ہاں ثمی! کل ہی کاشی بتا رہے تھے کہ تمہارے ہاں کوئی آصف صاحب آتے ہیں جو کہ بالکل ہی ان کے ہم شکل ہیں۔ کیا واقعی؟"

ثمرین اطمینان سے بولی "ہاں!"

کاشف اس کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگا اور شیاما پھر تیزی سے بولی۔

"تو تم ان سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ سچ کتنا مزا آئے جو ہم چاروں ساتھ نکلیں لوگ کاشف اور آصف میں فرق ہی نہیں سمجھیں گے اور پھر ہم لوگ خوب تفریح لیں گے!"

ثمرین سپاٹ لہجے میں بولی

"اونہہ! تم بھی بالکل بچی ہو۔ شادی شکل دیکھ کر نہیں کی جاتی۔"

شیاما محبت پاش نظروں سے کاشف کو دیکھتے ہوئے بولی

"واہ پہلی چیز تو شکل ہی ہوتی ہے۔ اگر کاشف اتنے پیارے نہیں ہوتے تو پھر ہم دونوں کی دوستی ہی نہیں ہوتی اور جو دوستی نہیں ہوتی تو یہ نوبت نہیں آتی۔"

وہ شادی کے کارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنسی لیکن ثمرین نہایت سنجیدگی سے بولی

"بڑی عجیب بات کہی تم نے!" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی" اور فرض کرو کہ یہ وہ کاشف نہیں جنہیں تم چاہتی چلی آرہی ہو، بلکہ کوئی اور ہیں جن کی شکل صرف کاشف سے ملتی ہے تو کیا تمہارے لئے اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا؟"

تب پہلی بار کاشف نے ہنستے بھرپور انداز میں قہقہہ لگایا اور ستائشی نظروں سے ثمرین کو دیکھتے ہوئے بولا

"بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہیں آپ۔"

ثمرین مسکرا دی۔ مگر سوالیہ نگاہیں شیاما پر ہی جمی رہیں۔ اور شیاما بے حد اطمینان سے بولی

"نہیں۔ میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ جو کاشف میرے سامنے بیٹھے ہیں اس وقت" وہ ایکدم گہری نظروں سے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ بہت ہی شاندار چیز ہیں اور مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اور میرے لئے یہی بہت کافی ہے۔ اب چاہے اندر سے یہ کچھ بھی ہوں۔ مجھے تو بس ان سے ہی محبت ہے۔ ثمرین کو شیاما کے اس سطحی جواب پر بہت دکھ ہوا اور اسے محسوس ہوا جیسے کاشف کا چہرہ بھی تاریک ہو گیا۔ کیونکہ شیاما نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اس کے نزدیک کاشف کے ظاہر کی اہمیت ہے۔ اور تب ہی اچانک اسے اس روز کے پاس بے پہ کہے ہوئے آنٹی کے الفاظ یاد آ گئے جس میں اس نے کاشف کی طرفداری کرتے ہوئے اس پر زور دیا تھا کہ وہ کاشف کو اپنا لے۔ کیونکہ شیاما اس کے قابل نہیں۔ اسے تو بس مرد چاہیئے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ البتہ کاشف جیسا سمارٹ اور ہینڈسم ہو۔ ثمرین کو یاد تھا اس وقت وہ اس بات پر کتنی چراغ پا ہوئی تھی۔ مگر آج آنٹی کے الفاظ حقیقت کا روپ دھارے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اسے یوں ایک دم ہی سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر کاشف معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ نے آپ کو کسی کی یاد کے حوالے کر دیا۔"

ثمرین نے چونک کر بڑی گہری نظروں سے اپنے چہرے پر مرکوز کاشف کی ذہین نگاہوں میں دیکھا۔ پھر جلدی سے میز پر سے کارڈ اٹھاتے ہوئے بات بدل کر بولی

"ارے۔ آپ لوگ بھی عجیب ہیں۔ اتنی خوبصورت خبر کے ساتھ آئے اور ایسی بور باتوں میں الجھا دیا۔"

پھر دونوں کی طرف دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولی

"آپ دونوں کو ہی بہت بہت مبارک ہو۔ ہم منہ میٹھا کرنے کا انتظام کرتے ہیں۔ اور ہاں یہ دادی جان اب تک کیوں نہیں آئیں؟"

اس نے کئی باتیں ایک ساتھ کہتے ہوئے۔ کارڈ ہاتھ میں تھامے تھامے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ کاشف اور شیاما اسے روکتے رہ گئے مگر وہ اندر چل دی۔ ثمرین تیزی سے فون کی طرف بڑھی اور دھڑکتے دل سے کارڈ پر لکھا R.S.U.P. کے نیچے کاشف والا کا نمبر ڈائل کیا اور ماؤتھ پیس پر دوپٹہ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ چند سیکنڈ کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہیلو"

اس کی انگلیوں کی گرفت ریسیور پر یوں سخت ہو گئی جیسے ریسیور میں پیوست ہو جانا چاہتی ہوں اور سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ پھر ہیلو ہیلو کی متواتر آواز پر وہ حواس مجتمع کرتے ہوئے، آواز پر قابو پاتے ہوئے آواز بنا کر بولی

"کون کاشف صاحب بول رہے ہیں؟"

دوسری طرف سے آواز آئی "جی ہاں۔ آپ کون صاحبہ ہیں؟ کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟"

وہ معنی خیز لہجے میں بولی "نہیں اپنا راز وہاں ہی سمجھیئے۔"

"کیا مطلب؟ کون ہیں آپ؟ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

دوسری طرف سے کاشف کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی تو وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی اور مترنم ہنسی سے بولی۔

"یہ تو آپ کو بعد میں بتائیں گے کہ آپ کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔"

کاشف کی آواز میں ٹینشن سا پیدا ہو گیا اور وہ جیسے زبردستی ہنستے ہوئے بولا

"کون ہیں آپ؟ بتاتی کیوں نہیں۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ میں نے کوئی ڈرامہ ورامہ نہیں کھیلا پھر ڈراپ سین کیسا؟"

ثمرین ہنسی ضبط کرتے ہوئے سپاٹ آواز میں بولی

"اوں ہوں! اب یہ ایکٹنگ کام نہیں دے گی۔"

وہ تلخ آواز میں بولا "واٹ نان سینس! شریف لوگوں کو پریشان کرنا کوئی شرافت تو نہیں۔"

وہ اس کی جھنجھلاہٹ پر محظوظ ہوتے ہوئے بولی

"جی ہاں! جب ہی آپ کو تنگ کر رہے ہیں۔"

دوسری طرف خاموشی رہی تو ثمرین یہ سوچ کر کہ کہیں وہ فون بند نہ کر دے، جلدی سے بولی

"اجی حضرت زندہ ہیں یا...؟"

وہ بیزاری سے بولا

"ایسی اوٹ پٹانگ باتوں کے بعد بھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟"

وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ کے سوا کسی اور میں یہ ظرف ہو۔"

کاشف جھنجھلاتے ہوئے بولا "دیکھئے محترمہ یا تو صاف صاف بات کیجئے ورنہ میں فون بند کرتا ہوں۔"

ثمرین تیزی سے بولی "شوق سے کیجئے! لیکن میں بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں۔"

اور دل ہی دل میں مسکرائی "کیوں کاشف جی! آپ نے ہمیں اتنے عرصے الجھائے رکھا تو کیا ہم آپ کو تھوڑی دیر بھی پریشان نہیں کر سکتے؟"

اسے خاموش پا کر کاشف کی آواز آئی

"چلو حسن کم جہاں پاک"
وہ جلدی سے بولی "دیکھئے مسٹر زبان سنبھال کر بات کیجئے ورنہ اگر میں نے بھانڈا پھوڑ دیا آپ کی ثمرین صاحبہ کے سامنے تو کچھ جواب ابھی کے نہیں رہیں گے"

اب تو کاشف کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ایک دم ہی ملائمت اختیار کرتے ہوئے بولا

"پلیز۔ آپ بتاتی کیوں نہیں۔ کون ہیں آپ؟ آپ میرے اور ثمرین کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟"

وہ مدھم ہنسی سے بولی

"ہوں! تو آ گئے نا لائن پر" پھر فخریہ لہجے میں بولی "میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے جبھی آپ رسیور نہیں پٹخ رہے اور اتنے مضطرب سے معلوم ہوتے ہیں"

کاشف کھسیانی ہنسی سے بولا

"آپ تو کوئی پہنچی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہیں"

وہ اسی طرح آواز بناتی ہوئی بولی "اس میں کیا شک ہے لیکن پہلے کچھ سوال جواب ہو جائیں"

وہ چلا اٹھا "افوہ! اب بھی سوال جواب کی گنجائش باقی ہے؟"

وہ اس کی پرواہ کئے بغیر بولی

"ذرا فٹافٹ یہ تو بتایئے کہ آپ ثمرین سے ہاکس بے کی ہٹ میں آنف کے نام سے کیوں ملے اور پھر بدستور آنف ہی بن کر کیوں اس سے ملتے رہے جبکہ آپ نے خود ثمرین سے کہا تھا جب وہ آپ کے گھر آئی تھی کہ آپ کبھی اس کے راستے میں نہیں آئیں گے۔ یعنی یہ کہ جب آپ جانتے تھے کہ آپ اسے اپنا نہیں سکتے تو پھر ان سب حرکات سے کیا فائدہ؟"

کاشف یوں خاموش ہو گیا کہ جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔۔۔

ثمرین کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی

"ہیلو، آپ خیریت سے تو ہیں! اس انکشاف پر جناب کی روح تو قفس عنصری سے پرواز نہیں کر گئی؟"

وہ گہری سانس بھر کر بیچارگی سے بولا

"یا پیر و مرشد! مجھ پر دیا کیجئے۔ ارے آپ تو تمام کے تمام اندرونی معاملات سے باخبر ہیں۔ اس لئے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جھوٹ بولوں تو کیا بولوں"

وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "بھئی ہمارے پاس فالتو باتوں کا وقت نہیں اور ہماری گفتگو سے آپ کو اندازہ بھی ہو گیا ہو گا کہ ہم کس قدر محرم راز ہیں۔ اس لئے فٹافٹ ہمارے سوال کا بالکل صحیح جواب دیجئے"

کاشف ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

"آپ نے جو کچھ کہا سچ کہا۔"

ثمرین کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ بیچارگی سے کہتا گیا "اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے کچھ حاصل نہیں لیکن جس طرح ثمرین کی نفرت میرے لئے ایک حقیقت ہے اسی طرح میرے دل میں اس کے لئے محبت بھی ایک اٹل حقیقت ہے اور پھر"۔۔۔۔ وہ رکتے ہوئے بولا "میری محبت تو بے لوث ہے! وہ ثمرین سے کچھ نہیں مانگتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ آفتاب کبھی بھی زمین کے ذرے کو قبول نہیں کر سکتا"

ثمرین نے دانتوں تلے ہونٹ دبا لیا اور وہ اداسی سے کہتا چلا گیا "مگر پھر بھی میں ثمرین سے بھیس بدل کر ملتا رہا تاکہ اپنی پیاسی روح کو اتنا سیراب کر لوں کہ جب وہ زندگی میں ہمیشہ کے لئے میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تب بھی اس کی یاد کی زنجیریں مجھے زندگی کی حرارت بخشتی رہیں اور میں ایک مکمل انسان کی حیثیت سے عملی زندگی میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے ایسے کام کرتا رہوں جن سے میرے ملک کی دکھی انسانیت کو فائدہ پہنچے"

ثمرین نے دل میں سوچا۔ "کتنی عجیب بات ہے کہ جو لوگ ہمیں بظاہر اتنے قابل نفرت نظر آتے ہیں وہ اندر سے کس قدر خوبصورت ہوتے ہیں!"

کاشف اس کی خاموشی پر پھیکی ہنسی سے بولا

"شاید آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آئے لیکن آپ کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے اعمال پر نظر رکھتے ہوئے میرے قول پر ضرور یقین کریں گی اور میرے اس راز کو جو خدا معلوم آپ پر کیسے ظاہر ہو گیا، کسی اور پر کبھی بھی آشکارا نہیں کریں گی"

ثمرین اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے شریر ہنسی سے بولی

"ارے ارے فرہاد صاحب! آپ تو خواہ مخواہ ہی جذباتی ہوئے جا رہے ہیں۔ بھئی میں خدانخواستہ آپ کی دشمن نہیں، بلکہ دوست ہوں"

"جی کیا فرمایا آپ نے؟"

وہ حیرت سے بولا تو وہ مدھم ہنسی سے بولی

"جی ہاں۔ اور آپ کی اس سلسلے میں خاصی مدد بھی کر سکتی ہوں اور کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میں نے آپ کو انڈر آبزرویشن رکھ کر دیکھ لیا کہ آپ بے مثال انسان ہیں، لیکن آپ نے جو چکر چلا رکھا تھا اس کے سلسلے میں تھوڑا کنفیوز ہو گئی تھی کہ واقعی آپ ہی آنف بن کر آتے ہیں ثمرین کے ہاں یا وہ دوسرے صاحب جو اسے ہاکس بے کی ہٹ میں ملے تھے۔ جب وہ شیاما کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے گئی تھی"

کاشف مارے حیرت کے چلا اٹھا "اوہ خدایا! آپ ...

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

بارے میں بھی جانتی ہیں!"

ثمرین محظوظ مسکراہٹ سے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی

"جی ہاں! لیکن صرف اس حد تک کہ وہ جو کوئی تھے آتف ہرگز نہیں تھے جن سے ثمرین کی ہاکس بے پر ملاقات ہوئی اور جو اس کے گھر آتے تھے یعنی اس روز آپ کے دھوکے میں ثمرین نے ان سے ملاقات کی۔ اور وہ پتہ نہیں کیوں آپ کو پوز کرتے رہے۔ لیکن بہر حال ثمرین کی ان سے وہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔"

اس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تو کاشف اپنی مخصوص زندہ ہنسی سے بولا

"میڈم! یہاں آپ سے ذرا سی چوک ہو گئی۔"

"وہ کیا؟" اس نے آواز میں حیرت کا تاثر دیتے ہوئے پوچھا تو وہ بشاشت لہجے میں محظوظ آواز میں بولا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ صاحب جو وہاں ثمرین کو ملے تھے دراصل اصلی آتف اور میرے جڑواں بھائی ہیں۔"

ثمرین کی نگاہیں لان پر بیٹھے آتف کی طرف اٹھ گئیں اور وہ بڑی توجہ سے کاشف کی آتف کے بارے میں مختصراً مگر مکمل کہانی سننے لگی۔ اور اس کے خاموش ہوتے ہوئے بولنے ہی والی تھی کہ وہ جلدی سے بولا

"اور آپ سے جو چوک ہوئی ہے وہ یہ کہ ثمرین کی ان سے وہ آخری ملاقات نہیں تھی۔ بلکہ آج وہ شیاما کے ساتھ ثمرین کے گھر شادی کا کارڈ دینے گئے ہیں۔"

ثمرین ماؤتھ پیس پر سے ایک دم دوپٹہ ہٹاتے ہوئے اپنی نارمل آواز میں بولی

"بلکہ پہنچ چکے ہیں اور ابھی سامنے ہی دونوں لان میں بیٹھے دادی جان سے باتیں کر رہے ہیں۔"

"ک... کون... کون بول رہا ہے؟"

کاشف کی آواز کپکپا اٹھی اور چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ ثمرین محظوظ ہنسی سے بولی

"ہمارے سوا بھی کوئی آپ کا رازداں ہو سکتا ہے۔"

وہ لرزتی آواز میں بولا

"کون؟ ثمرین!"

"جی جناب!" وہ محظوظ ہنسی سے بولی "آپ کا کیا خیال تھا اس دنیا میں صرف ایک آپ ہی عقل مند بستے ہیں؟"

وہ خاموش رہا تو وہ ایکدم ہی بے حد سنجیدہ آواز میں بولی

"تو کیا سزا دی جائے آپ کو اس شرارت پر؟"

وہ بے حد ادا س آواز میں بولا "جو آپ چاہیں! اعتراف تو آپ نے کروا ہی لیا۔"

اور دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد دیتا رہا! ثمرین کچھ دیر خاموشی سے سوچتی رہی۔ پھر بولی

"کیا شیاما اس حقیقت سے واقف ہے کہ اس کی شادی آپ سے نہیں بلکہ آتف صاحب سے ہو رہی ہے؟"

کاشف فوراً بولا "ہاں! اور اس کے لئے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا! ——— اور" ——— وہ رکتے ہوئے بولا "جو کارڈ آپ کو دیا گیا ہے، وہ اسپیشلی بنوایا گیا ہے جس میں آتف کے نام کی جگہ میرا نام لکھا ہوا ہے۔"

"اوہ! ویری انٹرسٹنگ!" وہ مسکرائی "تو سب ہی اس پلان میں شامل ہیں!"

کاشف جلدی سے بولا "سوائے میرے ممی پپا کے!"

ثمرین مسکرائی پھر حیرت سے بولی۔

تعجب ہے آپ کے ممی پپا کو اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ وہی لڑکی جو کچھ عرصے پہلے آپ کی بہترین دوست بنی ہوئی تھی آج... آپ کے بجائے آپ کے بھائی سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی!"

کاشف پھیکی ہنسی سے بولا "شیاما کی طرح ان کے لئے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ شیاما کس کی دلہن بنے! وہ تو بس اسے دلہن بنا کر گھر لانا چاہتے تھے۔ میری اس بات پر حیران ہوتے تھے کہ اتنی دوستی کے باوجود میں اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا اور اس سے پہلے کہ مجھ پر دباؤ پڑتا کہ آتف لوٹ آیا اور پھر اس نے شیاما سے شادی کی پیشکش کی تو ممی پپا نے اسے نہ صرف یہ کہ بالکل معاف کر دیا بلکہ فوراً ہی کرنل صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ اور شیاما تو دس دن کے اندر ہی آتف کی یوں گرویدہ ہو گئی جتنی میری بھی کبھی نہیں تھی اور سب نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔"

ثمرین عجیب سے لہجے میں بولی "تعجب ہے کہ شیاما سے اتنی انڈر اسٹینڈنگ کے باوجود آپ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ہم دونوں کے آپس کے اتنے جھگڑے کے باوجود اتنی..."

کاشف کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مگر ثمرین بات ادھوری چھوڑتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "اگر آپ اس دوستی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر دس منٹ کے اندر یہاں پہنچ جائیں۔"

وہ گھبرا اٹھا۔ "مگر وہاں تو وہ دونوں بیٹھے ہوں گے!"

وہ تیزی سے بولی "جب ہی آپ سے کہہ رہے ہیں!"

وہ مسکرا اٹھا "خوب!" پھر جھجکتے ہوئے بولا "مگر کیا یہ اچھا لگے گا کہ جن لوگوں نے میرا ساتھ دیا، خاص طور پر آتف بھیا بھائی کو میں ڈبل کراس کر دوں؟"

ثمرین مصنوعی غصے سے بولی "ٹھیک ہے۔ پھر کبھی ہمیں اپنی صورت مت دکھائیے گا۔"

وہ گھبرا کر بولا "اچھا اچھا پہنچ رہا ہوں۔ ناراض مت ہوں۔"

ثمرین نے کریڈل پر فون رکھ دیا اور باہر لان کی طرف آ گئی اسے دیکھ کر دادی اماں حیرت سے بولیں

"کہاں رہ گئی تھیں۔ یہ لوگ کب سے جانے کی ضد کر رہے ہیں۔"

ثمرین معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔

"بغیر منہ میٹھا کیے یہاں سے کوئی نہیں جا سکتا۔ ہم اسی انتظام میں مشغول تھے۔"

آنتف مدھم مسکراہٹ سے بولا

"میرے خیال میں مٹھائی پھر کبھی کے لیے اٹھا رکھیں ابھی تو بہت سے کارڈ بانٹنا باقی ہیں۔"

ثمرین اسے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی

"آپ کے پاس اور کوئی نہیں کارڈ بانٹنے کے لیے؟"

شیاما جلدی سے بولی "یہ بھی اکلوتے ہیں بھی اکلوتی تو ظاہر ہے کاموں کو پورا کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ممی ڈیڈی دونوں طرف کے آخر کہاں تک کام کریں گے؟"

ثمرین آنتف کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "واقعی اگر آپ کا کوئی بھائی بہن اور ہوتا تو یہ مشکل نہیں پڑتی۔"

آنتف چونکتے ہوئے بولا "جی! ٹھیک کہتی ہیں آپ۔"

وہ اسے بدستور ستاتے ہوئے بولی "کاش! آنتف بھی آپ کے بھائی ہوتے تب بھی کچھ آرام ملتا آپ کو۔"

آنتف کا منہ سرخ ہو گیا۔ شیاما بھی کچھ بوکھلا سی گئی۔ تب ہی کاشف گیٹ میں داخل ہوا اور سامنے ہی ثمرین کو دیکھ کر چند لمحے کے لیے دیکھتا رہ گیا۔

ثمرین نے اس کے تاثرات پڑھ لیے اور مدھم سی شریر مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے شریر لہجے میں بولی

"ارے آنتف صاحب آپ! آئیے تشریف لائیے۔ بڑے دنوں بعد آئے۔"

کاشف اس کی شرارت بھانپ گیا اور سرخ چہرے اور جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔ ساتھ ہی آنتف، شیاما اور دادی جان نے پلٹ کر دیکھا اور کاشف پر نظر پڑتے ہی آنتف کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا اور اس نے اسے یوں گھورا جیسے کہہ رہا ہو "گدھے! اس وقت تمہیں نازل ہونے کو کس نے کہا تھا؟" کاشف کی نگاہوں میں عجیب بے بسی تھی۔ اس سب سے محظوظ ہوتے ہوئے ثمرین نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہی شرارت سے شیاما اور آنتف کو مخاطب کرتے ہوئے جان بوجھ کر کہا۔

"کاشف صاحب، شیاما ان سے ملیں۔ یہی ہیں آنتف صاحب آپ کے ہم شکل۔" اس نے اصلی آنتف کو مخاطب کرتے ہوئے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "آپ کو حیرت نہیں ہوئی اس کے اس قدر ہم شکل ہونے پر جبکہ آپ دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں ہے اور ایسا تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ دو مختلف لوگوں کی آپس میں گہری مشابہت تو ہو سکتی ہے لیکن اتنی یکسانیت صرف جڑواں بھائیوں میں ممکن ہے۔ جبکہ آپ دونوں تو ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں۔"

کاشف سے تو مارے شرمندگی کے نظریں ہی نہیں اٹھائی جا رہی تھیں اور آنتف کیونکہ صورت حال سے واقف نہیں تھا، اس لیے اسے کاشف پر سخت تاؤ آ رہا تھا کہ ثمرین کی باتوں پر وہ اس طرح جھینپ کیوں رہا ہے۔ اس لیے صورت حال کو سنبھالنے کے لیے وہ کاشف کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھرپور مسکراہٹ سے بولا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی آنتف صاحب! واقعی ہم دونوں تو بالکل سگے جڑواں بھائی لگتے ہیں۔"

کاشف نے سرخ چہرے سے ثمرین کی طرف دیکھا جس کا چہرہ شرارت و ہنسی کی آمیزش سے دہک رہا تھا۔ کاشف کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ اسے اور آنتف کو ایک دم اُلو سمجھتے ہوئے بے حد محظوظ ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ جھینپی سی مسکراہٹ سے آنتف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"اب اس ایکٹنگ کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنی ہنڈیا بیچ چوراہے پر پھوٹ چکی ہے۔"

ہیں! آنتف نے بری طرح اچھلتے ہوئے تیزی سے پلٹ کر ثمرین کی طرف دیکھا۔ شیاما بھی شرمندہ سی نظر آ رہی تھی۔ کاشف ثمرین کی طرف بڑھتے ہوئے آنتف سے مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہمیشہ کی طرح آج بھی ثمرین نے ہمیں اپنی ______ ذہانت سے حیرت میں ڈال دیا ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ یہ کس طرح پوری طرح ہم دونوں کو پہچان گئیں البتہ ان کا تیر بالکل نشانے پر بیٹھا اور ابھی ان سے فون پر بات ہونے کے بعد ہی ان کے حکم کے تحت میں یہاں پہنچا ہوں۔"

آنتف بھولی بسری یادوں میں ڈوب کر ثمرین کو دھندلائی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے زیر لب بولا "دلوں کا یہ میل، احساسات کا ایسا ناطہ بہت مشکل ہی سے قسمت والوں ہی کو ملتا ہے، ورنہ آج کل تو اٹوٹ بندھن باندھنے والی روحیں ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے کو چھونے کے باوجود پہچان نہیں سکتیں۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

کاشف اور ثمرین آنٹ کو حیران نظروں سے دیکھتے رہ گئے۔
شیاما منہ بنا کر بولی
"پلیز نقی! ہر وقت فلسفہ نہ بگھارا کیجئے۔ سخت بوریت محسوس ہوتی ہے۔"
آنٹ نے چونک کر سپاٹ نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر پھر ثمرین اور کاشف کی نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے جلدی سے مسکراتے ہوئے بولا
"ٹھیک کہتی ہو تم۔ اسی لئے تو مجھے ہر وقت تمہاری ضرورت پڑتی ہے تاکہ تم مجھے حماقتوں کے سمندر میں غوطہ زن نہ ہونے دو۔"
شیاما بے حد خوش ہو گئی۔ البتہ کاشف کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
آنٹ و شیاما جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے! ثمرین نے دونوں کو شادی کی گرمجوشی سے مبارکباد دی اور دادی جان سے دعا سلام کے بعد گیٹ تک چھوڑنے گئی اور جب کچھ دیر بعد کاشف گیا تو دادی جان کو اور ثمرین کو رضامند کر چکا تھا کہ اگلے روز ہاکس بے پر چاندنی رات کا نظارہ کیا جائے۔ کیونکہ کل پونم ماشی کی رات تھی یعنی چودھویں کی اور بقول کاشف وہ اس خوبصورت دوستی کا آغاز ایک نئے انداز میں اس رات سے کرنا چاہتا تھا کہ ہر مہینے کی چودھویں رات کو اس دوستی کی سالگرہ منا سکے۔
اگلی شام جس وقت یہ لوگ ہاکس بے پہنچے آسمان پر چاند تاروں کی بارات میں بھرپور انداز میں مسکراتا بے حد حسین، بے حد دلفریب لگ رہا تھا اور پانی یوں لگ رہا تھا جیسے پگھلی ہوئی چاندی کا سیلاب ہو۔ ثمرین ہٹ کی سیڑھیوں پر کاشف کے ساتھ بیٹھی بے خیالی میں کہہ اٹھی۔
"واقعی شخصیت کتنی اہمیت رکھتی ہے۔"
کاشف اپنی دلکش آواز میں دھیرے سے بول اٹھا
"ہاں واقعی! چاندنی نے سمندر کے پانی کو اپنے رنگ میں یوں رنگ لیا ہے جیسے کسی پُر وقار و پُر نور ہستی نے مجھ جیسے بے تکے بے راہ رو انسان کو اپنے وجود میں سے کچھ رنگ دے کر کیا سے کیا بنا دیا۔"
ثمرین اس کی گہری نگاہوں کو چہرے پر محسوس کرتے ہوئے اور اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے ہولے سے مسکرا دی اور کاشف کو محسوس ہوا جیسے یہ مسکراہٹ صرف ہونٹوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش سے پھوٹی پڑ رہی ہے اور وہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ ثمرین فولادی خول زیب تن کرنے کے باوجود ایک پُرخلوص دل کی مالک ہے!
اور اس کے خوشگوار موڈ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا
"یاد ہے ثمرین! ایک بار تم نے میرے اس سوال پر کہ لگتا ہے ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، کہا تھا کہ اس دنیا میں تو ہم پہلے نہیں ملے لیکن ہو سکتا ہے کہ آسمان پر روحوں کے روپ میں ملے ہوں۔"
ثمرین ایک بار پھر مسکراتے ہوئے بے حد خوبصورت لہجے میں بولی
"آپ نے تو تمام جملے لفظ بہ لفظ یاد رکھے ہیں۔"
وہ بے خود سا بولا "ہاں! کیونکہ جو بات تم نے مذاق میں کہی اسے میں نے سو فیصدی حقیقت جانا اور اگر میری یہ سوچ درست نہ ہوتی تو شاید آج میں تمہیں دنیا کے میلے سے ڈھونڈ نہ پاتا۔"
وہ عجیب سے لہجے میں بولی "آپ کو یقین ہے کہ آپ نے ہمیں ڈھونڈ لیا ہے؟"
وہ اسے چونک کر دیکھتے ہوئے بولا "عجیب سوال ہے۔" اور مدھم مسکراہٹ سے کہنے لگا "لیکن اس کا جواب موجود ہے میرے پاس!"
"کیا؟"
ثمرین نے پہلی بار سمندر پر سے نظریں سمیٹتے ہوئے کاشف کی طرف دیکھا۔
کاشف اس کی خوبصورت پر وقار ذہین آنکھوں میں محویت سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔
"ثمرین بیگم! کسی کو ڈھونڈنے کے لئے خود کو ہجوم میں کھونا پڑتا ہے اور یہی کچھ میں نے کیا جس کی بدولت تمہیں پا لیا۔"
ثمرین بری طرح چونکتے ہوئے بولی
"لیکن آپ کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا، کیونکہ کسی کو پانے اور خود کو کھونے کا مطلب ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ سے جدا ہو گیا ہے اور اپنے آپ سے جدا رہنے والی شخصیت کبھی بھرپور نہیں ہوتی۔"
کاشف نے حیران ہوتے ہوئے سوچا "میرے اللہ! یہ تو مجھ سے بھی زیادہ خود پسند ہے۔ اپنی ذات میں کسی کا داخلہ گوارا نہیں کر سکتی میں کیا کروں؟" پل بھر کو اس کے روشن چہرے پر بدلی سی چھا گئی اور نہ جانے کیوں ثمرین نے کاشف کو بھی اداس کرنا نہیں چاہا اور وہ اس کی توجہ سمندر کے رخ موڑتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی۔
"ذرا دیکھئے تو سمندر کی چاند کی طرف فلک بوس ہوتی لہروں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے چاند ان پر رقص کرتی چاندنی کو اپنے پاس

Waqar Azeem
Pakistanipoint.Com

آکاش پروا پس بلانے کی خاطر اس پورے تختِ ساگر کو اپنی طرف کھینچنا چاہ رہا ہے۔"

وہ برجستہ بولا

"ہوں! جب بے تابیٔ دل حد سے بڑھ جائے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ ویسے تو میں نے تقریباً دنیا کے ہر ساحل پر فل مون کا لطف اٹھایا ہے، مگر نہ جانے کیوں آج زندگی میں پہلی بار یہ لہروں اور چاند کے درمیان کشش کا کھیل مجھے ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہا ہے۔ یہ خاموشی، یہ فضا میں رچی ساحل کی خوشبو، یہ اندھیرا، یہ ٹھنڈک، یہ سمندر پر چاند کی برسات، وہ آکاش پر چندا کی بھرپور مسکراہٹ اور کسی کا ساتھ یہ دعا کرنے پر مجبور کر رہا ہے کہ کاش یہ گھڑیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں پر ہی منجمد ہو جائیں۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ محظوظ نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ کے اوپر بھی چودھویں کا چاند اتنا گہرا اثر ڈالتا ہے۔"

وہ گہرے لہجے میں بولا

"اب تک تو صرف محظوظ کرتا تھا، مگر آج واقعی دیوانہ بنا رہا ہے۔ کیونکہ آج وہ آکاش سے اتر کر میرے قریب چلا آیا ہے۔"

وہ آسمان کی طرف نگاہوں کے اشارے سے بولی

"اور وہ کیا ہے؟"

وہ اس کی شوخی پر محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"وہ تو اس چاند کا محض عکس ہے اور کچھ بھی نہیں۔"

ثمرین ایک دم ہی سپاٹ لہجے میں بولی "کیا ملتا ہے اس قسم کی بکواس کر کے آپ کو؟"

وہ اس کے اس طرح اچانک ہی تبدیل ہو جانے والے موڈ پر بری طرح چونکتے ہوئے بولا

"تعجب ہے آپ کو یہ خوبصورت سماں اور باتیں امپریس نہیں کر رہیں۔ لیکن تب بھی صرف میری خاطر آپ اس وقت یہاں بیٹھی ہوئی ہیں!"

یہ کہتے ہوئے اسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا مگر ثمرین جلدی سے بولی "نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں! بس اب اندر کوچ کرنے ہی والے ہیں۔"

وہ گھبرا کر بولا "پلیز تھوڑی دیر تو رک جائیے۔ آپ کی بدولت ہی اس فضا میں یہ نکھار، یہ حسن ہے۔ اگر آپ چلی گئیں تو یہ سب بے معنی بن جائے گا۔"

وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے لاپرواہ مسکراہٹ سے بولی

"تعجب ہے آپ اپنی پسند کے لمحات اکیلے نہیں انجوائے کر سکتے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"شاید آپ کو اس بات کا تجربہ نہیں کہ غم تو بانٹنے سے ہلکا ہوتا ہے خوشیاں دُگنی ہو جاتی ہیں۔"

ثمرین نے پل بھر کو اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور جانے کیا محسوس کرتے ہوئے ایک دم بولی

"آپ آج کی رات بہت اچھے میزبان ثابت ہوئے ہیں اس لئے ہم بھی آپ کی خوشی دوبالا کرنے کو تیار ہیں ورنہ سچ بڑی زور کی نیند آ رہی ہے۔"

"چوکیدار ٹھیک کہتا ہے کہ آپ دل کی بہت اچھی ہیں۔"

کاشف نے دمکتے چہرے سے کہا پھر گہری نظروں سے ثمرین کے چاندنی میں جھلمل کرتے وجود کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

"آج تو چاند کو دیکھ کر میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ سمندر کی طرح پاگل ہو جاؤں۔"

ثمرین اس کی نگاہوں کی کرنیں اپنے چہرے پر اٹکتے دیکھ کر بات بدلتے ہوئے مدھم مسکراہٹ سے بولی

"آپ کی یہ کیفیت ہر تاریخ کے چاند کو دیکھ کر ہوتی ہے یا صرف چودھویں کے چاند کو؟"

وہ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے محظوظ مسکراہٹ سے ذومعنی لہجے میں بولا

"آپ نے میری بات پر غور نہیں کیا۔ میں نے جملے میں آج کا چاند کہا تھا، اس لئے اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ تو ہر تاریخ کے چاند کو دیکھ کر مجھے کچھ محسوس ہوتا ہے اور نہ ہی ہر چودھویں کے چاند کی میرے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔"

ثمرین خجل ہوتے ہوئے پلکیں جھپکتے ہوئے شریر دھیمی مسکراہٹ سے بولی

"پھر تو ہمیں یہاں سے فوراً نو دو گیارہ ہو جانا چاہیے، کیونکہ اگر آپ نے بھی سمندر کا روپ دھار لیا تو پھر ہم آسمان کہاں سے لائیں گے جس پر چندا کی طرح چڑھ کر ڈوبنے سے محفوظ بھی ہو سکیں۔"

کاشف نے گہری پرستائش نظروں سے ثمرین کی طرف دیکھا جو اتنی گہری بات کتنے خوبصورت انداز میں کہہ گئی تھی اور جب دونوں کی شفاف شوخ نگاہیں ٹکرائیں تو بے اختیار دونوں ہی ہنس پڑے اور ان کی پاکیزہ روحوں سے پھوٹنے والی اس ہنسی میں جانے کیا جادو تھا کہ فضا میں جلترنگ سے بج اٹھے۔ ہوا ان کی خوبصورت ہنسی کو

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

قیمتی سرمایہ سمجھتے ہوئے دور تک اُڑا لے گئی اور چاند کو بھی محسوس ہوا جیسے اس مقدس حسین ہنسی کے آگے اس کی اپنی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی ہو۔ جب ہی اس نے بدلی کے آنچل میں اپنا چہرہ چھپا لیا تو ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیل گیا۔ ثمرین ہنسی پر قابو پاتے ہوئے گھبرا کر بولی

"چاند بھی کیا چیز ہے! جب روشنی لٹانے پر آتا ہے تو لگتا ہے جیسے اپنا تمام خزانہ آج ہی خالی کر دے گا۔ اور جب اپنی روشنیاں سمیٹتا ہے تو ایک دم ہی اتنا سنگدل بن جاتا ہے کہ چاروں طرف پھیلتے گھٹا ٹوپ اندھیروں کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔"

کاشف اسے بغور دیکھتے ہوئے مدھم مسکراہٹ سے بولا

"آپ ہی دیکھئے، پیار کی روشنی بکھیرتا چاند کتنا پیارا لگتا ہے جبکہ پیار کی روشنی سمیٹ کر اندھیروں میں دھکیل دینے والا چاند روح تک کو اداس کر دیتا ہے۔"

ثمرین اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے مسکرائی

"زیادہ ذو معنی لہجے میں بات مت کیا کیجئے۔ اس سے ذہن پر زور پڑتا ہے اور اس کے علاوہ پٹنے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔"

وہ بھرپور مسکراہٹ سے بولا

"اگر آپ کا مجھے پیٹنے کو جی چاہ رہا ہے تو یہ آرزو بھی پوری کر لیجئے۔ بندہ اُف نہیں کرے گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "ارے واہ! آپ تو بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ یاد ہے اپنی پہلی ملاقات؟"

وہ جلدی سے بولا "مجھے بحیثیت کاشف کچھ یاد نہیں البتہ... بحیثیت آنف ایک ایک لمحہ ذہن پر نقش ہے۔"

ثمرین اس کی پشیمانی محسوس کرتے ہوئے اطمینان سے بولی

"لیکن آپ کو کاشف سے اتنی نفرت نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر کاشف نہیں چاہتا تو آنف کبھی وجود میں نہیں آتا۔ سچ ثمرین!"

کاشف کا چہرہ اس احساس سے دمک اٹھا کہ ثمرین نے کاشف کو آخر کار قبول کر لیا۔ ثمرین دھیرے سے مسکرائی۔ "بالکل سچ! بلکہ ہمارے خیال میں تو آنف سے زیادہ کاشف قابل تعریف ہے کیونکہ اسے اپنی خامیاں، اپنی کوتاہیاں نہ صرف یہ کہ نظر آتی ہیں۔ بلکہ وہ ان کا ازالہ کرنا بھی جانتا ہے۔"

وہ تیز ہوتی دھڑکنوں اور کانپتی آواز سے بولا

"تو اب تم کاشف سے ناراض نہیں ہو؟"

وہ نرم مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "نہیں۔"

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہنے لگا

"آج تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں! جب شروع شروع میں تم سے امپریس ہوا تو اپنے سامنے ایک مضبوط۔ انوکھی منفرد لڑکی کو دیکھ کر کسی عام مرد کی طرح میرا سینہ بھی حسد و جلن کی آگ سے جل اُٹھا! میرا جی چاہا کہ میں اس خود پسند، مطمئن وجود کو چکنا چور کر دوں اس لڑکی کو یکسر بدل کر رکھ دوں جس نے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کیا۔ اس کے لئے پہلے تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ تم سے لاپرواہی، سرد مہری کا مظاہرہ کروں مگر پھر اس احساس سے کہ تمہیں بھلا اس کی کیا پرواہ ہو گی؟ میرے ذہن میں یہ ترکیب آئی کہ تم سے دوستی کروں اور پھر تمہیں اپنے رنگ میں رنگ ڈالوں اور پھر جب اپنی انا کو تسکین مل جائے تو پھر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر، کوئی لڑائی جھگڑے کا جواز کھڑا کر کے، تم سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی اختیار کر لوں۔"

ثمرین نے حیرت سے پوری آنکھیں کھولتے ہوئے سرگوشی میں کہا "واقعی انسان بھی کتنی عجیب چیز ہے! ایک مکمل راز۔"

کاشف مسکرایا۔ وہ جلدی سے بولی

"ہاں تو پھر کتنی کامیابی ہوئی آپ کو اپنے مقصد میں؟"

وہ محظوظ ہنسی سے بولا "خاکسار کو یہ کامیابی ہوئی کہ جب اس نیت سے شیاما کے ساتھ آپ کے گھر میں قدم رکھا! در تنہائی میں آپ کے بارے میں مسلسل اور ہر پہلو سے سوچتا رہا تو پھر یوں ہوا کہ خود سے جدا ہوتا گیا اور تم میں جذب ہوتا گیا اور جب بیدار ہوا تو نہ جانے کاشف کہاں کھو چکا تھا اور اس کی جگہ آنف کھڑا مسکرا رہا تھا! جو تم سے دیوانہ وار پیار کرتا ہے مگر کاشف سے اتنی ہی سخت نفرت!"

ثمرین کی اپنے چہرے پر اٹکی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"کیا اب بھی تم کاشف کو اچھا سمجھتی ہو؟"

وہ دھیرے سے بولی "اگر کاشف اچھا نہیں ہوتا تو یہ اعتراف نہیں کرتا۔ اپنے اس راز کو اپنے ہی تک محدود رکھتا۔" وہ کاشف کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی "اور اسی لئے ہماری نظروں میں یہ کاشف بہت بلند او قابل پرستش ہے جسے اپنی اتنی بدترین خامی کا احساس ہوا۔"

وہ بے ساختہ کہہ اُٹھا "تو پھر ایسے انسان کو اپنانے میں آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہو گا؟"

ثمرین کے گال جل اٹھے۔ اس نے سٹپٹا کر کاشف کی مضطرب، پُرشوق، بیتاب نگاہوں میں دیکھا پھر بے حد ضبط سے بولی۔

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ زندگی کی گاڑی صرف اسی وقت توازن برقرار رکھ سکتی ہے جب... اس کے دونوں پہیوں میں ہم آہنگی ہو۔ اور اگر غیر جذباتی ہو کر دیکھا جائے تو ہم دونوں تو بالکل ہی ایک دوسرے کا تضاد ہیں۔ ہماری ہر بات، ہر چیز میں پسند و ناپسند تک

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

بالکل متضاد ہیں۔"

کاشف نہایت سنجیدگی اور اعتماد سے بولا

"تم سے ملنے سے پہلے میں بھی یہی عام سوچ رکھتا تھا کہ جیون ساتھی سے ذہنی ہم آہنگی کے بغیر زندگی کی گاڑی توازن برقرار نہیں رکھ سکتی اور زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ کا روپ دھار لیتی ہے، مگر تم سے ملنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ جیسے شادی کے مقدس بندھن میں ذہنی ہم آہنگی سے بھی بڑھ کر ایک چیز اہمیت رکھتی ہے اور وہ ہے ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا۔ اور اگر دونوں فریقین میں یہ خوبی موجود ہے تو پھر پسند و ناپسند کا تضاد اور خیالات کا فرق زندگی کو دلچسپ و رنگین بنا دیتے ہیں۔

عجیب منطق ہے۔" ثمرین دلچسپی سے بولی۔

وہ دلکش مسکراہٹ سے بولا "اب یہی دیکھ لیجیے کہ مجھ میں اور شیبا میں کس قدر ذہنی ہم آہنگی تھی کہ ہمارے خیالات، پسند و ناپسند سب کچھ بالکل ایک جیسے تھے، لیکن اس کے باوجود مجھے ہمیشہ اپنے اندر ایک عجیب سی تنہائی، تکلیف دہ سناٹا محسوس ہوا — مگر تم سے ملتے ہی جیسے میرے وجود پر چھایا جمود ٹوٹ گیا۔ مجھے اپنے اندر رونقیں اترتی محسوس ہوئیں۔"

وہ اس کی جھکی جھکی پلکوں کی اوٹ میں جگمگاتی مسکراہٹ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا

"اب یہی دیکھ لیجیے۔ آج کی رات میں نے درحقیقت پہلی بار قدرت کے اس پُرنور حسن کو دیکھا ہے۔ اس چاندنی رات کو محسوس کیا ہے اور وہ بھی آپ کی وجہ سے۔ پہلے کبھی روح میں یہ سرشاری محسوس نہ ہوتی تھی جو آج ہو رہی ہے!"

ثمرین نہ جانے کیا سوچتے ہوئے بولی

"اس کے علاوہ کوئی معقول دلیل ہے؟"

وہ فوراً بولا "کیوں نہیں۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ مجھے چاندنی راتیں پسند ہیں لیکن آپ کو ساحل کی سہ پہریں اور شامیں، لیکن میرے جذبات کا احترام کرتے ہوئے آپ نے آج کی رات میرا ساتھ دیا اور ہم دونوں ہی کو لطف آ رہا ہے۔ ہے نا، ایمانداری سے بتائیے۔"

ثمرین نے مدھم مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ مسرور سا کہنے لگا۔ "اور اسی طرح میں بھی آپ کے جذبات کا احترام کروں گا اور کبھی ہم دونوں ساحل کی سہ پہریں اور شامیں بھی اسی طرح ایک ساتھ منائیں گے۔ اور میں ابھی سے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اس وقت بھی اتنا ہی انجوائے کروں گا جتنا ابھی کر رہا ہوں بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی، کیونکہ تب یہ خیال ذہن میں ہوگا کہ یہ آپ کی خوشی میں شیئر کر رہا ہوں۔ تو اس طرح ایک دوسرے کی مختلف پسند کی بدولت

نئی نسل کی نمائندہ افسانہ نگار

سیما یاسمین مجتبیٰ

کے افسانوں کا مجموعہ

بحرِ بیکراں

سیما یاسمین مجتبیٰ کا انداز عام انداز سے ہٹ کر ہے۔ ان کی تحریر میں ایک انفرادیت ہے۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کا مشاہدہ نہایت عمیق ہے۔

بحرِ بیکراں

شائع ہو گیا ہے

آفسٹ چھپائی، سفید کاغذ، مجلّد

قیمت ۲۰ روپے

آج ہی خط لکھ کر طلب فرمائیں

سعودی عربیہ میں تمام پاکستانی بقالوں پر دستیاب ہے۔

نازیہ پبلشرز

149-G/2 پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کراچی ۲۹

یا

مکتبہ خواتین ڈائجسٹ اردو بازار کراچی ۱

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہم دونوں دو مختلف موسم محسوس کر سکیں گے۔ یہی بات پھولوں رنگوں اور دوسری باتوں میں بھی ہے۔ تو ذرا سوچئے جب ہم دونوں کی پسند سے ایک آشیانہ تیار ہوگا تو اس میں دھنک کے تمام رنگ موجود ہوں گے۔ کتنی ورائٹی اور کتنا حسن ہوگا! ذہنی ہم آہنگی کی پیدا کردہ یکسانیت و محدودیت اور جمود کے بجائے ذہنی تضاد کے مختلف رنگوں کی قوس و قزح ہوگی۔ شخصیت کی لامحدودیت ہر نئے میں آشکارا ہوگی اور رونقیں در و بام سے پھوٹیں گی۔ کیونکہ ہم دونوں میں ذہنی تضاد ضرور ہے مگر ایک دوسرے کے احترام کا جذبہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اور یہی دونوں خصوصیات چونکہ ہمارے گھر کی تعمیر میں شامل ہوں گی اور ساتھ ہی ہماری ایک دوسرے کے لئے پُرخلوص، سچی، کھری محبت بھی تو بس ہمارا گھر رشکِ جنت ہوگا اور ہم دونوں زندگی کے ہر حسن سے بھرپور انداز میں محظوظ ہو سکیں گے۔ کچھ آپ کی بدولت، کچھ اپنی بدولت اور کچھ ہم دونوں کی ایک پسند کی بدولت۔"

"آپ نے تو سو فیصد قائل کر دینے والی تقریر کی ہے۔" ثمرین گہری مسکراہٹ سے بولی۔ "لیکن بہت سی باتیں کہنے میں تو بہت آسان لگتی ہیں لیکن ان پر عمل کرنا بے حد دشوار بلکہ اکثر ناممکن ہوتا ہے۔"

کاشف جلدی سے بولا "یہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کا نہ اپنے اوپر اعتماد ہو اور نہ اپنے ساتھی پر۔ اور خاص طور پر ازدواجی زندگی میں ایسا اس وقت ہوتا ہے جب شوہر اپنی بیوی کی خوبیوں کے آگے احساسِ کمتری کا شکار ہو جائے۔ اس کی قابلیت سے جلنے لگے جس کی بدولت بیوی بے چاری گھبرا گھبرا کر اپنے آپ کو شوہر سے ایک ڈگری کم ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے اور یوں زبانی محبت و پرستش کا دعویٰ کرنے کے باوجود عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی ایسے لوگوں کا گھر جہنم بن جاتا ہے جبکہ —"

وہ پُراعتماد مسکراہٹ سے بولا "میں اپنی خوبیوں اور خامیوں سے نہ صرف یہ کہ اچھی طرح واقف ہوں بلکہ اس بات پر ایک عجیب سی خوشی اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ آپ بہت سی باتوں میں مجھ سے برتر ہیں، اور آپ سے مل کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں ایک ایسے دوست سے مل رہا ہوں جو ہر سرد و گرم میں نہ صرف یہ کہ میرے شانہ بشانہ چل سکتا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر میری رہنمائی بھی کر سکتا ہے اور بعض لمحات میں مجھے یہ احساس بھی بخشتا ہے کہ وہ ایک ایسا نازک سا جیتا جاگتا آسمانی تحفہ ہے کہ جس کی خوشی و ناخوشی، آرام و آسائش کی ذمہ داری مجھ پر ہے یعنی جس کا میں رکھوالا ہوں اور اس لئے اس کا جتنا بھی خیال رکھوں کم ہے!" وہ پیار سے لبریز نظروں سے ثمرین کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا "اور یہ احساس جسم و جاں میں ایسی سرشاری بھر دیتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

ثمرین نہایت اطمینان سے بولی "سوچتی ہوں جب آپ کے سر سے یہ محبت کا بھوت اترے گا تو پھر آپ اپنے خوبصورت خیالات کو کیا نام دیں گے؟"

وہ محظوظ مسکراہٹ سے بولا "اپنی محبت کی عقل و شعور اور تیز بینائی کی تو آپ خود گواہ ہیں اور ایسی محبت کسی آسیب کی طرح مر کر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔" وہ ہنس پڑا اور ثمرین بھی مسکرا اٹھی۔

وہ شوخی سے بولا "صرف ہنسنے سے کام نہیں چلے گا میڈم! جواب دیں میرے پرپوزل کا۔"

ثمرین کے نازک چہرے پر بڑا گہرا ابر چھا گیا۔ اس نے جلدی سے پلکوں کی اوٹ میں آنکھوں میں جھلملاتی نمی کو چھپا لیا اور مدھم سرگوشی میں بولی

"آپ پہلے شخص ہیں جس نے ہماری اصلیت پہچانی اور ہمیں چاہا۔ ورنہ اب تک تو سب ہمیں انسان کے بجائے ایک چٹان سمجھتے رہے۔" وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔

کاشف پیار بھری مسکراہٹ نگاہوں میں سجائے اسے محویت سے دیکھتا رہا اور وہ کہتی رہی۔ "لیکن آپ نے ہماری حقیقت نہ جانے کیسے پہچان لی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہمارے اس خول سمیت ہی ہمیں پیار کرنا شروع کر دیا کہ آج ہم آپ کے سامنے یہ خول اتارنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن وہ چند لمحے رکتے ہوئے جیسے اپنی تمام قوت مجتمع کرتے ہوئے بولی "لیکن ہم آپ سے شادی نہیں کر سکتے۔"

وہ ویران نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے خشک لبوں سے بولا "ثمرین یہ، یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ خدا کے لئے مجھ سے ایسا مذاق نہ کرو کہ جو میرے حواس چھین لے!"

وہ اس کے بے جان پڑتے سفید ہوتے چہرے کو اداس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھیگی آواز میں بولی۔

"یقین کیجئے اس میں ہی ہم دونوں کی بہتری ہے۔"

وہ بھاری سانسوں سے روہانسا ہوتے ہوئے بولا "ایسا ممکن ہے تمہارے بنا یا تو میں مر جاؤں گا یا پاگل ہو جاؤں گا۔ اور اسے تم ہم دونوں کے لئے بہتری سمجھتی ہو؟"

وہ خلاؤں میں چمکتی چاندنی کی نمی آنکھوں میں اتارتے ہوئے کہنے لگی۔

"ممکن ہے ایسا کچھ بھی نہ ہو اور ہم سے جدا ہو کر آپ زیادہ مطمئن زیادہ خوش زندگی گزار سکیں۔"

وہ کرب میں ڈوبی مسکراہٹ سے بولا "ٹھیک ہے پھر آزما کر دیکھ لو۔"

اس کی آواز اس کے ٹھوس لہجے میں نہ جانے کیا سچائی پنہاں

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

تھی کہ ثمرین پوری جان سے کپکپا اٹھی اور وہ اس کے قریب آتے ہوئے گھٹنوں کے بل گھاس پہ ٹکتے ہوئے بولا

"مگر، تم، تم ایسا کیوں چاہتی ہو۔ مجھے پسند کرنے کا اعتراف کرنے کے باوجود مجھے کیوں زندہ درگور کر رہی ہو؟"

وہ اس کے قرب سے بے چین ہو کر یکدم کھڑے ہوتے ہوئے بولی "کیا روحوں کے بندھن کے بعد جسموں کے ملن کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟"

وہ اس کی معصوم ادا پر سرشاری سے مسکراتے ہوئے نیلگوں آسمان پر جگمگاتے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم دلکش لہجے میں بولا

"میں اس روشن چاند کو گواہ بنا کر کہتا ہوں ثمرین کہ اگر کوئی تمہاری روح کو جسم سے الگ کر دے اور دونوں کو برابر برابر کھڑا کر کے پوچھے کہ تمہیں کیا چاہیے؟ تو خدا کی قسم میں تمہاری روح کا انتخاب کروں گا۔"

ثمرین کا سر اس کے سینے پر جھکتا چلا گیا اور وہ لرزتی آواز میں تیز سانسوں کے درمیان زیر لب بولی

"پلیز ایسی باتیں مت کیجئے۔ ہمارا دل بہت کمزور ہے! اسی لئے ڈاکٹروں نے ہمیں شادی سے منع کیا ہے کہ ہم سنجوگ کی خوشیاں نہیں برداشت کر سکتے۔ اور اسی لئے ہم نے آپ سے شادی سے انکار کیا۔ ورنہ آپ سے تو مر کر بھی جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر بے حد کوشش کے باوجود وہ اپنی آواز کاشف کے کانوں تک نہیں پہنچا سکی جو اس کے ریشمی بالوں میں منہ چھپائے کسی چھلکتے پیمانے کی طرح اس پر اپنی تمام چاہتیں، تمام عبادتیں نثار کرتے ہوئے بڑی لجاجت، بڑی منت سماجت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا

"ثمرین! میری روح! مجھے اپنے آپ سے جدا مت کرو! تم جو چاہو گی میں کرنے کو تیار ہوں۔ جو شرط چاہو رکھ لو۔ مگر مجھے نہ ٹھکراؤ۔ تمہارے بغیر میں کچھ نہیں تصور کر سکتا۔ زندگی بھی نہیں!!"

وہ فولادی شخصیت کا مالک، ہر ایک کو مرعوب کر دینے والا بظاہر لاپرواہ نظر آنے والا شخص اس وقت شمع کی طرح پگھل رہا تھا اور ثمرین کی گرفت اس کے بازوؤں پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی، چاند بھی اس شمع کی طرح جلتے پروانے کو بغور دیکھنے اس کے قریب جھک آیا اور شاید اس پروانے کی شمع کو نذرانۂ عقیدت دینے کے خیال سے اس نے اپنی تمام کرنیں ثمرین کے براؤن کرلی بالوں میں ٹانک دیں تو کاشف بے حد پیار سے کھوئے کھوئے انداز میں، اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا

"دیکھو چاند بھی تمہاری خوشامد کرنے میری مدد کو آ گیا۔ اب تو مان جاؤ۔ کچھ تو منہ سے بولو" پھر اس کے بالوں کے درمیان سے جھلکتے ننھے سے کان کے قریب منہ لے جا کر میٹھی سی شوخی سے بولا

"اس جذبۂ دل کے بارے میں ایک مشورہ تم سے لیتا ہوں
اس وقت مجھے کیا لازم ہے جب تم پہ میرا دل آ جائے؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے والہانہ انداز میں ثمرین کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بیتابی سے کہا

"بولو نا!"

مگر وہ پلکیں موندے ہونٹوں پر خوبصورت سی گداز مسکراہٹ سجائے یوں کھڑی رہی جیسے کوئی دلچسپ کہانی سنتے سنتے سو گئی ہو۔ کاشف کو اس کی یہ کیفیت کچھ عجیب سی لگی۔ وہ گھبرا کر اسے ہلاتے ہوئے بولا "ثمرین۔

"ثمرین! آنکھیں کھولو نا۔ یہ کیسا مذاق ہے۔"

اور ساتھ ہی اس نے اس کے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے تو اس کی گردن ڈھلک کر اس کے سینے سے جا لگی۔ وہ اسے اسی طرح تھامے جلدی سے کرسی پر بٹھاتے ہوئے دیوانہ وار اسے پکارنے لگا۔

"ثمرین! ثمرین! کیا ہو گیا تمہیں! تم اتنی بے جان سی کیوں نظر آ رہی ہو؟"

مگر سوائے ایک خاموش مسکراہٹ کے اسے جواب میں

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

کچھ نہیں ملا تو اس کے بشاش چہرے پر وحشتیں رقص کرنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر اس کے دل کی دھڑکنوں کو سننا چاہا تو وہاں سوائے سناٹے کے کچھ نہیں پایا۔ اس نے پاگلوں کی طرح اس کی نبضیں ٹٹولیں تو وہاں بھی ایک خاموشی کے سوا کچھ نہیں پا سکا۔ پھر وہ کچھ دیر گھٹنوں کے بل شبنم میں نہائی سبز گھاس پر بیٹھ کر ثمرین کو سکتے کے عالم میں تکتا رہا جو لان چیئر کی پشت سے سر ٹیکے، بند پلکوں اور مسکراتے ہونٹوں سے کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ بے حد سندر۔ بے حد معصوم۔ وہ ٹوٹی خوف زدہ آواز میں بولا

"نہیں! نہیں! تم نہیں مر سکتیں! تم تم مجھے پریشان کر رہی ہو۔ جب ہی تمھارے لبوں پر یہ شریر مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے اور یوں مطمئن نظر آ رہی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے میرے جدائی کا لفظ استعمال کرنے پر خوف زدہ ہو کر میرے سینے میں منہ چھپا لیا تھا۔ پھر بھلا ایکدم چند سیکنڈ بعد ہی تم کیسے مجھ سے اتنی دور جا سکتی ہو جہاں جانے والے کبھی واپس نہیں لوٹتے۔"

وہ چیخ اٹھا "نہیں نہیں! تمھیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم زندہ ہو۔ مرنے والوں کے چہرے یوں تروتازہ نہیں ہوا کرتے!" وہ اس کے چہرے کے گرد پھیلے براؤن کرلی بالوں پر والہانہ انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"انھیں دیکھ کر اس وقت بھی زندگی کی حرارت کا احساس ہوتا ہے۔"

وہ زور زور سے چیخنے چلانے لگا اور ہوا بھی پریشان ہو اٹھی اور بے حد تیز رفتاری اختیار کرتے ہوئے اس کی آہ و فریاد سمندر پار تک لے جانے لگی تاکہ کوئی اس دیوانے کو سمجھانے، دلاسا دینے آئے جو اس اچانک اور جان لیوا صدمے سے نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ مگر ساحل پر آہ و زاری کرتی اس پٹختی موجوں نے ہوا کی محنت کو ضائع کر دیا اور کوئی کاشف کی آہ و بکا، چیخ و پکار نہیں سن سکا۔

اور سویرے جب چاند و کشش کا کھیل ختم ہو چکا تھا اور سمندر نڈھال سا رواں دواں تھا کہ چوکیدار بٹ کی طرف آیا تو سامنے ہی لان میں سیڑھیوں کے پاس، دیو قامت پیڑوں کی چھاؤں میں ثمرین کو کرسی پر آنکھیں موندے مسکراتے ہوئے نیم دراز پایا اور کاشف کو اس کے قدموں میں بیٹھے، اس کے گھٹنوں پر سر ٹیکے، اسکے گرد مضبوطی سے باہیں لپیٹے ہوئے دیکھا تو اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

وہ تیز قدموں سے بٹ کے اندر پہنچا اور دادی اماں کو (جو کہ اسی وقت جاگی تھیں) مخاطب کرتے ہوئے غم و غصے سے بولا

"بیگم صاحبہ! ذرا چل کر دیکھیے باہر کیا ناٹک ہو رہا ہے!"

وہ اس کا مطلب نہ سمجھنے کے باوجود اسکے لہجے کی بدولت فوراً اس کے ساتھ باہر نکل آئیں اور جب لان میں پہنچیں تو اس منظر کی تاب نہ لا سکیں اور تیز رفتاری سے ثمرین کے قریب پہنچتے ہوئے اس کے گال پر ایک تھپڑ رسید کرنے ہی والی تھیں کہ اسکے چہرے کو عجیب سا محسوس کرتے ہوئے پوری جان سے لرز اٹھیں۔

وہ چند لمحے کسی مورتی کی طرح اسے تکتی رہیں۔ پھر لرزتے قدموں سے آگے بڑھیں اور اسکے چہرے کو تھاما تو اس کی بے جان گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ وہیں غش کھا کر گر پڑیں۔ چوکیدار بھی تھر تھر لرزنے لگا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر کانپتی آواز میں بڑی مشکل سے کہا

"کاشف میاں! یہ ثمرین بی بی کو اچانک کیا ہو گیا؟" تو جواب میں کاشف کا ساکت جسم ثمرین کے قدموں میں جھک گیا۔ مضبوط دل شیر خان بھی اپنی چیخ نہیں ضبط کر پایا اور اس کی چیخ پر دادی جان ہوش میں آتے ہوئے وحشت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں جو پاگلوں کی طرح کبھی کاشف کی خاموش دھڑکنیں سننے کی تو کبھی پُر سکون نبض کو زندہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ دادی جان ایک بار پھر ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ ہو گئیں —— اور اس سب آہ و بکا سے بے پرواہ آکاش کی بلندیوں پر مسرور سے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ثمرین اور کاشف چلتے چلے جا رہے تھے۔ اور فضا کاشف کے سچے قول سے گونج رہی تھی۔

"خدا کی قسم ثمرین اگر کسی نے تمھارے جسم اور روح کو علیحدہ کر دیا اور مجھ سے پوچھا کہ تمھیں کیا چاہیے؟ تو اس روشن چاند کی قسم میں تمھاری روح کا انتخاب کروں گا۔ اور ثمرین کسی معصوم روح کی طرح مطمئن سی، پُر نور مسکراہٹوں کے ساتھ اپنے پُر خلوص ساتھی کے ساتھ بنا کسی ڈر و خوف کے ایک سرشاری کے عالم میں کہکشاں پر قدم رکھتے ہوئے اپنے حسین ساتھی سے کہہ رہی تھی

"ہمیں آپ کی چاہت پر یقین تھا۔۔۔ اسی لئے تو ہم نے آپ کو اپنے ساتھ لے لیا اور اب ہمیں کبھی بھی کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔ نہ بیماری، نہ کمزوری، نہ کوئی مجبوری۔ اور یہاں تک کہ موت بھی نہیں کیونکہ ہم نے روحوں کا بندھن باندھا ہے جو امر ہوتا ہے اور جسے خدا بھی توڑنا پسند نہیں کرتا۔

واقعی کسی نے سچ کہا ہے ؎

یہ رشتۂ خلوص ہے ٹوٹے گا کس طرح
روحوں کو بھلا چھو سکے ہیں فنا کے ہاتھ!

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

خوشبو رنگ سہانے موسم

شکیلہ سنبل فردوس

WaqarAzeem
Pakistanipoint.Com

خاموش

فضا اچانک یکے بعد دیگرے کئی فائروں سے جاگ اٹھی۔ بھیا جانی اور راتو جانی اپنے اعلیٰ نسل کے کتوں کی رہنمائی میں ایک طرف لپک پڑے اور وہ دھوپ کی تمازت سے اپنی آنکھوں کو بچانے کے لئے اپنی کیپ ماتھے تک کھینچتی ہوئی ایک ہاتھ سے رائفل کا بٹ ریت پر سختی سے جما کر اس کے سہارے اطمینان سے کھڑی ہو گئی اور دوسرا ہاتھ کمر پر ٹکا کر آس پاس کا جائزہ لینے لگی۔ اس وقت وہ سیاہ چمکتے ہوئے شوز اور چست جین پر سیاہ ہی چمڑے کی جیکٹ میں سر پر کیپ جمائے ایک جیالے سپاہی کی طرح تن کر کھڑی تھی۔

مگر یہ کیا؟ . . .

جیپ کے ایک تیز ہارن سے . . . وہ بری طرح اچھل پڑی دراصل ابو جانی اور بھیا جانی کے چلے جانے سے ماحول ایک دم اداس اداس اور تنہا تنہا ہو گیا تھا اور ایسے میں بالکل اچانک غیر متوقع طور پر بج اٹھنے والے تیز ہارن سے اس کا ڈر جانا ایک یقینی امر تھا۔ اس نے اسی انداز میں کھڑے کھڑے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ سبز جیپ سے کئی لڑکے اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے۔

ایک نظر میں اس نے جان لیا تھا کہ ان لڑکوں کے گروپ کا تعلق ان اوباش قسم کے نوجوانوں سے ہے جن کی زندگی کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا سوائے لمبی لمبی سڑکیں ناپنا، غنڈہ گردی کرنا اور ملک میں انتشار پھیلا کر تخریب کاری کرنا ان کے دلچسپ مشغلے ہوتے ہیں۔ چند لمحے پہلے کی ساکن اور خاموش فضا ان کے بیباک قہقہوں سے چیخ اٹھی تھی۔ شاید وہ لوگ پکنک کے لئے آئے تھے۔ تب ہی ڈھیروں سامان بھی اِدھر اُدھر رکھے ہوئے تھے۔

دل ہی دل میں وہ بری طرح خوف زدہ تھی کیونکہ وہ بالکل تنہا تھی۔ کسی بھی وقت لڑکے کوئی بدتمیزی کر سکتے تھے جن کے شیطانی قہقہے اور بھی بلند ہو گئے تھے۔

مگر وہ بظاہر لاپرواہ سی بنی ڈٹ کر کھڑی رہی۔ اسی پوزیشن میں جیسے اس نے ان کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

"معاف کیجیے ہم بھی اِدھر کھڑے ہیں۔"

کورس کے انداز میں پیچھے سے پوچھا گیا۔

اور پھر ایک دم کئی لڑکے اس کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔

"کہئے کوئی شکار ملا؟"

ان میں سے ایک نے اس کے لباس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ مگر وہ خاموش رہی۔ جانتی تھی ان کو منہ لگانا بہتر نہیں۔

"نہیں ابھی تو نہیں۔"

دوسرے نے جواب نہ پا کر زنانہ آواز بنا کر کہا تو پھر قہقہوں کا طوفان اُبل پڑا۔

"شکار تو اب خود قریب آ گیا ہے۔"

تیسرا کیوں پیچھے رہتا۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"ان لانبے لانبے بالوں کو غائب کر دیجیے تو بالکل ڈان شکاری نظر آئیں گی۔"

ایک اس کی جیکٹ پر پھیلے سرخی مائل کالے بالوں کی آبشار کی طرف اشارہ کر کے بولا تو وہ اب کے صبر نہ کر سکی اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کو دونوں ہاتھوں سے پوری قوت سے گھما کر اس کی طرف بڑھی۔ تب ہی کسی نے رائفل کا بٹ پیچھے سے تھام لیا۔

"محترمہ قتل بھی ہو سکتا ہے۔"

کسی نے تیز آواز میں کہا تو وہ گھوم کر مداخلت کرنے والے کو دیکھنے لگی جو سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میں ان کی بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔" تب وہ غم و غصے سے جل ہی اٹھی۔

"شٹ اپ۔"

اس نے اپنا مرمریں ہاتھ پوری طاقت سے اس کے سفید گال پر جڑ دیا اور اسے حیران چھوڑ کر اپنی گری ہوئی رائفل اٹھا کر اپنے سامان کے پاس آ گئی۔

وہ لڑکوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر جیپ میں جا بیٹھا۔ اس کے چہرے پر سنگلاخ چٹانوں کی سی سختی تھی اور ہونٹ غصے کو ضبط کرنے کی وجہ سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ یہ اس کی سب سے پہلی اور بڑی بے عزتی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس کے ارادے بھانپتے ہی سارے لڑکے چلتی جیپ میں گرتے پڑتے گھس گئے سامان کی پرواہ کئے بغیر۔

اس نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔ تب اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جو سرخ ہو رہا تھا۔

آج اس نے کتنی بڑی جسارت کی تھی۔

تب ہی اسے اپنی . . . . . . ہتک پر رونا آ گیا۔ کچھ دیر آنسو بہہ بہہ کر اس کے سرخ ہاتھ کو ٹھنڈا کرتے رہے۔

کچھ دیر بعد بھیا جانی اور راتو جانی ہاتھوں میں شکار کی ہوئی مرغابیاں پکڑے آ گئے۔ وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں اس

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کی گلابی ہوتی آنکھوں کو بھی نہ دیکھ سکے جو رونے سے سرخ ہو گئی تھیں۔

"میرا خیال ہے اب چلا جائے یہی بہت ہیں۔"
اور وہ اپنی شکار کی ہوئی مرغابیاں اور رائفل لئے گاڑی میں آ بیٹھے۔

ڈوبتے سورج کی دم توڑتی کرنوں میں گول ستونوں والے لمبے سے برآمدے میں آپی جی بیٹھی اون سلائیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ دھیرے دھیرے سرد شام میں گھل رہی تھی مگر وہ ابھی تک باہر ہی بیٹھی تھیں۔ جیپ تیزی سے گیٹ میں داخل ہوئی اور خطرناک حد تک تیز رفتار میں موڑ مڑتی ہوئی گیراج میں جا کھڑی ہوئی اور تب ہی وہ برآمدے کی سیڑھیاں تیزی سے پار کر کے آندھی طوفان کی طرح راہداری میں گھس گیا اور پھر زوردار طریقے سے دروازہ بند ہونے کی آواز پر آپی جی بوکھلا کر اٹھ پڑیں۔

"خدا خیر ہی کرے۔"

وہ سلائیاں چھوڑ چھاڑ کر اس کے کمرے میں چلی گئیں۔

وہ بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔

"کیا ہوا جانی؟"

وہ پریشانی سے بولیں۔

تب اس نے چھت سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔ اس طرح جیسے اسے ان کی مداخلت گراں گزری ہو۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وہ بہت جلد اس کی صحت کے بارے میں پریشان ہو جاتی تھیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں۔"

وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

"آخر کچھ پتہ بھی چلے ہوا کیا؟"

"آپی جی۔ آپ اس وقت چلی جائیں۔ یہ نہ ہو کہ میں آپ کی شان میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں۔"

وہ زبردستی لہجے میں نرمی پیدا کر سکا تو آپی جی وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ تب وہ اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر مضطرب سا ہو کر ٹہلنے لگا۔ وہ اس وقت کچھ سوچنا چاہ رہا تھا بہت کچھ..... آخر کچھ اور نہ بس چلا تو کمرے کی چیزیں ادھر ادھر پٹخ کر ابتر کرنے لگا اور تھک ہار کر پھر بستر پر جا پڑا۔ ایک بالشت بھر کی لڑکی نے کس بے باکی سے اسے تھپڑ مارا تھا۔ اسے جیسے کبھی کسی نے اف تک نہ کی تھی۔ جسے کبھی کسی نے پیار سے پھول تک نہ مارا تھا گھر بھر کا لاڈلا۔ چار بہنوں کے اور ماں باپ کے نازوں نے جس کا دماغ عرش تک پہنچا دیا تھا۔ جس کی ہر جائز اور ناجائز ضد کو ایک فرض جان کر پورا کیا جاتا جس کی سرتابی کے بارے میں کسی نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ اس لڑکی کی جرأت نے اس وقت اس کی رگ رگ میں نفرت و انتقام کے شرارے بھر دیئے تھے۔ سارے راستے اس کے دوست بھی اس کے جذبہ انتقام کو ہوا دیتے آئے تھے اور اس کی بزدلی کے اس مظاہرے پر کھل کر ہنستے آئے تھے۔

مگر وہ.....

نہیں جانتا تھا کہ وہ اس بے عزتی کو اتنے صبر سے کیوں پی گیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس تھپڑ کا جواب فوری طور پر کیوں نہ دے سکا تھا۔

جانے کس چیز نے اسے باز رکھا۔

جو وہ کچھ کہے بغیر یوں چلا آیا۔

غلطی اس کی نہیں تھی تو پھر.....

کیوں اسے سزا دی گئی۔

آخر کیوں.....؟

وہ جیب سے کچھ چیزیں اتارتا رہا۔ تب تک اس کے دوست اپنی فطرت دکھا چکے تھے۔ وہ روکنے گیا تو وہ الٹا اسی پر برس پڑی۔

ان کم بختوں نے بھی آج حد کر دی تھی بدتمیزی کی مگر اس لڑکی کو آخر کیا مصیبت پڑی تھی یوں تنہا وہاں جانے کی اس قسم کی حرکتوں کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر اتنا برہم کیوں ہوتی ہیں۔

میں اسے وہ سبق دوں گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گی۔

اس نے دائیں ہتھیلی پر بایاں مکا مار کر گویا فیصلہ کر لیا اور پھر آپی جی کی بھیجی ہوئی کافی پی کر سکون سے لیٹ رہا۔

تب ہی.....

چھن سے کوئی شے تصور میں اتر آئی۔

شربتی شرارے اگلتی غصیلی آنکھوں اور لانبے لانبے سرخی مائل بالوں نے ہر سو ایک ٹھنڈا ٹھنڈا سا اندھیرا پھیلا دیا جس میں پرسکون ہو کر وہ نیند کی وادی میں بھٹک گیا۔

"تو پھر آج کیا پروگرام ہے آلو جانی؟"

وہ کھانے کی میز سجاتے ہوئے بولی۔

"بھئی وہی جو رات بنایا تھا۔ مچھلی کا شکار۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

بھیا جانی تولیئے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے گنگنائے۔
"ہاں تھوڑی دیر آرام کرلیں پھر چلتے ہیں۔"
ابو جانی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے مسکرائے۔
تب وہ تینوں دریا پر پہنچے تو وہاں چھٹی کی وجہ سے کافی لوگ پہلے ہی فشنگ سے شوق فرما رہے تھے۔ دریا کے کنارے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ لوگ ان سب سے پرے قدرے پرسکون جگہ پر اپنا سامان اتارنے لگے۔
تب ناز سب سے پہلے اپنا گوشت لگا کانٹا پانی میں ڈال کے بیٹھ رہی تو بھیا جانی بے اختیار ہنس دیئے۔
"چلو یہ تو گئی کام سے۔"
"کیوں گئی کام سے۔ سب سے پہلے موٹی سی مچھلی پکڑوں گی" اس نے پلٹ کر دیکھا۔
سیاہ فلیپر اور سفید اور سیاہ چیک وارمی شرٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح بڑی لاپرواہ نظر آرہی تھی۔ تنکوں کا بڑا سا ہیٹ سر پہ پہنے وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ لانبے لانبے بالوں کی چوٹیاں سینے پر لہرا رہی تھیں۔
پھر واقعی سب سے پہلے اس نے ایک موٹی سی مچھلی پکڑلی۔
"ابو جانی!" وہ چیخ چیخ کر انہیں بلانے لگی۔ مچھلی بہت بھاری تھی۔ تب ہی بھیا جانی نے بھاگ کر اسے کھینچا۔
"ارے واقعی کافی صحت مند مچھلی پکڑلی۔"
بھیا نے اس کی چوٹی کھینچی۔
ناز کا شور سن کر کافی دور بیٹھا جانی چونک پڑا۔ وہ دور سے ہی بچوں کی طرح خوش ہوتی اس لڑکی کو پہچان گیا۔ وہ بھی آج پاپا کے ساتھ فشنگ کے لئے آیا تھا۔
تب ہی اس روز کی اپنی بے عزتی اور ہتک کا تصور کر کے اس کا خون رگوں میں تیز ہوگیا اور چہرے کا رنگ مزید سرخ ہوگیا۔
بھیا جانی نے بھی ایک مچھلی پکڑلی۔ تب ہی ابو نے کہا۔
"چلو ناز اب تم مچھلی تلو۔ تمہاری مچھلی دیکھ کر بھوک چمک اٹھی ہے۔" وہ ہنسے۔
"نہیں ابو مچھلی تو آپ مزے دار تلتے ہیں۔"
وہ ٹھنکی۔
"مکھن نہ لگاؤ سمجھیں۔"
"نہیں جناب ہم نے اور بھیا نے اپنا مقصد پالیا ہے۔ صرف آپ ناکام رہے ہیں اس لئے آپ پہ فائن ہوگا مچھلی تلنے کی شکل میں۔"
وہ ہیٹ اوپر کرتی ہوئی شوخی سے بولی۔

تب ہی تینوں نے مل کر مچھلی تلی اور ریت پر سفید اور کالا قالین بچھا کر بیٹھ گئے۔
مگر پہلا ہی مچھلی کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے وہ دہل گئی۔ ابو جانی اور بھیا جانی کے کندھوں کے درمیان کافی فاصلے پر کھڑا اس روز والا شخص اسے بری طرح گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیا نہ تھا نفرت، انتقام، غصہ اور جانے کیا کیا۔۔
اس نے ٹکڑا واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور گھبرا کر پانی کا گلاس اٹھا لیا۔
"کیا ہوا بیٹی؟" ابو جانی چونکے۔
"کچھ نہیں۔ لقمہ اٹک گیا تھا۔"
وہ زبردستی مسکراتی ہوئی بمشکل بولی۔
پانی پیتے ہوئے پھر اس نے دیکھا وہ اسی حالت میں کھڑا تھا۔ براؤن جینز اور سفید شرٹ میں وہ غصہ چہرے پہ لئے ہوئے کتنا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف کے ساتھ ساتھ اس کی ہینڈسم پرسنالٹی بھی اتر گئی۔ تب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک طرف نکل گیا اور ناز کے زرد چہرے پر اطمینان چھلک پڑا۔
"اُف کتنی بولتی آنکھیں ہیں۔"
گھر آکر جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو سب سے پہلا یہی خیال ذہن میں کوندا
وہ آتش دان میں آگ جلاتی ہوئی کپڑے بدلنے چلی گئی پھر آتش دان کے قریب اپنی چیئر پر وہ نٹنگ لے کر بیٹھ گئی۔ اسے سردیوں میں آتش دان کے قریب بیٹھ کر بنائی کرنا بڑا اچھا لگا کرتا۔ یہی اس کی سردیوں کی مصروفیات ہوا کرتیں۔ اپنے بھیا اور ابو جانی کے سوئیٹر وہ خود بنتی تھی اور اس کے علاوہ ملنے والوں کی آفر بھی وہ اس سلسلے میں بہت جلد قبول کرلیا کرتی۔
اس وقت وہ بھیا جانی کا سوئٹر بن رہی تھی۔ نمونہ بہت آسان تھا اس لئے ذہن اس میں الجھنے کے بجائے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس اجنبی شخص، اجنبی دشمن کے بارے میں۔ آتش دان میں کوئلے پوری آب و تاب سے دہک رہے تھے۔

○

ناز جب پیدا ہوئی تو آصفہ بیگم نے زندگی سے روٹھ کر موت کو گلے لگا لیا۔ ناز جیسی ہستیوں پر ہمیشہ معاشرہ منحوس کا لیبل چسپاں کرتا ہے کیونکہ ان کی زندگی کسی کی موت کا سبب سمجھی جاتی ہے۔ اس کی پھوپھی نے جب اسے منحوس کہا۔۔۔ تو

Waqar Azeem pakistanipoint.com

احسن صاحب نے تڑپ کر اسے سینے میں چھپا لیا تب وہ حیران رہ گئیں۔ وہ تو سمجھی تھیں کہ بیوی کو اتنا چاہنے والا اس کا بھائی بیوی کی موت کا ذمہ دار بیٹی کو ٹھہراتے ہوئے اُس سے نفرت سے منہ موڑ لے گا۔ مگر احسن صاحب نے اس معصوم کلی کو اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔ احسن صاحب جو آصفہ بیگم کو دیوانہ وار چاہتے تھے عین ممکن تھا ان کی موت کا ذمہ دار ناز کو سمجھ بیٹھتے اور لوگوں کی طرح اسے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے مگر انھوں نے ناز کی پرورش نازک پھول کی طرح کی کہ گرم ہواؤں کی جرأت نہ تھی کہ... اس پھول کو مرجھائیں تیز ہواؤں کو اجازت نہ تھی کہ اس کے قریب سے گزر جائیں کہ کہیں وہ اس نازک پھول کی پنکھڑیوں کو منتشر نہ کر دیں۔

اب وہ بھائی اور باپ کے لیے ایک خوبصورت سا کھلونا تھی جس کو دیکھ کر وہ دونوں بچوں کی طرح خوش ہوتے۔

احسن صاحب بنیادی طور پر ایک روایت پسند ذہن رکھتے تھے مگر بیٹی کی ناز برداریوں میں وہ ان کو اپنی طبیعت پر جبر کر کے زبردست طریقے سے نظر انداز کرتے آرہے تھے ناز کو فشنگ، رائیڈنگ اور شکار کھیلنے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور وہ ان میں بڑی ماہر تھی۔ حالانکہ یہ سب انھیں پسند نہ تھا مگر بیٹی کی خوشی سے مجبور تھے۔ فراز بہن کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

ناز نے بی۔ اے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ جن دنوں اس نے بی۔ اے پاس کیا تھا ان ہی دنوں احسن صاحب ریٹائر ہو گئے تھے۔

ناز کا دل تو بہت چاہتا تھا کہ وہ یونیورسٹی جوائن کرے مگر باپ کی تنہائی کے خیال سے وہ ایسا نہ کر سکی۔ کیونکہ فراز آفس چلا جاتا اور وہ یونیورسٹی تو احسن صاحب بالکل تنہا رہ جاتے اور یہ ناز کو گوارا نہ تھا کہ اس کے دکھی سے ابو تنہائیوں سے گھبرا جائیں۔ اسلئے اب ناز چاہتی تھی کہ بھیا کی شادی کر دی جائے۔ تاکہ بھابی کے دم سے زندگی کچھ پُر رونق ہو جائے۔ وہ مسلسل کئی کئی روز تک باپ اور بھائی کے پیچھے پڑی رہی کہ بھیا کی شادی کر دی جائے۔

"ابو، یہ اس لیے چاہتی ہے کہ پھر اس کا جلدی سے نمبر آجائے۔"

بھیا چھیڑتے تو وہ روٹھ جاتی۔

پھر واقعی ابو جانی نے بھیا جانی کی منگنی کر دی۔ لڑکی ابو کی پسند تھی اور اس سلسلے میں انھوں نے بھیا کی ذرا بھی رائے نہ لی۔ اس معاملے کو انھوں نے خالصتاً اپنا ہی معاملہ سمجھا جس سے بھیا خاصے خائف اور خوف زدہ تھے مگر زیب کی ایک جھلک نے ان کے سارے وسوسے ختم کر دیے۔ وہ ابو کی پسند کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

وہ تینوں چھٹی کا دن بڑی خوبصورتی سے منایا کرتے تھے کبھی شکار، کبھی رائیڈنگ اور فشنگ اور کبھی کبھی کوئی فنکشن کر ڈالتے یہ تینوں دکھی سے لوگ اپنے دکھ اس طرح کم اور دور کرتے۔

اس روز بھی ناز اپنے بھائی اور باپ کے ساتھ شکار کے لئے آئی تھی جب اُس اجنبی سے سامنا ہوا تھا۔ غصے میں وہ جو حرکت کر بیٹھی تھی۔ اس کا افسوس اُسے آج تک تھا۔ کیونکہ اس کا ہاتھ بالکل ایک بے قصور پر اٹھ گیا تھا۔ اور آج پھر اس کا سامنا ہوا تو اس کا افسوس خوف میں بدل گیا تھا کیونکہ اس اجنبی کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے غم و غصے اور انتقام و نفرت کے شعلے اُسے بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ کہ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔

افوہ سوچوں میں وہ نمونے کی کتنی سلائیاں غلط بُن گئی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر سلائیاں ٹوکری میں رکھیں اور لائٹ آف کر کے اندھیرے میں کھو گئی۔

نہانے کے بعد وہ اپنے لانبے لانبے بال تولیے سے خشک کرتی ہوئی برآمدے میں بچھی ہوئی کرسیوں کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ پھر چلتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ سورج کی تیز کرنیں اس کے بالوں پر پڑنے لگیں۔ بالوں سے گرنے والے قطرے دھیرے دھیرے سیڑھیوں کو تر کرنے لگے۔ دونوں ہاتھوں سے گلے میں پڑے گلابی تولیے کو پکڑے وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ ابو جانی صبح ہی چند دوستوں کے ساتھ شکار کے لیے چوڑے پروگرام پر چلے گئے تھے جو ایک ہفتے سے کم نہیں تھا۔ بھیا ابھی تک آفس سے نہیں لوٹے تھے۔ گھر میں آج وہ بالکل تنہا تھی۔ بال قدرے خشک ہوئے تو وہ اٹھ کر اندر جانے کا سوچ رہی تھی کہ بھیا آگئے

"لو بھئی ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔"

وہ کرسی پر تقریباً گرتے ہوئے بولے

"کیا ہوا؟" وہ گھبرا سی گئی۔

"کچھ نہیں ہوا۔" وہ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو کر بولے۔

Waqar Azeem pakistanipoint.com

"نہیں" وہ بولی۔

"بھئی مجھے آج شام دفتر کے کام سے کراچی جانا ہے۔"

"تب بھیا ہمیشہ کی طرح ہفتہ لگ جائے گا۔"

وہ سوچتی ہوئی بولی

"ہاں"

"ابو جانی بھی نہیں اور پھر آپ بھی نہ ہوں گے۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کیا کیا جائے؟"

وہ موزے اتارتے ہوئے بولے۔

"اس کا ایک حل ہے تمہیں تمہاری سہیلی روبی کے ہاں چھوڑتا جاؤں۔"

"ٹھیک ہے وہ بھی کب سے کہہ رہی ہے آنے کو۔"

وہ بھیا کے موزے اٹھاتے ہوئے اندر چلی گئی۔

"اور سنو چائے پلا دو۔" انھوں نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

O

"سنو ناز رائیڈنگ کے لئے چلیں۔"

اچانک روبی رسالہ ایک طرف پھینک کر کھڑی ہوگئی۔

تب ممی آگئیں۔

"نہیں۔ تم نے اس سرد موسم میں ایسی حماقت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ کافی کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

تو روبی خاموش ہوگئی۔

"میں ذرا مسز حامد کی طرف جا رہی ہوں، تم دونوں آرام کرو۔"

ممی کافی کی خالی پیالی رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

تو وہ بھی اچھل کر کھڑی ہوگئیں۔

"چل یار ہو جائے ایک زوردار مقابلہ۔"

روبی چہک کر بولی۔

"ٹھیک ہے۔" ناز بھی مسکرائی۔

دونوں لباس تبدیل کر کے گھوڑے لے کر نکل پڑیں۔

روبی اور ناز بہت سالوں تک اکٹھی پڑھتی رہی تھیں۔

دونوں میں بہنوں کا سا پیار تھا مگر بھیا جانی کی پوسٹنگ دوسرے شہر میں ہو جانے کی وجہ سے برسوں کا ساتھ چھوٹ گیا گو کہ یہ شہر زیادہ دور نہ تھا۔ صرف دو گھنٹے کا فاصلہ تھا مگر پہلے جیسی ہر روز کی ملاقات نہ رہی تھی۔ ہفتوں بعد وہ ایک دوسرے کو دیکھ پاتی تھیں۔

ایک ہفتے کے لئے وہ روبی کے پاس آئی تو انھوں نے بڑے بڑے پروگرام بنا ڈالے۔

روبی ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔

جو ایک آزاد ماحول کی پیداوار تھی۔

بے حد خوبصورت ہونے کے باوجود غرور نام کی کوئی چیز اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔

ابھی وہ تھوڑی دور نہ جا پائی تھیں کہ ملازم نے کسی کا فون آنے کی اطلاع دی۔

"تم خود سن لو۔" روبی دور سے ہی چلائی۔

"عدنان صاحب کا فون ہے جی۔"

تب وہ مڑی اور گھوڑا دوڑاتی ہوئی گیٹ میں گھس گئی۔ ناز مسکراتی ہوئی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی چلی گئی۔ بار بار وہ مڑ کر دیکھ لیتی۔

"آیا روبی آئی کہ نہیں؟"

تب وہ کافی آگے نکل آئی۔

ہوا کے سرد جھونکے اس کے کانوں میں گھسے چلے آرہے تھے۔ شام کے سائے لمبے ہوگئے تھے۔ بادلوں کے لحاف میں سورج منہ چھپائے چلا جا رہا تھا۔

تب ہی اس نے گھوڑے کی طنابیں کھینچ کر اسے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔

پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ بڑے خوش رنگ پھول اس شام کی سرد ہوا کے سنگ لہرا رہے تھے۔

کیکر کے اونچے درخت کے نیچے وہ کھڑی تھی جس کے سہارے کاسنی پھولوں والی جنگلی بیل ہولے ہولے ہوا کے جھونکوں سے لرزتی ہوئی اپنے ننھے ننھے پھول فضا میں لٹا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پھولوں کا گچھا توڑنا چاہا مگر پھولوں پر ہی اس کا ہاتھ کانپ گیا۔

سامنے ہی تو وہ آرہا تھا اجنبی....

اس کا سفید گھوڑا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جس پر وہ اپنی تمام وجاہت سمیت بیٹھا تھا۔

اس نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ تب ہی اس کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی تھی اور آنکھیں مارے نفرت کے سکڑ رہی تھیں۔ وہ اس کے روبرو آکر کھڑا ہوگیا۔

اس نے تیز نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

لانبے لانبے بالوں کو دو حصوں میں بانٹ کر اسفنج کانوں کے قریب سے ربڑ سے کس کر آزاد چھوڑ دیا گیا تھا جو اس کے سینے پر منتشر ہوکر ادھر ادھر پڑے تھے۔ شربتی آنکھیں کچھ نادم نادم کچھ

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

سہمی سہمی سی تھیں۔ سرخ جینز اور سیاہ شرٹ اور سیاہ دستانے پہنے وہ ہمیشہ کی طرح دلفریب اور انوکھا انداز لیے دل میں اترے جا رہی تھی۔

مگر وہ جلد ہی سنبھل گیا۔

تب اس نے اپنے گھوڑے کی طنابیں بالکل اس کے قریب لاکر غصے کی وجہ سے سختی سے کھینچ لیں۔ وہ اتنے قریب تھے کہ کندھے سے کندھا ٹکرا گیا۔

ناز کی حالت اس وقت بے جان بت کی مانند تھی جو حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی مگر خوف زیادہ مسلط تھا۔

"آپ مجھے اچھی طرح پہچان گئی ہوں گی؟"

وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔

جب ہی اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا ایک لمحے کو، اور پھر دوبارہ سیدھی ہو گئی۔

"آپ نے جواب نہیں دیا؟" وہ طنزیہ بولا۔

"میں فضول لوگوں کی باتوں کا جواب نہیں دیتی۔"

وہ ابرو چڑھا کر نفرت سے بولی۔ جانے اس میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی یہ بات کہنے کی۔ تب ہی اس کے جواب سے وہ پورے کا پورا کھول گیا۔ ہتک پہ ہتک اس بالشت بھر کی لڑکی کے ہاتھوں سے ہو رہی تھی۔

"فضول لوگ!" وہ ہنسا زہریلی ہنسی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے گھوڑے کی لگام تھام لی تو وہ گھبرا اٹھی۔ تب وہ لگام کھینچتا چلا گیا۔

گھوڑا ہنہناتے ہوئے اگلے دو پاؤں اٹھا کر پورے کا پورا کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں رکابوں سے کھسکے اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی نیچے گھاس پر آ رہی۔

تب وہ نفرت سے بولا۔

"یہ جواب اس تھپڑ کا نہیں بلکہ اس بات کا ہے جو تم نے ابھی کہی ہے۔ تھپڑ کا جواب تو بہت بھیانک ہو گا مس۔"

وہ دانت پیس کر بولا اور اسے اسی حالت میں چھوڑ کر گھوڑے کو ایڑ لگا کر گرد اڑاتا ہوا بہت دور چلا گیا۔

کچھ دیر وہ حیران و پریشان پڑی رہی۔ بازو پہ کچھ درد سا محسوس ہو رہا تھا وہ اٹھی اور پھر گھوڑے پر سر رکھ کر بے اختیار ہو کر رو دی۔ اپنی بے بسی پر اس کی سسکیاں ہواؤں میں گونج اٹھیں

○

وسیع و عریض ہال مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ آنے والے مہمان اپنی پسند کے مشروب بڑی کثرت سے استعمال کر رہے تھے۔

ناز بھی اپنے من پسند ایپل جوس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے آنے والے مہمانوں کو دیکھ رہی تھی۔

آج روبی کے خالہ زاد عمر بھائی کی برتھ ڈے پارٹی تھی جس میں وہ روبی کے تمام گھر والوں کے ساتھ شریک تھی۔ روبی اس وقت مہمانوں میں الجھی ہوئی تھی۔

کیک کاٹا جا چکا تھا۔ وہ ایک طرف بیٹھی ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ تب ہی اس کی نظر ایک جگہ ٹک کر رہ گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ صوفے کی بیک چھوڑ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہی عمر بھائی اور روبی سے باتیں کر رہا تھا۔ سیاہ سوٹ میں وہ بڑا ہینڈسم لگ رہا تھا۔

اس سے پہلے بھی وہ تمام مہمانوں کا جائزہ بڑی اچھی طرح لے چکی تھی۔ غالباً وہ ابھی آیا تھا جب ہی اسے ابھی نظر آیا تھا۔

گلابی ساڑھی میں ابھی اس کے عارض دہک رہے تھے اب زرد پڑ گئے تھے۔ وہ اٹھی اور باہر کی طرف لپکی۔ جب ہی روبی نے اسے پکڑ لیا۔

"ادھر آؤ ناز۔ تمہیں ایک خاص الخاص شخصیت سے ملواؤں۔"

وہ مسکرائی تو وہ سمجھ گئی کہ وہ خاص شخصیت کون ہو سکتی ہے۔

"پھر کبھی مل لوں گی۔ میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ یہاں میری طبیعت گھبرا رہی ہے۔"

"پھر کبھی شاید موقع نہ ملے۔ ویسے تم جانتی ہو گی اسے، تمہارے ہی شہر کی معروف شخصیت ہے۔"

"میں کسی کو نہیں جانتی۔ مجھے جانے دو بلکہ میں ڈرائیور کو لے کر گھر جا رہی ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

اس نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

تب ہی روبی اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر گھبرا گئی۔

"واقعی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔"

"نہیں اب حالت اتنی بھی نازک نہیں۔"

وہ زبردستی مسکرائی۔

"اچھا پھر تم چلو۔ جاتے ہی کوئی اچھی سی ٹیبلٹ لے لینا ہم سب بھی جلد ہی پہنچ جائیں گے۔"

وہ اس کا ہاتھ تھپتھپا کر بولی۔

تب ہی باہر نکلتے ہوئے اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ عمر بھائی کے قریب کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ الجھی ہوئی نظروں سے۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

اور کچھ عجیب نظروں سے ....
وہ تیزی سے مڑی اور باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آکر وہ بستر پر یوں گر گئی جیسے برسوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔ کچھ دیر جانے کیا سوچتی رہی پھر آنکھیں جھلملا گئیں۔ تب وہ تکیے پر سر رکھ کر بے اختیار رو دی۔

"اوہ! وہ کس مشکل میں گرفتار ہو گئی ہے جس نے اس کا چین درہم برہم کر دیا ہے۔ وہ اجنبی ہر موڑ پر اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ تب اس کی روح تک کانپ جاتی ہے۔ اس کی بولتی آنکھیں اُسے خوفزدہ کر دیتی ہیں۔ نہ جانے کب اس کا انتقام کس شکل میں سامنے آجائے۔

اُف نہ جانے کونسا طریقۂ انتقام وہ اپنائے!

وہ اس کی جوابی کاروائی کی منتظر تھی۔

یہ انتظار بڑا جان لیوا تھا۔ وہ پُرسکون ہونا چاہتی تھی اپنی غلطی کی سزا پانے کے بعد۔

"وہ مجھے کسی حال میں نہیں چھوڑے گا" یہ اس کی سوچ کا فیصلہ تھا۔

کچھ دیر رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے اُٹھ کر لباس تبدیل کیا۔ جب ہی روبی آگئی۔

"کیا حال ہے ناز؟" وہ تشویش سے بولی۔

"ٹھیک ہے" اس نے جھکی جھکی پلکیں اٹھائیں تو وہ اس کی آنکھیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ارے تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں!"

"سر میں درد جو ہو رہا ہے" وہ اصل بات چھپا گئی۔

"لاؤ میں تمہارا سر دبا دوں" وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی اور اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

"روبی۔ تم کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں؟" تھوڑی دیر بعد وہ دھیرے سے بولی۔

"تمہیں یہ خیال کیونکر آیا؟" وہ چونکی۔

"میں تمہارے اس خاص الخاص مہمان سے ملی جو نہ تھی!"

"اوہ! تم مسٹر جانی کی بات کر رہی ہو"

"تو اس کا نام جانی ہے؟"

"ہاں... تمام لوگ اُسے یہی کہتے ہیں" وہ رسان سے بولی۔ عمر بھائی کے ساتھ لندن میں پڑھا کرتا تھا" انھوں نے اس کا غائبانہ تعارف کرایا تھا آج مل بھی لیا۔

"بڑی پُرکشش شخصیت ہے مگر بہت بگڑا ہوا رئیس زادہ ہے"

وہ اس کے ساتھ لیٹ گئی۔

"اور کیا کوالیفیکیشن ہے جناب کی؟"

وہ دل میں تجسس چھپائے بظاہر لاپرواہی سے بولی۔

"دیکھنے میں پُروقار مگر حقیقت میں بڑا رنگین مزاج اور اوباش قسم کا ہے"

وہ اپنے ناخنوں کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔

"یہ بڑی جائیداد کا تنہا وارث"

اس نے بازو پھیلائے۔

"ہاں ایسے لوگ ہمیشہ بُری کمپنی کا شکار ہوتے ہیں"

وہ بولی تو بے نیازی سے تھی مگر دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس لئے کہ اس شخصیت پر پڑا پردہ پوری طرح ہٹتا چلا جا رہا تھا۔

جو اس نے اس کے بارے میں سوچا تھا وہ بالکل صحیح ثابت ہو رہا تھا۔

ایسا شخص بڑا خطرناک ہو سکتا تھا۔

تب ہی ہارن بج اٹھا۔ روبی نے کھڑکی کے کرٹینز اُٹھا کر دیکھا۔

"ناز فراز بھائی" وہ خوشی سے چیخی۔

"نہیں ابھی تو ان کے آنے میں دو دن باقی ہیں۔

اُسے یقین نہیں آیا۔ تب بھیا کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور لپک کر ان کے سینے سے جا لگی۔

اور آنسو روانی سے گالوں پر بہہ گئے۔ اس سیلاب کو جو پہلے ہی بہنے کے لئے بے قرار تھا ایک بہانہ مل گیا۔ اور اس طرح جانی کے بارے میں مزید معلومات اور باتیں بیچ میں رہ گئیں اور وہ بھیا کے ساتھ اپنے شہر واپس آگئی۔

اُس شام عجیب سی بات ہو گئی جس سے وہ کئی روز پریشان رہی۔ ہوا یوں کہ وہ عظمیٰ سے مل کر گھر آرہی تھی جب اس کی گاڑی کالج روڈ پر آئی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے آنے والی سفید گاڑی مسلسل اسکے پیچھے آرہی ہے۔ وہ آزمانے کو ایک دو موڑ مڑی تب اسے یقین ہو گیا کہ وہ گاڑی واقعی اس کے تعاقب میں ہے اس نے گھبرا کر گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اس وقت تک اُس نے مُڑ کر نہ دیکھا جب تک اس کی گاڑی گھر کے گیٹ تک نہ پہنچ گئی۔ وہ گاڑی کو گیٹ سے باہر ہی روک کر نیچے اُتر آئی۔

اس نے دیکھا وہ گاڑی بھی اس سے کچھ فاصلے پر رُک گئی ہے۔ تب وہ بُری طرح چونکی۔ گاڑی میں وہی تھا جس نے اس

Waqar Azeem Pakistanipoint.Com

کا سکھ چین چھین لیا تھا... خلاف معمول آج اس کا چہرہ کسی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ تب وہ غصے سے چیخ اُٹھی۔

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں مسٹر؟"

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔" عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر رینگ گئی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ تڑخ سے بولی۔

"تو پھر جان جاؤ گی۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا بولا۔ اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ کچھ دیر ساکن سی کھڑی رہ گئی۔

"اُف اس نے تو میرا گھر بھی دیکھ لیا۔" تب اس کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

ڈرائنگ روم میں کچھ خواتین مہمان بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ چائے لیکر یونہی اندر گئی۔ وہ اس آسمانی شلوار سوٹ اور لانبی سی چوٹی والی پیاری سی لڑکی کو دیکھتی رہ گئیں۔

"ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔"

مسز علی، احسن صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

"یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

وہ ناز کو اپنے قریب بٹھا کر اس کی پشت پیار سے سہلانے لگیں۔

تب ابو جانی نے اس سے ان خواتین کا تعارف کرایا۔ مسز علی کے ساتھ ان کی بڑی بیٹی آمنہ اور دو چھوٹی بیٹیاں فائزہ اور مائرہ تھیں۔ لڑکیوں کو بھی ناز بے حد پسند آئی۔ وہ سارا وقت اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں اور جب جاتے جاتے مسز علی ناز کو اپنے ساتھ لپٹا کر ابو سے بولیں کہ

"بھائی صاحب، یہ بچی ہماری ہے اب۔"

تو اس کا دل بری طرح دھڑک اُٹھا۔ اس نے ابو کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس خاتون سے مشکل سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے اور پھر واقعی ابو جانی نے مسز علی کی طرف سے آنے والا پیغام منظور کر لیا۔ بھیا کی طرح یہ معاملہ بھی ابو جانی کا اپنا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس کی بھی کوئی رائے نہیں لی۔ اس کی حالت بھی اندر ہی اندر بھیا جانی کی طرح تھی۔ اور پھر ایک شام ایک چھوٹی سی تقریب میں مسز علی اسے اپنے بیٹے کے نام کی انگوٹھی پہنا کر اسے کسی کی امانت بنا گئیں۔ اس شام جانے کیوں اس کا دل دُکھوں سے بھر گیا

ابو جانی کی جدائی کا خیال...

بھیا جانی سے دوری کا خیال

یا پھر

کسی اور کا احساس...

جیسے وہ اندر ہی اندر ایک خوف کے باوجود ایک خدشے کے ساتھ چاہے چلی آ رہی تھی۔ وہ اجنبی سا چہرہ بار بار خیالات میں آ کر اسے پریشان کر رہا تھا۔

اور وہ اپنے دل کو سمجھا رہی تھی کہ اب کسی غیر کا خیال گناہ ہے۔ جبکہ وہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔

یہ خیانت ہے کسی کی امانت میں...

مگر دل کب کسی کی سنتا ہے؟

اس کا دل تو کسی اور کا نام لے رہا تھا۔

دل کے مندر میں تو کوئی کب سے دبے پاؤں داخل ہو چکا تھا جس کی اُسے آج خبر ہوئی تھی۔

اس کے دل کا مندر تو کسی کے دبے پاؤں کی آہٹ سے ہوئے گونج رہا تھا۔

دل کے چمکتے اور صاف شفاف فرش پر کسی اور کا عکس جھلملا رہا تھا۔

"نہیں۔ مجھے اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔"

اس نے خود کو ملامت کی اور پھر اس کی شربتی آنکھیں ڈھیروں آنسوؤں سے جھلملا اُٹھیں۔

شب و روز کی رفتار بڑی دھیمی اور سست تھی۔

مائرہ اس سے ملنے اکثر چلی آتی جو حارث کی سب سے چھوٹی اور بن بیاہی بہن تھی۔

مائرہ ڈھیروں باتیں اس سے کرتی۔ کبھی اپنے بارے میں، کبھی اس کے متعلق، کبھی کبھار حارث کے بارے میں۔ جو اچانک منگنی سے دو روز پہلے کاروباری سلسلے میں جاپان چلے گئے تھے جن کو ابو جانی اور بھیا جانی مجبوری کے تحت ایئر پورٹ سی آف کرنے گئے تو وہیں منگنی کی انگوٹھی پہنا آئے تھے اور اُن کے جانے کے بعد ان کے گھر والوں نے اسے پہنائی تھی۔

شب و روز کے ان چکروں میں اُسے وہ اجنبی بہت یاد آتا رہا جس سے سامنا ہوئے ڈھیروں روز گزر گئے تھے۔ ورنہ پہلے چند دنوں میں چار مرتبہ ان دونوں کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔

وہ سوچتی۔

شاید اس نے اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا ہے۔

یا پھر کہیں اور چلا گیا ہے۔

Wadar Azeem
Pakistanipoint.com

ان دنوں پھوپھی جان بھی آگئیں جو اس کی منگنی کا سُن کر ذرا بھی خوش نہ ہوئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہنے لگیں کہ

"تو بھیا کونسی اتنی عمر ہو گئی تھی بچی کی۔"

"دراصل آپا ان لوگوں کا اصرار اتنا بڑھ گیا تھا کہ میں بے بس ہو گیا۔"

پھر ابو جانی بولے

"آخر ایک روز کرنا ہی تھا آپا۔"

"کسی روز بلوا یئے گھر پہ میں مل کر دیکھوں کیسا ہے لڑکا۔"

وہ تجسس سے بولیں۔

"وہ تو منگنی سے پہلے ہی جاپان چلا گیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔ شاید سیر و تفریح کے لیے رُک گیا ہو۔"

ابو جانی چشمہ اتارتے ہوئے مسکرائے

"منگنی سے پہلے!"

پھوپھی جان حیرانگی سے بولیں۔

"میں نے تو کہا تھا ان لوگوں سے کہ منگنی کی رسم اس کی واپسی پر ہو جائے گی مگر وہ مانے نہیں بلکہ کہنے لگے

"اچھے رشتوں میں کسی قسم کی تاخیر بہتر نہیں ہوتی۔"

"پھر آپا رسم تو بزرگوں نے پوری کرنی تھی۔ بچوں کے موجود ہونے یا نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔"

وہ لاپرواہی سے بولے۔

"بھیا خیر سے میرا فرحان ایک دو ماہ میں واپس آ رہا ہے میں نے تو سوچا تھا کہ گھر کی لڑکی گھر میں ہی رہ جاتی۔ خیر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔"

وہ سرد آہ بھر کر بولیں۔

"حارث بھی بہت اچھا لڑکا ہے آپا۔"

ابو کی آنکھوں میں شفقت اُمنڈ آئی

تب ہی حارث کے نام پر وہ وہاں سے کھسک گئی۔

تب واپسی پر وہ پھوپھی جان کے ساتھ مری چلی گئی۔

○

مری وہ اکثر آتی رہتی تھی۔ یہاں بھی اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں جن میں فرح اس کی سب سے گہری دوست تھی۔ بالکل بہنوں جیسی محبت تھی دونوں میں۔

اس روز موسم بڑا خوبصورت تھا۔ پچھلی رات بہت سخت برفباری ہوئی تھی جس کی وجہ سے ہر سو برف کا آنچل ڈھلک آیا تھا۔

دوپہر تک ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔ پھر بادل آسمان پر اُمڈ آئے تو خوبصورت مری اور بھی دلفریب لگنے لگی۔ تب تانیہ نے فرح کے ہاں جانے کا سوچا وہ تیار ہو کر پھوپھی جان کے کمرے میں چلی آئی

"پھوپھی جان میں ذرا فرح کے پاس جا رہی ہوں۔"

"اچھا۔"

"مگر سنو۔ اگر موسم زیادہ خراب ہو گیا تو؟"

"تو پھوپھی جان میں رات فرح کے پاس رہ جاؤں گی۔"

وہ مسکرائی۔

"دیکھو زیادہ گھومنا پھرنا مت سردی لگ جائے گی۔"

وہ کمبل ٹھیک سے اپنے اردگرد لپیٹتے ہوئے پھر بولیں۔

کتنی دیر تک وہ اور فرح باتیں کرتی رہیں۔ ہوش تب آیا جب شام جھک آئی تھی۔

"اچھا فرح میں اب چلوں کافی دیر ہو گئی ہے۔" تب فرح کے گھر سے نکلتے نکلتے شام بہت گہری ہو گئی۔ فرح نے بہت چاہا کہ وہ رُک جائے مگر وہ نہ رُکی۔ ابھی اُسے بہت سا فاصلہ طے کرنا تھا۔ مگر ٹپ ٹپ بوندیں برسنے لگیں تو وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ بھاگ کر ایک مکان کے برآمدے میں پناہ لی۔ تقریباً پندرہ منٹ تک بوندیں گرتی رہیں۔ تب تک شام نے بادلوں کی وجہ سے اندھیری رات کا روپ دھار لیا۔ بارش رُکی تو وہ پھر چل پڑی۔ سردی بہت ہو گئی تھی۔ وہ لمبے کوٹ کے کالروں میں منہ چھپائے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ کافی دور چل کر اسے احساس ہوا کہ وہ غلط موڑ مڑ کر بہت آگے تک آ گئی ہے۔ اس نے واپس جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ بادل اور بجلی کے شور سے دہل گئی۔ مدھم مدھم بوندوں نے تیز طوفانی بارش کا زور پکڑ لیا وہ بُری طرح سے گھبرا گئی اور پھر تیزی سے ایک کاٹیج کے ڈھلانی چھت والے برآمدے میں آ گئی جو تینوں اطراف سے خوبصورت بیل سے ڈھکا ہوا تھا۔ باہر اندھیرا گہرا ہو گیا تھا جو کبھی کبھی بجلی کی تیز چمک کے ساتھ جل سا اُٹھتا۔ اس برآمدے میں آ کر اسے کچھ سکون ملا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ کاٹیج اندھیرے میں ڈوبا پڑا تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ خالی ہے۔ اُف اگر بارش زیادہ تیز ہو گئی تو وہ کدھر جائے گی اور پھر راستے سے بھی بھٹک گئی ہے۔ طرح طرح کے خیالات اسے پریشان کر رہے تھے۔

اُف میں فرح کے گھر رُک جاتی تو یہ مصیبت پڑتی۔ اللہ جانے کب بارش رُکے یا نہ رُکے۔ تب تمام رات اس برآمدے میں گزارنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔

گھبراہٹ اور خوف و رنج کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ اُبل پڑا۔

Wadi Azeem
Pakistanipoint.com

تقریباً دو گھنٹے ہو گئے تھے اسے اس برآمدے میں کھڑے مگر بارش ایک گھرے تواتر کے ساتھ برس رہی تھی۔ سردی اور کھڑے رہنے کی وجہ سے ٹانگیں سُن ہو رہی تھیں اور دل تھا کہ ڈوبے چلا جا رہا تھا۔ جب تیز آندھی بھی بارش کے ساتھ چلنے لگی تو تیز بوچھاڑ اس کو بھگونے لگی۔ دور کہیں بجلی زور سے کڑکی تو وہ خوف سے چیخ پڑی۔ تب ہی کاٹیج کے اندر روشنی جل اٹھی اور پھر برآمدے کا دروازہ ایک تیز روشنی کی لکیر کے ساتھ کھُل گیا۔ یوں ایک دم روشنی کا جل اُٹھنا نازکو پراسرار لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پیچھے دیکھا۔ کمرے کے دروازے پر کوئی کھڑا تھا اور جس کو ایک نظر میں پہچان کر اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ وہ آگے بڑھا اور اسے بازو سے کھینچتے ہوئے روشنی میں لے آیا۔

"چھوڑ دیجئے مجھے۔" وہ اس سے بازو چھڑا کر برآمدے سے باہر بھاگنے لگی۔ دل آنے والے لمحوں سے بری طرح گھبرا گیا۔ مگر اس نے اسی تیزی سے اسے پھر پکڑ لیا۔

"پاگل مت بنو۔ بھیگ جاؤ گی۔"

وہ اسے پکڑے پکڑے دروازے تک لے آیا۔

"نہیں مجھے جانے دیں۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دیں۔"

وہ بُری طرح سسک پڑی اور ہاتھوں سے منہ چھپالیا

"چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔"

کھردری آواز اس کا دل اور زیادہ دھڑکا گئی۔

وہ اسے کھینچتے ہوئے اندر کمرے میں لے گیا۔

"بیٹھ جائیے۔" آتش دان کے قریب بچھی ہوئی ایزی چیئر کے پاس آکر وہ بولا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر دبی دبی سسکیاں لینے لگی۔ وہ کس قدر بے بس تھی اس احساس کے ساتھ ہی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ باہر کھڑی رہنے کی وجہ سے موسم کی دہشت اس پر طاری تھی اور کچھ اس شخص کی وجہ سے خوف زدہ تھی۔ "یہ شخص اب کسی بھی لمحے اپنی توہین کا بدلہ لے سکتا ہے۔"

جانے اس کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہو۔ اب جبکہ اس کو یہ اختیار حاصل ہے یہ احساس ہی اسے مارے دے رہا تھا۔ روتے روتے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ آتش دان سلگانے میں مصروف تھا۔ براؤن نائٹ گاؤن کے ساتھ الجھے الجھے کالے بال اور خمار آلود آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ لمبی نیند کے بعد بیدار ہوا ہے۔

بہت سارا رونے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ آنسو صاف کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے سامنے دیکھا۔ وہ سامنے والی چیئر پہ سنجیدہ صورت لئے بیٹھا تھا۔ اور اسی کو دیکھ رہا تھا والہانہ نظروں سے۔ تب ہی وہ بولا۔

"رو چکی ہوں تو یہ کوٹ اتار دیجئے۔ گیلا ہو گیا ہے۔"

"نہیں۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ اس نے تڑپ کر اسے دیکھا اور بے بسی سے بولی۔

"ٹھیک ہے مگر آئندہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ بیمار پڑ گئیں تو۔۔۔۔؟"

وہ اس کی اُڑی اُڑی رنگت کو دیکھ کر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہا تھا۔

"چلیئے۔ اتار دیتے اسے۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آنے لگا۔

"اچھا۔ اُتارتی ہوں۔" وہ جلدی سے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے گھبرا کر بولی۔ کوٹ اُتار کر اس نے کرسی کی پشت پر پھیلا دیا اور چھوٹے سے اسکارف سے سر ڈھانپ کر بیٹھ گئی۔

ہلکی گلابی سلکی شلوار اور وی نیک والی قمیض۔۔۔۔ میں وہ سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ سیاہ اسکارف چہرے کے گرد ہالہ کئے ہوئے تھا۔ پُشت پر لمبے لمبے بالوں کا آبشار گر رہا تھا۔ یہ سہمی سہمی سی لڑکی اُسے بڑی پیاری لگی۔ وہ اس کی طرف گہری گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تب ہی بوکھلا کر اس نے پوچھا۔

"ادھر آپ اکیلے رہتے ہیں؟" اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"جی ہاں۔" وہ دلفریب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"یا اللہ! تو ہی لاج رکھنے والا ہے۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں پھر برسات اتر آئی جب ہی پیچھے سے سفید کشمیری شال اس کے کندھوں پر اُس نے ڈال دی۔ شال لے ایک احساس ہونے لگا تحفظ کا احساس۔ اس کے ساتھ ہی دل پگھل کر آنکھوں سے بہنے لگا۔ وہ شال میں چہرہ چھپا کر ایک بار پھر رو دی۔

باہر خوفناک بادلوں کی گرج کے ساتھ بارش برس رہی تھی تیز مست ہوا بری طرح سے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا رہی تھی۔ بجلی کی تیز لپکتی چمک اندھیرے سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔

"لیجئے یہ کافی پی لیں۔" تھوڑی دیر بعد وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی۔

"نہیں۔ مجھے نہیں پینی کافی۔"

اس نے نمناک پلکیں چونک کر اُٹھائیں اور خوف زدہ

نظروں سے پیالی کی طرف دیکھا جیسے اس میں زہر ہو۔"

"پی لیجیے۔ اس میں کچھ نہیں۔"

اس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ اس نے سعادت مندی سے کافی تھام لی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ وہ بھی سامنے والی چیئر پہ کافی لے کر بیٹھ گیا۔ تب وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

"اس خطرناک موسم میں آخر آپ جا کہاں رہی تھیں؟"

اس نے اس طرح پوچھا جیسے وہ اس کے اس امر سے بہت نالاں ہو۔ تب اس نے آہستہ آہستہ تمام واقعہ سنایا۔

اچانک زور سے بادل گرجے اور اس کے ساتھ ہی لائٹ فیل ہو گئی۔ کمرے میں آتش دان میں جلنے والی آگ کی وجہ سے ملگجا سا اُجالا پھیل گیا۔ تب ناز اس افتاد پر دل ہی دل میں کانپ گئی

"اب کیا ہو گا؟" مارے خوف کی اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔" اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ چمک اُٹھی۔ اس نے اٹھ کر میز پر پڑے کینڈل اسٹینڈ میں لگی موم بتیاں روشن کیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گئی اور شیشے سے پرے اندھیرے میں جانے کیا تلاش کرنے لگی۔ گھبراہٹ اور خوف کے مارے پورا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"آپ بہت زیادہ خوف زدہ ہیں۔" وہ موم بتیاں جلا کر پلٹا اور اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"ن... نہیں تو۔" وہ ہکلا گئی۔

کچھ تامل کے بعد وہ بولا

"آپ کو وہ تھپڑ تو یاد ہو گا؟"

وہ گال سہلاتے ہوئے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ تب اس کا دل تیزی سے دھڑک کر سینے کی دیواریں توڑنے کو بے تاب ہونے لگا۔ سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھا جو بالکل قریب آ گیا تھا۔ تب اس نے بے بسی سے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

جب ہی شال پہ پڑے اس کے لمبے لمبے بالوں کو وہ ہاتھ میں لے کر مسکرایا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر اسے دیکھا۔

جس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور پھر یہ مسکراہٹ طنزیہ مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔

"گھبرائیے نہیں۔ میں یہ دیکھنے لگا تھا کہ آپ جیسی ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی کے یہ بال اصلی ہیں یا مصنوعی۔"

اس نے ناز کے بالوں کی ایک موٹی سی لٹ کو ہولے سے کھینچ کر چھوڑ دیا۔ کچھ دیر اسے گہری گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر ہٹ گیا اور وہ کھڑکی کے بند کواڑوں سے سر ٹکا کر آنسوؤں کی یلغار کے ساتھ سسک پڑی۔

پھر تھوڑی دیر بعد اسے اپنے شانوں پہ نرم نرم لمس کا احساس ہوا۔

"ناز!" پیار بھری سرگوشی اُبھری اور وہ تڑپ کر اور حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کا نام کیسے جانتا ہے؟

"بھئی اتنی حیران کیوں ہیں؟ روبی نے بتایا تھا آپ کا نام"

وہ آنکھوں کا سوال سمجھ کر صاف جھوٹ بول گیا اور وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی۔

"آیئے کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا جو سجی پڑی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں۔" اس نے شربتی آنکھیں اٹھائیں جو متورم ہو رہی تھیں۔

"اس وقت گیارہ بج رہے ہیں۔ یقیناً آپ نے دوپہر کا کھایا ہوا ہو گا میری طرح ....

"آیئے ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔" اس کے لہجے میں پیار گھل گیا اور آنکھوں میں والہانہ پن۔ وہ جلدی سے کھانے کی میز کی طرف بڑھ گئی اور وہ مسکرا کر رہ گیا

میز کے درمیان جلتی ہوئی موم بتیاں مدھم مدھم لو بر سا رہی تھیں جن کے سائے میں وہ خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔

ابھی انھوں نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ لائٹ جل اٹھی

یہ طوفان تو نہ تھمے گا آپ ساتھ والے بیڈ روم میں چلی جایئے۔ اور سکون سے سو جایئے۔ صبح آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آؤں گا"

کہہ تو وہ ٹھیک رہا تھا۔ وہ سہمے سہمے قدم اُٹھاتی کمرے میں چلی آئی۔ یہ کمرہ سارے کا سارا گلابی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیڈ کور، لحاف، قالین تک سب گلابی تھا۔ وہ ابھی کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ آ گیا۔

"دیکھیے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ....

دروازہ لاک کر کے اطمینان سے سو جایئے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے متانت سے بولا۔

"اچھا شب بخیر۔" وہ اس پر ایک خوبصورت سی نگاہ ڈال کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی اس نے لپک کر دروازہ اچھی طرح لاک کر لیا۔ باقی تمام دروازے بھی اس نے اچھی طرح چیک کیے اور بیڈ پہ آ گئی۔ وہ دیر تک جاگتی رہی۔ جب تک بارش اسی طرح

برستی رہی۔ ادھر وہ لیٹا ہوا اس کی خوف زدہ ۔۔۔۔۔۔ حرکتوں کو یاد کر کے دل ہی دل میں ہنستا رہا۔

شاید رات کا کوئی پہر تھا۔ اسے کوئی جگا رہا تھا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ کیسے ادھر آئے؟" وہ تقریباً خوف سے چیخ پڑی۔
کسی خدشے نے سر اٹھایا

"اٹھیے جناب صبح ہو گئی ہے۔" وہ شگفتہ لہجے میں بولا۔

تب اس نے چونک کر دیکھا۔ کھڑکی کے شیشے سے سحر کا اجالا چھن کر اندر آ رہا تھا۔ پھر اس نے حیرانگی سے کھلے دروازے کی طرف دیکھا جو اس نے رات بڑی اچھی طرح بند کیا تھا۔

وہ اس کی استفہامیہ نظروں کو سمجھ گیا۔

"میں نے کئی دفعہ آپ کا دروازہ بجایا مگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے کچھ تشویش ہوئی، اسی لئے مجھے مجبوراً اس دروازے کی دوسری چابی استعمال کرنی پڑی جو میرے پاس موجود تھی۔ شاید آپ بہت گہری نیند سو رہی تھیں۔" اس نے شرارت سے مسکرا کر چابی انگلی میں گھمائی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر بڑی ہی دلفریب مسکان تھی۔

اس وقت وہ اسے کتنا عظیم لگا بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی کی طرح۔ اس کے کردار کی پختگی ناز کے دل میں اس کے لئے بڑا اعلیٰ مقام بنا گئی۔ اس کے چہرے سے نور کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس کے پاس سر اختیار تھا مگر اس نے ناز جیسی کمزور ہستی پر کوئی اختیار استعمال نہ کیا۔

"کیا سوچنے لگیں؟ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لیں۔ میرا ملازم کل سے چھٹی پر گیا ہے اور مجھے بار بار چائے بنانے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔"

وہ شرمندہ سی ہو کر بیڈ سے نیچے اتر آئی

"رات کافی دیر جاگتی رہی تھی جبھی آنکھ نہیں کھلی۔"

تب ناشتے کے بعد وہ اسے گھر کے دروازے تک چھوڑ گیا۔

"چلیے میں آپ کی پھوپھی جان سے مل لوں۔"

"نہیں ابھی نہیں پھر کبھی۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"جیسی آپ کی مرضی۔"

"اچھا پھر اجازت۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

اور اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور چلا گیا۔

اور وہ جلدی سے گیٹ میں گھس گئی۔

تیزی سے چلتی ہوئی وہ پھوپھی جان کے کمرے میں آ گئی۔

"آ گئی میری بیٹی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ "اچھا کیا تم نے فرح کے ہاں رک گئیں ورنہ رات بڑا طوفان تھا۔" وہ دوبارہ اخبار کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

اور انہیں مطمئن دیکھ کر ناز نے تمام واقعہ بتانا فضول سمجھا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس شخص کی اعلیٰ ظرفی اور مضبوط کردار نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ کمرے میں آ کر بھی اسی کے بارے میں سوچتی رہی اس کی والہانہ نظریں اب بھی اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔

اس صبح بالکل اچانک فرحان امریکہ سے واپس آ گیا۔۔ کئی سال پہلے فرحان تعلیم کے سلسلے میں امریکہ گیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ وہیں ملازمت بھی کرنے لگا تھا اور اب کئی سالوں بعد پاکستان لوٹ کر آیا تو پھوپھی جان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

"ارے ناز، تم کتنی بدل گئی ہو۔" فرحان نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھیں شوق و انبساط سے لبریز تھیں۔

"آپ بھی تو پہچانے نہیں جا رہے۔" وہ بھی ہنسی۔

فرحان کا دبلا پتلا جسم اب کافی بھر گیا تھا۔ چہرے پر قابلِ رشک صحت کی سرخیاں لہرا رہی تھیں۔ بھوری آنکھیں جو اس کی حاسدانہ طبیعت کی عکاسی کرتی تھیں، کچھ اور بھوری ہو گئی تھیں۔

شام تک بانو آپا بھی پنڈی سے بھائی کے آنے کی اطلاع پا کر بچوں سمیت آ گئی تھیں۔ پھوپھی جان کا اداس سا گھر ہنگامے اور شور سے بھر گیا تھا۔ دو چار روز بعد بھیا جانی بھی اسے لینے آ پہنچے۔ دو روز بعد ان کی روانگی تھی۔ وہ اپنے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھ رہی تھی کہ فرحان آ گیا۔

"تو پھر آپ جا رہی ہیں؟"

"جی جناب۔" وہ مسکرائی۔

"ناز۔" اس نے پکارا تو وہ چونک کر پلٹی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں ہمیشہ کے لئے رہ جاؤ۔"

اس کی آنکھوں میں ابھرتی تحریر وہ پہلے ہی روز پڑھ چکی تھی۔ اب وہ اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔

"یہ ناممکن ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"کیوں؟"

"بھئی میرے بعد ابو جانی اور بھیا اکیلے رہ جائیں گے۔"

"بھئی میرا مطلب ہے کہ ماموں جان سے تمہیں ہمیشہ کے لئے مانگ لیا جائے۔"

وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر گنگنایا۔ تب وہ اس کے

ہاتھوں کو جھٹک کر بولی۔

"یہ انگوٹھی دیکھ رہے ہیں فرحان بھائی؟ یہ انگوٹھی مجھے کسی اور نام سے منسوب کر چکی ہے۔ بہت پہلے۔"

"میں جانتا ہوں۔ ممی نے بتایا ہے۔"

"اور اس کے باوجود آپ خواہش کر بیٹھے۔" اس کی آواز میں غصے کی لرزش تھی۔

"یہ تو معمولی بندھن ہے جسے توڑا بھی جا سکتا ہے۔"

ماں کے کہے ہوئے الفاظ اس نے دہرا دیئے۔

"مگر میرے لئے معمولی نہیں!" وہ اٹیچی کیس جھٹکے سے بند کرتے ہوئے باہر آ گئی۔

○

اسے مری سے آئے کافی روز ہو گئے تھے۔ اسے فرحان کی جرأت پر غصہ تو بہت آیا مگر جب اس کی واپسی پر اس نے اپنے الفاظ واپس لے لئے تو اس نے اسے معاف کر دیا۔

گھر آئی تو اس نے سنا کہ حارث واپس آ چکے ہیں۔ اس شام اس کے سر میں درد تھا۔ وہ کمرے میں لیٹی تھی۔ بھیا کی چھٹی تھی وہ باہر برآمدے میں بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ابو جانی شکار کے سلسلے میں صبح سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اچانک.... .... برآمدے میں بھیا کی آواز گونج اٹھی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ارے یار حارث آخر تمہیں ادھر آنے کی فرصت مل گئی۔"

حارث کے نام سے ہی اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا اور جانے کیوں بدن ہولے ہولے کانپنے لگا۔ وہ چاہتی تو اٹھ کر کھڑکی سے اس شخص کو دیکھ سکتی تھی جو اس کی زندگی بھر کا ہمسفر بننے والا تھا مگر جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکی عجیب سا خوف مانع تھا۔

جانے کیسا ہو....

کہیں سپنے بکھر نہ جائیں....

جہاں تک اس کے بس میں ہے وہ ان سپنوں کو سنبھالے رکھے گی۔ وہ کمبل کھینچ کر لیٹ گئی۔

مگر تھوڑی دیر بعد ہی ملازم اسے بلانے آن پہنچا۔ مگر وہ ڈرائینگ روم میں نہ گئی اور ویسے ہی لیٹی رہی۔ بہت سے لمحے یوں ہی سرک گئے۔ تب ہی بھیا شور مچاتے چلے آئے۔

"بھئی تمہیں بلایا تھا۔ آئیں کیوں نہیں رانی۔" انھوں نے کمبل کھینچا۔

"آؤ آج اپنے "ان" کو دیکھ لو۔" انھوں نے شرارت سے سرگوشی کی۔

"نہیں بھیا۔ میں وہاں نہ جاؤں گی۔" اس نے سرخ چہرے کو جھکاتے ہوئے شرمگیں آواز میں کہا۔

"چلو۔ بالکل بے وقوف ہو۔ اٹھو کیوں نہیں جاؤ گی؟"

وہ اسے کھینچتے ہوئے ڈرائینگ روم تک لے گئے۔

"اب چھوڑیئے بھی۔" اس نے بازو چھڑاتے ہوئے کہا اور اپنی بے ترتیب ہوتی شال کو درست کیا اور پھر بھیا کے ساتھ ڈرتے ڈرتے ڈرائینگ روم میں قدم رکھا۔ تب ہی اس نے پلکیں اٹھائیں تو وہ اچھل گئی۔ سامنے والے صوفے پر وہی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سیاہ پینٹ اور گلابی شرٹ میں وہ اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ ہلکی مسکان ہونٹوں پر لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے جذبے لٹاتے ہوئے۔

چیک دار لونگ اسکرٹ اور سرخ بلاؤز اور سیاہ شال کندھوں پر ڈالے وہ اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ الجھے الجھے بالوں میں اس کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ تب ہی بھیا بولے۔

"یہ حارث ہے.... اور حارث، یہ نازنہ ہے میری پیاری سی بہن۔"

یہ انکشاف نازنہ سہہ نہ سکی۔ دل ایک انجانی خوشی اور انجانے خوف سے جھٹکوں کے ساتھ دھڑکنے لگا پھر وہ بے دم ہو کر بھیا کے بازوؤں میں جھول گئی۔

"ارے نازنہ کیا ہوا؟".... بھیا گھبرا گئے۔ اور حارث بھی جلدی سے اس کی طرف لپکا

"اس کی طبیعت صبح سے ہی اچھی نہیں۔ میرا خیال ہے کھڑے ہونے سے گھبرا گئی ہے۔" بھیا اسے یونہی تھامے ہوئے اس کے کمرے میں اسے واپس لے آئے۔ اور کمبل اس پر ڈال کر اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

"نازو!" وہ اسے پکارنے لگے۔ تب اس نے ہلکی سی جنبش کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ انھوں نے جلدی سے پانی اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"کیا ہوا تھا؟" بھیا پریشانی سے بولے۔

"بھیا۔ ذرا سر چکرا گیا تھا۔" وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

بھیا کچھ دیر اس کے پاس بیٹھے رہے پھر اٹھ کر ڈرائینگ روم میں چلے گئے۔ بھیا کے جانے کے بعد خیالات کی یلغار نے اسے گھیر لیا۔ وہ شخص جس کی آنکھوں میں نفرت اور انتقام کے جذبے لپکتے تھے، وہاں ایک دم نئے جذبے کیسے موجزن ہو گئے۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ کہیں یہ بندھن اس نے کسی پلان کے تحت تو نہیں باندھا۔ مجھ سے کوئی انتقام لینا تو مقصود نہیں ہے ایسا تو نہیں کہ وہ عین موقع پر شادی سے انکار کر کے اپنی توہین

کا بدلہ لینا چاہتا ہو۔ یا پھر شادی کی پہلی رات ہی اس کے ہاتھ میں طلاق نامہ تھما کر اپنا انتقام پورا کرلے۔ وہ شخص جو دبے پاؤں اس کے دل میں تو داخل ہو ہی گیا تھا زندگی میں بھی دبے پاؤں کوئی چاپ کیے بغیر چلا آیا تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا۔ کہیں وہ کسی موڑ پہ دامن بچا کر دبے پاؤں ہی نہ نکل جائے۔ مگر وہ اُسے کبھی بھی بھلا نہ سکے گی۔ کہیں اس کا انتقام میری پوری زندگی پر محیط نہ ہو جائے۔

مگر میں اسے اپنی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہ دوں گی

کمرے میں اس کا دل گھبرایا تو وہ اُٹھ کر بوگن ویلیا سے ڈھکے اندرونی برآمدے میں آگئی اور ستون سے سر ٹکائے جانے اور کیا سوچنے لگی۔ اسے اپنے کندھوں پہ بوجھ محسوس ہوا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو حارث ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

تب ہی وہ بولا

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ ان آنکھوں میں پکتے نفرت اور انتقام کے شعلوں کی جگہ یہ انجانے جذبے کیوں سما گئے ہیں؟

کہیں یہ کسی انتقامی کارروائی کا پیش خیمہ تو نہیں۔

ان آنکھوں میں موجزن انتقام کی لہروں کا یوں پُرسکون ہو جانا کچھ معنی رکھتا ہے۔

یہ دشمن ایک دم دوست کیسے ہو گیا؟"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ کھل کر کہو۔" وہ بے چینی سے بولا۔

"کہیں یہ بندھن آپ نے مجھے رسوائیاں دینے کو تو نہیں جوڑا کہ عین موقع پر گڑبڑ مچا کر مجھے میرے کئے کی سزا دی جائے۔"

آخر کار وہ دل کی بات زبان پر لے آئی اور یہ کہنے سے پہلے وہ بھول گئی کہ وہ پہلے اس کی اعلیٰ ظرفی کا اعتراف کر چکی ہے۔

"خوب۔" وہ عجیب سی ہنسی ہنسا۔

"راہیں تو تم خود ہی بتا رہی ہو۔"

"آپ اتنے بھولے بھی نہیں۔ یہ راہ آپ نے خود متعین کی ہے۔"

وہ تڑخ سے بولی

"ورنہ یوں مہربان ہو جانا میری سمجھ سے باہر ہے۔"

حارث کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی روشنی ماند پڑ گئی اور چہرے پر کرب اُمڈ آیا۔ اس لڑکی نے اس کی توہین کی تھی ایک بار نہیں بار بار۔

"تم میری توہین کر رہی ہو ناز۔"

"توہین نہیں حقیقت بے نقاب کر رہی ہوں۔" وہ طنزیہ مسکرائی۔

تب وہ پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا مزید کچھ کہے بغیر۔

کئی اداس اور بوجھل دن گزر گئے۔ تب ہی فرحان ابو جانی سے ملنے چلا آیا۔ اس کے ساتھ پھوپھی جان بھی تھیں۔

اس شام وہ لان میں بیٹھی تھی کہ فرحان باہر سے آیا تو اسی کی طرف چلا آیا۔

"ابھی حارث سے مل کر آ رہا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"اور اتفاق کی بات وہ میرا پرانا دوست نکلا۔۔۔۔ ویسے بڑی چیز ہے یہ حارث بھی۔"

وہ تامل سے بولا

"کیوں؟" وہ چونکی۔

بڑے افیئرز چلایا کرتے تھے طالب علمی کے زمانے میں کمپنی بھی اچھی نہیں۔ پیسہ تو پانی کی طرح بہاتا ہے۔"

غرضکہ وہ کتنی دیر بیٹھا اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔

"اللہ جانے تم پر اکتفا کیسے کرے گا۔"

فرحان اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر اندر چلا گیا اور وہ بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

آج فرحان اپنی اسکیم کی کامیابی کا جشن منا رہا تھا۔

آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ناز کو تو وہ حارث سے بدظن کر ہی چکا تھا۔ حارث کو بھی ناز اور اپنی محبت کے فرضی قصے سنا کر اپنے لئے راہ ہموار کر چکا تھا۔

اس شام مائرہ کی سالگرہ تھی۔ بھیا کے دوست کی سالگرہ تھی۔ وہ اسلئے نہ جا سکے۔ ابو جانی اور فرحان پھوپھی جان اور وہ "حارث ولا" پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ پورا گھر روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ناز یہاں پہلی بار آئی تھی۔ مائرہ نے اسے دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا اور اس سے لپٹ گئی اور پھر اپنی ڈھیروں سہیلیوں سے اس کا تعارف کروایا۔ پھر اسے ایک صوفے پہ بٹھا کر ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔۔۔

عنابی ساڑھی میں اس کا حسن چمک رہا تھا۔ ہلکے طلائی زیوروں نے ناز کا روپ اور دلفریب بنا دیا تھا۔ وہ دور مہمانوں میں گھرے ہوئے حارث کو دیکھ چکی تھی۔ اس نے بھی کئی بار الجھی الجھی نظروں سے اسے دیکھا تھا جو فرحان سے باتیں کر رہی تھی اور ہنسی اس کے لبوں سے پھوٹ رہی تھی۔ کیک کاٹنے کی رسم کے بعد کھانے کا سلسلہ چل نکلا۔ ناز کا دل جانے کیوں حارث کی بے رخی پہ اداس سا ہو گیا تھا۔ باہر رات اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ وہ ہال سے نکل کر لان میں چلی آئی۔ اس نے

چاند کی مدھم لو میں دیکھا۔ فوارے کی منڈیر پر کوئی بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ اس نے پلٹنا چاہا تھا کسی نے پکار لیا۔

"ناز!" یہ سپاٹ سی آواز حارث کی تھی۔

"یہاں آؤ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

وہ چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔ تب اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"ناز، میں نے تمہیں دل کی تمام تر سچائیوں سے چاہا ہے تم میری پہلی اور آخری چاہت ہو۔ تم سمجھتی ہو میں نے یہ بندھن تم سے انتقام لینے کی خاطر باندھا ہے۔" وہ جوش سے بولا۔

.... مگر خدا گواہ ہے میں نے یہ بندھن بڑے خلوص سے جوڑا ہے۔ ..... وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

تم سے بدلہ لینا ہوتا تو قدرت نے مجھے بڑے موقع دیئے تھے۔ تمہاری چاہت نے میری زندگی بدل ڈالی میں جو بہنوں اور ماں باپ کے بے جا لاڈ پیار اور نرمی سے غلط راہوں کا مسافر بن گیا تھا۔ اس نے خود ہی اعتراف کیا۔

تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا آپ بدلنے کی خواہش جاگی میں نے تمہیں پانے کے لئے سب کچھ ترک کر دیا۔ اپنے کاروبار میں دلچسپی لینے لگا اور پھر اس روز تمہارے تعاقب میں آ کر تمہارے گھر کا پتہ چلا کر گیا اور پھر ممی کو بھیجا تب میری خواہش پوری ہو گئی۔ مگر تم نے اس محبت کو غلط رنگ دیا۔ جسے میں برداشت نہ کر سکا۔ اپنی محبت کی توہین کوئی نہیں برداشت کر سکتا۔ تم جذبوں کی پرکھ سے ناآشنا ہو۔ .... لیکن اب تمہیں فرحان کے ساتھ خوش دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں کی راہوں سے ہٹ جاؤں۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کانپ گئی۔

"تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔ یہ خیال ہی میری زندگی کے لئے کافی ہے۔"

اس نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر اس کی گود میں رکھ دی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی وہ جا چکا تھا۔

اس کا چہرہ غم و غصے سے جل اٹھا۔

فرحان کے نام کا حوالہ دے کر تم اپنا اصل مقصد حاصل کر گئے ہو۔ فرحان کے ساتھ اپنا نام سن کر وہ غصے سے پاگل ہو گئی

اپنا انتقام پورا کر گئے ہو کتنی چالاکی سے۔

تمہارے پلان کو میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔

گھٹیا، دغاباز، فریبی۔

تم سا چاہت کو کیا سمجھے۔

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھا گئے تھے۔ ہوا دھیرے دھیرے پودوں اور درختوں سے ٹکراتی اور آگے بڑھ جاتی۔ پورے لان میں شاخوں سے گرنے والے پتے اور پھول ہوا کے سنگ ہولے ہولے ادھر ادھر سرک رہے تھے۔ فضا موتیا، بیلا اور گلاب کی مہک سے بوجھل تھی۔

ایسے موسموں کی وہ ہمیشہ سے دیوانی تھی مگر آج کھڑکی میں کھڑی موسم کی دلفریبی سے یکسر بے نیاز تھی۔

زرد رنگت اور الجھے الجھے بالوں میں وہ بڑی پریشان لگ رہی تھی۔ دو روز ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے آپ پر ٹوٹی ہوئی قیامت سے کسی کو باخبر نہیں کیا تھا۔

کس سے کہتی یہ سب۔ کوئی بھی تو نہ تھا۔

کئی بار اپنی بے بسی پر وہ دل کھول کر روئی تھی۔

"یہ معمولی بندھن ہے جسے توڑا بھی جا سکتا ہے۔

فرحان کے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے۔

ہاں معمولی ہی تھا جب ہی حارث نے آسانی سے توڑ ڈالا۔ آخری اور پہلی چاہت جتانے والا میری معمولی سی غلطی کو نظر انداز نہ کر سکا۔ کوئی میرے دل سے پوچھے اس بندھن کی قیمت۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں ایک ہی صنم رہے گا اسی کی بندگی سے میرے دل کا مندر آباد رہے گا۔

دل دھڑکے گا تو حارث صرف تمہارے نام سے۔

وہ کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکا کر سسک پڑی۔

پھر وہ کمرے کی خاموش فضا سے نکل کر پھوپھی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مگر اچانک دروازے پر رک گئی۔

پھوپھی جان حارث کا نام لے رہی تھیں۔

"اے فرحان تو تو کہہ رہا تھا۔ حارث نے انگوٹھی واپس کر دی ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولیں۔

"ہاں میں نے خود دیکھا ہے حارث کو پرسوں رات انگوٹھی واپس کرتے۔" وہ بھی اسی انداز سے بولا۔

"مگر تیرے ماموں تک ابھی یہ خبر نہیں پہنچی۔ پھر کیسے تیرے لئے بات کروں۔" وہ پان چباتے ہوئے بیزاری سے بولیں۔

"ممی ناز نے بتایا یا نہیں ہو گا

"اچھا" وہ تامل سے بولیں۔ پھر آج میں خود علی سے بات کروں گی۔"

دروازے کے قریب کھڑی ناز کیلئے یہ باتیں سربستہ راز

نقیں۔ جب ہی فرحان مدھم آواز میں بولا۔
"مجھے امید نہ تھی کہ معاملہ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔"
ناز تو ایک ہی داؤ میں بدظن ہو گئی تھی۔ حارث سے۔
وہ ہولے سے قہقہہ لگا کر بولا۔
مگر حارث کو کئی مرتبہ اپنی اور ناز کی فرضی محبت کا یقین دلانا پڑا۔
وہ سرگوشی کے انداز میں بولا
سو پرسوں رات وہ میرے لئے راہ ہموار کر گیا۔"
تب ناز کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ آستین کے سانپ نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ وہ تڑپ کر پلٹی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔
"میں تم ماں بیٹے کے خواب کبھی پورے نہیں ہونے دوں گی"
وہ اسی وقت حارث کے پاس جانا چاہتی تھی اپنی بیگناہی کا یقین دلانے اور روٹھے ہوئے ساتھی کو منانے۔ اس کے دل میں خوشیوں کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔
قوت سماعت نئی بہاروں کی چاپ سن رہی تھی۔ ہونٹ خود بخود نئی نویلی کلیوں کی طرح کھل رہے تھے۔
سیاہ ساڑھی میں اس کا حسن سیاہ رات کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ دراز کھول کر اس نے حارث کی واپس کی ہوئی انگوٹھی اٹھائی اور گیراج کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

گیٹ کے قریب گاڑی کھڑی کر کے وہ اندر چلی آئی
پھولوں بھری روش پر چوکیدار بیٹھا تھا۔
"بابا! حارث گھر پر ہیں؟" اس نے غمگین سے بیٹھے بوڑھے چوکیدار سے پوچھا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر سرد آہ بھر کر بولا۔
"بی بی، گھر پر تو ہیں مگر کسی سے بات نہیں کرتے......
کل سے بے ہوش پڑے ہیں۔"
ناز کے دل کو دھچکا لگا۔
"کیوں کیا ہوا؟"
پرسوں سے تیز بخار ہے۔ آج ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ ہوش میں ہی نہیں آتے۔ کوئی صدمہ چاٹ گیا ہے دو دنوں میں۔"
ناز سے اب برداشت نہ ہو سکا۔
"بابا مجھے ان کے کمرے میں لے چلو۔"
وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
حارث کے کمرے کے ساتھ والے برآمدے میں سائرہ اور

ایک
نئی کتاب
مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ عدنان بھیا کی کتاب

ہاتھ کے کھیل
چھپ گئی ہے۔
یہ کتاب آپ مجھے وی پی سے بھجوا دیں، میں پوسٹ مین کو پیسے دیکر وی پی وصول کر لوں گا / گی۔ میرا پتہ اس خط پر لکھا ہے۔
نجومی کے زیور
کیرو کی کتاب کا ترجمہ عدنان صاحب نے نہایت آسان اور سادہ زبان میں کیا ہے۔ اس کتاب میں ۶۰ تصاویر ہیں جن کی مدد سے ہر شخص اپنا یا دوسروں کا ہاتھ پڑھ سکتا ہے
یہ کتاب ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے محدود تعداد میں چھاپی ہے۔ لہذا آج ہی خط لکھ کر وی پی سے منگوا لیں۔ قیمت ۵/- روپے
کتاب منگوانے کا پتہ۔
کراچی بک ڈپو
اردو بازار
کراچی ۱

مائرہ جانماز بچھائے اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کر رہی تھیں۔ آمنہ اور سائرہ آپی شہر سے دور تھیں، اس لئے ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ مسز علی غش پہ غش کھا رہی تھیں اور بے دم ہو کر بستر پہ پڑتی تھیں۔ حارث کے کمرے میں صرف علی صاحب تھے جو لمحہ بہ لمحہ اپنی امیدوں کے گل ہوتے ہوئے چراغ کو بڑی حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ جب ہی ناز کمرے میں داخل ہوئی۔ انھوں نے سر اٹھا کر اپنی ہونے والی بہو کو دیکھا جس کے لئے ان کے بیٹے نے ہر قابلِ اعتراض روش چھوڑ دی تھی۔ پھر وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ حارث سفید بستر پہ چہرے پہ املتاس کی زردی لئے بے سدھ پڑا تھا۔ خوبصورت بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ سیاہ کمبل سینے تک پڑا تھا جس پر اس کا صاف شفاف ہاتھ چمک رہا تھا۔۔۔

خوشیوں سے کھیلنے والا حارث چاہت کے دکھ نہ اٹھا سکا اس کی لگن سچی تھی تب ہی تو ان حالوں کو پہنچا تھا۔ فرحان کی جھوٹ اور فریب سے بھری کہانی نے اس خوبصورت سے شخص کو کتنا دکھ پہنچایا تھا۔۔۔ ناز بجلی کی سی سرعت سے اس کی طرف بڑھی۔

"حارث!"

غم سے لرزتی ہوئی آواز خاموش فضا میں گونج اٹھی۔

"حارث۔ ہوش میں آیئے۔ ادھر دیکھئے میری طرف۔"

وہ بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ حارث کو جھنجھوڑنے لگی۔

مگر وہ ویسے ہی بیگانوں کی طرح پڑا رہا۔

"حارث میری زندگی اور دل میں آپ دبے پاؤں آ گئے تھے۔ مگر میں اب یوں آپ کو دبے پاؤں دامن بچا کر نہ جانے دوں گی۔ کچھ کہے بغیر۔

حارث! بولیے۔ آنکھیں کھولئے۔

وہ اس کے ہاتھ پہ ہونٹ رکھ کر سسک پڑی۔

جب ہی اس نے پرس کھول کر انگوٹھی نکالی اور حارث کے خالی ہاتھ میں سجا دی۔

"یہ آپ کی ہی امانت ہے حارث۔ میں کسی فرحان کو اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے دوں گی۔

وہ ایک بار پھر اسے جھنجھوڑنے لگی۔

"حارث! وہ سب جھوٹ تھا۔ میں نے فرحان کو کبھی بھی نہیں چاہا۔ کبھی نہیں۔"

وہ اس کے بیڈ کی پٹی سے سر ٹکا کر ہچکیوں میں رونے لگی کتنی ہی دیر وہ بے دردی سے روتی رہی اور بار بار اسے پکارتی رہی۔

اس کی پکار میں جانے کونسی تڑپ تھی کہ ڈوبتی ہوئی نبضیں پھر ابھرنے لگیں۔ کمرے کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی پُر اسرار سسکیوں نے اسے بند پلکیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے سر کو جنبش دی اور دائیں طرف دیکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رونے والے کا سر اونچا کرنا چاہا۔ جب ہی اپنے خالی ہاتھ میں پڑی انگوٹھی کو وہ پہچان گیا اور رونے والے کو بھی۔

"ناز!"

یوں ہی سر رکھے رکھے وہ پھر سسکی۔

"حارث! فرحان جھوٹ کہتا ہے۔ وہ ہمیں جدا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے تو ہمیشہ آپ کی تمنا کی ہے

حارث کو اپنی قوتِ سماعت پہ یقین نہ آیا۔

"ناز!" وہ دھیرے سے بولا۔

اور اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ سرخ سرخ بھیگی آنکھوں سے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں پیار کی جوت جگائے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے زمین سے اٹھا کر اپنے قریب بٹھا لیا۔

تب وہ ڈھیروں ملنے والی خوشی سے بے قابو ہو کر اس کے ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے تحاشا آنسو بہانے لگی۔

"حارث، یہ دبے پاؤں آ جانے کی عادت آپ چھوڑ دیں

آنسو صاف کرتی ہوئی وہ شرمگیں آواز میں بولی۔

"اچھا۔۔ جی!" وہ مدھم ہنسی میں بولا۔

"اب ہم بڑے شور و غل سے آئیں گے!"

وہ اس کے لمبے بالوں کو کھینچتے ہوئے شرارت سے بولا۔

تو اس کے کانوں کی لویں تک گلابی ہو گئیں۔

تب وہ کچھ یاد کر کے بولی۔

"آپ بڑے خراب ہیں۔ آپ نے اس طوفانی رات کیوں نہ سب کچھ بتا دیا!"

"بھئی اس وقت بتا دیتا تو تمھاری خوف زدہ۔۔۔۔

۔۔۔ حرکتوں اور گھبراہٹ سے لطف اندوز کیسے ہوتا؟"

بلکہ یوں کہو کہ جب بھی تم سامنے آتیں

تمھاری سہم جانے والی ادا بڑی مسرور کرتی!"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر ہنسا۔

"شریر!"

وہ خفیف سا مسکرائی

اور پردے کے پیچھے کھڑی مائرہ سب کو خوشخبری سنانے کے لئے بھاگ گئی۔

خوشبو کا سحر

خالدہ ملک

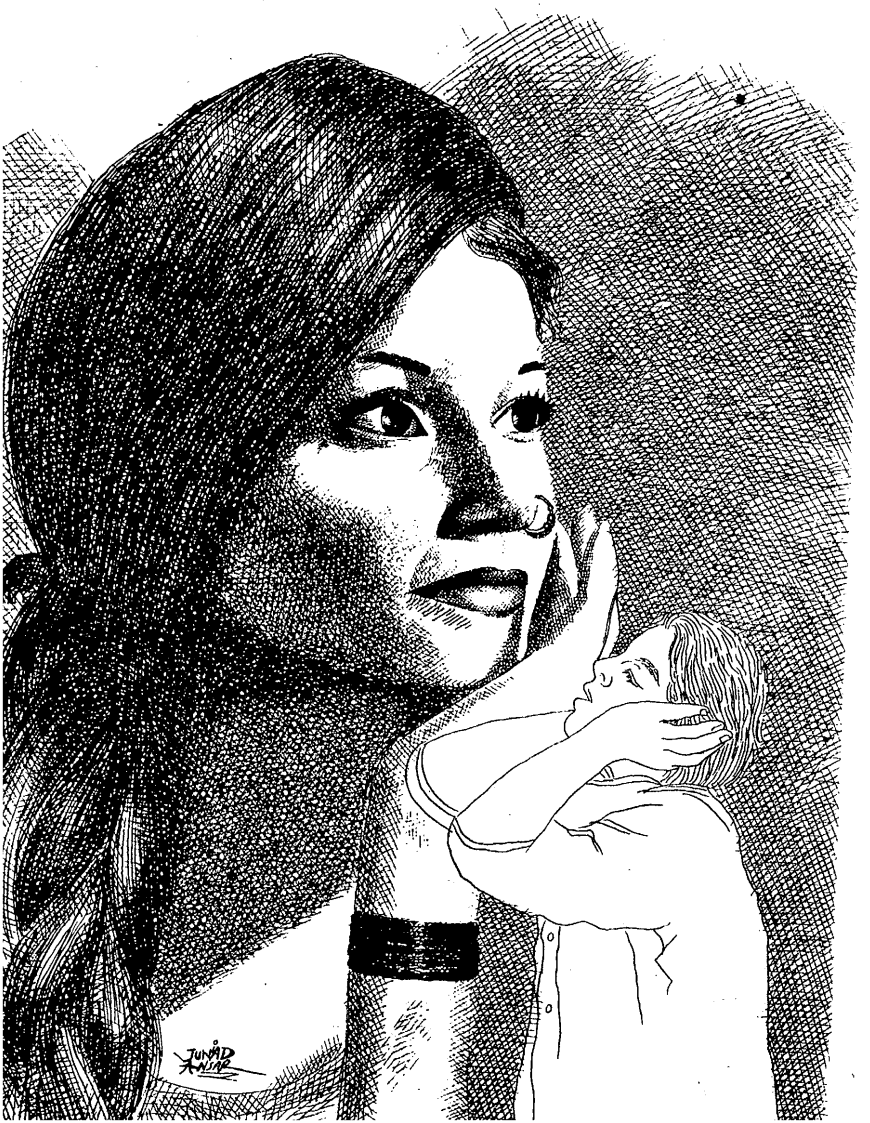

عام پاکستانی مردوں کی طرح گوری چمڑی طاہر کی بھی کمزوری تھی۔ لیکن اس سلسلے میں اس غریب کو اس واسطے زیادہ قصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا کہ اس نے جب ہوش سنبھالا یا دوسرے لفظوں میں رنگوں اور رُتوں میں تمیز کرنے کا شعور اس میں جاگا تو اس نے اپنے ارد گرد زیادہ تر گوری چمڑی ہی دیکھی تھی۔

طاہر کے والد کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب وہ میٹرک میں پڑھتا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد زینت بیگم نے بچوں کی تعلیم کو ہر بات پر مقدم سمجھتے ہوئے اپنی تمام جمع جتھا کو طاہر اور فوزیہ کی تعلیم پر خرچ کرنے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ ایف۔ اے کرلینے کے بعد طاہر نے مزید تعلیم حاصل کرنے سے انکار کردیا۔ گو کہ ماں نے کبھی طاہر کو گھر میں پیسے دھیلے کی تنگی کا احساس نہ ہونے دیا لیکن جن بچوں کے سر سے والد کا سایہ اٹھ جاتا ہے وہ وقت سے قبل ہی شعور کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ طاہر نے بھی اپنے طور پر محسوس کرلیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات اٹھانا اس کی بیوہ اور تنہا ماں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یوں بھی ایسے کون سے خزانے بھرے پڑے تھے۔

طاہر کے والد حیات علی فوج میں کپتان تھے اور ان کی موت اچانک دل کے بند ہوجانے سے واقع ہوئی تھی۔ اپنی بیس سالہ ملازمت کے سلسلے میں جو معاوضہ متعلقہ شخص کی موت کے بعد اس کے لواحقین کو ملتا ہے اس کو بھلا کتنا عرصہ چلایا جاسکتا ہے؟

اور پھر صرف خرچ کرنے سے تو بھرے خزانے بھی ایک روز خالی ہوجاتے ہیں اور یہاں بیک وقت تین تندوروں کو ایندھن مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ دونوں بچوں کی پڑھائی، کتابیں لباس اور دیگر ضروریات تھیں جنہیں پورا کرتے کرتے زینت بیگم وقت سے قبل بوڑھی ہوگئی تھیں۔

ایف۔ اے کرنے کے بعد طاہر نے فوج میں ملازمت کے حصول کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ پھر نہ جانے کیوں اس نے اپنا ملک چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ماں بیچاری ممتا کی ماری جس کے دو ہی بچے تھے بھلا کیوں کر ایک کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کرسکتی تھی؟ لیکن طاہر کی ضد نے انہیں مجبور کردیا کہ بچوں کی خواہشات کے آگے والدین ہمیشہ سے ہی جھکتے چلے آئے ہیں۔

زینت بیگم نے کچھ تو اپنا زیور گروی رکھ کے اور باقی اپنے عزیزوں اور ملنے جلنے والوں سے قرضِ حسنہ لیکر بندھے دل سے بیٹے کی یہ خواہش پوری کردی اور یوں طاہر میاں پاکستان کو چھوڑ کر باہر سدھارے۔ پورے آٹھ مہینے تک تو زینت بیگم بیٹے کے خط کو ترستی رہیں۔ ادھر طاہر میاں یورپ کے تقریباً تمام ملکوں کی خاک چھانتے مزدوریاں کرتے، فاقے کاٹتے آخر کار سویڈن میں مقیم ہوگئے اور جب تک ڈھنگ کی نوکری حاصل کرکے پہلی تنخواہ وصول نہ کرلی، ماں کو خیریت کا خط تک نہ لکھا۔

کہتے ہیں خوشیوں اور مسرتوں کا چہرہ نظر آجائے تو دکھوں کے سائے خود بخود اوجھل ہوجاتے ہیں۔ زینت بیگم بھی ایک طویل عرصے بعد بیٹے کا خط پاکر نہال ہوگئیں اور پھر ماہ بماہ ایک معقول رقم ہاتھ میں آنے لگی تو ان کے پچھلے سارے زخم ایک ایک کرکے مندمل ہونے لگے۔ تھوڑے عرصے بعد کچھ رقم جمع ہوئی تو بیٹے کی پیشانی پر سہرا دیکھنے کی ماں کی ازلی ابدی خواہش مجسم ہوکر ان کی آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

طاہر کے ہر خط کے جواب میں زینت بیگم اُسے واپس پاکستان آنے اور شادی کرنے کے بارے میں لکھتیں اور ہر بار طاہر میاں ماں کا خط پاکر مسکرا دیتے۔

شادی؟

اس لفظ کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے پردے پر پاکستان میں بستے گھرانوں کے اندر ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس سانولی رنگت والی لڑکیاں چپلیں گھسیٹتی ادھر سے ادھر چلتی پھرتی نمودار ہوتیں اور ایسے ہزاروں ہیولے دور بیٹھے بیٹھے پاکستانی لڑکیوں کے وجود سے گھن آنے لگتی۔

بھلا پاکستانی لڑکیاں بھی اس قابل ہوسکتی ہیں کہ ان کے ساتھ شادی کرکے ساری زندگی بسر کی جاسکے؟

کیا ہوتی ہے پاکستانی لڑکی؟

ملگجی، ڈھیلی ڈھالی، سر پہ دوپٹہ جمائے جھک کر چلتی ہوئی۔

نہ اٹھنے بیٹھنے کی تمیز نہ بات کرنے کا سلیقہ، نہ اوڑھنے پہننے کا قرینہ۔

اس نے کبھی اپنے ملک کی کسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے بارے میں سوچا تک نہ تھا لیکن پھر بھی اس نے ماں کو کبھی ہاں یا ناں میں جواب نہ لکھا۔

ماں کے ہر خط کے جواب میں وہ یہی لکھتا رہا کہ جب تک بہت سارے پیسے نہ کمالے گا وطن واپس نہ آئے گا اور یوں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے شوق میں اس نے خود کو مشین بنالیا تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے وہ صرف تین گھنٹے سوتا۔ باقی تمام وقت کام میں صرف ہوجاتا۔

پورے پانچ سال کی جان ماری اور دن رات کی محنت کے بعد اپنے اخراجات سے الگ اس نے اتنی زیادہ دولت جمع کرلی تھی کہ اب اُسے اوور ٹائم لگانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ بس دفتر میں جو ملازمت ملی تھی وہی کرتا اور دو بجے فارغ ہوجاتا۔

پچھلے تمام عرصے میں اس نے یورپین عورتوں کو اپنے ساتھ

کام کرتے ہوئے دیکھا تھا کہ کام کے دوران یورپ کی عورت صرف ایک مشین ہوتی ہے۔ اداؤں سے مبرا جسم، جذبات اور میک اَپ دونوں سے عاری چہرہ۔ صرف مشین۔ کام کرنے والی مشین۔

پھر بھی قریب سے آنکھیں سینکتے رہنے کے ساتھ ساتھ گوری چمڑی طاہر کے دل میں روز بروز گھر کرتی چلی گئی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ یورپین کے مقابلے میں پاکستانی لڑکی اسے بے حد ماند ماند سی ملگجی سی لگتی۔

پھر جب اس نے فالتو کام کرنا چھوڑ دیا اور شام کا وقت فارغ گزرنے لگا تو اس نے گھومنا پھرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ کلبوں اور ریستورانوں اور کیفوں میں بھی جانے لگا تھا۔ یہ گویا زندگی کا نیا موڑ تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے مغرب کو بغور دیکھا۔ مغربی عورت کی ادائیں اور ناز نخرے بھی ایک انوکھا انداز لیے ہوئے تھے۔ لباس پہننے اور خود کو اسمارٹ اور چاق و چوبند رکھنے میں ان عورتوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بس یہی بات طاہر کو متاثر کر گئی تھی۔

دولت وافر ہو تو انسان کو اوڑھنے پہننے، رہنے سہنے اور بہتر زندگی کے ڈھنگ بھی آجاتے ہیں۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس نے دن رات ایک کر کے جو بے تحاشا دولت جمع کی تھی اب اس میں سے کچھ خرچ کرنے کے موڈ میں تھا۔ دوستوں کی محفلوں اور پارٹیوں میں اس نے پینا پلانا بھی شروع کر دیا تھا۔ شکل و صورت خدا نے اچھی دی تھی۔ سانولی رنگت یورپ کی آب و ہوا سے نکھر کر ملاحت کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ گویا اب سانولا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگا تھا اور مرد جب کندنی سانولی رنگت والا ہو، بے دریغ پیسے لٹا تا جاتا ہو تو اس کے لیے یورپ میں خاتون دوستوں کی کمی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اب اس کی ڈھیروں لڑکیوں سے دوستی تھی۔ شادی بھی اس نے بہر حال ان ہی میں سے کسی ایک سے کرنی تھی۔ صرف انتخاب کا مرحلہ باقی تھا اور انتخاب کچھ یوں بھی مشکل ہو گیا تھا کہ مغربی لڑکی سے دوستی کے بعد لفظ شادی میں کوئی چارم نہیں رہتا۔ یہ عجیب بات تھی جس پر اس نے کئی بار غور کیا۔ سوچا اور بغیر سمجھے چھوڑ دیا۔

ادھر پاکستان سے آنے والے ہر خط میں ماں کا ایک ہی اصرار تھا کہ واپس آؤ تاکہ تمہاری شادی کروں۔ پھر ایک روز اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ ایک بہت طویل عرصہ بعد پاکستان کی سرزمین پر لوٹا تھا۔ اس نے محسوس کیا پاکستان تو ویسا ہی تھا جیسا وہ چھ برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ گرد، غربت، منافقت، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ ہاں بچے ذرا بڑے ہو گئے تھے۔ جو درمیانے سائز کے تھے وہ جوان ہو گئے تھے۔ دس بارہ برس کی عمر کی بچیاں جوان ہو کر نکھر آئی تھیں۔ چہروں پر نکھار اور رنگ و روپ بھی آگیا تھا۔ لیکن ان کا چلن وہی تھا جو ان سے پہلے والی پود کا تھا۔ بس صرف اسکول یا کالج جاتے وقت وہ ڈھنگ کے لباس میں دکھائی پڑتیں اور پھر گھر میں ویسی ہی سلیپر گھسیٹتی ہوئیں، سروں پر دوپٹے جمائے جھک جھک کر چلتی ہوئی ملگجی اور سہمی سہمی سی لڑکیاں۔ اسے ان ماند ماند میلی کچیلی لڑکیوں سے نفرت تھی۔ پاکستان پہنچنے کے بعد پندرہ بیس روز تو رشتہ داروں سے ملتے ملاتے ہی گزر گئے۔ پھر انہی دنوں اس کے ماموں زاد بھائی کی شادی کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور یوں تمام رشتہ داروں کے ایک جگہ جمع ہو جانے کا بہانہ بن گیا۔

طاہر کے لیے شادی سے متعلقہ تمام رسومات بڑی حیرت انگیز تھیں۔ بارات سے تین روز قبل ہی تمام رشتہ دار ایک ایک کر کے جمع ہو گئے تھے۔ آدھی آدھی رات تک ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں بے معنی گیت گاتی رہتیں۔ سونا یا آرام کرنا تو ان دنوں میں گویا سب کو بھول ہی گیا تھا۔ لڑکیاں بالیاں صحن میں بچھی دری پر تالیوں کے شور میں اونچی آوازوں میں سُر ملانے کی کوشش میں مصروف نظر آتیں اور لڑکے بالے کوٹھے کی منڈیروں سے چپکے نظارے کے ساتھ ساتھ رنگا رنگ فقرے بازی میں مشغول رہتے طاہر نے بھی ان دنوں دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ کبھی کبھی وہ کسی لڑکی کے ساتھ حد سے بڑھی ہوئی شرارت آمیز حرکت کر جاتا تو مروت کی ماری لڑکیاں درگزر کر جاتیں کہ بیچارے طاہر بھائی ایک ماہ بعد تو واپس ہی چلے جائیں گے۔ گویا پردیسی سمجھ کر اس کے دھول دھپے کو بھی برداشت کیا جا رہا تھا۔

سارے نوجوان لڑکے خواہ کوٹھوں کھڑکیوں سے جھانکتے پھریں لیکن لڑکیوں کی محفل میں شرکت کی انہیں اجازت نہیں تھی کہ یہ اس خاندان کی روایات میں نہیں تھا۔ لیکن طاہر کے لیے کچھ رعایات اس کے پردیسی ہونے کے سبب تھیں لہٰذا وہ کوٹھے پر چڑھ کر دور سے ترستے رہنے کی بجائے لڑکیوں میں گھسا بیٹھا اور فقرے بازی، دھول دھپے اور چٹکیوں کے ذریعے اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کر رہا تھا۔

گو کہ اس نے یورپین لڑکیوں کو بہت قریب سے دیکھا پرکھا بلکہ برتا تھا لیکن پاکستان میں بستی ان چھوٹی موٹی اور سمٹی سکڑی لڑکیوں کو چھیڑنے میں اسے عجیب و غریب لذت، مسرت اور طمانیت کا احساس ہوتا اور وہ بیچاریاں مروت کے مارے خاموش رہ جاتیں۔

انہی شور شرابے اور ہنگامہ پرور دنوں میں ایک روز عجیب حادثہ ہو گیا۔ بعض حادثے بھی کیسے دل خوش کن اور روح پرور ہوتے ہیں

اس کا اندازہ طاہر کو پہلی بار ہوا۔

مہندی کی رسم والی رات کوئی تین بجے تک تو خوب ہنگامہ رہا پھر آہستہ آہستہ کئی لڑکیاں تو نیند کی ماتی تھکی ہاری وہیں ڈھولک کے ارد گرد دری پر اوندھی ہو گئیں۔ باقی جو بچ رہیں وہ گھر کے کونوں کھدروں میں جگہ ڈھونڈتی پھریں۔ رات سفر کے آخری مرحلوں میں تھی۔ ادھر مردانے میں بزرگ اور لڑکے بالے بھی سو گئے تھے طاہر نے ہر جگہ اپنے سونے کے لیے گنجائش نکالنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ تھک ہار کر وہ گھر کے تمام کمروں سے ہٹ کر اس کوٹھری کی طرف چلا جہاں بستروں والی پیٹی، صندوق اور دوسری الا بلا چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ شادی والے گھر میں ہر جگہ روشنی کا مکمل انتظام ہوتا ہے۔ لہٰذا کوٹھری کی بتی بھی جل رہی تھی اور دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے کو ہاتھ لگایا اور دھکا پا کر اندر گھس گیا۔

چاروں اطراف نظر دوڑائی۔ پیٹیوں، صندوقوں اور بکھرے ہوئے رنگ برنگ کپڑوں کے ڈھیر کے بیچوں بیچ ایک جھلنگا سی چارپائی بچھی تھی جس کی پائینتی پر کپڑوں کا ڈھیر تھا اور اسی جھلنگا سی چارپائی میں دھنسا ایک فتنہ بے خبر سو رہا تھا۔

اس نے قریب ہو کر غور سے دیکھا۔ وہ عطیہ ہی تھی۔ عطیہ دور کے رشتے میں اس کی پھپھی زاد لگتی تھی۔

اُس نے پھر غور سے دیکھا۔ عطیہ جو پہلی نظر میں ہی اسے تمام لڑکیوں سے قدرے مختلف لگی تھی۔

جو سب لڑکیوں کے درمیان بیٹھی نمایاں لگا کرتی تھی۔

جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں زیادہ چمکنے والا ستارہ۔

موتیوں کے ایک جیسے ڈھیر میں بڑا اور چمکدار موتی۔

حالانکہ وہ بھی باقی پاکستانی لڑکیوں کی طرح سر پر دوپٹہ جمائے چپل گھسیٹا کرتی۔ لیکن ہر قسم کا لباس اس کے جسم پر خوب سجتا تھا۔ دوپٹہ لینے کا انداز بھی نرالا تھا۔ چہرے کے تاثرات میں نکھار کے ساتھ ساتھ ایک انفرادیت تھی۔ دیکھتی تو یوں جیسے بس اِک نگاہ غلط انداز ڈال رہی ہو۔

چلتی تو یوں جیسے آسمان کو پاؤں تلے روند ڈالنا چاہتی ہو۔

طاہر چند لمحے تو اس سوئے ہوئے فتنے کو بغور دیکھتا رہا پھر یکایک اسے اس تعفن زدہ ماحول میں ایک عجیب و غریب مہک کا احساس ہوا جو ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھی۔

اس کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

یہ کسی کریم، پاؤڈر یا سینٹ کی خوشبو نہیں تھی۔ پھر عطیہ کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے کوئی میک اَپ نہیں کر رکھا۔ بس دھلا دھلایا چہرہ قدرے سرخی مائل گالوں پر گھنی پلکوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔

وہ اس غیر مرئی مہک کو محسوس کرتا ہوا بالکل غیر ارادی طور پر پنجوں کے بل چارپائی کے قریب بیٹھ گیا اور اس ہوش رُبا فتنے کو مزید غور سے دیکھنے لگا۔

مہک بڑھ گئی تھی۔

یکلخت سویا ہوا فتنہ ذرا سا کسمسایا اور کروٹ بدلنے سے قبل ایک طویل سانس لے کر ہوا کو منہ کے ذریعے خارج کر دیا۔

اُف خدایا۔ خوشبو کا ایک ہلکا سا جھونکا طاہر کے نتھنوں میں گھستا چلا گیا۔

کیا یہ مہک اس فتنے کے وجود سے اٹھ رہی تھی؟

کیا پھیپھڑوں کے اندر سے خارج ہونے والی گیس اس قدر مسحور کن ہو سکتی ہے۔

کیا سانس بھی اس قدر خوشبودار ہو سکتی ہے۔

وہ حیران تھا بلکہ کچھ پریشان بھی۔

کیا ایسی دلربا اور دل کی دھڑکنوں میں ہلچل مچا دینے والی مہک کسی کاربن ڈائی آکسائڈ میں پائی جاتی ہے۔

انسان کے اندر سے...... متعفن فضا سے نکلی ہوئی ہوا خوشبودار بھی ہو سکتی ہے؟

یہ تمام سوالات بیک وقت طاہر کے ذہن و قلب میں ہلچل مچا رہے تھے۔ بہر حال اس بات میں شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ مہک اسی سوئے ہوئے فتنے کے سانس لینے سے پھیل رہی تھی۔

اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ بالکل غیر شعوری طور پر اس کے دونوں ہاتھ اُٹھے اور اس انداز میں عطیہ کے چہرے کی طرف بڑھے جیسے ہاتھوں کے پیالے میں اس چاند کو تھام لینا چاہتے ہوں۔

لیکن یہ کیا؟

عطیہ کے چہرے سے صرف چھ انچ کے فاصلے پر پہنچ کر طاہر کے ہاتھ گویا فضا میں معلق ہو گئے تھے جیسے کسی غیبی طاقت نے اس میں زنجیر ڈال کر وہیں باندھ دیا ہو۔

کتنے ہی لمحے اس حالت میں گزر گئے۔ اس کے چہرے پر عجب طرح کا جلال تھا گو کہ وہ سو رہی تھی۔

کیا بے بسی تھی کہ ایک سوئی ہوئی عام سی لڑکی کے چہرے کو سوتے میں چھو لینے کا حوصلہ بھی اُسے نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کی ساری قوتیں جیسے جواب دے گئیں اور لگنے لگے لمحے اس کے دونوں

ہاتھ کٹی ہوئی شاخوں کی مانند خود اس کی گود میں آگرے۔

وہ اُٹھا۔ لمحے بھر کو اسے غور سے دیکھا۔ پھر اپنی الجھتی رُکتی چلتی سانسوں کو اعتدال پر لانے کے بعد وہ کوٹھری سے باہر نکل گیا۔ صحن کے ایک کونے میں فرشی دری تہہ کر کے رکھی گئی تھی۔ اس نے بھاگ کر اسے اُٹھایا اور کوٹھے پر جاکر سیڑھیوں کے قریب چھ فٹ بھر کی جگہ میں دری کو ادھا نیچے بچھا کر آدھا اوپر اوڑھا اور دم سادھے لیٹ گیا۔

اور پھر ان پئے نشے میں جھومتے ہوئے اور اس عجیب و غریب مہک کو اپنی نس نس میں سموئے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح دم رات کے سوئے ہوئے ہنگامے جاگے تو وہ بھی اسے صحن میں چلتی پھرتی نظر آئی۔

ارے یہ تو وہی لڑکی ہے۔

کیا شے تھی اس میں جس نے رات مجھے اس کو چھونے تک نہ دیا؟

کون سی طاقت تھی جس نے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لئے تھے؟

وہ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب اچانک عطیہ کی نظر اس پر پڑی لمحے بھر کو اس نے طاہر کو گھورا اور پھر دوسری جانب پلٹ گئی۔ اسے طاہر کی ایسی نظریں بہت بُری لگی تھیں اس ایک لمحے میں اس کے چہرے پر حقارت، نفرت اور غصّے کے سائے اس انداز سے لہرائے کہ طاہر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کے منہ پر تھوک کر چلی گئی ہے۔

طاہر نے بھی نفرت سے ناک سکیڑی۔ پاکستانی لڑکیوں سے نفرت ایک بار پھر عود کر آئی تھی۔

شادی کا ہنگامہ سرد ہوا تو طاہر نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ حالانکہ اس کی چھٹی میں ابھی کافی روز باقی تھے۔ ماں نے وجہ دریافت کی تو نہ جانے وہ کیوں اُلجھ سا گیا۔

"امی کیا دھرا ہے پاکستان میں؟

ہر طرف اُڑتی گرد۔

سڑے بُسے لوگ

میلے کچیلے بچے بچیاں

سمٹی سمٹائی۔ احساس کمتری کی ماری لڑکیاں۔

سڑکوں پر بھیک مانگتے فقیر

زندگی کی کسی ضرورت کو پورا نہ کرتے ہوئے آپ کے یہ گھر۔

اور پھر یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، زندگی کا چلن۔

1000

سوالات

اور مزید معلومات پر مشتمل

محمود خاور

کی نئی کتاب

کیا آپ بتا سکتے ہیں؟

ہر عمر کے بچوں اور بڑوں کے لئے عام اور خاص معلومات پر ایک ایسی کتاب جو آج تک کسی بھی ادارے نے شائع نہیں کی ہوگی۔ ایک ایسی کتاب جو دوستوں اور بچوں کو تحفہ میں دی جا سکتی ہے۔

سفید کاغذ، خوبصورت چھپائی، چار رنگ کا خوبصورت رنگین ٹائیٹل، ایک ایسی کتاب جو بچوں کے لئے والدین کا بہترین تحفہ ثابت ہوگی۔

قیمت ۵ روپے

رنگا رنگ کتاب کلب ۴۲ اردو بازار کراچی

کیا کرتے ہیں یہاں لوگ۔ بس کھانا پینا اور سو رہنا۔ کوئی دلچسپی کا سامان نہیں۔ کوئی تفریح نہیں۔

امی یہاں کوئی کیسے زندگی گزار سکتا ہے؟ کیسے دن کاٹ سکتا ہے؟"

"بیٹے اسی لئے تو کہتی ہوں شادی کرلے۔ تیرا دل لگ جائیگا گھر اپنی پسند اور مرضی کے مطابق بنا لینا۔ میں نے تیرے لئے کئی اچھی اچھی لڑکیاں دیکھ لی ہیں بس تو تیار ہو جا۔"

طاہر نے ماں کی بات سن کر چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"ہائے یہ سادہ دل مائیں جن کو صرف بیٹوں کے سر پر سہرا دیکھنے اور چھم چھم کرتی بہو گھر لانے کے علاوہ کوئی ارمان نہیں ہوتا۔" اس نے دل میں سوچا "میں کسی ڈھیلی ڈھالی میلی کچیلی اور غیر حیثیت پاکستانی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔" وہ ماں کو یہ بات بتا دینا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کس مصلحت کے تحت خاموش ہو گیا اور اگلے سال واپس آنے کا وعدہ کرکے اس نے آخر کار رخت سفر باندھ لیا۔

سویڈن واپس آئے آج اسے چوتھا دن تھا۔ پچھلے تین دن اس نے انتہائی بوریت میں گزارے تھے۔

اپنے تمام دوستوں سے وہ باری باری مل چکا تھا۔ خواتین دوستوں سے بھی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ محفل بازی اور پینے پلانے کا شغل بھی جاری تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود اس کا دل نہ جانے یہاں کیوں نہ لگ رہا تھا۔ اپنا وجود اسے بے طرح کھوکھلا سا لگ رہا تھا۔ ایک بے چینی تھی، ایک بے کلی تھی جو اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

یوں لگتا اس کی کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے جس کے بارے میں خود اس کو بھی علم نہ تھا کہ تلاش ہی کر سکتا۔

آج کا سارا دن بھی اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں گزار دیا تھا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی جب اچانک اسے ماریا کا خیال آیا اور وہ ٹیلیفون کی جانب لپکا۔

ماریا اس کی نئی دوست تھی۔ کوئی ایک ماہ پیشتر اس کی اس سے ایک کیفے میں ملاقات ہوئی تھی۔ نہایت مختصر ملاقات۔ ایک دوسرے کے نام اور ٹیلیفون نمبروں تک محدود۔ طاہر نے اس کا نمبر ملایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ کیا وہ اس وقت اس کے فلیٹ پر آ سکتی ہے؟ ساتھ ہی اس نے اپنے فلیٹ کا پتہ اسے بتا دیا۔

ماریا نے پہلی ملاقات میں ہی اس میچ رنگت والے اور بے تحاشا پیسے خرچ کرنے کے عادی نوجوان کو دل سے پسند کیا تھا۔ وہ اس سے دوستی بڑھانا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لئے اس سے بڑھ کر بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔

ماریا نے فوراً حامی بھرلی اور تیس میل کا فاصلہ بذریعہ کار طے کرکے آدھ گھنٹے کے اندر اندر وہ اس کے فلیٹ پر پہنچ گئی۔

سردی کے مارے اس کا خوبصورت سرخ و سفید چہرہ قدرے نیلا ہو رہا تھا۔ آتے ہی اسے ہیلو کہہ کر وہ باتھ روم میں گھس گئی نہانے کے بعد وہ مختصر لباس میں طاہر کے سامنے تھی۔

اس کا دودھ کے مانند سفید جسم ڈھلنے کے بعد اور سفید لگ رہا تھا۔

چند لمحے وہ مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔ ماریا نہ سمٹی تھی نہ سکڑی تھی۔ نہ ہی اس کے چہرے پر شرم و حیا کا کوئی سایہ لہرایا۔ بس وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔

طاہر بظاہر ماریا پر نظریں جمائے کھڑا تھا لیکن اس کے پردۂ ذہن پر یک بیک کئی ہیولے ابھرے۔ پاکستان میں بستی ڈھیلی ڈھالی سمٹی سکڑی ہنگی سی لڑکیاں .... جن کے چہرے پر بھی اگر نظر پڑ جائے تو ان کا چہرہ کئی رنگ بدلتا تھا اور خود کو ڈھکنے اور چھپانے میں مصروف ہوتے ہوئے بوکھلائی جاتی تھیں۔

ماریا کا جسم بہت خوبصورت تھا۔

اس کی آنکھوں میں عجیب و غریب چمک تھی۔

چہرے پر بڑی دل کش مسکراہٹ تھی۔

لمحے لمحے ماریا کی تصویر کے آگے ساری تصوراتی شبیہیں ماند پڑ گئیں۔

پاکستانی لڑکیاں اسے منافق نظر آنے لگیں۔

جو اپنے فطری جذبات کو چھپاتی ہیں

عورت کو مرد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ------

------ اسے ایک بار پھر پاکستانی لڑکیوں سے گھن آنے لگی۔ اور لمحہ بھر میں اسے ماریا پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

وہ بیڈ روم میں آکر صوفے پر گر گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ماریا بھی اندر چلی آئی۔ اس نے رک کر نگاہ غلط انداز طاہر پر ڈالی اور ڈریسنگ ٹیبل کے قریب پہنچ کر ہیئر ڈرائیر سے اپنے بال سکھانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سیدھی طاہر کی طرف آ گئی۔ اس کے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ تھی۔

نہ جانے کیوں طاہر نے اس سے اپنے آپ کو دور کرنا چاہا۔

ماریا کو اس کی اس حرکت پر حیرت کے ساتھ ساتھ ناگواری

کا احساس ہوا۔ لیکن وہ ان خوبصورت لمحات کو تلخ بنانا نہیں چاہتی تھی۔

.... طاہر کے حواس جب جواب دینے لگے تو اس نے اپنی باہیں طاہر کی گردن کے گرد حمائل کر دیں۔ جذبات کا تیز ریلا آیا۔ لیکن اگلے لمحے طاہر نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ نہ جانے کہاں سے کوئی ناگوار سی بُو اٹھ رہی تھی۔ اسے ماریا کی قربت سے ناگوار سی بُو کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے چند لمحے بڑی عجیب و غریب نظروں سے ماریا کی جانب کچھ سوچتے ہوئے دیکھا پھر یک لخت اس نے اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے شکنجے سے آزاد کر دیا اور صوفے پر ٹوٹی ہوئی ڈال کی طرح گر گیا اور صوفے کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

ماریا نے ایک دو بار اس کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا لیکن وہ اپنے حواسوں میں کب تھا۔

ایک مہک ان دیکھی سی۔ ایک انجانی سی خوشبو نے اس کا احاطہ کر رکھا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس میں گم تھا۔

بہت دیر گذر گئی۔

کئی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

گویا صدیاں بیت گئیں۔

قرن گزر گئے۔

اس نے جب آنکھیں کھولیں تو کمرہ خالی تھا۔ ماریا شاید جا چکی تھی۔ ماریا بھی بہر حال صنفِ نازک سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ اس کی نسوانیت پر، اس کی انا پر بہت بڑی چوٹ تھی۔

طاہر نے اپنے چاروں اطراف نگاہیں گھمائیں

ماریا جا چکی تھی۔

خوشبو کا ہالہ بھی اسے جُل دے گیا تھا۔

اب وہ تنہا تھا۔ بالکل اکیلا۔ سوچتا ہوا، کھویا ہوا بدحواس سا وہ چند لمحے آنکھیں موند کر سکون سے کچھ سوچتا رہا پھر جست لگا کر اٹھا اور وارڈروب کھول کر اپنے کپڑوں کو اپنے اٹیچی کیس میں جمایا۔ اپنے کمرے کو لاک کر کے چابی مالکن کے حوالے کی اور سیدھا ایئر پورٹ کی طرف چل پڑا۔

آج قسمت بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ رات ایک بجے والی فلائیٹ میں اسے پاکستان کی ایک سیٹ مل گئی۔ ہوائی جہاز کی سیٹ پر بیٹھتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے صدیوں کی تھکن اتر گئی ہو۔ وہ خود کو نہایت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

پھر جب ہوائی جہاز پاکستان کی فضاؤں میں داخل ہوا تو بالکل غیر ارادی طور پر وہ کھڑکی میں سے باہر کو اور نیچے جھانکنے لگا۔

اچانک وہی مخصوص سی مہک، خوشگوار اور دل خوش کن سی خوشبو اس کے چاروں طرف پھیل گئی

یکلخت جیسے اس پر کوئی بھید کھل گیا ہو۔

جیسے کسی بھولے بھٹکے راہی کو منزل مل جائے۔

کسی فلسفی کا عرصے سے اُلجھا ہوا مسئلہ حل ہو جائے۔

کسی ریاضی داں کا صدیوں سے حل نہ ہونے والا سوال حل ہو جائے

جیسے کوئی سائنسداں طویل عرصے کی کوششوں کے بعد کوئی نئی چیز ایجاد کر لے۔

بس کچھ اسی قسم کی مسرت سے وہ اس وقت دو چار تھا۔

ایک دم سے اس پر یہ راز منکشف ہوا کہ وہ مہک وہ جان لیوا خوشبو تو اس کے اپنے دیس کی مٹی کی خوشبو تھی۔

اپنے وطن کی فضاؤں میں رچی مہک تھی۔

وہی جان لیوا خوشبو جسے وہ پچھلے کئی روز سے حرزِ جاں بنائے ہوئے تھا۔

اپنے وطن کی مہک

اپنی دھرتی کی خوشبو تھی

جو اسے بُلا رہی تھی۔

پکار رہی تھی۔

اور وہ اس بلاوے پر اپنا سب کچھ قربان کر کے چلا آیا تھا۔

*

کرن کتاب
پیوند کاری
(پیچ ورک)
اس کتاب میں مختلف کپڑوں کے فالتو ٹکڑوں سے کارآمد استعمال کی چیزیں بنانے کی تراکیب تصاویر کے ہمراہ شامل ہیں
ہر خاتون کے لئے ایک کارآمد کتاب
آج ہی بہنوں کے مقبول ترین ماہنامے
کرن
کے اکتوبر کے شمارے کے ہمراہ مفت حاصل کریں!

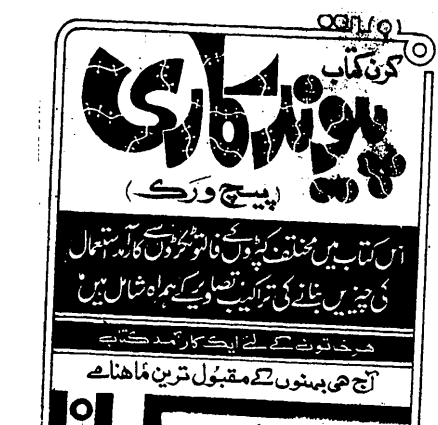

تنِ داغ داغ لٹا دیا

نسرین قریشی

میں گزشتہ چار سال سے ٹھیکیداری کر رہا ہوں۔ حال ہی میں مجھے ایک گرلز کالج میں ہاسٹل کی تعمیر کا ٹھیکہ ملا تو میں لاہور سے یہاں چلا آیا۔ ہاسٹل کی تعمیر کا یہ ٹھیکہ مجھے والد صاحب کے ایک دوست ضیاء الرحمٰن صاحب کی وساطت سے ملا تھا، اس وجہ سے میں ان کا بہت مشکور و ممنون تھا۔

اب رہائش کا مسئلہ تھا۔ یوں تو ضیاء انکل نے مجھے اپنے ہاں قیام کی دعوت دی تھی۔ مگر ہوسٹل کی تعمیر و تکمیل میں اٹھارہ ماہ صرف ہونے تھے۔ پھر والد صاحب کا بھی حکم تھا کہ میں اپنے قیام کا بوجھ ان کے دوست پر قطعاً نہ ڈالوں۔ اسی وجہ سے میں پہلی فرصت میں کوئی فلیٹ چاہتا تھا۔ یا پھر ایک کمرہ ہی کیوں نہ ہو اس وقت میں وہ بھی کرائے پر لے لیتا۔ لیکن مشکل یہ تھی میں اس شہر سے واقف نہ تھا۔ نیا نیا آیا تھا۔ اب تک ضیاء انکل کا بیٹا احتشام ہی گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا — میری اس سے دوستی محض دو پل میں ہو گئی تھی۔ اور ان پہلے پانچ دنوں میں ہی اس کی مدد سے میں نے ارد گرد کا خوب اچھی طرح جائزہ لے لیا اور آج اسے کوئی مکان دکھانے کو کہہ بیٹھا۔

"تم زیادتی کر رہے ہو شیراز! پاپا نے تمہیں رات بھی روکا تھا۔" وہ بولا تو میں ہنس پڑا۔

"ارے تم بھی بھول رہے ہو احتشام صاحب! کہ آخرکار انکل نے مجھے اجازت دے دی تھی۔ چلو یار جلدی جلدی یہ کام نمٹاؤ تاکہ میں یکسوئی سے ہاسٹل کے سلسلے میں اپنا کام شروع کر دوں۔"

"اُوہو تم —" وہ دانت پیس کر بولا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ "جاؤ گے کہاں؟ ایک عدد کمرہ کہاں پوچھتا پھروں گا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہاں تکلیف کیا ہے؟"

"تکلیف مجھے نہیں ہے۔ میں تو بہت خوش ہوں، بڑے مزے میں ہوں۔ لیکن اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ بھی مزے میں رہو۔ یار غیر معینہ مدت کا مہمان وبالِ جان بن جاتا ہے جبکہ میں صرف مہمان رہنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی مہمان وہمان نہیں ہو تم۔ یہ گھر ہے تمہارا۔"

"بہت شکریہ۔ لیکن یہ لو ایڈریس۔ کل غلام نبی بتا رہا تھا کہ اس محلے میں ایک مکان خالی ہے۔ چلو ان سے بات کر کے دیکھتے ہیں۔"

احتشام سارا راستہ بڑبڑاتا رہا۔ آخر ہم مطلوبہ جگہ پہنچ گئے میں مالک مکان سے بات چیت کرتا رہا۔ مگر اس کا منہ اب تک بنا ہوا تھا۔ وہ مکان چار کمروں پر مشتمل تھا۔ مالک مکان اسے کسی فیملی کو دینا چاہتا تھا جبکہ مجھے صرف ایک کمرہ درکار تھا۔ وہ شخص کسی طور نہ مان رہا تھا۔ ہم مجبوراً چل پڑے۔ پھر کئی جگہ گئے — آخر کار ایک محلے میں مجھے اپنا مطلوبہ مکان مل گیا۔ میں نے ضرورت کی چیزیں احتشام کے ساتھ مل کر خریدیں اور دونوں نے مل کر اس کمرے کو سیٹ کیا۔ تب کہیں جا کر میں اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔

سارا سارا دن بھاگ دوڑ کی نظر ہو جاتا تھا۔ کبھی میٹیریل کے لیے بھاگتا کبھی مزدور لاتا تھا۔ آخر یہ کام بھی ہو گیا تو بس میں دو تین چکر لگا آتا اور شام کو انہیں مزدوری دے کر چھٹی کراتا۔ انہی دنوں مجھے دو اور ٹھیکے مل گئے تو جہ بٹی اور مصروفیات بڑھ گئیں۔ اب ایک پاؤں میرا کالج میں ہوتا تو دوسرا مارکیٹ میں۔ مصروفیات کچھ اتنی زیادہ تھیں کہ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ تھی اور کالج کی نوخیز کلیاں بھی میری توجہ نہ کھینچ سکی تھیں — میں اس روز کسی کام سے جب پرنسپل کے آفس کی جانب جا رہا تھا تو کئی لڑکیاں چونکی تھیں۔ مگر میں سر جھکائے اپنے ایک ساتھی سے باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا۔ لیکن مجھے اپنے وجود پر پڑنے والی ہر نگاہ کا اندازہ تھا اور خوب اچھی طرح تھا۔ ہر چوتھے پانچویں روز مجھے پرنسپل صاحبہ کو رپورٹ دینا ہوتی تھی۔ تب انکے آفس جاتے ہوئے راستے میں بہت سی لڑکیوں کی بولتی آنکھیں

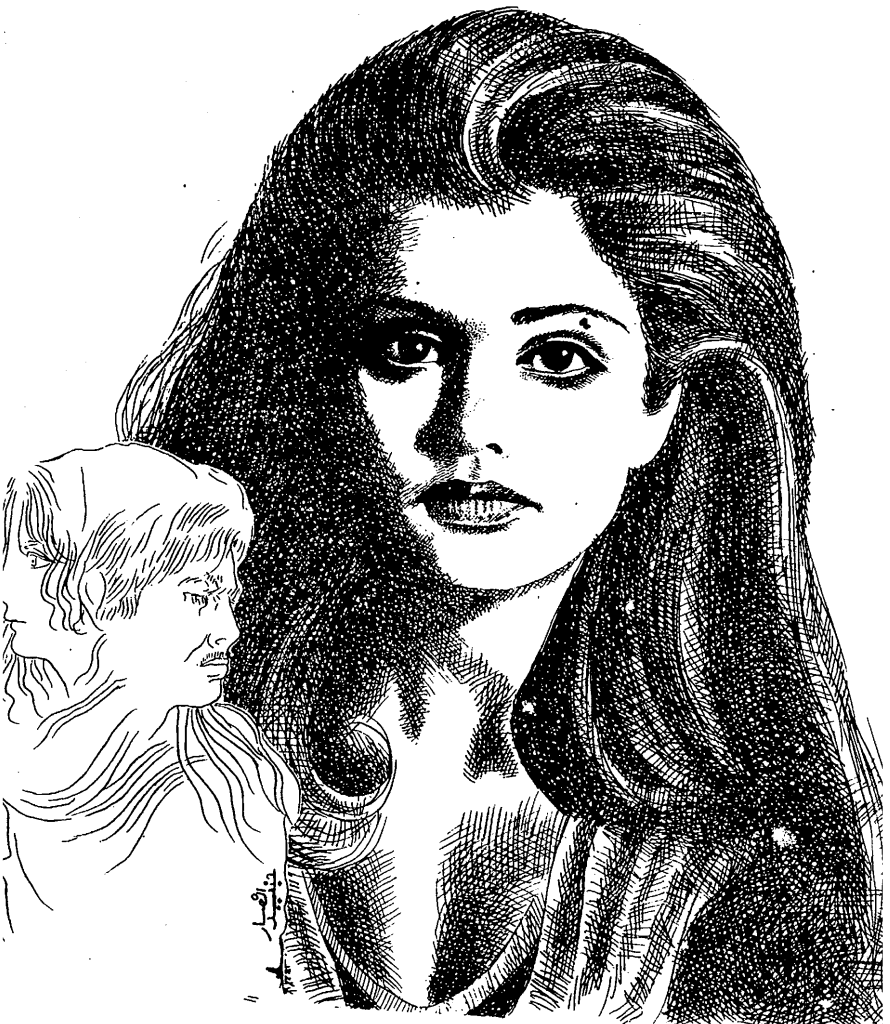

ٹکراتیں۔ مگر میں سر جھکا لیتا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ جاتا تھا لیکن اس روز جب میں پرنسپل کے آفس کی جانب بڑھا تو ایک طرف چند لڑکیاں تھیں۔ ان کے کندھوں پر بیگ لٹک رہے تھے اور ہاتھوں میں فائل تھی۔

"پارو۔ چل کون کھانے ہیں۔"

پارو۔ میں اس نام پر سر اٹھا کر ادھر ہی دیکھنے لگا کہ یہ چہرہ تو گذشتہ کئی روز سے میری نگاہوں کی زد میں تھا۔

چلو

ایک خوبصورت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے دیکھا وہ سب کون کھانے چلدی تھیں۔ میں آگے بڑھ آیا۔ مگر ذہن میں سیٹھ مرلی دھر کی حویلی ابھرنے لگی تھی۔ یہ چہرہ جسے کسی لڑکی نے پارو کے نام سے پکارا تھا میں نے بارہا اسے اسی حویلی سے نکلتے دیکھا تھا۔ پھر بارہا میرا اسکوٹر اور مرلی دھر کی گاڑی صبح آٹھ بجے کے قریب آگے پیچھے کالج پہنچے تھے۔

یہ اور بات ہے کہ میں اپنے اسکوٹر کو اندر سے جاتا اور مرلی دھر کی گاڑی وہیں سے پلٹ جاتی تھی۔ میں کنکھیوں سے دیکھتا، ایک نازک سی لڑکی جس کا چہرہ چاند کی طرح روشن روشن تھا بڑی ادا سے کھٹ کھٹ کرتی اندر چلی آتی تھی۔ بہت بار ایسا ہوا تھا۔ اور آج جب اس خوبصورت لڑکی کا نام مجھے معلوم ہوا تھا تو اچھی خاصی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

شام ڈھلے میں تھکا ہارا گھر واپس آرہا تھا۔ دو ماہ ہو گئے تھے مجھے یہاں رہتے ہوئے۔ کئی لوگوں سے واقفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور گلی کے نکڑ پر علی احمد صاحب کا مکان ہے۔ ان صاحب سے تو دوستی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان کے مکان کے قریب ہی ایک گھر چھوڑ کر اس محلے کی شان۔ مرلی دھر کی عظیم الشان حویلی ہے۔ علی احمد بتا رہا تھا کہ اس دو منزلہ حویلی کے کمروں کی تعداد ۴۵ تک ہے۔ اور میں یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

"کتنے افراد ہیں مرلی دھر کی فیملی کے؟"

"سیٹھ مرلی دھر ہیں، ان کی بیگم ہیں، تین بیٹے ہیں اور شاید ایک بیٹی ہے۔"

"بس۔ یہی افراد ہیں؟ پھر یہ ۴۵ کمروں کا کیا کرتے ہیں؟"

"بھئی تمہیں اتنی دلچسپی کیوں ہے، کچھ بھی کریں۔" علی احمد ہنس پڑا تھا۔ "اچھا بھئی...... میں ذرا بازار تک ہو آؤں۔ تمہاری بھابی نے کچھ چیزیں منگوائی ہیں۔ پھر آکر بیٹھوں گا۔"

وہ یہ کہہ کر چلا گیا تو میں بھی اپنے بستر پر گر گیا۔

اگلے روز میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس وقت میں کالج جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اسی سمے پارو کی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو میں بھی تیزی سے بیرونی دروازے کی سمت بڑھا۔ اسکوٹر باہر نکالا اور جلدی سے تالا لگا کر اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا۔ یہ لڑکی کچھ اتنی کومل تھی کہ میری خواہش تھی کہ دن بھر کے کاموں میں مغز ماری سے قبل میں اس کی صورت سب سے...... پہلے دیکھوں۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک چوراہے پر سبز بتی کے انتظار میں پارو کی گاڑی کے برابر کھڑا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے گاڑی میں جھانکا۔ وہ کچھ نوٹس دیکھ رہی تھی۔ شاید ٹیسٹ تھا آج۔ جبھی پڑھائی کچھ اتنی زیادہ ہو رہی تھی۔

پھر روز ہی یہ اتفاق ہونے لگا کہ میرا اسکوٹر پارو کی گاڑی کے آگے پیچھے نظر آنے لگا تو وہ جیسے چونک سی پڑی۔ اور میں منہ پھیر کر مسکرا دیا۔

کئی روز یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اب پارو کی نگاہیں بھی شاید صبح ہی صبح مجھے تلاش کرنے لگتی تھیں۔ مگر میں یوں لاپرواہی سے اس کی گاڑی کے پاس سے گذر جاتا جیسے یہ تو محض اتفاق ہے۔ میں پارو پر ہرگز یہ جتانے کے حق میں نہ تھا کہ یہ روز کا ساتھ ساتھ گھر سے نکلنا اور کالج پہنچنا کسی "سازش" کا نتیجہ ہے۔ ایک بار بھی میں اسے غور سے دیکھ لیتا تو وہ یقیناً اس واہمے بلکہ حقیقت کا شکار ہو جاتی کہ یہ سب میں جان بوجھ کر رہا ہوں، اس کی چاہ میں اس کی آرزو میں کر رہا ہوں۔

اس روز بھی وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک درخت کے سائے میں بیٹھی گپیں ہانک رہی تھی۔ میں وہاں سے کچھ ہی فاصلہ پر کھڑا مسز اسلم رحمان سے بات چیت کر رہا تھا۔ انہیں پرنسپل صاحبہ نے حال ہی میں ہاسٹل کی ذمہ داری دی تھی۔ اب مجھے ہر قسم کی ہدایات انہی سے لینا ہوتی تھیں۔ پھر مسز رحمان تو چلی گئیں۔ مگر میں اپنے اسسٹنٹ سے وہیں کھڑا باتیں کرنے لگا۔ مگر میرے کان ان لوگوں کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

"پارو! یہ شخص ہے بڑا اسمارٹ۔"

یہ رائے یقیناً میرے بارے میں تھی۔ اپنی اسمارٹنس کے بارے میں سُنا تو ہاتھ خواہ مخواہ کالر اور ٹائی کی گرہ پر جا پہنچے

"چلو یار بجری وغیرہ کا آرڈر دے آئیں۔ صبح سے تو تمہیں جلدی پڑی تھی اب کیا ہوا؟" میرا اسسٹنٹ بولا۔

"جلدی تھی ہی نہیں بلکہ اب بھی ہے۔ مگر تم جانتے ہو کہ یہاں کام کتنی سست رفتاری سے ہو رہا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ میں ان پر بھرپور توجہ نہیں دے پا رہا ہوں۔ یار لگتا ہے جیسے یہ سب سلو موشن میں ہو رہا ہے لہٰذا میں تھوڑی دیر ان مزدوروں کو دیکھتا ہوں تم جا کر آرڈر دے آؤ کہ کل صبح دو ٹرک، ایک ریت اور دوسرا بجری کا پہنچ جائے۔"

جونہی وہ دفعان ہوا تو میں پھر ادھر کان لگا بیٹھا۔ ان کی گفتگو کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ میں نے اُسے کوسا جس نے عین موقع پر مجھے باتوں میں الجھا لیا تھا۔ مگر خیر بچی کھچی گفتگو بھی کم حوصلہ افزا نہ تھی۔

"چلو مانا کہ شریف آدمی ہے۔ اور بھئی ایمانداری کی بات ہے کہ نظر بھی آتا ہے۔ مگر نام کیا ہے؟ تمہارا تو محلے دار ہے تمہیں پتہ ہی ہوگا۔"

"نام ۔ بھئی کچھ یاد نہیں۔ دراصل یہ حال ہی میں، صرف

...د ماہ ہی قبل ہمارے محلّے میں آیا ہے۔ مگر تمہیں نام سے کیا
...لب ہے محترمہ فرحت صاحبہ!" وہی کھنکتی آواز تھی جو میرے دل
...ی دھڑکن بن چکی تھی۔
'واہ۔ میں نے تمہارے پڑوسی سے کیا لینا؟ اور کیا
...ینا ہے۔ بس میں نے تو یہ پوچھا ہے کہ تمہارے اس
...ریف پڑوسی کی نظر کبھی تم پر نہیں پڑی؟"
بڑی شریر آواز تھی۔ میں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو دبایا
اور رُخ پھیر موڑ لیا۔
'نظر پڑنے کا کیا سوال! بتایا تو ہے بہت شریف آدمی
...ہے۔ پھر تم سب میری حویلی کو بھی جانتی ہو کہ کس بیہودہ انداز
...پر بنائی گئی ہے۔ چاروں جانب کمرے ہی کمرے ہیں۔ پھر دوسرے
دو منزلہ ہے اور تیسرے چھت پر بھی اونچی اونچی دیواریں کھڑی
کر دی گئی ہیں۔ ایسے میں اسے کیونکر نظر آسکتی ہوں۔ اور پھر
وہ دیکھے بھی کیوں؟ کیا کوئی اور کام نہیں ہے اُسے؟"
'بہت کام ہیں بتو۔ سارا وقت غریب گھن چکر بنا رہتا
ہے اب گیا اب آیا۔ مگر تم بتا رہی تھیں صبح کے وقت تو فارغ
ہوتا ہے وہ۔"
ایک اور بے پناہ شریر آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔
'اُتو کی دُم۔ ٹھہرو تم۔!" وہ اس کے پیچھے بھاگی تو وہ باقی
بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں چند لمحے وہیں اپنی اسی پوزیشن میں
کھڑا رہا جب وہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اپنا اسکوٹر
سنبھالا کہ مجھے تو کسی الیکٹریشن سے بہت ضروری ملنا تھا اور یہ
پارو کی بچی ــــ اس کی وجہ سے بہت وقت برباد ہو گیا تھا۔
شام کو تھکا ہارا بستر پر گر گیا۔ مگر اسی وقت احتشام آگیا
تو پارو کی پرچھائیں نظر میں ڈولتی رہ گئی۔
"بہت تھکے تھکے نظر آرہے ہو؟" وہ میرے بستر پر
ہی ٹک گیا۔
'ہاں یار۔ کام ہی ایسا ہے۔"
'میں تو ہمیشہ سے کہتا ہوں کہ تم بڑے احمق ہو۔ بھلا اس
کام میں پڑنے کی کیا تُک تھی۔ مجھے دیکھو دفتر میں بیٹھا عیش کرتا
ہوں، عیش!!"
"چسکا میرے بھائی چسکا۔ میں لگی بندھی تنخواہ میں گزارہ
نہیں کر سکتا۔ کھلی رقم چاہتا ہوں۔ آئے اور دامن بھر دے۔
"نوکری وکری میرے بس کا روگ نہیں یار۔"
'مگر یہ ٹھیکیداری تو مجھے جوا لگتی ہے جس میں جیت جاؤ

تو مال ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ رسک ہی رسک ہے اس میں۔"
"تجربہ کبھی ہارنے نہیں دیتا۔ اناڑی ہارا کرتے ہیں۔ اور
میں اناڑی نہیں ہوں جب کام مکمل کر کے اپنی محنت کا معاوضہ
پاتا ہوں تو ساری تھکن اتر جاتی ہے۔"
'اچھا ــ! اب چائے کی پیالی تو پلاؤ تاکہ میں یہاں سے
رخصت ہوں۔" احتشام بولا تو میں بری طرح ہنس دیا۔
"اپنا شعبہ کچن نہیں ہے۔ چائے کا سامان خصوصاً تم نے
اپنی خاطر مدارت کے لئے ہی رکھا تھا۔ جاؤ بنا لو۔ میں بھی پی لونگا۔"
'میں بناؤں؟"
'بالکل! ہمیشہ یہاں آکر بناتے ہو پھر آج کونسی نئی بات
ہے؟" میں ہنس دیا۔
'ہاں۔ یہ تم اتنا چہک کس سلسلے میں رہے ہو؟"
وہ میرے سر پر کھڑا بری طرح گھور رہا تھا۔
'بے فکر رہو۔ چائے کا سلسلہ ہرگز نہیں ہے۔"
'آج میں خود چائے ہرگز نہ بناؤں گا۔ احتشام اکڑا۔
'کیوں۔ آج کیا ہوا؟"
'ہونا کیا تھا ــ مگر نغمہ اس شق میں ترمیم ہو سکتی ہے
اگر تم یوں چہکنے اور ہنسنے کا مطلب بتا دو۔" وہ بولا۔
'مطلب؟" میں نے سوچنے کی اداکاری کی پھر بڑے
آرام سے اس کے کان میں ہولے سے کہا۔
'مطلب ہنسنے اور رونے کا ایک۔"
'رونے کا نہیں چہکنے کا۔" اس نے تصحیح کی ـــ" ہاں
وہی تو جناب! ایک عدد کومل سی، پیاری سی، نازک سی۔"
'بس بس۔ تمہاری یہ سی سی بتا رہی ہے کہ وہ کوئی لڑکی ہے
کہو ہیں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" احتشام پھر اکڑا۔
'نیور۔! وہ ایک بڑھیا بھی ہو سکتی ہے۔"
'غلط۔ بڑھیا نازک ہو سکتی ہے اگر اسے ضعیف کے
معنوں میں استعمال کرو۔ مگر وہ نہ تو پیاری ہو سکتی ہے اور نہ ہی
کومل۔ چلو اب حدود اربعہ بتاؤ لڑکی کا۔"
'یہ نہ بتاؤں گا۔ بس ہے ایک لڑکی۔ دل کو بھا گئی ہے۔"
تو آج اسی خوشی میں چائے پلا دو۔" وہ یتیم سی صورت بنا کر بولا۔
تو میں بھی فراخدلی پر اتر آیا۔
'چلو۔" میں بولا۔ کیونکہ وہ یہاں آکر ہمیشہ خود چائے بناتا
تھا۔
'کہاں؟"

"کسی شاندار سے ہوٹل میں تمہیں چائے پلاؤں ۔۔ میں نے کھانا بھی کھانا ہے۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

اور ہم دونوں ہنستے ہوئے باہر نکل آئے۔ تبھی اسی وقت سیٹھ مرلی دھر کی گاڑی حویلی کے بڑے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی، اور میں نے دیکھا پارو نے مجھے دیکھ کر بے ساختہ نظریں چرا لی تھیں۔

"یہ ادھر کیا تاڑ رہے تھے؟"

"لڑکی کو۔۔!"

"ہیں ۔۔ یعنی لڑکی کو ۔۔۔ اسی لڑکی کو ناں ۔۔؟"

"جی نہیں۔ اب ساری لڑکیاں وہی تو نہیں بن سکتیں۔"

"ہاں ۔ یہ بھی ٹھیک ہے ۔ مگر ہر شریف بہو بیٹی کو یوں تاڑنا بھی اچھی بات نہیں ہے۔" احتشام نے کہا اور میں نے خاموشی کی زبان میں اس سے اتفاق کر لیا۔

اس دوپہر جب میں کام کا جائزہ لینے آیا تو وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ کھڑی تھی۔

"لو آ گیا تمہارا ہمسایہ ۔ صبح سے مری جا رہی تھیں۔"

"آہستہ بولو بدبخت ۔ وہ سن لے تو؟"

مدھم سی سرگوشی میرے کانوں میں دم توڑ گئی۔

اسی دن وارڈن صاحبہ نے بھی بلوایا تھا۔ میں ادھر گیا تو انہوں نے بتایا کہ اولڈ ہوسٹل کے دو تین کمروں کی چھتیں ٹپکتی ہیں کچھ بجلی کا کام بھی ہے۔"

میں وہاں سے واپس آ رہا تھا کہ پارو کو ادھر ہی آتے دیکھا۔ اس وقت آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ ساری ونگ خالی پڑی تھی۔ لڑکیوں کے ہنسنے بولنے کی آواز بھی نہ تھی کہ سبھی کالج گئی ہوئی تھیں۔ میں آنکھیں پھاڑے پارو کو دیکھنے لگا۔ وہ تھوڑا گھبرا سی گئی۔

"ہمسایہ ہوں آپ کا۔ پھر اتنی خوفزدہ کیوں ہیں؟"

مگر وہ تیزی سے ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور میں بھی باہر چلا آیا۔ مجھے اس کی گھبراہٹ بہت پسند آئی تھی کہ میرے خیال میں یہ بھی ایک شریف لڑکی کے پاکیزہ کردار کی مظہر ہوتی ہے اور اگلے روز وہ سب پھر کون کھاتی ہوئیں میرے بارے میں مصروف گفتگو تھیں۔ پارو کے حوالے سے باتیں کی جا رہی تھیں۔ ہم دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جا رہا تھا۔ میں اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ ان سے تھوڑے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

"یہ تو نہ کہو پارو۔ بات نظر آنے کی نہیں۔ اب یہاں کالج میں بھی تو ہزاروں لڑکیاں بھری پڑی ہیں مگر دیکھ لو۔ جب آتا ہے سر جھکا کر آتا ہے۔ بھئی مجھے تو زبردست حیرت ہوتی ہے۔ آج کل تو لڑکیاں اتنی بیباک ہیں اور وہ مرد ہو کر۔"

جانے کون تھی، صفائی پیش کر رہی تھی۔

"ارے رہنے دو رفعت۔ گھنّا ہے گھنّا۔!"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" جانے کون پوچھ رہی تھی۔

"رابعہ سے ملنے کل ہوسٹل گئی تھی کہ آج کالج کیوں نہیں آئی۔ تو یہ بھی وہیں تھا۔ تو یہ ۔۔۔ وہ آنکھیں جو ہر وقت جھکی رہتی ہیں نا اس وقت کسی اُلو کی مانند پھٹی پڑی تھیں۔ ارے یہ کمبخت بس لڑکیوں کے ہجوم میں شریف بنتا ہے۔" وہ کافی اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ شاید مجھے ہی سنانا چاہتی تھی۔

"اب اسی کی باتیں ہوتی رہیں گی یا مسز قمر کا پیریڈ بھی اٹینڈ کرنا ہے۔" نجمہ بولی تب جیسے سب کو ہوش آ گیا اور فوراً وہاں سے چل دیں۔ تب مجھے بھی کل کا واقعہ یاد آ گیا۔ واقعی مجھ سے زبردست حماقت سرزد ہو چکی تھی۔ مجھے اپنا کردار یوں داغ دار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کی سہیلیوں نے اس درخت کے نیچے آ کر بیٹھنا چھوڑ دیا۔ میں نے مہینے بھر سے اس کی صورت نہ دیکھی تھی۔ کالج میں میں بے تکلفی سے آتا جاتا تھا، مگر وہ تو جانے کہاں جا چھپی تھی۔ عجیب قسم کی بے چینی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ کیسے پاؤں۔ اور کیسے دل کی بے چینی سے آگاہ کروں۔

انہی دنوں اولڈ ہوسٹل کی چھتوں سے فارغ ہوا تو فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ اور ایک کامن روم کی چھت کی مرمت کا فوری آرڈر ملا۔ برسات آنے والی تھی اسی لیے پرنسپل صاحبہ چھتوں کی مرمت کا کام کرا رہی تھیں۔ کل میں نے نیو ہوسٹل سے دو مستری پکڑے اور ادھر لگا دیئے۔ پھر دوپہر کو چھتوں کا کام دیکھنے اوپر گیا۔ یہیں ساتھ ہی دوسری طرف منزل کے کلاس رومز میں پڑھائی ہو رہی تھی۔ وہیں ایک کمرے میں مجھے پارو کا خوبصورت چہرہ نظر آ گیا۔ اچانک اس کی نظر اٹھی تو مجھ سے ٹکرائی۔ مگر جلد ہی اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ مگر میری نظر اب بھی اسی کے سراپے پر جمی ہوئی تھی۔

اس کے ماتھے کا تلک اور بے تحاشا حسن اسے اور بھی منفرد ظاہر کر رہا تھا۔ میں اپنے گرد و پیش سے بے نیاز اسے دیکھتا رہا۔ پھر لیکچرار صاحبہ نے طالبات سے جانے

کیا کہا کہ وہ تمام سیٹیں چھوڑ کر لیکچرار کے گرد جمع ہو گئیں۔ مگر چند لڑکیاں اب بھی اپنی سیٹوں پر تھیں یوں لگتا تھا جیسے انہیں اس بتے سے کوئی دلچسپی نہ تھی جو نیچر انہیں دکھانا چاہ رہی تھیں۔

ان طالبات کی نظر باہر کی طرف اٹھی تو مجھ پر جم کر رہ گئی ایسے میں ایک آواز ابھری۔ اور یہ پارو کی سہیلیوں میں سے کسی کی آواز تھی جو کہہ رہی تھی۔

"ارے مردہ نپولین کو کیا دیکھنا۔ ادھر باہر دیکھو۔ زندہ نپولین۔"

اپنے بارے میں یہ نیا انکشاف سُنا تو میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

تو یہاں یورپین ہسٹری کی کلاس ہو رہی ہے۔

میں دل ہی دل میں کہتا نیچے چلا آیا۔ اتنے میں بیل ہوئی تو اوپر کی لڑکیاں نیچے اور نیچے کی لڑکیاں اوپر جانے لگیں۔ سیڑھیوں کے قریب زیادہ رش تھا کہ وہ بھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نیچے آ گئی۔

"ہاں نجمہ۔ وہ تم کسی زندہ نپولین کا ذکر کر رہی تھیں؟" پارو نے پوچھا۔

"بھئی تمہارے تو پڑوس میں رہتا ہے بقول تمہارے۔"

"اوہ۔ کتنی فضول ہو تم سب۔ ہر دم اسی کا ذکر رہ گیا ہے کتنے عظیم آدمی سے تشبیہہ دی تم نے۔"

"بس بس۔ اب تم تو لیکچر نہ دو کہ تمہارا نپولین بھی بس جانے والا ہے۔ اور تمہاری گاڑی بھی پہنچ گئی ہو گی۔ چلو بھاگو جان چھوڑو۔"

میں ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ اور پارو کی آواز ابھری

"ابھی کہاں جائے گا غریب۔ جانے کب تک یہاں مصروف رہتا ہے۔"

"اوہو۔ تو گھبراتی کاہے کو ہو۔ یہیں ہوسٹل میں چلی آؤ میرے پاس۔ یہ شام کو جاتا ہے مزدوروں کو فارغ کرنے کے بعد۔"

یہ شاید وہی لڑکی تھی جس سے ملنے پارو ہوسٹل گئی تھی اور مجھ سے ٹکرا گئی تھی۔

"لو میرا اس سے کیا واسطہ۔ کیا اپنا گھر بار چھوڑ کر اس کی خاطر ہوسٹل چلی آؤں۔" وہی مدھ بھری آواز تھی جس پہ میں دل وار بیٹھا تھا۔

"اب بھی واسطے کی بات کرتی ہو تو پھر یہ روزانہ ایک ساتھ کالج آنا کیا یہ سب اتفاق ہوتا ہے؟"

"ظاہر ہے۔" بڑی شانِ بے نیازی تھی لہجے میں۔

"جی نہیں۔ تم دونوں ہی بدذات ہو۔ عین وقت پر اراداتاً نکلتے ہو۔ ہمیں الو بناتی ہو لڑکی۔ وہ بھی اسی وقت نکلنے کے لئے مرتا ہو گا جب تم کالج آتی ہو۔ اور تم بھی جانے دعائیں مانگتی ہو گی وہ نکل نہ گیا ہو۔"

"واہ۔ اگر نکل بھی گیا تو کدھر جائے گا یہیں تو آنا ہوتا ہے اسے۔" پارو نے کہا تو میں نے دل میں سوچا

کتنی چالاک ہو تم اور کتنی سیاست دان۔ مجھ پہ رعب ڈالتی ہو۔ یہ نہیں پتہ کہ تمہارے دل کی ہر ہر بات مجھ پہ آشکارا ہے۔

میں ہنس کر دیوار کی اوٹ سے نکل آیا۔ ان سب کی باتیں جاری تھیں مگر میرے پاس ہی وقت کم تھا۔ مجھے کئی ضروری کام نمٹانے تھے۔ اس لئے ان سب کی نظر بچاتا اسکوٹر کی طرف بڑھا۔ مگر جس وقت اسکوٹر اسٹارٹ کیا تو اسکا تقریباً پورا گروپ پیچھے گردنیں موڑ چکا تھا۔

چند دن اور بیت گئے۔ میری مصروفیات آج بھی وہی تھیں۔ گھر سے امی جان کے کئی خط آ چکے تھے کہ میں کسی دن گھنٹے دو گھنٹے کے لئے آ کر شکل دکھا جاؤں۔ یہاں آئے کئی ماہ ہو گئے تھے۔ مگر میں چاہتا تو امی جان کی خواہش پوری کر دیتا۔ مگر اس دل کا کیا کرتا جو پارو سے دو پل کے لئے بھی دور ہونا نہ چاہتا تھا۔

وہ میرے پاس نہ تھی، مجھ سے ہمکلام نہ تھی مگر میں اُسے دیکھ تو سکتا تھا۔ میرے لئے یہ بھی بہت بڑی سعادت تھی لہٰذا ہر بار امی کو اپنی مجبوریوں اور اپنی بے پناہ مصروفیات لکھ کر بھیجتا۔ تھک ہار کر امی نے اصرار کرنا بند کر دیا۔

اس روز میں ایک کام کی غرض سے وارڈن صاحبہ کے پاس گیا۔ ذہن میں پارو سے یہاں ہونے والی ملاقات ابھر آئی۔ بے اختیار میرے دل نے دعا مانگی کہ اے کاش آج پھر مجھے یہیں کہیں تنہا مل جائے تاکہ دل کی تھوڑی سی بے چینی سے اسے آگاہ کر دوں۔ اور شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی یا پھر میری طلب ہی سچی تھی جب میں نے دیکھا کہ وہ اس سنسان ونگ میں چلی آئی تھی تو میرے قدم تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور دل خدا کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے یوں میری تمنا پوری

کر دی تھی۔

وہ بڑی ترنگ میں چلی آرہی تھی آنچل کا ایک کونہ گھماتی ہوئی سفید یونیفارم پر بلو دوپٹہ تھا۔ اور کندھے پہ براؤن رنگ کا بیگ جھول رہا تھا۔ میں نے ارد گرد دیکھا اور دوسرے لمحے میں پارو کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔

مجھے یوں اپنے روبرو پایا تو وہ پھر گھبرا گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کی گھبراہٹ غصے میں تبدیل ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ اس لڑکی کے دل میں میرے لئے نرم و نازک سے جذبات ہیں۔ مگر اپنی شرافت کا بھرم رکھنے کو یوں ادائیں دکھاتی ہے اس لئے اس غصے کا مجھ پر بالکل اثر نہ ہوا۔ بلکہ میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔

"پارو۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ اور تم جانتی ہو کہ وہ 'سب کچھ' کیا ہے۔"

"کیا؟" وہ دھاڑی۔ "آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ کوئی ایسی ویسی لڑکی۔ میں سیٹھ مرلی دھر کی بیٹی ہوں۔ کیا سمجھے؟"

"صرف اپنی محبت سمجھتا تھا۔ مگر خیر اگر آپ سیٹھ مرلی دھر کی بیٹی ہی رہنا چاہتی ہیں تو میں آپ کو دوبارہ مجبور نہ کروں گا۔"

میں چہرے پہ اداسیوں کی گھمبیرتا لئے لوٹ آیا۔ پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا کہ وہ مجھے دیکھ بھی رہی ہے یا نہیں۔ پھر میں دو دن کام پر بھی نہ گیا، گھر سے باہر نہ نکلا۔ احتشام کھانا لا کر کھلا جاتا۔

"یہ سب کیا ہے۔ تم اچھے بھلے ہو پھر کیوں گھر میں پڑے رہتے ہو؟ کیا کہیں چوری کی واردات کر آئے ہو کہ گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ کان کھول کر سن لو آئندہ میں تمہاری اس مصنوعی قسم کی بیماری کی تیمارداری نہیں کر سکتا۔"

احتشام بھی دھاڑا۔

"تحمل سے میرے دوست۔ تحمل سے! تمہیں کیا پتہ یہ سب کتنا ضروری ہے۔" میں دبی دبی مسکراہٹ لئے کہہ رہا تھا۔

"مثلاً کتنا ضروری ہے؟ یہ بی بی جمالو بن رہا ہوں۔" وہ لڑاکا خواتین کی مانند آستین چڑھائے پوچھ رہا تھا۔

"بیوقوف تمہارا وقت ضائع ہو رہا ہے، کام کا حرج ہو رہا ہے اور تم ہو کہ پتہ ہی نہیں۔"

"ہو جانے دو جو ہو رہا ہے۔"

"اور یہ دو دنوں کا نقصان؟"

"سب اسی کے کھاتے میں ڈالوں گا۔ اس نے آخر شیراز کو سمجھ کیا رکھا ہے!" میں جوش میں آ گیا۔

"وہ کس طرح؟"

"چاہتی ہے مجھے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"پھر جیت کیسے رہے ہو؟" احتشام نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"اسی کو۔۔۔ کہ وہ صرف دل ہی دل میں ہماری پرستش نہ کرے۔ ذرا ہمت کرے۔"

"تو یہ بات ہے۔" احتشام نے شرارت سے کہا تو ہم دونوں ہنس دیئے۔

"سب تمہاری شاگردی کا نتیجہ ہے۔"

"مجھے الزام نہ دو۔ اپنا یہ حساب کتاب بھی اسی کے کھاتے میں ڈالو کہ یہ سب اسی کی کرپا ہے۔"

احتشام نے "کرپا" کا لفظ استعمال کیا تو میں آنکھیں پھاڑے اسے گھورنے لگا۔

"یوں کیوں دیکھ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتی ہے؟"

وہ میرا سوال سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ سمجھدار آدمی تھا۔ میرا مذہب کے بارے میں پوچھنا اور اپنا "کرپا" کہنا سبھی یاد آ گیا۔ پھر بولا۔

"جی جناب! وہ ہندو مذہب سے ہے اور میرا خیال ہے اس کا یقیناً سیٹھ مرلی دھر سے بھی واسطہ ہو گا۔" اس نے اندھیرے میں تیر چھوڑا جو نشانے پر لگ گیا تھا تب میں نے سبھی کچھ اسے بتا دیا۔

"اس عشق کا انجام کیا ہو گا؟" احتشام نے پوچھا۔

"وہی جو ہونا چاہیئے۔ اگر اس نے ہمارے لئے مذہب ترک کر دیا تو محترمہ مسز شیراز ہوں گی۔"

"واہ جی۔ پارو بیگم جناب کو گھاس نہیں ڈالتیں اور یہ انہیں اپنی مسز بنانے چلے ہیں!" اس نے تمسخر اڑایا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

"یار دیکھو علی احمد ہو گا۔"

احتشام دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر فوراً ہی الٹے پاؤں واپس آ گیا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یار! وہ آ گئی ہے۔ تمہاری ہونے والی مسز!"

"تو لے آؤ! مگر اسے بتانا کہ میں بیمار ہوں۔ جاؤ جاؤ"

لے آؤ اندر۔" میں خوشی سے لرزتی آواز میں بولا۔

"اور ہاں احتشام صاحب، اسے اندر پہنچا کر خود بھی دفعان ہو جانا، کل ملیں گے۔"

مگر جواب میں اس نے آنکھیں دکھائیں اور گھونسہ دے مارا۔

اگلے لمحے وہ پارو کے پیچھے پیچھے تھا۔ پارو کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور اس نے اپنا پورا وجود ایک چادر میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے بمشکل اٹھنے کی اداکاری کی۔

"آپ بیٹھیں خاتون! شیراز تو پرسوں سے بیمار پڑا ہے، غریب سے اٹھا بیٹھا بھی نہیں جاتا۔"

احتشام کے "خاتون" کہنے پر میں نے بمشکل ہنسی روکی۔ وہ احتشام کی بات سن کر شرمندہ سی کھڑی تھی۔ وہ اس کے لئے کرسی لے آیا۔

"بیٹھئے!" میں نے آواز کو بہت مدھم کر لیا تھا۔ وہ چادر سنبھالے بیٹھ گئی۔

میں نے احتشام کو جانے کا اشارہ کیا تو وہ دانت پیستا ہوا جانے لگا۔

"خاتون! میں ذرا شیراز کی دوا لے آؤں۔ آپ آ کر دروازہ بند کر لیں۔"

وہ اٹھ کر دروازہ بند کرنے چلی گئی۔ اور واپس آئی تو میں منہ بنائے لیٹا تھا۔

"بہت شرمندہ ہوں میں!" اس نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔ میں اس قابل ہی نہ ہونگا جو آپ نے وہ سب کہا۔ پھر میں نے تو بالکل برا نہیں منایا کہ ہر شخص اپنی پسند ناپسند کے سلسلے میں آزاد ہے۔ پھر میں آپ کو مجبور کیوں کروں؟" میں عیاری سے بولا۔

"برا نہیں منایا تھا تو پھر یونہی بیمار پڑ گئے۔" وہ شوخی پر اتر آئی۔

"یہ تو شاید اس لئے ہوا کہ آپ نے ایسا چاہا ہوگا!"

"میں نے؟"

"اور کیا۔ اسی وقت اقرار کر لیتیں تو ہم کاہے کو بیمار پڑتے۔"

"اچھا جانے دیں اب۔ اب میں آ گئی ہوں لہذا فوراً ٹھیک ہو جائیں۔"

بڑا محبت بھرا حکم تھا میں مسکراہٹ کو روک نہ سکا۔

"آپ کہیں اور ہم نہ مانیں۔ میں صبح کالج آؤں گا ۔۔۔۔ انشاء اللہ!"

"جی نہیں۔ اب ہمیں اتنی سعادتمندی بھی پسند نہیں۔ فی الحال آپ آرام کریں گے۔"

"جی بہتر۔"

"بس اب میں چلوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب تو ناراض نہیں ہیں ناں؟" اس نے سرخ عارض چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ضرور ہوں۔ مگر سلسلہ آپ کی جلد واپسی ہے۔"

"نہیں!"

وہ بیقراری سے میرے قریب آ گئی اور میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چھوڑ دیں۔ آپ کے دوست آتے ہی ہوں گے۔ پھر میں چھپ چھپا کر آئی ہوں۔ کہیں ماما جی کو خبر نہ ہو جائے۔"

"آتی رہو گی ناں؟"

"جی نہیں۔ روز روز آنا مذاق تو نہیں ہے۔"

"چلیے کبھی کبھار سہی۔"

تو اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا۔

"ارے ارے۔ میں چلی جاؤں گی۔ آپ نہ اٹھیں۔"

"کیوں؟"

"بیمار جو ہیں۔"

"کوئی بھی نہیں! تمہیں دیکھ کر تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔"

میں مسکرا کر اس کے برابر کھڑا ہو گیا تو پارو نے دانت بھینچ لئے۔ پھر "بے ایمان" کہا اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میں دیر تک ہنستا رہا۔

"ہو گئی ملاقات؟" اسی دم احتشام آ گیا۔

"بالکل۔"

"مبارک ہو۔"

"شکریہ! تم کہاں تھے؟"

"میں گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا۔ پھر تمہارا علی احمد مل گیا تو اس سے باتیں کرنے لگا۔ مگر چند ہی منٹ گذرے ہونگے کہ تمہاری پارو بیگم کو بھاگتے دوڑتے دیکھا تو چلا آیا۔ ویسے شیراز صاحب اب اتنی بھی عیاشی اچھی نہیں۔"

"واہ! میں نے کیا کیا ہے اسے۔ اب وہ خود ہی خوشی میں اچھلتی کودتی گئی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تم جیسے گھامڑ کو پا کر وہ خوشی میں اچھلے گی کسی فلمی ہیروئن کی طرح؟"

"دیکھو تم ہمیشہ زیادتی کرتے ہو۔ یعنی مجھے کچھ سمجھتے ہی نہیں بس تمہارے لئے تو میں گھر کی مرغی ہوں۔ میری قدر پوچھنی ہے تو باہر جا کر پوچھو۔ پھر لڑکیاں تو میری شرافت پر مرتی ہیں۔"

"بس بس۔۔۔ رہنے دو مجھے سب معلوم ہے۔ خیر اٹھو! کہ آج تو تم سے ڈنر اڑانا بھی عین ثواب کا کام ہے۔"

تب میں اٹھا اور دانت پیستے ہوئے احتشام کے ساتھ باہر نکل آیا۔ توبہ! دو دن سے گھر میں قید تھا تو جیسے ساری دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔ اب باہر آیا تو بہت سکون محسوس کر رہا تھا کھانے کے بعد ہم کافی دیر گھومتے رہے اور جب رات زیادہ ہو گئی تو ہم دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

اس وقت گھر آتے ہوئے میری روح بہت پرسکون تھی۔ دل مطمئن تھا۔ لبوں پر آپ ہی آپ مسکان مچل رہی تھی۔ اپنے محلے میں پہنچا تو میری نگاہیں پارو کی حویلی کا طواف کر رہی تھیں۔ آج تو میں جدھر دیکھتا تھا یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہی پارو کا چہرہ ہے۔ پھر پتہ نہیں کیسے پارو میں اتنی ہمت آ گئی کہ جب بھی میں ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا تو جیسے بھی ہو پاتا وہ مجھ سے ملنے ضرور آتی۔ مگر چند منٹوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی تھی اور اسی بات پر ہم دونوں میں لڑائی ہو جاتی تھی۔ میں خفا ہو جاتا اور وہ منانے کے لئے بھی نہ رکتی تھی۔

"بیشک منہ پھلا لو۔ اب آئندہ ملاقات میں مناؤں گی۔ فی الحال وقت بالکل نہیں ہے۔" وہ فوراً چلی جاتی اور میں تکیئے پہ ہی مُکّے برساتا رہ جاتا۔

اب ہوسٹل بس تیار ہوا چاہتا تھا۔ مقررہ معیاد کے صرف پندرہ دن باقی تھے اور پھر اس شہر سے واپس لوٹ جانا تھا۔ جونہی پارو کو پتہ چلا تو وہ بے پناہ اداس ہو گئی اب تو وہ میرے اصرار پر تھوڑی دیر اور بھی رک جاتی تھی۔ پھر میری صورت دیکھتے دیکھتے وہ گھر جانا بھی بھول جاتی اور میں ہی یاد کراتا تھا۔

"آجکل تم بہت اداس رہنے لگی ہو۔ وجہ؟" میں نے پوچھا۔

جواب میں صرف اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"یار کچھ بولا کرو۔ دیکھو اب تو میرے واپس جانے میں بھی صرف بارہ دن ہیں۔"

"چلو گھر چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو میں بھی چل دیا۔

"آج پاگل موقع نکال کر گھر آنا۔ باہر آ کر تو تم بالکل غیر بن جاتی ہو۔ یونہی ہی نہیں ہو۔"

"ہاں ضرور آؤں گی۔"

"بڑی فرمانبردار بنتی جا رہی ہو۔" میں ہنسا۔

"کیا کروں پھر؟ تم کونسا روز روز بلاؤ گے۔ بارہ دن تو اور یہاں ہو تم۔ پھر کیسے نہ آؤں گی۔"

میں نے ٹیکسی رکوائی اور اسے اس میں سوار کرا کے خود اپنے اسکوٹر پر بیٹھ گیا۔ وہ گھر چلی گئی اور میں احتشام کی طرف کہ کافی عرصے سے ان کے ہاں نہ گیا تھا۔

اور پھر دو تین روز بعد وہ رات کے پہلے پہر چلی آئی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"پارو تم! اس وقت؟"

"صرف نو دن اور میرے ہیں شیراز۔ اب وقت کے بارے میں بات نہ کرو۔ میں ایک ایک لمحے سے خراج وصول کرنا چاہتی ہوں بس تم چپ چاپ بیٹھ جاؤ اور میں تمہیں دیکھتی رہوں گی۔"

اس نے میرے ہاتھ تھام لئے تو میں نے ہاتھ چھڑا کر اسے قریب کر لیا۔ اور اسی لمحے جانے کتنے آنسو اس کے عارضوں پر پھسلتے چلے گئے۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ مگر میں نے اپنے رومال میں اس کے آنسو جذب کر لئے۔

"میں آتا رہوں گا۔ تم دل چھوٹا کیوں کرتی ہو؟"

"میں اندھیروں میں امید کے چراغ جلا تو لوں اگر روشنی کا یقین ہو جائے۔ مگر کیا کروں۔ مذہب کا فرق تو ہر دیا بجھا دیتا ہے۔ پھر کس آس پہ جیوں؟"

"ہاں یہ فرق تو ہے۔ مگر ہماری محبت کی بنیادیں اتنی کمزور ہرگز نہیں پارو کہ شادی نہ ہو سکنے کا خوف انہیں کھوکھلا کر دے۔" میں نے کہا تو وہ چپ سی رہ گئی۔ پھر تھوڑی دیر تک مجھے دیکھتی اور اس کے بعد ایک دم اٹھی اور کچھ بھی کہے بنا لوٹ گئی۔

اگلے روز میری نظر اس پر پڑی تو وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھانے پینے میں مشغول تھی۔ مگر چہرہ بہت اداس اداس تھا۔ میں بھی ایک نظر اسے دیکھ کر آگے بڑھ گیا اور کام کا جائزہ لینے لگا۔ مسز اسلم بھی آ گئیں۔

"شیراز صاحب! پھر کب تک کام مکمل ہو جائے گا؟"

"بس میڈم۔ اب تو چند روز کی بات ہے۔"

وہ اسی کے متعلق باتیں کرتی رہیں اور میں بھی جوابات دیتا رہا۔ مگر ذہن میں اب بھی پارو کا اداس اداس چہرہ تھا۔ اس کے سرخ عارض زرد پڑتے جا رہے تھے۔ اور لبوں پر مسکراہٹوں کی کلیاں نہ کھلتی تھیں۔ اس وقت اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود میرا ذہن اسی گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا کہ میرے جانے کے بعد اس لڑکی کا کیا بنے گا؟ یہ تو خود کو تباہ کر لے گی۔ پھر کالج میں ضروری کام نمٹا کر میں واپس آ گیا مگر میرا ذہن ہنوز اسی کشمکش کا شکار رہا۔

یہ چند روزہ قیام، یہ گنے چنے دن ہی میرا سرمایہ تھے گو کہ میں مرد تھا، اور مرد مجبور نہیں ہوتے مگر مذہب کے فرق نے مجھے بھی مجبور و بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ اب میں اُسے اور اپنے دل کو تسلی دیتا بھی تو کیا نتیجہ مسکراہٹیں مجھ سے بھی روٹھ گئیں ابھی چند روز بیشتر وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"شیراز! چند روز بعد تم چلے جاؤ گے مگر یہ بھی سوچا ہے آخر ہمارا کیا بنے گا؟"

"ارے۔ اب سوچنے کو کہہ رہی ہو جب آرزوؤں اور تمناؤں کے سمندر میں بیچ منجدھار میں آ گھرے ہیں۔ سوچنا ہی تھا تو پہلے سوچتیں جب ایک دوسرے کو با آسانی چھوڑا اور بھلایا جا سکتا تھا۔"

"میں سخت پریشان ہوں۔"

"اور میں بھی۔"

"پھر کیا کریں؟"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ پھر یہ کہ اگر مجھے ذرا سا بھی یقین ہو جاتے کہ تم مجھے مل جاؤ گی تو میں تمہارے گھر والوں کے پاؤں پکڑنے کو بھی تیار ہوں۔ مگر تم جانتی ہو یہ سب لاحاصل ہے۔ اب میں مجبور ہوں۔"

میری بات سن کر وہ جوش میں بولی۔

"مگر میں اور میری محبت مجبور نہیں ہیں شیراز۔ میں مجبوری کا رونا نہیں رو سکتی کہ میرے دل نے تو عرصہ ہوا تمہیں اپنا مان لیا ہے۔"

اور آج رات میری نیند کسی کی ٹھک ٹھک کی نذر ہو گئی۔ پھر جو کچھ میں نے دیکھا اس پر میری آنکھیں یقین کرنے کو تیار نہ تھیں۔ مگر پارو ایک زندہ حقیقت بنی، رات کے پچھلے پہر میرے دروازے پر کھڑی تھی۔

میں دروازے کے بیچ کھڑا تھا۔ وہ ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میرا موڈ جارحانہ ہوتا جا رہا تھا مگر میں دروازے میں کھڑا کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا تب میں سامنے سے ہٹ گیا تو وہ اندر چلی آئی۔

"تم۔ کیوں آئی ہو؟"

میں نے کمرے میں آتے ہی اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں

"پارو! تمہیں یوں رسوائی کا سمبل بن کر میرے پاس رات کے اس پچھلے پہر ہرگز نہ آنا چاہیئے تھا۔ میں ایک عزت دار آدمی ہوں اور یقیناً تم بھی باعزت باپ کی بیٹی ہو۔ پھر کیا تم یہ چاہتی ہو کہ کل سیٹھ مرلی دھر اور شیراز میں دشمنی کی بنیاد پڑ جائے، ان دو آدمیوں میں جو ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہیں؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میری محبت تم سے وابستہ رہنا چاہتی ہے میں تم سے الگ ہو کر جی نہ سکوں گی۔"

"پارو۔ پارو! میں عورت کا بہت احترام کرنے والوں میں سے ہوں۔ مگر تم مجھے مجبور کر رہی ہو کہ میں تمہارا چہرہ اپنے ہاتھوں رنگ کر تمہیں واپس تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔"

"شیراز۔ تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔"

"ہاں کرتا تھا۔ مگر ایک باوفا اور باعصمت لڑکی سے۔ اور تم؟ ... تم کیا بن گئی ہو! سوچو کیا رہ گیا ہے تم میں۔ کل کی پارو آج کی پارو سے مختلف تھی اور میں اسی کل والی پارو کا دیوانہ تھا۔ تم سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

"اتنے کٹھور نہ بنو شیراز۔ یہ سب میں نے تمہاری چاہ سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ میں تمہارے بن جی نہ سکوں گی کبھی نہیں۔"

وہ میرے اس کٹھور رویے سے دل برداشتہ ہو کر بے اختیار رو دی۔

تو جانے وقت کا وہ کونسا لمحہ تھا جب میرے قدم اس کی طرف بڑھ گئے۔ پھر مدھر سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے میں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔

"تم نے کھانا بھی کھایا یا نہیں؟"

"مجھے بھوک پیاس بالکل نہیں ہے۔ بس ہمیں راتوں رات یہاں سے دور نکل جانا چاہیئے۔"

"نہیں۔ میں ایک دم تمہارے ساتھ ہی اس محلے کو چھوڑ کر اپنی زندگی اجیرن کرنا نہیں چاہتا۔ ٹھیک ہے تم واپس نہ جاؤ۔

میرے پاس رہو، میرے ساتھ، میری دلہن بن کر، مگر۔"

"کیا۔؟ اسی گھر میں؟ اسی محلے میں؟" وہ پریشان سی پوچھ رہی تھی۔

"ہمارے قلبی تعلق کو کوئی نہیں جانتا پارو۔ میرا خیال ہے کسی نے ہمیں کبھی اکٹھے نہیں دیکھا۔"

"ہاں۔ میں بہت احتیاط سے آتی رہی ہوں۔ پہلے اسی سہیلی کے ہاں جاتی تھی جس کا بہانہ کرتی تھی پھر وہاں سے برقعہ اوڑھ کر تمہیں ملتی رہی ہوں اسی وجہ سے تمہیں کبھی پانچ یا دس منٹ سے زیادہ وقت بھی نہ دے سکی۔"

"بہت خوب۔ لہٰذا اب تمہارے گھر والے تمہیں اس محلے میں نہیں بلکہ یہاں سے باہر تلاش کریں گے۔ اور یہ دو تین دن تم یہاں بند رہو کہ ابھی میرا کام بھی ختم نہیں ہوا۔ پھر یوں بھی کہ صبح جب تمہارے گھر والے تمہارے فرار کو جانیں گے تو کم از کم مجھے اس محلے میں موجود ہونا چاہیے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" وہ تقریباً رو دی۔

"بھئی ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ سارا محلہ میری شرافت کا گواہ ہے۔ ہر شخص یہاں میری قسم کھا سکتا ہے کہ میرا کردار آج تک بے داغ رہا ہے۔ بس تم میرے جانے کے بعد ذرا بند رہو گی۔ یہ صرف چند روز کے لئے ہے تاکہ میرے معمولات میں فرق نہ آئے۔ میں صبح گھر کو باہر سے تالا لگا جاؤں گا ہمیشہ کی طرح۔ اور اندر کوئی کھٹ پٹ کی آواز نہ ہو۔ چپ چاپ رہنا جیسے یہاں کوئی نہ ہو۔"

وہ افسردہ اور خوفزدہ نظر آ رہی تھی میں اٹھ کے اس کے قریب چلا آیا اور تسلی دینے کو اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"صرف چند روز۔ پھر تمہیں دوسرے شہر چھوڑ آؤں گا۔ راتوں رات، پھر آٹھ دس دن مزید یہاں ٹھہروں گا تاکہ میری بے گناہی ظاہر ہو۔ تم سمجھ رہی ہو ناں۔ پارو! پھر میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں گا ہمیشہ کے لئے۔ ساتھ رہنے کے لئے۔" میں نے شریر سی مسکراہٹ سے کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے شیراز۔ جیسے ابھی بپا آئیں گے اور مجھے لے جائیں گے۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ خدا کے لئے جتنی جلد ہو سکے نکل چلو!"

وہ روتی ہوئی میرے شانوں سے آ لگی تو میں نے بھی اسے ساتھ لگا لیا۔

"ارے پگلی! ایسے بنا ٹھکانہ بنائے تمہیں کہاں لے جاؤں ابھی۔ دوسری جگہ جا کر کوئی جگہ، کوئی مکان بھی تو دیکھنا ہے۔ یہ انتظام ہوتے ہی تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ بس تمہیں ذرا بننا ہو گا کہ چند روز میرے بنا اکیلی رہ سکو۔ دراصل جانم! میں نہیں چاہتا کہ کسی کو یہ شک بھی ہو کہ تم میرے پاس آئی ہو!"

"آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔"

"کوئی نہیں سن رہا بے فکر رہو۔ مگر ہاں اب سونے کا کیا پروگرام ہو گا؟" میں پھر شرارت پر اتر آیا۔

"کیسا پروگرام؟" وہ ہلدی کی طرح زرد ہو گئی۔

"یہی کہ میرے ہاں تو بس ایک ہی چارپائی ہے۔ دوسرا کوئی بوریا بستر نہیں۔ یہ سردی کا موسم! کیا کریں اب۔"

میں خوامخواہ اسے ستا رہا تھا۔ مگر یہ سچ بھی تھا کہ میرے پاس اس گھر میں صرف ایک ہی چارپائی تھی۔

"کرنا کیا ہے۔ آپ اپنے بستر پر سوئیں میں یہاں اس کرسی پر ٹک جاؤں گی۔ پھر یوں بھی میری آنکھوں سے تو آج خوف کے مارے نیند بھی اڑ گئی ہے۔" وہ اٹھ کر کرسی پر چلی گئی۔

"پارو۔ اب ان حالات میں جب تم نے میرے ساتھ جینے مرنے کا عہد کر لیا ہے تو ایک قربانی اور دو۔ اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو جاؤ۔"

"جب بھی، اور جتنی بار بھی آپ کہیں گے میں مسلمان ہوں گی شیراز۔"

اس کی آنکھوں میں عزم کی پرچھائیں تھی۔

"میری خاطر۔؟"

"تمہاری خاطر بھی۔ مگر سلمیٰ نے اور رابعہ وغیرہ نے مجھے اسلام کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ تب میں نے جان لیا تھا کہ واقعی اگر دنیا میں کوئی سچا مذہب ہے تو وہ یہی اسلام ہے۔"

"اوہ!" میں نے بڑی محبت سے اسے دیکھا مگر فوراً ہی شریر موڈ مجھ پر حاوی تھا۔ "مگر یہ چارپائی کا مسئلہ تو ہنوز باقی ہے۔ اسے کیسے حل کریں؟"

"آپ آرام سے سو جائیں۔" وہ جھینپ کر بولی۔

"یوں کیسے سو جاؤں جان۔ تم سردی میں اکڑتی رہو اور میں لحاف میں جا گھسوں۔"

"ہاں ہاں سو جائیں۔ نہیں اکڑتی میں۔"

"ارے اٹھو۔ دل و دماغ پر تو عرصے سے قابض ہو۔ چلو آج تمہیں یہ بستر بھی پیش کر دیں۔"

میں نے اسے کرسی سے اٹھا کر بستر پر دھکیل دیا اور خود کرسی پر چلا آیا۔ یہ لڑکی میری محبت تھی، میرا دل اور جان تھی۔ میری خاطر گھر بار چھوڑا تھا اور اب مذہب چھوڑنے کو تیار بیٹھی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک گولا میرے چہرے پر لگا۔

اوہ، پارو نے اپنی شال مجھ پر کھینچ ماری تھی۔

"کیا کروں اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"پیروں پر ڈال لو۔"

میں نے اُسے اپنے اردگرد لپیٹ لیا مگر تھوڑی دیر بعد پھر اس سے مخاطب تھا۔

"پارو یار۔ زبردست ٹھنڈ ہے۔ تھوڑی سی رضائی اپنے پیروں پر ڈال لوں؟"

جواباً وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم پورے کے پورے اس میں جا گھسو مجھے تو یوں بھی نیند نہیں آ رہی۔" میں شرمندہ سا ہو گیا۔

"سو جاؤ۔ اب کچھ نہ کہوں گا۔"

وہ دوبارہ جا کر لیٹ گئی۔ بتی جل رہی تھی۔ اور میں اس کی پائنتی کے رخ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ رات کا جانے کونسا پہر تھا کہ وہ ایکدم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ شکر ہے تم یہیں ہو۔ میں نے خواب دیکھا تھا شیراز کہ۔۔۔"

"کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہوں ارے سو جاؤ۔ مجھے صبح جلدی جاگنا ہے۔" میں نیند سے بوجھل لہجے میں بولا۔

وہ مطمئن ہو کر لیٹ گئی اور کچھ دیر بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔ پھر۔

مزید دو دن وہ میرے گھر میں رہی اور تیسری رات میں اسے لاہور لے گیا۔ پہلے ہی ایک مکان کا بندوبست کر آیا تھا۔ صبح کے وقت ہم لاہور پہنچے۔ اُسے ضرورت کی چیزیں دے کر ہوشیاری سے رہنے کی تلقین کی اور دوپہر تک واپس لوٹ آیا۔ پھر مزید پندرہ روز میں پارو کے شہر میں رہا مگر کسی نے مجھ سے پارو کے بارے میں ایک سوال بھی نہیں کیا۔ میں مطمئن ہو کر واپس لوٹ آیا۔ آ کر احتشام اپنے مخلص دوست کی مدد سے پارو سے شادی کر لی۔ مگر یہ ایک خفیہ شادی تھی۔ میں نے اپنے والدین کو، اپنے عزیزوں کو، اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ ایک محلے میں ایک چھوٹا سا مکان تو میں پارو کو لاہور لانے سے قبل ہی لے چکا تھا۔ اب اسی مکان میں احتشام کی مدد سے میں نے شادی بھی کر لی۔

پارو حسبِ وعدہ مسلمان ہو چکی تھی اور اب وہ میری وجیہہ تھی۔ میں بڑے پیار سے اُسے جوہی کہہ کر پکارتا تھا اور وہ کسی نرم و نازک پھول کی طرح کھل کھل جاتی تھی۔ والدین چونکہ میری شادی سے آگاہ نہ تھے پھر میں رہتا بھی لاہور میں ہی تھا اور جوہی بھی اب اسی شہر میں تھی۔ اس وجہ سے بہت گڑبڑ ہو گئی تھی میں جوہی کے پاس زیادہ وقت نہ گزار سکتا تھا۔

ہر دم یہ شادی ایک جرم کی مانند مجھے خوفزدہ کرتی رہتی اور میں چوروں کی مانند، چھپتا چھپاتا اس کے پاس آتا تھا۔ پھر صبح کا اجالا پھیلنے سے قبل ہی جوہی سے رخصت بھی ہو جاتا۔ دن کے اجالوں میں میں نے اس طرف آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا ہر دم دیکھ لیے جانے کا خوف میرے حواس پر سوار رہتا تھا۔

جوہی، جو ایک بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ یقیناً ناز و نعم سے پلی بڑھی ہو گی مگر اب اسے ایک متوسط طبقے کی خاتون خانہ کی مانند رہنا پڑ رہا تھا۔ پھر یوں بھی میں نے اُسے محلے میں تعلقات بڑھانے سے روک دیا تھا کہ خدانخواستہ کوئی اسے پہچان نہ لے، اس کے ماضی سے باخبر نہ ہو جائے۔ اور اس بات کی مجھے ازحد خوشی تھی کہ وہ میری کسی خواہش کو رد نہیں کرتی تھی۔ اس نے میری خاطر ساری دنیا سے منہ موڑ لیا۔ محلے میں نہ کسی کے ہاں جاتی تھی۔ نہ کوئی یہاں آنے کا حوصلہ کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"جوہی۔ تم محلے میں کسی کے ہاں جاتی ہو؟"

"نہیں۔ اگر میں یہ حماقت کروں گی تو لوگ بھی تو یہاں آئیں گے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ ایسا ہو اور لوگ میرے ماضی کی سرزمین پر جا پہنچیں۔"

"تم ساری دنیا سے کٹ کر رہ گئی ہو۔ کبھی پچھتاتی نہیں ہو کہ۔۔۔۔۔؟" میں اس کے من میں جھانکنا چاہ رہا تھا۔

"واہ۔ پچھتاؤں گی کیوں؟ جس کی خاطر یہ سب کیا وہ تو میرا ہے ناں تم مجھ سے مخلص ہو، یہ کیا کم ہے!"

وجیہہ نے یہ بات مسکراتے ہوئے کہی تھی مگر اس کی آنکھوں کے گھور اندھیروں نے مجھے اس کی روح کے گھاؤ دکھلا دیئے تھے کہ وہ یہاں قید ہو کر خوش نہیں ہے۔ اسے اپنے اقدام پر پچھتاوا ہے مگر ظاہر کرنے سے فائدہ بھی کیا ہے۔

اس لمحے مجھے اپنی ذہنی کیفیت چھپاتی یہ لڑکی بہت قابلِ رحم معلوم ہوئی۔ میں اس کے قریب آگیا اور اسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔ وہ ہولے سے ہنس دی تو میں بھی شرمندہ ہو کے اسے گھورنے لگا۔

"آج پندرہ روز بعد آیا ہوں۔ دراصل کچھ تو مصروفیات بے پناہ تھیں دوسرے رات باہر گزارنے کا معقول جواز امی کی عدالت میں پیش کرنا تھا۔ لہٰذا احتشام کو بیمار کرنا اور آج میں اسی شہر میں ہوں جہاں تم لڑائی کرتی تھیں۔ سنو یار! گھبرایا نہ کرو۔ میں خواہ آؤں نہ آؤں، مگر میرا دل یہیں اسی بیڈ روم میں تمہارے پاس ہوتا ہے۔"

"معلوم ہے مجھے۔!"

"کیا؟"

"بس۔ اب ستاؤ نہیں۔" وہ جھینپ گئی اور میں مسکرا کر اس کے چہرے پر جھک آیا۔

صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس وقت جگانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا کہ بہت دیر سے جگایا تھا مگر مجھے بہرحال انہی اندھیروں میں، دنیا والوں کے جاگنے سے قبل یہاں سے نکلنا تھا کیونکہ اس معاملے میں میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی محبت سے اس کے بکھرے بال سمیٹے پھر تیار ہونے چلا آیا۔

"جوہی۔ اٹھو یار۔!"

میں نے دو تین بار پکارا تو وہ آنکھیں ملتی مجھے دیکھنے لگی۔

"ابھی تو اتنا اندھیرا ہے، سو جاؤ۔" اس نے مجھے بازو سے کھینچ لیا اور میں بستر پر جا گرا۔

"کوئی اندھیرا نہیں۔ چار بجنے والے ہیں۔ اٹھو تم دروازہ بند کر لو، میں چلتا ہوں۔"

میں اٹھا تو وہ بھی اٹھ بیٹھی۔ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی۔

"کبھی تو دو چار دن کے لئے آجایا کرو۔ میں تو تمہاری صورت کو ترس جاتی ہوں۔"

"کیسے۔ کیسے آجاؤں؟ یہ مہینے بیس دن بعد بھی بڑے بہانے بنانے پڑتے ہیں۔ بھابی اور بھیا تو بڑے انداز سے چھیڑتے ہیں کہ "امی اسے کوئی کام وام نہیں ہوتا۔ بس بچہ ذرا بڑا ہو گیا ہے لہٰذا اب آپ اس کی شادی کر دیں۔"

"کیا۔؟" وہ چونکی مگر پھر سر جھکا لیا۔ اور مجھے یاد آیا کہ امی تو آجکل باقاعدہ میرے لئے لڑکی تلاش کر رہی ہیں۔"

"اچھا بیٹھو۔ میں چائے بنا لاؤں۔"

وہ چلی گئی اور کچھ دیر بعد ناشتہ بنا لائی۔ میں نے جلدی میں ناشتہ کیا اور نکل آیا۔ مگر آنکھوں میں وجیہہ کی موہنی صورت تھی۔ میرے جانے سے کیسی اداس ہو جاتی ہے جیسے پردیس جا رہا ہوں اور کئی سالوں کے بعد آؤں گا۔ تب میں نے چند روز وجیہہ کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ خواہ کتنے بہانے بنانے پڑیں مگر اس کی یہ پہلی فرمائش تو مجھے ہر صورت پوری کرنا تھی کہ یہ لڑکی میری محبت تھی۔

ان دنوں میں فارغ ہی تھا۔ کوئی کام نہ تھا۔ تب نئے ٹھیکے کی تلاش کی بجائے میں نے دس پندرہ دن جوہی کے نام لکھ دیئے۔ اس دوپہر میں نے دروازے پر دستک دی تو ایک خوفزدہ اور مہین سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"کون ہے؟"

"بھئی میں ہوں شیراز۔"

کئی لمحے گزر گئے مگر کھٹکا نہ گرا تب مجھے یاد آیا کہ شادی کے بعد ایک روز بھی تو میں دن کے اجالوں میں ادھر نہیں آیا اسی لئے وہ بے یقینی کی کیفیت میں کھڑی ہے۔

"یار! دروازہ کھولو۔"

تب اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کیا مگر وہ حیرت سے مجھے اور میرے سوٹ کیس کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔ کراچی میں ایک بڑا ٹھیکہ مل گیا — ڈیڑھ سال لگ جائے گا سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔"

میں سوٹ کیس لئے اندر چلا آیا مگر وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں دبی دبی مسکراہٹ لئے اسے دیکھتا رہا۔ مگر اسی اثنا میں میں نے اس کے رونے کی آواز سنی تو ساری شرارت بھول گیا۔

"پگلی! میں تو مہمان ہوں تمہارا۔ دس پندرہ دن کے لئے آیا ہوں اور تم یوں رو رو کر مہمان کا سواگت کرو گی؟"

وہ پھر حیرت زدہ رہ گئی مگر اب خوشی کی دبیز تہہ اس کی حیرت میں سمٹ آئی تھی۔

"مہمان بن کر تو سدا سے آتے رہے ہو۔ مگر آج ہی تو محسوس ہوا ہے کہ شوہر گھر آیا ہے۔"

وہ مسکراتی ہوئی سوٹ کیس اندر لے گئی میں بھی پیچھے چلا آیا

اور ہولے سے اپنے رومال سے اس کے عارضوں کی نمی خشک کی۔ وہ مسکرا دی اور شادی کے بعد آج ہی میں اسے اتنا خوش دیکھ رہا تھا۔

"بہت خوش ہو؟" میں نے اس کی ٹھوڑی پر ٹھوڑی رکھ کر پوچھا۔

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے؟" وہ مجھ ہی سے سوال کر بیٹھی۔

"اچھا تو کتنا خوش ہو؟"

"بہت زیادہ۔"

"پھر بھی۔"

"بس۔ جتنی آسمانوں اور زمین کی وسعت ہے!"

"پھر تو بہت خوش قسمت ہوں میں۔" میں ہنسا۔

"نہیں۔" وہ ایکدم اداس ہو گئی۔ "خوش قسمت تو میں ہوں جسے تم ایسا سچا شوہر ملا ہے۔ جس نے ایسی لڑکی کو باعزت پناہ دی جو اس قابل ہی نہیں تھی۔ شیراز، گھر سے بھاگ جانے والی عورت تمہیں ملی ہے۔ پھر تم خوش قسمت کہاں رہ گئے؟" وہ رو دی۔

"اچھا بکواس نہیں کرو۔ اٹھو میرے لئے کھانا نکالو۔ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔ ہاں پکایا کیا ہے تم نے؟"

"مٹر گوشت ہے۔ مگر ٹھہرو میں کچھ اور بھی بنا لوں۔ زیادہ دیر نہ لگے گی۔"

وہ کچن کی طرف بھاگی۔ میں بھی وہیں چلا آیا۔

"بس کچھ اور نہ کرو۔ یہی دے دو یار بڑی بھوک لگی ہے۔" میں کنستر پر ٹک گیا۔

"اچھا۔ مگر کہیں ڈھنگ سے تو بیٹھیں۔"

وہ اندر سے ایک کرسی اور چھوٹا ٹیبل اٹھا لائی۔ میں ایک اور کرسی نکال لایا اور یہ پہلی بار تھا کہ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

صحن میں اس نے گلاب لگا رکھے تھے۔ بڑا صاف ستھرا گھر تھا۔ چھوٹا تھا مگر وجیہہ نے اسے اپنے ذوق کے مطابق سیٹ کر رکھا تھا۔ بیڈ روم میں عنابی پردے تھے اور اسی رنگ کی مناسبت سے اس نے بیڈ روم ڈیکوریٹ بھی کر رکھا تھا۔ پھر بھی مجھے احساس تھا کہ پارو کے لئے یہ سب بہت کم تھا۔ وہ بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اور اب ایک حویلی سے نکل کر اس تنگ سے مکان میں آگئی تھی پھر گھر کا تمام کام بھی وہ خود ہی کرتی۔ سودا سلف بھی خود لاتی تھی۔ مگر برقعہ اوڑھ کر۔ اور نقاب وہ کہیں نہ الٹتی تھی کہ جانے کب اسے پہچان لیا جائے۔

"بس شیراز۔ ہر دم پہچان لئے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

اس دوپہر اس نے کہا تو میں نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔ میں ایک ملازم رکھ لیتا ہوں تمہیں آنا جانا نہ پڑے گا۔"

"نہیں نہیں۔ میں اکیلی ہوتی ہوں۔ لانا ہی کیا ہوتا ہے۔ سبزی وغیرہ کے لئے نا۔ ورنہ سارا سامان تو تم خود ہی دے جاتے ہو۔"

"تو کوئی غریب لڑکی رکھ لو۔ اس کا تو کوئی حرج نہیں۔ پھر تمہارا دل بھی بہلا رہے گا۔"

تب وہ خاموش ہو گئی اور چند روز بعد میں نے ایک بوڑھی عورت بازار سے سودا سلف لانے کے لئے رکھ دی۔ اچھا ہے دونوں باتیں تو کر لیں گی ورنہ وجیہہ عزیزہ تو گونگوں کی طرح رہنا پڑتا تھا جبکہ میں مہینوں بعد ایک آدھ بار آتا تھا۔ وہ کسی قیدی کی مانند رہ رہی تھی پھر بھی اس نے کبھی شکایت نہ کی تھی نہ گلہ نہ کیا تھا۔ شاید اسے احساس تھا کہ فرار ہو جانے والی لڑکیاں ان حقوق کی مالک نہیں ہوتیں۔

میں اب کی بار پندرہ بیس دن وجیہہ کے پاس رہا۔ ان دنوں میں وہ بہت خوش رہی۔ میں جو خوش تھا مطمئن سا ہے، اور مجھے فخر تھا کہ میں نے اس لڑکی کو دھوکا دیا تھا نہ فریب۔ محبت کی تھی تو نبھا بھی رہا تھا۔ مگر ایک عجیب قسم کی پریشانی مجھے لاحق تھی۔

کبھی وجیہہ مجھے زہر سے بڑھ کر بری لگنے لگتی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی تھے مگر عام لوگوں کی طرح دنیا کے سامنے نہ آسکتے تھے۔ مجھے چوروں کی طرح یہاں آنا پڑتا تھا اور لوگوں کے جاگنے سے قبل نکل جاتا تھا۔ اس ساری افراتفری کی ذمہ دار میرے نزدیک وجیہہ ہی تھی کہ میرے دل میں تو ایک بار بھی خیال نہ آیا تھا کہ زندگی کبھی ایسے موڑ پر بھی آئے گی۔ پھر میں نے ایک بار بھی تو اسے اپنے ساتھ بھاگ جانے کا مشورہ نہ دیا تھا۔

پھر میں کیسی یہ سزا کاٹ رہا تھا کہ دنیا سے نظریں چار نہ کر سکتا تھا۔ یہ کس کے گناہوں کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ یہ کیفیت اکثر مجھے پریشان کر دیتی۔ میرا ذہن ان سوالوں سے عاجز آجاتا اور اس سمے وجیہہ پر بے تحاشہ غصہ آتا تھا مگر میں اس غصے کا اظہار ایک بار بھی اس پر نہ کر سکا۔

کبھی اسے اپنی اس ذہنی کشمکش کے بارے میں نہیں بتایا کہ فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ جیسی بھی تھی اب میری بیوی تھی۔ پھر کام کی زیادتی کی وجہ سے اور ادھر امی جان نے میری شادی کی مصروفیات کا جال بُنا تو میں مہینوں وجیہہ کی طرف نہ جا سکا۔ پھر شادی ہو گئی۔ دلہن گھر میں آ گئی۔ اور یوں پہلے کی طرح راتوں کو فرار ہونا بھی ممکن نہ رہا۔ پورے تین ماہ بیت گئے۔

مگر میں وجیہہ سے مل نہ سکا۔ اس ذہنی کیفیت کے باوجود وہ مجھے عزیز تھی اور اس کے بارے میں مجھے فکر رہتی تھی۔ پھر آجکل تو یوں بھی اس کی زیادہ فکر تھی کہ بوا نے بتایا تھا۔

"بیگم صاحبہ! امید سے ہیں۔"

میں کافی دیر وجیہہ کو ستاتا رہا تھا۔

"ارے پگلی! ایسی خبریں شوہر کو براہ راست دی جاتی ہیں تم نے بوا کا سہارا کیوں لیا؟"

"بوا بزرگ ہیں۔ انہیں ہی پتہ ہوگا! پھر یوں بھی تم تو چار ماہ بعد آ رہے ہو۔ کب بتاتی۔"

وہ جھینپی جھینپی کہہ رہی تھی اور میں اسے آنکھوں سے دل میں اتار رہا تھا۔

"بوا تو کہہ رہی تھیں تمہیں خط لکھ دوں۔ مگر کہاں لکھتی۔ تم تو اپنا ایڈریس دینے کے روادار نہیں۔"

"کیا کروں جان۔ تم میری سب مجبوریاں سمجھتی ہو۔"

"پھر آخر کب تک یونہی حقائق کو چھپائے رکھو گے۔"

"جب تک تم نے تعاون جاری رکھا۔ دیکھو اسی میں ہم سب کا بھلا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی تو پھر میں اسی حوالے سے تنگ کرنے لگا جو بوا بتا چکی تھیں۔

اور آج تین ماہ ہو چکے تھے۔ وجیہہ کی یقیناً بڑی نازک حالت ہو گئی ہو گی... مجھے اس کے پاس ہونا چاہیے۔ شادی کے ہنگاموں سے مجھے جو نہی فرصت ملی میں چل پڑا۔ وجیہہ ان دنوں بہت اداس اداس لگ رہی تھی۔ شاید والدین یاد آ رہے تھے پھر میں بھی تو پنچھی کی طرح پھیرا لگاتا تھا۔

"مزید کتنا انتظار کراؤ گی؟"

"چلو ہٹو۔ بوا سن لیں گی۔"

"وہ غریب تو کچن میں ہیں۔ انہیں کیا پڑی کہ ادھر کان لگا کر بیٹھیں۔ اچھا لو۔ تم میرے کان میں بتا دو۔"

میں نے اس کے چہرے کے قریب کان کر دیا۔

"بدتمیز ہو پورے۔"

اس نے کروٹ بدل لی۔

"کیا شوہر کو بدتمیز کہہ رہی ہو۔ ہوتی ناں اماں تم اپنی ساس کے پاس تو تمہارا احتشر نشر کراتا۔"

جواب میں وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

"ساس کا قرب۔ مجھ جیسی کے لئے کہاں!"

"ہاں ان سے پوچھو جو ساس کے پاس رہتی ہیں۔ کیسے جان پر بنی ہے ان کی کہ کہاں سے بڑھیا پلے پڑی ہے۔ کب جان چھوڑے گی۔"

"اور دیکھو بے ایمانی نہیں چلے گی۔ تم میرا سوال گول کر گئی ہو۔"

میں نے چڑایا تو اٹھ کر بھاگ لی۔ میں باہر آیا تو وہ کچن میں بوا کے پاس جا بیٹھی تھی۔

"اے بیٹی۔ یہاں بڑی گرمی ہے، اندر جاؤ۔"

"میں یہاں ٹھیک ہوں بوا۔"

وہ میری طرف دیکھتی ہوئی بولی تو میں ہنستا ہوا واپس آ کر بستر پر گر گیا۔

اسی صبح میں واپس چلا گیا۔ اور عجیب اتفاق کہ پھر دو ماہ تک ادھر نہ جا سکا۔ اور جب گیا تو وجیہہ کی گود میں گول مٹول سی بچی تھی۔ میری اپنی بچی! میں نے بے تحاشا اسے چوما۔ بوا سامنے تھیں لہٰذا آنکھوں سے وجیہہ سے باتیں کیں۔ مگر کچھ ہی دیر بعد میرا ذہن پھر مجھے ورغلا رہا تھا۔

یہ بچی اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔ دور اپنی دنیا میں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جس طرح تم دنیا کے سامنے وجیہہ کو اپنی بیوی کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے اسی طرح تمہاری بیٹی بھی اسی گمنامی کے غار میں قید رہے پھر ایسی عورت کا کیا اعتبار جو ایک مرد کی خاطر خاندان والدین اور مذہب کو تج دے۔ تم ایسی عورت کی تربیت دلاؤ گے بیٹی کو۔ جو بے اعتباری کی حدود کو چھو رہی ہے۔ میرا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔

میں وجیہہ سے بات کئے بغیر واپس آ گیا۔ مگر ذہنی سکون عنقا ہوتا جا رہا تھا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا۔ اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو اپنا آپ بہت ہیچ اور کمتر لگتا ہے۔ مگر ایسے میں مجھے پہلی بار یہ پتہ چلا کہ میں نے اس عورت سے

محبت کی عشق کیا۔

مگر اعتبار تو کبھی بھی نہیں کیا۔ پہلے دن سے یہ عورت دل میں پھانس بن کر اٹک گئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے میں اسے اپنے گھر نہ لے جا سکا۔ کہ یہ اس قابل ہی نہ تھی۔ گھر چھوڑ جانے کا جرم ہمارے معاشرے میں کوئی معمولی جرم نہیں۔ اس سے تو خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے اور انسان کسی کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اسے اپنا آپ بہت ذلیل محسوس ہوتا ہے اور یہی حال میرا بھی تھا۔

میں وجیہہ کے ساتھ اس گناہ میں شریک تھا جس سے خاندان کی ناک کٹ جاتی ہے۔ مگر میں خود اپنی ناک کٹوانا نہ چاہتا تھا۔ یہ بچی اس کی صحبت میں ہرگز نہ رہے گی۔ گو کہ وجیہہ بھی ماں تھی اور کوئی ماں اولاد کو بری تربیت نہیں دیتی، غلط راہ نہیں دکھاتی مگر میں کیا کرتا کہ یہ دل ایک ہی مطالبہ کرنے لگا تھا کہ میں اس عورت سے اپنی پھول سی بچی کو الگ کر دوں۔

اور دل کے اس مطالبے کو آخر میں نے قبول کر لیا کیونکہ بہرحال میری بچی کا وہی گھر ہے جہاں میں رہتا ہوں وہ چور کی مانند کیوں جیئے۔ ہمارے کیے کی سزا وہ کیوں کاٹے! تب میں وجیہہ سے کہہ بیٹھا۔

"جوہی! میری خواہش ہے کہ میری ملیحہ میری ماں کی گود میں پلے بڑھے۔!"

"مگر تم نے تو بتایا تھا کہ امی ہماری شادی سے لاعلم ہیں۔"

"لاعلم تو ہیں۔ مگر میں انہیں کہہ دوں گا کہ یہ لاوارث بچی ہے۔"

"مگر کیوں شیراز۔ کیوں؟ تم مجھ سے میری بچی کو کیوں دور کرنا چاہتے ہو؟"

وہ ہمیشہ کی طرح رو پڑی۔

میں ہنس دیا۔ دیر تک ہنستا رہا۔ اور پھر جو بولا تو جانے میرا لہجہ کیسا تھا۔

"جوہی بیگم! میں نے تمہیں محبت دی، گھر بار دیا، تحفظ دیا۔ مگر اس کے عوض مجھے کیا ملا؟ میں نے تمہاری ذات سے کیا پایا؟ کچھ بھی نہیں۔ تم نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ کچھ نہیں۔ اور وہ جو ایک چیز اعتبار ہوتی ہے نا۔ وہ تم مجھے دے ہی نہ سکیں۔ تو یہ وجہ ہے کہ میں اپنی بیٹی کو تمہاری تربیت نہیں دلوانا چاہتا۔"

"میں نے تمہیں کچھ نہیں دیا؟" وہ روتے روتے بالکل میری طرح ہنس دی۔ مگر لہجہ اس کا بھی عجیب سا تھا۔ "شیراز تمہاری محبت کے جواب میں کیا کچھ نہ کیا۔ تمہاری محبت کا قرض، محبت دے کر ادا کیا۔ پھر تمہارے اسی قرض کو چکانے کے لئے گھر بار، ماں باپ، مذہب برادری سبھی کچھ چھوڑ آئی۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ تم میری جانب سے تہی دست رہے ہو۔ بولو ۔۔۔ اب کیا چاہتے ہو۔!!"

"صرف اعتبار۔ کہ مجھے شادی کے بعد کبھی تم پر اعتبار نہیں آیا۔"

"پھر یہ میں کیسے دوں؟ کیسے دے سکوں گی؟" وہ رو دی۔

"جوہی جس روز کوئی لڑکی محبوب کی خاطر گھر بار اور والدین کی نیک نامی بیچ آتی ہے نا تو اسی روز اس کے محبوب کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ عورت ہرگز قابل اعتبار نہیں ہو سکے گی۔ شاید اسی لئے ایسی لڑکیوں کا حشر برا ہوتا ہے۔ مگر تم گواہ ہو، میں نے محبت نبھائی ہے۔ اعتبار ہار کر بھی تمہیں رسوا نہیں کیا۔ تمہارا احترام کیا۔ تم سے شادی کی تمہیں اپنی ہونے کا اعزاز بخشا۔ مگر یہ بچی۔ یہ جس کی رگوں میں میرا خون گردش کر رہا ہے اسے میں تمہارے زیر سایہ نہ پلنے دوں گا اس کے لئے خواہ مجھے اس بچی کو یتیم ظاہر کرنا پڑے۔"

"تمہیں اعتبار چاہیئے۔ مل جائے گا۔ میں تمہیں اس سلسلے میں بھی تہی دست دیکھنا پسند نہ کروں گی۔" وہ خاموش ہو گئی۔

میں خرچ کے لئے روپے رکھ کر لوٹ آیا میری ملیحہ میرے ہمراہ تھی۔ گھر آ کر امی جان اور بیوی کو بمشکل یقین دلایا کہ یہ میرے دوست کی بچی ہے جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور اس کی بیوی اس بچی کو جنم دیتے ہی چل بسی ہے۔"

غزالہ، میری بیوی نے بچی کو گود میں بھر لیا اور امی جان نے بھی محبت سے ملیحہ کے بال سنوارے۔ تب اگلے روز میں جوہی کے ہاں آ گیا۔ بوا نے دروازہ کھولا اور میں تیزی سے اس کے بیڈ روم میں آ گیا۔ مگر یہ کیا۔ سامنے بیڈ پر میری جوہی، میری ملیحہ کی ماں، میری پارو، میری چاہت آنکھیں بند کئے ساکت پڑی تھی۔ میں بیقراری سے اس کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھا، پھر دل کی دھڑکن سنی جو جانے کب کی بند ہو چکی تھی۔ تب میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ آج میں نے جوہی سے اعتبار بھی پا لیا تھا۔ مگر کب۔ اسے کھو دینے کے بعد میرا دم گھٹنے لگا۔ آنسو تیزی سے بہنے لگے اور سسکتا ہوا میں اس پہ گر گیا، لیکن اتنی نازک صورت حال میں بھی کانوں میں ایک نقطہ ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ میں نے کانوں میں انگلیاں دے دیں، تاکہ "اعتبار ۔۔۔ اعتبار ۔۔۔ اعتبار" کی گردان سے نجات پا جاؤں جو ممکن نہ تھی۔

بشریٰ نسیم

*

دشتِ جاں کا سناٹا

گھٹی گھٹی سی ہوک سینے میں دبائے ہوئے وہ بے دلی سے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی آئینے میں اپنا عکس نظر آتے ہی وہ بری طرح پھوٹ پڑی تھی اور دوسرے ہی لمحے کسی زخم خوردہ شیرنی کی طرح بپھر اٹھی جھپٹ کر آئینہ کو دیوار سے نوچا اور پوری قوت سے آنگن میں دے مارا۔

چھن ——— چھناک ——— چھن ——— آئینہ کی کرچیاں دور دور تک بکھر گئیں۔

'ارے کم بخت توڑ دیا آئینہ؟'

اماں شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر پلٹ آئیں لیکن وہ تو جوں کی توں لال بھبھوکا چہرہ لئے خونخوار ہو رہی تھی۔

'ہاں ——— ہاں، سب آئینے توڑ دوں گی، سب توڑ دوں گی۔'

وہ جنونی حالت میں اپنے بال نوچنے لگی تو اماں نے آگے بڑھ کر ایک دو ہتڑ اس کی کمر پر جڑ دیا۔

'نامراد! آئینے توڑنے سے کیا ہوگا جنم جلی صورت تو وہی رہے گی۔ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہے۔'

اماں بی... غصہ دکھاتے ہوئے پسیج سی گئیں اور وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے بلک اٹھی۔

وہ تو خود ہی شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں جانے سے کتراتی رہتی تھی لیکن آخر کو لڑکی تھی اور یہ تو یوں بھی اس کی بچپن کی سہیلی کی شادی تھی وہ سب خیالات پس پشت ڈال کر ابٹن کی رسم میں چلی آئی تھی اور اماں کے ہزار کہنے پر اس نے اپنے زرد کپڑوں پر دھنک بھی لگالی تھی وہ تو کپڑے پہن کر مارے ڈر کے آئینے کے سامنے بھی نہ گئی تھی کہ کہیں اپنی صورت دیکھ کر جانے ہی کو جی نہ چاہے۔

پھر بھی حمیدہ کے گھر کا آنگن پار کرتے کرتے بھی کتنے ہی قہقہوں اور دبی دبی سرگوشیوں نے اس کا پیچھا کیا تھا وہ سب کی نظروں سے بچتی بچاتی آ تو گئی تھی لیکن اس خوبصورت رسم میں کونے میں سر دیئے بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر 'میرے میہڑے سے آج مجھے آیا یہ پیلا جوڑا یہ ہری ہری چوڑیاں' گیت الاپ رہی تھیں۔ اور تب ہی وہ گیت کی لے میں کھو کر لڑکیوں کے ساتھ آواز میں آواز ملانے لگی۔

لیکن ——— لڑکیاں تو جیسے اس کے منہ کھولنے کی ہی منتظر تھیں۔

آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر تمسخرانہ ہنسی لئے ایک دوسرے کو ٹھوکا دیتے ہوئے اس کی طرف یوں دیکھتیں جیسے اس کے سر پر سینگ اگ آئے ہوں۔

'مس نجمہ، ہیلو ہیلو! آپ کے حسن کا راز۔'

ایک شریر سی لڑکی نے نجمہ کے آگے ہاتھ مائک کی طرح بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

'میرے حسن کا نکھار سوڈا کاسٹک پاؤڈر۔'

نجمہ نے فلمی اداکاراؤں کی طرح چہرہ گھماتے ہوئے جواب دیا تو اردگرد بیٹھی تمام لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں یہاں تک کہ حمیدہ بھی زرد مایوں کے جوڑے میں چھوٹے سے گھونگھٹ میں مسکرا دی۔

اور وہ ——— وہ تو اس مذاق سے اس بری طرح ٹوٹ پھوٹ سی گئی کہ حمیدہ کے ہزار روکنے پر بھی نہ رکی اور تیر کی طرح چلی آئی۔

اور اب ——— آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر وہ پاگل ہو اٹھی تھی۔ کیا وہ اتنی ہی بدصورت تھی کہ اس سے شدید نفرت کی جائے، اس کا مذاق اڑایا جائے۔

'خدایا!

مجھے اس تحقیر کے بدلے تو موت دے دے میرے مالک۔

...... یا پھر سب لڑکیوں کو میری طرح کر دے، بالکل میری طرح تاکہ یہ میرا مذاق تو نہ اڑا سکیں۔'

وہ بدصورت تھی ——— سیاہ آبنوسی رنگت، چہرے پر چیچک کے داغ، موٹے موٹے ہونٹ، سرخ پھیلا ہوا جبڑا، البتہ آنکھیں اور بال بہت خوبصورت تھے سیاہ بڑی بڑی غلافی

آنکھیں، اور گھٹنوں کو چھوتے ہوئے سیاہ خمدار بال جب وہ کھولتی تو کبھی کبھی تو اماں ہی گھبرا کر کہہ دیا کرتی تھیں۔

'' اے ہے، ہجو بالوں کو تو باندھ لے مجھے تو تیرے بالوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔''

لیکن چہرے کی اتنی بدصورتی میں اتنے ذرا سے حسن کو کون تلاش کرتا۔

وہ تو واقعی جنم جلی تھی۔ کیونکہ اس کے جنم لیتے ہی طوفان مچل اٹھے تھے۔ اس سے پہلے ایک بھائی تھا دو سال کا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو اس کی بے انتہا سیاہ رنگت اور بھونڈے نقوش نے پہلے دن ہی سے اماں کے دل میں نفرت ڈال دی وہ خود تو اچھی خاصی شکل و صورت کی مالک تھیں ابا میاں بھی خاصے تھے ہاں! رنگ سانولا تھا لیکن وہ تو جانے کہاں سے اتنی سیاہی

چرا لائی تھی........ اس کا رنگ تو اماوس کی رات کی طرح سیاہ تھا۔

شاید اسی لیے سیاہ بخت بھی تھی۔ کیونکہ اس کے پیدا ہوتے ہی ایک ہفتے کے اندر اندر اسے چیچک کا شکار ہونا پڑا۔ کافی بھاگ دوڑ کرنے پر وہ تو کسی نہ کسی صورت بچ گئی لیکن اس کا دو سالہ بھائی اس مرض کی لپیٹ میں اس بری طرح آیا کہ اماں سینے پر دو ہتڑ مار کر بلک اٹھیں۔

"ارے اس کلموہی کو ہی موت آ جاتی میرا جگر کا ٹکڑا تو بچ جاتا۔"

اور یوں........ وہ پیدا ہوتے ہی نفرتوں کے گرداب میں پھنس گئی، اس کے بعد اماں نے تلے اوپر تین بیٹیوں کو جنم دے کر ہار مان لی اور اس طرح وہ اس گھر کے چراغ کو گل کرنے کی واحد سزاوار ٹھہرائی گئی۔

یوں تو اس کی تینوں بہنیں بھی سانولی رنگت کی تھیں لیکن ان کے تیکھے تیکھے نقوش نے سانولی رنگت کو بھی دلکش بنا دیا تھا۔ ایک سب سے الگ تھلگ تھی تو وہ ہی بدنصیب تھی۔

اماں اٹھتے بیٹھتے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتیں۔ حالانکہ اس نے بھی انہی کی کوکھ سے جنم لیا تھا لیکن جانے کیوں وہ اسے ممتا کا وہ پیار نہ دے سکیں جو اولاد کے لیے ہوتا ہے وہ لاشعوری طور پر اسے کسی طور پر اولاد تسلیم نہیں کر پائی تھیں ایک تو اس نے پیدا ہوتے ہی ان کا ہنستا کھیلتا بیٹا چھین لیا دوسرے اس کے بعد تین بیٹیاں تلے اوپر پیدا کر کے آئندہ کے لیے ناامید ہو گئیں کیونکہ تیسری بیٹی کی پیدائش پر کچھ ایسی خرابی ہوئی کہ وہ آئندہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہیں۔

یہ تمام باتیں........ وہ اسی سے منسوب کرتیں۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتیں کہ ان کے ہاں کسی بدروح نے تو جنم نہیں لیا۔ اور یہ سوچ کر ہی انہیں اس سے خوف آنے لگتا۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ خوف نفرت میں بدلتا گیا۔

اس طرح وہ اپنے ہی گھر میں نفرتوں کا شکار ہو کر رہ گئی۔

اماں کی وجہ سے چھوٹی بہنیں بھی اس سے اتنی ہی نفرت کیا کرتی تھیں۔ وہ تینوں اماں سے اتنی الٹی سیدھی شکایتیں کرتیں کہ وہ سارا دن جل تھل آنکھیں لیے گم صم اکیلی بیٹھی آسمان تکا کرتی تقدیر کے اس بھیانک مذاق پر اس کا ذہن ہر وقت خدا سے شاکی رہتا۔

وہ جو اپنوں کی چاہتوں کی بھوکی تھی۔

وہ جو، محبت کی ایک ایک بوند کی پیاسی تھی۔

اس کی ترسی روح تو پیار کی چھایا کے لیے بھٹک رہی تھی۔

لیکن ــــ؟

اس کے گھر والے تو اسے چھوتے ہوئے یوں ڈرتے تھے کہ جیسے اسے ہاتھ لگاتے ہی سیاہ پتھر میں تبدیل ہو جائیں گے۔

اس نے بڑے کرب سے سوچا اور وہ منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا ایک مرتبہ اس کی چھوٹی بہن ملیحہ بخار میں پھنک رہی تھی وہ بڑی محبت سے اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔

"ملی، لاؤ میں سر دبا دوں؟"

اس نے بڑے پیار سے اس کا سر تھامتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں........ تم جاؤ........ جاؤ یہاں سے........ مجھے وحشت ہوتی ہے تم سے جاؤ... امی۔"

ملیحہ نے بخار کی بے ہوشی میں بھی اس کا وجود برداشت نہ کیا تھا۔ اور اس نے چیخ چلا کر جس نفرت کا اظہار کیا تھا اس پر اس کا دل لہولہان ہو کر رہ گیا۔

"ارے تم اس کے سرہانے بیٹھی کیا کر رہی ہو ــــ اس بیمار پر تو اپنی پرچھائیں نہ ڈالو۔"

امی جو ملیحہ کی آواز پر دوڑی آئی تھیں اسے ملیحہ کے بستر پر بیٹھے دیکھ کر چلا پڑیں۔ اور وہ اپنے امنڈتے آنسوؤں کو پلکوں میں چھپائے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اسے بچپن سے جو نفرت ملی تھی وہ شعور کی منزل تک احساس کمتری بن کر اس کے وجود پر چھا گئی تھی۔ اور اب تو وہ خود دنیا کی نظروں سے چھپنا چاہتی تھی، سب سے اوجھل رہنا پسند کرتی تھی۔ کسی کی شادی ہو، مہندی، ابٹن، کچھ بھی ہو وہ کبھی نہ جاتی، تب صرف اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھوں سے اپنی بہنوں کو تیار ہوتے دیکھتی رہتی۔ اس کی تینوں بہنیں بہت خوبصورت تھیں لڑکپن کی بے فکری نے ان کے چہروں پر حسن کا غرور بکھیر دیا تھا وہ رنگ برنگے گوٹے کناری سے سجے کپڑے پہن کر اتراتی پھرتیں لیکن وہ........ تو اپنے آپ کو گھر کے کام میں مصروف رہنے کا بہانہ بنائے بنائے چور نظروں سے انہیں دیکھتی رہتی۔ اماں بی نے بھی اسے کبھی جانے کو نہ کہا تھا شاید وہ خود بھی اسے اپنے ساتھ لے جانے سے کتراتی تھیں۔

اسی لیے وہ اکیلے گھر میں ڈانواڈول پھرا کرتی۔

اسے تنہائی میں سکون ملتا تھا۔ وہ اکیلے بیٹھے سوچا کرتی۔

جیسے وہ آسمانوں پر اڑی جا رہی ہو۔ اس کے خوبصورت چہرے اور خوبصورت لباس کو سب دیکھ رہے ہیں۔

اس کی بہنیں
اس کی ماں
اس کی سہیلیاں

سب پیچھے رہ گیا ہے اور وہ خود دور —— بہت دور سب سے اونچی ...... اوپر اور اوپر ...... آسمانوں میں سفید سفید، بادلوں کے سنگ تیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اس کے کھلے کھلے بالوں میں چمپا اور جوہی کے پھول مہک رہے ہیں۔ اور ایک حسین شہزادہ اس کا ہاتھ تھامے اسے محبت بھری نظروں سے تکے جا رہا ہے اور وہ ...... آنکھیں بند کئے مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ چلی جا رہی ہے۔

لیکن؟

آنکھ کھلتے ہی وہ تنہا ہوتی ..... یہ سب تو اس کا سپنا تھا۔ لیکن ان سپنوں میں اسے تسکین تو مل جاتی تھی

سپنے ..... جو اس کے اپنے تھے۔
سُندر سُندر سے
دھنک رنگ کی طرح روشن اور خوبصورت

وہ پہروں بیٹھی سوچا کرتی۔

تو پیار کا ساگر ہے
تیری اک بوند کے پیاسے ہم

گیت کے بول اس کے ذہن میں گونجنے لگتے تو اسے یوں جان پڑتا جیسے یہ گیت اسی کے لئے لکھا گیا ہو تب ...... اس کے سپنے بکھرنے لگتے ...... اور وہ چپ چاپ آنسوؤں کو پی کر شانت سی ہو جاتی وہ بھی تو پیاسی تھی۔

ایک ایک بوند کی
ایک ایک قطرے کی

مگر یہ پیاس، تو اب اس کا مقدر تھا۔

وہ دسمبر کے آخری دن تھے سارا سارا دن ہولے ہولے تیز جھکڑ چلتے رہے۔ رات کی بارش نے سردی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا امی پچھلے ایک ہفتہ سے ہلکے بخار میں مبتلا تھیں موسم کی شدت اور بارش نے انہیں نمونیہ جیسے مرض میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ دن رات ان کی پٹی سے لگی رہتی۔ رات کو دوسری بہنیں تو سو بھی جاتیں لیکن وہ ساری ساری رات ان کے سرہانے بیٹھی ان کے سینے کی سنکائی کرتی رہتی ..... یا پھر سجدے میں سر رکھے گڑگڑا کر ان کی صحت کے لئے بھیک مانگتی رہتی۔

"خدایا تو میری ماں کو صحت اور زندگی عطا کر دے۔ اے پروردگار، میری زندگی بھی میری پیاری امی کو دے دے۔ مجھے اپنے لئے زندگی نہیں چاہیئے۔ نہیں چاہیئے میرے مالک۔"

وہ سجدے میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تب غنودگی میں اماں بی کے کانوں سے اس کی آواز ٹکرائی ...... تو وہ اس سیاہ رنگت کی لڑکی کو دیکھتی رہ گئیں۔

جو ان کی بیٹی تھی
جس نے ان کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔
وہ جو جنم جلی تھی،
لیکن آج ان کے سینے میں اس کے لئے ایک تڑپ سی اٹھی تھی،
ان کے بازو بے چین ہو گئے۔
ان کا دل بے اختیار چاہا تھا۔
اس کی سیاہ پیشانی چومنے کو۔
چیچک زدہ چہرہ چومنے کو۔
وہ تو ان کی اپنی تھی۔
اپنا خون تھا۔
جگر کا ٹکڑا تھا۔

"خدایا —— مجھے معاف کر دینا۔ میں نے اپنی بچی سے بہت بے انصافی کی ہے۔"

دو آنسو ان کی آنکھوں کے گوشے بھگو گئے۔

تب ہی اس نے آنکھیں بند کئے کئے ان پر پھونک ماری تو گرم بازوؤں نے اسے تھام لیا۔

"سجیلہ۔"

پیار سے بھری نقاہت زدہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ حیران رہ گئی

"اماں۔"

برسوں کے شکوے بھلا کر وہ ممتا کے ساگر میں ڈوب گئی اس کے دل و دماغ میں تو ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

اک بوند کے پیاسے ہم
اک بوند کے پیاسے ہم

اس کی قسمت کی تھوڑی سی سیاہی چھٹ گئی۔ امی کی جان لیوا بیماری کو اس کی جان توڑ کوشش اور تیمارداری نے جس طرح

شکست دی تھی اس نے اسے پیار کا سہارا دے دیا تھا۔
تب ہی امی کو بھی احساس ہوا کہ ان کی بدصورت بیٹی کتنے نصیبوں والی ہے جس کی دعاؤں نے انہیں ایک نئی زندگی بخش دی تھی۔
پیار کا یہ ہلکا سا اشارہ پاکر وہ تنہا تھی۔ گو کہ اماں اب اس کے ساتھ پہلے والا برتاؤ تو نہ رکھتیں لیکن پھر بھی جانے کیوں اسے محسوس ہوتا جیسے وہ اسے بھیک دے رہی ہوں۔
اُسے پیار کے بول بھیک لگتے۔
ان کی جان کا صدقہ۔
اور اب تو وہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی۔ اُسے کسی کی بات بُری نہ لگتی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ بُرا مان کر وہ کیا کر سکتی تھی؟
کسی کا کیا بگاڑ سکتی تھی؟
پھر بُرا ہی کیوں مانے؟
اس کی اپنی دنیا تھی اپنی خوشیاں، اپنے دکھ
آج تو وہ خوش بھی تھی۔ اور اداس بھی۔
آج اس کا بی۔ اے کا رزلٹ نکلا تھا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی تھی۔ ابا میاں اخبار ہاتھ میں تھامے ہوئے اس کے پاس دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ ایک ہی تو تھے جو اس کے اپنے تھے۔
"سحو!۔۔ مبارک ہو بیٹا تم فرسٹ آئی ہو۔"
ابا میاں نے کپکپاتا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا تو ایک لمحے کے لئے خوشی سے اس کا دل ناچ اٹھا۔ لیکن؟ دوسرے ہی لمحے وہ اداس تھی۔
اماں نے باورچی خانے سے جھانکتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا تھا۔
"چلو اچھا ہوا۔"
اور۔۔۔۔۔۔ وہ پریم رس کے پیالے کو منہ لگاتے لگاتے رہ گئی۔
دن معمول کے مطابق گذرتے جا رہے تھے۔ اُسے بی۔ اے کئے ہوئے دو سال ہونے کو آرہے تھے۔ تینوں چھوٹی بہنیں بھی اب تو جوان ہو چکی تھیں ابا میاں کی کمر دن بدن جھکی جا رہی تھی۔
گرمی کی لمبی لمبی دوپہریں طبیعت میں اکتاہٹ سی بھر دیتیں۔ موسم گرما اور بیزار سا ہو گیا تھا۔ اماں بی کا لہجہ وا!
نفرت اور بیزاری ایک مرتبہ پھر عود کر آئی۔
کیونکہ اب پھر وہ نفرت کے قابل تھی۔
سینے کا پتھر بن کر جو رہ گئی تھی۔
اس کی بدصورتی اس کا داغ تھا۔
اور۔۔۔۔ اس داغ کو کوئی بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ بہنوں کی نفرت بھی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ ان کے لئے راستے کا پتھر جو تھا۔
اسی لئے ایک مرتبہ پھر وہ اپنے آپ میں ڈوبتی چلی گئی۔
گرمی کی سنسان دوپہروں میں وہ جان بوجھ کر باورچی خانے کی گھٹن میں گھنٹوں بیٹھی جانے کہاں سے کہاں پہنچ جایا کرتی۔
ان ہی دنوں ایک جھلسا دینے والی دوپہر کے بعد شام کو وہ آنگن میں جھاڑو لگا کر چھڑکاؤ کر رہی تھی کہ ابا میاں تیزی سے اماں کے پاس آئے اور جانے کیا کھسر پھسر کی کہ اماں بی نے اطمینان کا سانس بھرتے ہوئے کہا۔
"بس! خدا کرے یہ ہو جائے۔"
تب ہی اسے پتہ چلا کہ اس کے لئے کسی کا پیغام آیا ہے پہلی بار کسی اجنبی نے اس کے دل پر دستک دی تھی پھر بھلا وہ کاہے کو نہ ٹھٹھکتی۔ مارے ڈر کے اسے ساری رات نیند نہ آئی۔
کون ہے؟
کیسا ہے؟
کیا وہ مجھے پیار دے سکے گا؟
اگر اس نے بھی نفرت سے منہ موڑ لیا تو۔۔۔۔۔؟ تو؟؟؟
نہیں۔۔۔ نہیں۔
وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس حلق سے اتار کر اس کے حواس درست ہوئے، مشرق سے پو پھوٹ رہی تھی، وہ وضو کر کے نماز کے بعد دیر تک مصلے پر بیٹھی رو رو کر دعائیں مانگتی رہی۔
اور شاید!
یہ اس کی دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی تھی کہ اماں بی کو سکھ کا سانس آیا اور ابا میاں وہ تو بہت زیادہ خوش تھے۔
شام کو آتے ہوئے انہوں نے لڈوؤں سے بھرا ڈبہ اس کی ماں کے آگے سرکاتے ہوئے کہا۔
"لو بھئی! منہ میٹھا کر لو اگلے ہفتے تک رسم کر دیں گے۔"
اور وہ۔۔۔ توے پر روٹی ڈالتے ڈالتے ٹھٹک سی

گئی۔

"ہائے اللہ! یہ شرم بھی کیا ہوتی ہے۔ اپنے آپ سے آئی حیا رہی ہے۔"

روبی پکا کر اٹھی تو جانو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے شام کا پیلا دھندلکا آج اسے زندگی میں پہلی بار حسین دکھائی دے رہا تھا چڑیوں کی چہکار اسے یوں لگ رہی تھی جیسے وہ کہہ رہی ہوں —— مبارک ہو، مبارک ہو۔

آج تو وہ اپنی بہنوں کے چہرے سے ابھرنے والی تمسخرانہ مسکراہٹ کو بھی نظر انداز کر گئی تھی۔

رات کو اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے کتنے ہی خیالوں نے اسے آگھیرا تھا۔

"کون ہے وہ؟"

"کیا نام ہے؟"

"کیسا ہے؟"

اسے تو کچھ بھی پتہ نہ چل سکا تھا ..... اور وہ پوچھتی بھی کیسے۔

ان سب سوالوں کے جواب تو خود بخود مل جاتے جب چھوٹی بہنیں شرارت سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے سب کچھ بتاتیں اور بظاہر تو وہ انجان بنی رہتی۔ لیکن ساری توجہ انکی باتوں پر ہوتی۔ تب اسے پتہ چل جاتا کہ وہ کون ہے؟ کیسا ہے؟ لیکن ...... لیکن اس کے ساتھ تو کسی نے کوئی شرارت نہیں کی تھی۔ کسی نے پلٹ کر یہ بھی نہیں کہا تھا کہ تم ..... تم اب پرائی ہونے والی ہو۔

لیکن وہ تو ہمیشہ سے پرائی تھی سب کے لئے۔

تب وہ اپنی سوچوں کو اپنا ہمراز بنا کر پہروں جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ رات کو آنکھیں موندے وہ چپ چاپ رات گئے جاگتی رہتی۔

یہ کیسی خوشی تھی کہ اس کے خواب اس سے روٹھ گئے تھے۔

اس کے دل میں ہر وقت ایک چبھن سی ہوتی رہتی تھی۔

وہ تو آج بھی جاگ رہی تھی ..... روز کی طرح، اس سے کچھ ہی فاصلے پر ابا میاں کے قریب اماں جھکی جھکی سرگوشی کر رہی تھیں۔

"سجو کی ماں۔ لڑکا بہت شریف ہے بے چارے کا بہن بھائی، ماں باپ کوئی بھی نہیں ہے۔ خود ہی محنت مزدوری کر کے پڑھ لکھ گیا ہے اب اکاؤنٹنٹ بن کر باہر جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کل شام ہی بلوا لو۔ چھوٹی موٹی رسم کر دیں گے۔"

ابا میاں خوشی سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔

"سجو کے ابا تم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہو جب لڑکے کا کوئی آگے پیچھے ہے نہیں تو رسم کرنے کون آئے گا اور پھر تم جانو —— ایسی رسم میں لڑکی کو دیکھ کر۔"

اماں کا ادھورا جملہ خدشات سے پُر تھا۔

"میری مانو تو اگلے جمعہ کو نکاح رکھ لو۔ رخصتی سال بعد کر دیں گے۔ کام بھی سادگی سے ہو جائے گا اور کم از کم کسی بات کا خدشہ بھی نہیں رہے گا۔"

اماں بی نے اپنے خیال سے دور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا اور تھوڑی سی پس و پیش کے بعد ابا میاں بھی ان کے ہم خیال ہو گئے اس کے بعد وہ اس چھوٹی سی تقریب کو سجانے کے انتظامات کے لئے غور و فکر کرتے رہے اور وہ —— ان سب باتوں سے دور سوچ رہی تھی۔

"میرے اجنبی ہمسفر! تو گویا تم ایک ہفتے بعد میرے آنگن میں آن اترو گے مجھے اپنانے کے لئے لیکن کون جانے یہ بندھن زندگی بھر کا بھی ہو گا یا ......"

اس کی منفی سوچیں پھر یلغار کر رہی تھیں اور وہ خوشی اور دکھ کے سایوں میں لپٹی لپٹی جانے کب سو گئی۔

صبح حسب معمول بھی وہ دوسرے کام نمٹا کر باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھی پالک کا ساگ کاٹ رہی تھی کہ اماں اس کے قریب چلی آئیں۔

"سجیلہ۔"

آج اس نے دوسری مرتبہ اپنی ماں کے منہ سے پیار سے بھرپور لہجے میں اپنا نام سنا تھا۔

"جی اماں۔"

وہ تو اتنے سے پیار سے ہی پگھل اٹھی تھی۔

"اگلے جمعہ کو تمہارا نکاح ہے۔ ارشد بہت اچھا لڑکا ہے تمہارے ابا کہہ رہے تھے اس بیچارے کا کوئی بھی نہیں ہے اس لئے سوچا سادگی سے لگے ہاتھوں نکاح ہی کر دیں یوں بھی وہ اگلے مہینے سعودی عرب چلا جائے گا۔"

اماں اسے تفصیل بتا رہی تھیں لیکن اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اماں کے سینے سے لگ کر اتنا روئے کہ اس کا بوند بوند

کو پیاسا من جل تھل ہو جائے۔ لیکن پیار کا ساگر تو خشک تھا وہ اپنی خواہش کو سینے میں دبا کر رہ گئی اور یہ دبی دبی خواہش آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے بہہ نکلی۔ اماں اپنا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر رکھے رہے پل بھر بعد آگے بڑھ گئیں

اور پھر........ وہ شام بھی آ گئی جب وہ گلابی گوٹے سے بھرا دوپٹہ اوڑھے ماتھے پر ٹیکہ سجائے گھونگھٹ کی اوٹ میں زندگی زندگی آواز میں قبول کیا قبول کیا کہہ کر سسک اٹھی۔ اس لمحے اس سسکتی بلکتی بتول پر اماں کو ٹوٹ کر پیار آیا اور وہ اس کی پیشانی، رخساروں پر بوسہ پر بوسہ دیئے گئیں۔ تب ہی وہ تو سب کچھ بھول کر پیار کی اس برستی برکھا میں اپنا تن من بھگوتی رہی۔ اس کی جنم جنم کی پیاسی روح سیراب ہو رہی تھی اور وہ اماں کے کندھے سے لگے ہلکی پھلکی ہو گئی۔

وہ تو یہ بھی بھول گئی کہ ابھی چند لمحے پہلے سسرال سے آئی ہوئی مہمان عورتوں میں سے کوئی دوسری عورت کہہ رہی تھی

"وہ بے چارہ تو سر پکڑ کر رو دے گا۔"

"ہاں بہن اس کی ماں بہن ہوتی تو کم از کم پہلے آ کر لڑکی تو دیکھ لیتیں۔"

"اور کیا۔ کم از کم ارشد ہم سے ہی کہلوا دیتے کہ پہلے لڑکی کو دیکھ آؤ۔"

ایک شوخ سی لڑکی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"اس غریب کو کیا پتہ تھا کہ......"

قریب ہی بیٹھی دوسری عورت نے دبی دبی آواز میں بات ادھوری چھوڑ دی لیکن....... گھونگھٹ کی اوٹ میں سے بھی اس نے شریر نظروں اور دبی دبی ہنسی کو محسوس کر لیا تھا

ان کی باتیں سن کر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ گھونگھٹ کو آگ لگا دے۔

"ہاں اسے دلہن بننے کا کوئی حق نہیں۔"

وہ بدصورت ہے۔

وہ بدصورت ہے۔

لیکن اب اماں اسے سکھی رہنے کی دعائیں دے رہی تھیں تو وہ سوچ رہی تھی ماں کی دعائیں تو عرش ہلا دیتی ہیں۔

کون جانے یہ دعائیں پوری ہو جائیں۔

وہ من ہی من میں الجھتی رہی۔

رات ـــ کپڑے تبدیل کرنے سے پہلے اس نے ڈرتے ڈرتے آئینے میں دیکھا۔

یہ وہ تو نہیں تھی؟

پھر کون تھا؟

وہ تو آج بہت حسین لگ رہی تھی۔

گلابی کرن لگے دوپٹے میں اس کا سیاہی مائل رنگ بھی خوبصورت لگ رہا تھا۔ گھنگھریالے بالوں کی لٹیں ماتھے پر بے ترتیبی سے بکھر کر اور بھی دلکش لگ رہی تھیں ماتھے پر چمکتا ہوا ٹیکہ۔ ناک میں چھوٹی سی جگمگاتی ہوئی نتھ۔

"اللہ یہ حسن کہاں سے اتر آیا۔"

"ارشد"

اس کے من میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

میرے دیوتا۔

میرے سرتاج۔

میں تمہاری داسی بن کر رہوں گی ـــ تمہاری کنیز بن کر عمر گزار دوں گی۔ مجھے پیار سے محروم نہ کرنا۔

وہ آئینے میں اپنا عکس کھوجتے کھوجتے بہت دور پہنچ گئی تھی۔

پھر........ دن خود بخود خوبصورت سے ہو گئے اس پر دن بدن نکھار آتا جا رہا تھا۔ اماں اس کی صورت دیکھ کر حیران رہ جاتیں اور وہ....... سارا سارا دن اپنے خیالوں میں ان دیکھے شہزادے کے ساتھ مسکاتی رہتی اب تو اٹھتے بیٹھتے وہ ایسا حسین سپنا دیکھنے لگی تھی جس میں کھو کر وہ اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔

آج وہ دوپہر ہی سے کھانے کے انتظام میں جٹی ہوئی تھی رات کھانے پر ارشد اس کے گھر آ رہا تھا۔ کام کرتے کرتے اس کے ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھتے۔

اور جب رات کو آنگن میں کرسیوں پر آمنے سامنے اماں اور ارشد کھانا کھا رہے تھے تو وہ کمرے میں دروازے کی جھری سے لگی دم سادھے کھڑی تھی۔

ارشد ـــ اس کا جیون ساتھی ـــ اس کی زندگی کا ہمسفر۔ عین اس کے سامنے تھا۔ دبلا پتلا سانولا سا ـــ سفید قمیض اور کالی پینٹ میں وہ اسے دنیا کے تمام مردوں سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔

وہ اس کا سہاگ جو تھا۔

"ارشد! خدا کرے تمہاری صورت کی طرح تمہارا دل بھی خوبصورت ہو۔"

لمحہ بہ لمحہ یلغار کرتے ہوئے خیالات اٹے سے پھر لرزا رہے تھے۔

رات سارے کام ختم کرکے جب وہ سونے کے لئے لیٹی تو ارشد کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔

"ارشد صبح پانچ بجے کی فلائیٹ سے جارہا ہے۔"

ابا میاں کی آواز اس کے کانوں میں آئی جو اماں جی سے کہہ رہے تھے اور وہ ...... خیالوں ہی خیالوں میں ارشد کے ساتھ ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

رُت بدلی، دن بیتے دور دیس جانے والے کو سال بھر سے زیادہ گذر گیا تھا کچھ عرصے سے اس کا کوئی خط نہیں آرہا تھا ابا میاں اور اماں پریشان تھے یہاں پر اس کا کون تھا جس سے پتہ کرتے چند ایک دوست احباب تھے ان سے کوئی خاص بات نہ معلوم ہوسکی تھی۔

وقت کچھ اور سرک گیا تھا۔ گرمیوں کی دوپہریں پھر سرد ہواؤں میں تبدیل ہو چلی تھیں لیکن ارشد نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی تھی اس نے تو ایک سال کا کہا تھا اور اب تیسرا سال شروع ہونے کو تھا۔ اماں پھر اس کے نصیبوں کو کوس رہی تھیں۔ واقعی وہ تھی ہی بدنصیب۔

اور اب یہ تازہ دکھ تو سب دکھوں پر بھاری تھا اس کی خوبصورت غلافی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ساون رُت کی برکھا برس رہی تھی۔

یہ موسم کیوں بے کیف ہو چلا تھا۔

اس دن بھی چھاجوں مینہ برس رہا تھا وہ ورانڈے میں کھڑی دھواں دھار مینہ کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ دھواں دھار بارش تو اس کے من میں ہو رہی تھی۔ تب ہی ابا میاں بھیگتے بھیگتے چلے آئے۔ لمحے بھر کو وہ اس کے قریب ٹھٹکے اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

"اللہ۔ یہ آج ابا میاں کیوں رو رہے ہیں۔"

وہ ان کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر کانپ اٹھی اور جب وہ اپنے ہی خیالوں سے سہمی سہمی سی چائے لیکر ابا میاں کے پاس گئی تو انہوں نے ایک لمحہ اسے دیکھتے ہوئے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

"سنجو۔ میری بدنصیب بچی۔"

آنسوؤں سے ان کی آواز رندھ گئی۔ سجیلہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ ابا میاں برسوں کے بیمار نظر آرہے تھے۔

"یہ ...... ارشد نے بھیجا ہے۔"

انھوں نے رجسٹری لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا ؟"

اُسے اپنی ہی آواز پرائی لگی۔

"طلاق نامہ۔"

ابا میاں جیسے کہیں دور سے بولے۔

"طلاق۔"

اس کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں، ذہن سائیں سائیں کرنے لگا جسم میں سے گویا جان نکل گئی تھی۔

"طلاق۔"

"طلاق۔"

"طلاق۔"

یہ چار حرفی لفظ اس کے گرد گھوم رہا تھا ساری محبتیں جانے کہاں کھو گئی تھیں اس کے دل و دماغ میں نفرت کی آندھی اس طرح اٹھی تھی کہ من سنگھاسن ڈول گیا تھا۔ اور اس سنگھاسن میں سجی دیوتا کی مورتی جسے اس نے بڑے چاؤ سے سجا رکھا تھا ایک ہی جھٹکے سے ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اس کے آنسو خشک الاؤ کی طرح آنکھوں میں دہک اٹھے تھے خوبصورت آنکھیں جل تھل ہونے کی بجائے قہر اور نفرت برسا رہی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کاش ارشد اس کے سامنے ہو تو وہ اس کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھتی

تم میری صورت ہی دیکھ کر مجھے اتنی بڑی سزا دے رہے ہو میرے دل میں اتر کر دیکھا ہوتا تو ہوتا وہاں تو تمہارے لئے چاہتوں کے سمندر پھیلے ہوئے تھے تم ...... تم جو میرے اپنے تھے میری زندگی کے ساتھی ...... میرے ہم سفر لیکن تم بھی اوروں کی طرح بیگانے نکلے۔ تم نے یہ کیسی آگ بھڑکا دی جو میرے سہاگ کے ساتھ ساتھ تن من کو بھی جلا رہی ہے۔

یہ طوفان ایسا تھا جو اس کا سکون، چین، حسین خواب سب کچھ اڑا کر لے گیا تھا۔ زندگی کے اس بھیانک مذاق کو اس نے جس پامردگی سے برداشت کیا تھا اس پر سب حیران تھے۔

وہ نہ روئی۔

نہ تڑپی۔

نہ چلائی۔

بلکہ خاموش مسکراہٹ سے اس ستم کو سہ گذری تھی لیکن تنہائی میں تو اس کی آنکھوں سے دل خون ہو کر بہہ نکلتا تھا تب

اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔
تقدیر کو شکست دینے کا۔
اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا۔
اس نے اماں اور ابا میاں کے سامنے بڑے سپاٹ اور غیر جذباتی لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔
"ابا میاں اب آپ میرے لئے اور کچھ مت سوچئے میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کر رہی ہوں۔"
"بیٹے تم نے کیا سوچا ہے؟"
ابا میاں اب بھی غم سے دوچار تھے۔
"میں نے لاء..... میں داخلہ لے لیا ہے بس اب میں اپنی تعلیم مکمل کروں گی اور دنیا میں اپنے لئے اتنا بلند مقام حاصل کروں گی کہ کوئی بھی مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ اب یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔"
وہ بڑی پرعزم تھی۔ اور ابا میاں اس کے اس عظیم مقصد کے آگے چپ چاپ سے رہ گئے۔ وہ کر بھی کیا سکتے تھے!
اور اب ___ اس کے پاس اپنی گھمبیر سوچیں تھیں قانون کی موٹی موٹی خشک کتابیں ہر وقت اس کے اردگرد پھیلی رہتیں اس کے دن رات قانون کی گتھیوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔
کچھ ہی دنوں بعد اس کا آنگن شہنائی سے گونج اٹھا اس دفعہ ___ دلہن ملیحہ تھی۔ اس کی چھوٹی بہن اس نے بڑے چاؤ سے اسے سسرال رخصت کیا اب لوگوں کی ہنسی اور دبی دبی سرگوشیاں اس کے لئے بے معنی ہو گئی تھیں اس نے اپنے آپ کو پتھر کر لیا تھا سخت اور بے جان!
جس دن اسے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری ملی تو وہ روتے روتے یک بارگی مسکرا دی آج اسے منزل کا نشان نظر آ گیا تھا۔ بے چین دل اب بھی سکون کا متلاشی تھا اور وہ .... سکون کی تلاش میں مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے دور دیس جا بسی۔
دن رات کی گردش نے اسے بہت کچھ بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا مقصد کے حصول نے اس کے جذبات کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا پانچ سال کے طویل وقفے نے جہاں اس کی دوسری دو بہنوں کو سہاگن بنا دیا تھا وہیں اسے سجیلہ ہاشمی، ایل۔ ایل۔ بی بار ایٹ لاء کی معتبر حیثیت عطا کر دی تھی۔
پانچ سال کے عرصے کے بعد آج..... وہ پھر اسی آنگن میں آ کھڑی ہوئی تھی جہاں ایک شخص نے اس کے ارمانوں کو اس لئے لوٹ لیا تھا کہ وہ بدصورت تھی۔
آج اس آنگن کو پار کرتے ہوئے پرانی یادیں پھر گڈمڈ ہونے لگی تھیں وہ گوٹے سے بھرا گلابی دوپٹہ۔ چھوٹا سا گھونگھٹ وہ سپنے، وہ خواب ___ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔
لیکن وہ کس قدر بدل گئی تھی۔
"آپی! آپ تو پڑھتے پڑھتے ہی بوڑھی ہو گئیں۔"
اس کی چھوٹی بہن ناجیہ اس کے سر میں چمکتے چاندی کے تاروں کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"ہاں ناجی! وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔"
وہ سوگوار سی ہو گئی۔
"ملی یہ تمہارا بیٹا ہے؟ بہت پیارا ہے۔ آؤ بیٹا میرے پاس آؤ۔"
سجیلہ نے بات بدلتے ہوئے ملیحہ کے گول مٹول چار سالہ بیٹے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"ہاں آپی! یہ فیصل ہے۔ بہت شریر ہے۔"
ملیحہ نے ناجیہ سے بات کرتے کرتے پلٹ کر جواب دیتے ہوئے کہا۔
"آؤ بیٹا میرے پاس آؤ ناں! میں آپ کی آنٹی ہوں۔"
سجیلہ اب تک ہاتھ پھیلائے اسے پکار رہی تھی۔
"نہیں ہم آپکے پاس نہیں آئیں گے۔ آپ کالی ہیں، گندی ہیں۔ کالی مائی جیسی۔ کالی آنٹی۔"
فیصل چیخ چیخ کر کہتا رہا اور وہ ___ ایک دفعہ پھر اپنوں میں بکھر کر رہ گئی اس کے پھیلے ہوئے بازو شاخ کی طرح بے جان ہو کر لٹک گئے۔
تقدیر اب بھی اسے چرکے دے رہی تھی اب بھی اسے ہر قدم پر ایک نیا غم ملتا تھا اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں جل اٹھتیں۔
پھر۔
اس کی قانون کی ڈگریاں اس کی ہمدرد بن گئیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کی پریکٹس چمک اٹھی تھی معاشرہ میں ایک باعزت مقام حاصل ہو چکا تھا۔ وہ ایک شہرت یافتہ مجسٹریٹ بن چکی تھی۔
خوبصورت بنگلہ، سیاہ چمکدار کار، بینک بیلنس ___ اعلیٰ ملبوسات، عزت و وقار کیا کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔
ہاں! ایک چیز اگر نہیں تھی تو وہ اس کا سکون تھا۔
وہ آج بھی پیاسی تھی۔
محبت کی امرت کے لئے۔
پریم رس کی دو بوندوں کے لئے۔

لوگ اپنے مسائل سلجھانے کے لئے دولت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے لیکن وہ خود اپنی گتھی آج تک نہ سلجھا سکی تھی۔ حالانکہ وہ اب بات بات پر رونے والی بدصورت لڑکی نہ تھی۔

زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ خاموشیاں اور گہری ہوتی گئیں یادیں کبھی کبھی ٹیس بن کر ابھرتیں تو وہ پہروں بے چین رہا کرتی وہ دنیا کی دی ہوئی نفرت کو تو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن دل کی بے چینی کو شکست نہ دے سکی تھی۔

آج کے نئے مقدمے نے اس کی پرسکون دنیا میں پھر ہلچل مچا دی تھی اس کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے،

وہ بے وفا شخص،

جو اس کا سہاگ تھا،

اس کے من مندر کا دیوتا،

آج اس کے روبرو کھڑا تھا۔ تقدیر نے کس موڑ پر اسے لا ٹکرایا تھا۔ وہ تو اس ظالم کو بھول گئی تھی ـــــ یا پھر نہیں بھولی تھی، وہ تو شاید اب بھی اس کے خوابوں میں براجمان تھا۔

اس دیوتا کے چرنوں میں تو وہ اب تک چاہتوں کے سوکھے پھول دان کر رہی تھی۔

وہ آج اس کے سامنے مجرم کی حیثیت سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ وقت کی گردش نے اس کے خدوخال پر اچھا اثر ڈالا تھا دبلا پتلا جسم بھرا بھرا ہو کر اور بھی دلکش لگنے لگا تھا ـــ وہی روشن روشن آنکھیں ـــ وہی سیاہ خمدار بال، وہی تھا ـــ وہی تھا ـــ اسے تو وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔

اس کے سامنے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی اپنے اپنے دلائل پیش کر رہے تھے۔ لیکن اس کے کانوں میں تو ایک ہی گونج تھی۔

ارشد

ارشد

ارشد

قسمت کے اتنے بھرپور وار پر اس کا دل خون خون ہو گیا آج ارشد کے ہاتھوں میں گناہ کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں

اور اس کے ہاتھ میں

عدل و انصاف تھا

کل وہ منصف تھا

اور وہ سزاوار تھی۔ تب ہی تو چپ چاپ فیصلے کی صلیب پر آنکھیں بند کئے چڑھ گئی تھی۔

اور آج!

عدل کا ترازو اس کے ہاتھ میں تھا۔

اور وہ دشمن ایمان و جاں ...... اس کے فیصلے کا منتظر تھا۔

ارشد کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے اپنی بے پناہ خوبصورت بیوی فریدہ کے چہرے اور جسم پر تیزاب ڈال کے بگاڑ دیا اور اسے سسکا سسکا کر جان سے مار ڈالا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اب اس کا نام لے کر دیوانوں کی طرح چیختا چلاتا تھا اور اپنے جرم کا اقرار چیخ چیخ کر کر رہا تھا۔

"جناب عالی! میں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ـــ اسے تڑپا تڑپا کر مارا ہے ـــ اس لئے کہ وہ خوبصورت تھی ـــ اس لئے کہ میں اسے شدت سے چاہتا تھا۔ اب بھی چاہتا ہوں۔"

سجیلہ نے چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

بڑھے ہوئے شیو اور الجھے الجھے بالوں میں وہ ویران صورت آج بھی اس کے دل میں ہلچل مچا رہی تھی۔ اس نے اسے اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ ارشد نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر یکبارگی اس کی طرف دیکھا وہ کہہ رہا تھا۔

"فریدہ میری بیوی تھی۔ بہت پیاری، بہت خوبصورت مجھے اس سے شدید محبت ہے لیکن جب اس نے دوسرے لوگوں کی وجہ سے میری محبت کو ٹھکرا دیا تو میں نے اس دیوار کو ہی گرا دیا۔

جناب عالی! غلطی میری ہی تھی میں جو فریدہ کے حسن اور

اس کی جادو بھری اداؤں کا شیدائی تھا میں نے اسے آزادی کی ترغیب دی میں اس کے حسن کو دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر خراج محبت پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کلب کی راہ دکھائی۔ دراصل فریدہ کو اپنے ساتھ دیکھ کر میں فخر محسوس کرتا۔ میرے دوستوں کی رشک بھری نظریں مجھے اور غرور بخشتیں لیکن اسی غرور نے مجھے اتنا مردہ کر دیا کہ فریدہ کو غیر مردوں کی بانہوں میں دیکھ کر بھی میرا خون نہ کھولتا۔ فریدہ کے حسن کے پرستاروں کی تعداد دن بدن بڑھنے لگی تھی وہ بھی حسن کی تابانی کے لئے امارت کا سہارا ڈھونڈنے لگی اور اس کی نظریں خوب سے خوب کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔ تب۔۔۔۔۔۔ ایک رات۔۔۔۔ وہ گھر سے غائب رہی میں کمرے میں تنہا بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ۔۔۔۔۔ صبح کے ملگجے اندھیرے میں اپنے بے ترتیب لباس سمیت لڑکھڑاتی ہوئی بستر پہ بے سدھ سی گر پڑی تو میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

یہ راہ تو میں نے ہی اسے دکھائی تھی۔

رفتہ رفتہ فریدہ کی غیر حاضری نے مجھے جھنجھوڑنا شروع کیا۔

میں جو اس کا شوہر تھا۔

اس کا عاشق تھا۔

اس نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ میں اس کی نظروں میں دنیا کا سب سے کنگال آدمی تھا جبکہ اس کے پرستاروں میں ایک سے ایک بڑھ کر امیر ترین آدمی تھا اب میری حیثیت کیا تھی؟

وہ میری بیوی ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے ساتھ تو خوش رہتی اور میرے ساتھ ہر وقت جلی کٹی باتیں کرتی وہ جب دوسروں کے ساتھ قہقہے لگاتی اور مجھے نخوت سے دیکھتے ہوئے میرا مذاق اڑاتی تو میرا خون کھول اٹھتا۔ اس کا جہاں سوز حسن میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا تھا۔ آخر کار روز روز کے جھگڑے نے میری غیرت کو للکارا۔ اور۔۔۔۔۔۔ میں نے اس حسن کو اپنے ہاتھوں سے ہی مٹا دیا، جس نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ میں تو اس حسن کو اپنی منزل سمجھ بیٹھا تھا لیکن یہ تو۔۔۔ ایک سراب تھا۔۔۔ ایک کھلا دھوکہ۔"

ارشد اپنا بیان دے کر نڈھال سا ہو گیا۔

"کیا ملزم اس سے قبل کوئی شادی کر چکا تھا۔؟"

سجیلہ کے بے محل سوال سے دونوں وکلاء چونک اٹھے۔

"جی۔ میں نے شادی کی تھی۔"

ارشد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ بیوی کہاں ہے؟"

"میں اسے طلاق دے چکا ہوں۔"

"کیوں!؟"

سجیلہ کی آواز میں بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔

"اس لئے۔۔۔ اس لئے کہ وہ بدصورت تھی؟"

ارشد نے سر جھکا کے بتا دیا۔

اور وہ۔

لمحے لمحے کی موت مرتے ہوئے اس کی محبت اور نفرت کو برسرپیکار دیکھ رہی تھی۔

کاش ارشد! مجھے بھی تم یوں ہی قتل کر دیتے، میری بے پناہ بدصورتی پر۔۔۔۔ مجھے کچھ تو دیتے۔ محبت نہ سہی نفرت ہی سہی۔

صرف ایک لمحہ محبت کا۔

ایک لمحہ نفرت کا

کچھ تو ہوتا

تم جو میرے بنے تھے۔

میرا سہاگ۔

میرے مجازی خدا۔

میری بندگی تو دیکھی ہوتی

میری پرستش تو جانی ہوتی

دل میں یادوں کا طوفان مچل رہا تھا۔ وہ قلم تھامے محبت اور انصاف کے منجدھار میں ڈول رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں تم میرے نہیں ہو۔

تم صرف ایک مجرم ہو

قاتل ہو

تم نے میرا فیصلہ تو آنکھیں بند کر کے کر دیا تھا

لیکن

میں تمہارا فیصلہ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کروں گی۔"

تب

دوسرے ہی لمحے وہ آنکھوں میں جلتے آنسوؤں کو روکے پُرعزم انداز میں چودہ سال قید بامشقت کا فیصلہ مرتب کر رہی تھی۔

عکس اور آئینے

مہناز فاطمہ

خوشبو کا رنگ بڑا اچھوتا ہوتا ہے۔
ہر ذی حس کے لئے
لیکن جب خوشبو بکھر جائے تو ہر کوئی اس کو اپنے اندر اتار لینا چاہتا ہے اور محبت بھی تو خوشبو ہی ہوتی ہے۔ کتنا حسین احساس ہوتا ہے محبت کی خوشبو پا لینے کے بعد۔ انگ انگ جھوم اُٹھتا ہے۔ ذہن کے راستے جب یہ خوشبو جسم میں رچ بس جاتی ہے تو دل انجانے احساس سے جھوم اُٹھتا ہے۔

لیکن اچانک ہی جب خوشبو بھک سے اُڑ جائے تو محبت بالکل ساکت بت بن کر رہ جاتی ہے۔ دل کی دھڑکن بھی اس طرح معدوم ہو جاتی ہے کہ جیسے دل مردہ ہو گیا ہو۔ دھڑکنا بھول گیا ہو۔ اُداسیاں دل میں گھر کر لیتی ہیں۔

موسم اور رُتیں لاکھ بدلیں دل کا موسم تو ایک ہی رہتا ہے دل ایک ہی گردان کئے جاتا ہے۔ ایک ہی نام کی گونج چاروں طرف سنائی دیتی ہے۔ لیکن ایسے میں اسے کون سمجھائے کہ کاش کا لفظ حسرتوں کا جنازہ لئے پتہ نہیں تمہاں کہاں کس کس کے دل میں بھٹکتا پھرے گا اور شاید میرے دل میں تو اس لفظ کا بسیرا ہی ہو جائے گا۔ اس سے آگے وہ نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ پر اچانک ہی اماں کی آواز پر وہ واپس پلٹ آئی۔

"سائرہ وقت کو پکڑنے کی کوشش کیوں کرتی ہے۔ وہ کبھی تیرے ہاتھ نہ آئے گا۔ چل اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لے اور دیکھ سکندر آنے والا ہے کانچ کے برتن جلدی سے چھپا کر رکھ دے۔ کہیں کل کی طرح آج یہ بھی اٹھا کر چور چور نہ کر دیئے جائیں!!"

اماں اس کو سمجھا کر چلی گئیں تو اس نے اوپر سے چادر اتار کر پھینکی اور پلنگ پر سے اٹھ گئی۔ مہمان آئے تھے تو اس نے نئی خریدی ہوئی پیالیاں نکالی تھیں جو اب تک ویسے ہی باورچی خانے میں پڑی تھیں۔ گھر اُجاڑ مارا تھا تو کیا؟ تھا تو اپنا۔ لیکن اس اجاڑ مارے گھر میں اب یہ بھی زیب نہ دیتا تھا کہ جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے دو پیالیاں بھی ڈھنگ کی نہ ہوں۔ سو اس بھرم کی خاطر اس نے کچھ پیسے جوڑ جوڑ کر پیالیوں کا سیٹ خرید لیا تھا۔ اور اب اس کو جلدی سے چھپا دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ سکندر ہمیشہ کا جھگڑالو اور کینہ پرور تھا۔ گھر میں جب تک رہتا تو ہر شے اپنی جگہ پر تھم سی جاتی۔ وہ گھر میں ہر ہر قدم پر اپنا راج دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی من مانی اس طرح کرتا گویا خدا نے گھر میں بڑا بیٹا نہ بنایا ہو بلکہ زمین پر دوبارہ فرعون کو بھیج دیا ہو۔

اس نے جلدی سے پیالیاں ٹین کے ڈبے میں رکھ کر بند کر دیں اور مٹکے پر جلدی سے مگ رکھ دیا۔ کیونکہ اگر کبھی مگ نہ رکھا ہوتا تو وہ گلاس ہی اٹھا کر پٹخ دیتا اور اس وقت صبا کا دل چاہتا کہ چیخ چیخ کر کہے اتنے بڑے بڈھے ہو گئے ہو گھر میں دو پیسے کی چیز لانے کی ہمت نہیں لیکن ہر چیز توڑنے میں بہت ہی دادا بنتے ہو۔ وہ صرف یہ سوچ کر رہ جاتی۔ اندر ہی اندر بکھرتی ہوئی اس چنگاری کو اپنے اندر دبا لیتی۔ وہ کہہ بھی کیسے سکتی تھی۔

وہ جب ابا کے سامنے اکڑا رہتا اور ابا اس کو کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ کہتے بھی کیسے ہر وقت لاوا اندر ہی اندر کھولتا رہتا تھا اور ایک مرتبہ وہ جب باہر نکلتا تو ابا اور سکندر کی چیخ و پکار سن کر صبا دہلنے لگتی۔ سکندر کہنے کو ماں باپ کا بڑا بیٹا اور صبا کا بڑا بھائی تھا۔ لیکن ایسا بیٹا جو مرضی کا مالک ماں کو جوتی کی نوک پر رکھنے والا۔

بہن کو راستہ کا روڑا سمجھتا اور باپ
اس کا ایسا خادم تھا جو حاکم کے حکم کے مطابق مر مر کے کمائے

چلا جا رہا تھا۔ اس پر بھی اس باپ کے مقدر میں سکون نام کو بھی نہ تھا۔ جوان بیٹا آستین کا سانپ بن گیا تھا۔ سانپ کو مار ڈالنا بھی تو اپنے آپ پر ہی وار کرنا تھا۔ وہ صبح کا گیا شام کو گھر آتا تو سکندر کی باتیں سن سن کر جلتا کڑھتا۔ سینے میں ایک ہوک سی اٹھتی دل چاہتا اپنے آپ کو ختم کر دے یا اس ناخلف بیٹے کو جس نے خاندان .... کی عزت کو بٹہ لگانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

زمانے کے سرد و گرم سہہ سہہ کر ابا نے تین کمروں کا مکان بنوا لیا تھا۔ سو دال روٹی کے سہارے کے لئے یہی کافی تھا۔ بے حس حکمران کے درمیان حساس عوام تو گھٹ گھٹ کر ہی رہ سکتے ہیں سو یہی حال صبا اور اس کے گھر والوں کا تھا۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ سکندر کا یہی حال تھا۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا چیز ٹھنس کر رہ گئی تھی۔ کوئی سی پھانس تھی جو کہ اس کو بلبلائے رکھتی تھی۔ وہ گھر والوں کے لئے ان کے سر پر ننگی تلوار سونتے رہتا تھا۔

گھر میں کوئی مہمان آ جاتا تو اس دوران صبا اور اماں کا دل تو بس دھڑکتا ہی رہتا۔ دونوں بس یہی چاہتیں کہ جلد سے جلد بخیر و عافیت مہمان واپس چلا جائے اور سکندر کو پتہ نہ چلے کہ کوئی آیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو ہاتھ پکڑ کر آنے والے کو نکال باہر کر دیتا۔ لیکن خدا ہی بہتر جانے وہ ایسا کرنے سے کیوں باز رہا۔ صبا اسکول جاتی تو سکندر کو یہ بھی بُرا لگتا تھا۔ لیکن ابا کی موجودگی صبا کے لئے ڈھارس ہوتی تھی۔ صبا ان دنوں کو اب تک نہ بھول پائی تھی۔ جب ابا دفتر گئے ہوتے اور سکندر ان کے پیچھے گھر میں وہ ہنگامہ کرتا کہ اماں اور صبا لرزتی رہ جاتیں۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر اماں سے بد زبانی کرنے لگتا اور پھر تان صبا کی پٹائی پر آ کر ٹوٹتی۔ کیسے کیسے نہ ملا

تھا۔ وہ اس معصوم کو۔ یہ بھی نہ سوچتا کہ اپنی بہن ہے۔ اس کی اندھا دھند مارپیٹ سے اگر کبھی کچھ ہو گیا تو کل کلاں کو لوگ عیب دار نہ کہیں گے اس کی بہن کو۔ بے حس انسان۔

بچپن کی حدود کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آج صبا آبا کی ٹھنڈی چھاؤں تلے کالج میں قدم رکھ چکی تھی جبکہ سکندر اب بھی وہی سکندر تھا۔ ماں بہن اور باپ کو دق کرنے والا سکندر۔ وہ اب چونتیس پینتیس سال کا بھرپور نوجوان تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ محنت کیا ہوتی ہے۔ محنت کی دال روٹی میں کیسا ذائقہ ہوتا ہے۔ مرد کے معنی کیا ہیں۔ ایک نوجوان بیٹے کا کیا فرض ہوتا ہے۔ ایک بہن کا جوان بھائی ہو تو اس کی کیا کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ وہ ان تمام باتوں سے نابلد تھا۔ اگر دیکھا جاتا تو وہ دراصل ایک نفسیاتی کیس ہی تھا میٹرک کرنے کے بعد سے بالکل ہی آزاد ہو کر رہ گیا تھا۔ ابا اماں نے کیا کیا جتن نہ کئے کہ وہ ایک اچھا انسان بن جائے لیکن غلط صحبت نے اس کو اچھا انسان تو نہیں گھر والوں کے لئے آستین کا سانپ بنا کر رکھ دیا۔

آبا نے ہر موڑ پر اس کو سمجھایا۔ "سکندر آخر تجھے عمر گزارنی ہے کچھ کام کر لے۔ شریفوں کے طور طریقے یہ نہیں ہوتے جو تو نے اپنائے ہیں۔ باپ کا ساتھ چھوڑ دے زمانے بھر کا بدمعاش ہے کیوں اپنی مٹی پلید کرتا ہے۔" لیکن سکندر کا ایک ہی جواب ہوتا اور یہ جواب آبا کو اپنی عمر سے پہلے ہی ضعیف کر کے رکھ دیتا۔

"میری زندگی جیسے بھی گزر رہی ہے آپ لوگوں سے بہتر گزر رہی ہے۔ آپ نے کیا تیر مار لیا ہے۔ میرے ہاتھ نوکری کرنے کے لئے نہیں ہیں۔"

"آبا دل کو سنبھالے پھر گویا ہوتے۔

"تم ہماری فکر نہیں اپنی کرو۔ ہماری زندگی تو دال روٹی کھاتے گزر گئی۔ شرافت ہماری میراث ہے۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت تو نہ آئی۔ تو اپنی زندگی سنوار۔"

"ہونہہ۔" سکندر ایک ہنکارا بھرتا۔

"آپ یہ تمنا لئے اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ سکندر کی ایک بات آپ کو نصیب نہ ہوگی" اور ایسے میں آبا کی غیرت دار طبیعت تلملا اٹھتی۔

"کم بخت ابھی تیرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ تجھ جیسے سو کا

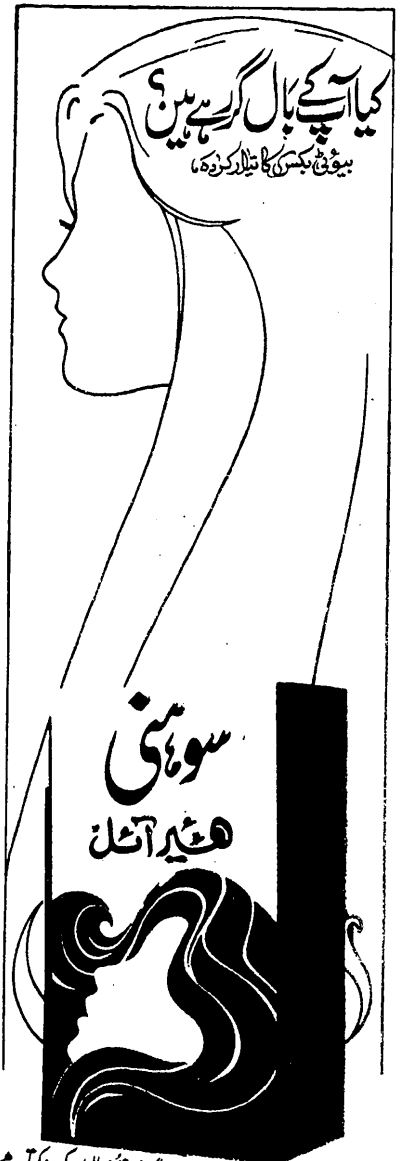

پیٹ بھر دوں جب ٹھوکریں کھائے گا تو تب ہی ہوش آئیگا۔"

اور پھر گھر دونوں کی گرج دار آواز سے گونج اٹھتا۔ محلے پڑوس کی عورتیں اپنی اپنی کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکنے لگتیں کہ ماں بیٹے میں آج پھر لڑائی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ابّا اپنی عزت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود ہی خاموشی اختیار کر لیتے اور اس وقت پورے گھر میں ایک ہو کا سا عالم طاری رہتا۔ ابّا کا دل چھلنی ہو چکا تھا۔

جوان بیٹا اور نااہل۔ نالائق۔

ابّا سر پر ہاتھ رکھے لیٹے لیٹے نہ جانے کیا کیا سوچتے رہتے کبھی دل چاہتا کہ سکندر کا گلا گھونٹ دیں۔ لیکن وہ صرف چند لمحوں کے لئے یہ خیال ذہن میں لا سکتے تھے۔ کبھی خدا سے اپنی موت کی دعا مانگتے۔

لوگ ابّا سے سکندر کے بارے میں پوچھتے تو ابّا ہمیشہ جھوٹ بولتے۔ ایک دنیا ابّا کے خاندان کو جانتی تھی۔ ابّا زمانے بھر کا منہ کیسے بند کر سکتے تھے۔ نہ جانے سکندر نے کس گھڑی جنم لیا کہ خاندان کی ناک کٹوانے کے درپے تھا۔

ایک شور تھا گھر میں چیزوں کے گرنے کا۔ بیچ بیچ میں اماں کی لرزتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔

"ارے بیٹا کیوں پھینک رہے ہو۔ ابھی دکان سے انڈا منگوائے دیتی ہوں۔ سارا آٹا برباد ہو رہا ہے۔ پہلے ہی اس کے پیسے ادا نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن وہ شدید غصے کے عالم میں سب چیزوں کو پھینک رہا تھا اور اماں اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھیں

"خدا کے لئے رحم کر سکندر اتنا نہ ستا۔"

"آپ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ سے سیدھے منہ بات کی جائے۔" وہ ایک مرتبہ پھر دھاڑا۔

بظاہر بات معمولی سی تھی لیکن گھر میں قیامت آ گئی۔ صبا کالج سے واپسی پر جونہی گھر میں داخل ہوئی صحن میں سامان کو بکھرے .... دیکھ کر سمجھ گئی۔ ڈر کے مارے وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے برابر والی خالہ کا کہ اسکو کھینچ کر گھر لے گئیں ورنہ نہ جانے اس کا بھی آج کیا حشر ہوتا۔

وہ خالہ کے گھر بیٹھی ہوئی تھی لیکن دل تھا کہ گھر میں لگا ہوا تھا۔ خدا خیر کرے خالہ، اماں اکیلی ہیں۔" عجیب عجیب خدشات اسے گھیرے رہے۔

خالہ اسے سمجھاتیں۔

"صبا روؤ مت سبھی کے بھائی ایسے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔" ایسے میں صبا کو توقیر یاد آ جاتا۔ توقیر جو کہ اس کی دوست کا بھائی تھا۔ روزانہ اس کو کالج چھوڑنے آتا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ پیسے ضرور رکھ دیتا اور کتنے پیار سے کہتا۔

"شانو خدا حافظ۔" اور وہ اپنے بھیّا کو پیار بھری نظروں سے خدا حافظ کہہ کر اندر چلی جاتی۔

شانو کا بھائی چند مہینے تو گھر پر رہتا تھا۔ پھر اس کا کوئی کاروبار تھا جس کے سلسلے میں وہ کبھی تین مہینے کبھی چار مہینے گھر سے باہر رہتا لیکن جب گھر میں آ جاتا تو گویا بہار آ جاتی۔ کتنا پیار کرتا تھا وہ اپنے گھر والوں سے۔ وہ سوچے چلی جا رہی تھی۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔

خالہ اپنے کاموں میں مگن تھیں۔ جب ہی وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔ دبے پاؤں گھر میں داخل ہوئی اور چپکے سے ادھر ادھر جھانکنے لگی۔ اماں سامنے صحن میں بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہی تھیں۔ گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ اماں کی نظریں جونہی صبا پر پڑیں وہ جلدی سے اس کی طرف دوڑیں۔

"صبا۔ اے صبا۔ سکندر باہر چلا گیا ہے جلدی سے کھانا کھا لو۔"

اور اس وقت صبا کو اماں پر پھر ٹوٹ کر ترس آیا۔ بیچاری صبح سے کام کر رہی ہیں اور پھر جوان بیٹے نے کلیجہ دق کیا ہوا ہے۔ پھر بھی اس کا کتنا خیال ہے۔

"اماں، بس ابھی آئی۔"

کھانا کھا کر دونوں ماں بیٹی گھنٹوں اپنے مقدر پر روتی رہیں۔ کبھی مہنگائی کا رونا، کبھی سکندر کی زیادتیوں کا تذکرہ اور کبھی ابّا کی صحت پر تشویش کا اظہار ہوتا رہا۔ سکندر حسب معمول لڑ جھگڑ کر باہر چلا گیا تھا۔ رات کو ابّا واپس آئے تو پھر سکندر کی حرکتوں کا پتہ چلا۔ اب ابّا کی عمر ایسی نہ تھی کہ کمائیں بھی، گھر کی ذمہ داری بھی اٹھائیں اور بیٹے کے عتاب کا نشانہ بھی بنیں۔ ابّا کو غصہ تو بہت آ رہا تھا لیکن اماں نے پھر ان کو سمجھایا۔ ممتا کی ماری اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ تو روز کا معمول بن گیا تھا۔

صبا نے جیسے تیسے بی۔ اے کر لیا اور اب اسے اس بات کا شدید احساس ہو گیا تھا کہ ابّا کی صحت ویسی نہیں رہی کہ گھر کا بوجھ اکیلے سنبھالیں۔ ان دنوں اس نے اپنی کئی سہیلیوں سے نوکری کا تذکرہ کیا ہوا تھا۔ شانو اسے تقریباً روز ہی کالج میں مل جاتی تھی وہی تو تھی بس اس کی عزیز از جان دوست۔

ادھر اماں کو صبا کے بارے میں فکر لاحق ہوئی تو ابّا

نے بھی برقعہ سنبھالا اور اڑوس پڑوس میں جانے لگیں۔ جب تک کسی سے تذکرہ نہ کر لیں پیری پر پیٹھ تو آنے سے رہتا۔

بات نکلی تو شانو کی امی تک پہنچی اور ایک دن شانو اپنی امی سمیت صبا کے گھر آ گئی۔

اماں تو خیر ان لوگوں کے آنے کا مقصد سمجھ گئیں لیکن صبا یہ نہ جان سکی۔

رات کو اماں نے صبا کے ابا کو سب بات سمجھائی۔

"تمہارا بیٹا تو کسی کام کا ہے نہیں۔ صبا کو اپنی زندگی میں اپنے گھر کا کر دیں تو اچھا ہے۔" اور ابا نے بھی اس معاملے پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ اماں ابا ساری باتیں کرتے رہے اور برابر کے کمرے میں بستر لگاتے ہوئے صبا نے سب کچھ سن لیا۔

اس کا من انجانی خوشیوں سے جھوم اٹھا۔ اُف کتنا پیارا ہے شانو کا بھائی۔ توقیر۔ اسے یاد آیا وہ جب بھی اس کو شانو کے ساتھ دیکھتا تو اس کی نظروں میں کتنا پیار ہوتا تھا۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا سکتی تھی اور ایک دن تو شانو نے اسے چھیڑا بھی تھا۔

"پتہ ہے صبا بھیّا کہہ رہے تھے کہ شادی کریں گے تو میری دوست سے ورنہ کریں گے ہی نہیں۔ تو میں نے بھیّا سے کہا سیدھے سیدھے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ کو صبا پسند ہے۔ صبا کے علاوہ اور کوئی میری دوست ہے ہی نہیں" اور اتنا سننا تھا کہ وہ سرخ ہو گئی۔ یہ احساس کیا کم تھا کہ کوئی اسے چاہتا ہے، پسند کرتا ہے۔

اس کے دل کے آنگن میں ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ خشک زمین پر جب بارش کی پہلی پھوار پڑتی ہے تو فضا کتنی خوشگوار ہو جاتی ہے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پل بھر میں دل و دماغ کو معطر کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس کا دل بھی بالکل ایک خشک زمین کے مانند تھا اور اس پر توقیر کی محبت نے کیسا چھڑکاؤ کیا تھا کہ وہ سرشار ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

اماں ابا کی گفتگو وہ سن ہی چکی تھی۔ بستر پر لیٹی تو خیالات میں توقیر کو اپنے پاس ہی بلا لیا۔

"صبا تم اتنی دکھی نہ رہا کرو۔ تم تو میرا وہ پھول ہو جس کو میں نے ہمیشہ اپنا سمجھا اور دیکھو میرا جذبہ کتنا سچا تھا کہ تم کسی اور کے مقدر کا پھول نہ بن سکیں۔ اب تمہارے آنے سے میرے گھر میں ہر طرف خوشبو کا راج ہو گا۔

رات کا کونسا پہر تھا جب وہ اپنے سپنوں میں کھوئی کھوئی سو گئی۔

سکندر نے جب یہ سنا تو جیسے ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"گھر میں ہر وقت مہنگائی کا رونا رویا جاتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ جو اب چلنے والا ہے۔"

تبھی اماں نے غصّے کو قابو میں کرتے ہوئے کہا "کیا بیٹی کو سدا گھر میں بٹھائے رکھیں گے۔ آخر ایک نہ ایک دن تو رخصت کرنا ہی ہے۔ تمہیں تو شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ تو ظاہر ہے اب اس کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"مجھے ان فضولیات میں نہیں پھنسنا" وہ بھنّا کر بولا۔ اگر مجھ سے بھی تذکرہ کر دیا جاتا تو آپ لوگوں کا کیا بگڑ جاتا۔"

نہ جانے اس کے دل میں کہاں سے اس مسئلے کے لئے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اماں کے دل میں آیا کہہ دیں "تم نے کس چیز میں دلچسپی لی ہے جو تم سے اس اہم مسئلے میں ٹانگ اڑانے کو کہا جاتا۔ تم کونسا بھلا چاہنے ہو بہن کا۔" لیکن اماں نے زبان نہ ہلائی اور اب کی دفعہ پھر خاموشی سے کھسکنے میں عافیت جانی۔

"آپ لوگوں نے جیسے اپنی زندگی گزار دی ہے ویسی چاہتی ہیں ہم لوگ بھی گزاریں۔ صبا کی شادی میرے دوست سے ہو گی۔" اس نے گویا فیصلہ دے دیا۔ اماں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"ماں باپ کے ہوتے ہوئے یہ فیصلہ کرنے کا حق تم کو نہیں سمجھے۔" اب اماں غصّہ ضبط نہ کر سکیں۔ کہنے کو تو اماں نے کہہ دیا، لیکن وہ آنے والے وقت سے خوفزدہ تھیں، نہ جانے یہ کیا کر بیٹھے۔ پتہ تو چل ہی گیا ہے شانو کے بھائی کا۔ اماں دل ہی دل میں دعا کرتی رہیں۔

"اے میرے پروردگار اس کو نیک راہ دکھا۔

اے میرے مالک عزّت کے ساتھ میری بیٹی کا ڈولا اٹھوا دے۔ اسی میں ہمارے خاندان کی عزت ہے۔

تمام باتیں سننے کے باوجود صبا آکاش کی بلندیوں پر سفر کرتی رہی۔ اسے ایک چاہنے والا ساتھی جو مل رہا تھا۔ اب اسے کوئی غم نہ تھا۔ وہ اسے تحفظ دے گا۔ شاید ایک داماد کا سہارا ابا کو صحت دے دے۔ سکندر کچھ دب جائے۔

سکندر۔ اپنی ضد کا پکا۔

اسکی ہر بات پتھر کی لکیر تھی۔

وہ افضل کا رشتہ صبا سے کرانے کے حق میں تھا۔

دوسری طرف — صبا یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ وہ ماں باپ کے طے کئے ہوئے رشتے کو نہ مانے اور اس بھائی پر بھروسہ کرے جو ہمیشہ ہی اسے رلاتا آیا ہے۔

وہ چکی کے دو پاٹوں میں پستی رہی۔

اپنے خیالات اور سکندر کی آوازوں پر لرزتی رہی۔

اماں پیار سے تھپکتیں تو سکندر کی گھن گرج اسے جگا دیتی۔

ابا صبح کے گئے رات کو گھر لوٹتے تو وہ چھپ کر باتیں سنتی

"صبا کی اماں تم ہمیشہ اس نالائق کی طرفداری کرتی ہو۔ میں اس کم بخت کو عاق کر دوں گا۔ اس نے آخر سمجھا کیا ہے۔ میری زندگی میں اس کی یہ جرأت۔ میرے بعد اس کا کیا حال ہو گا!"

اماں ہمیشہ کی طرح بات دبا گئیں۔ یہ نہ کرتیں تو پھر کیا کرتیں۔ اولاد تو اپنی ہی بری تھی۔

آستین کا سانپ تو خود اپنا بیٹا تھا۔

بیٹا جوان ہو جائے تو ماں باپ کی ڈھارس بندھتی ہے۔ یہاں تو ماں باپ کے لئے دردسر تھا۔ ایسے موقعوں پر تو بیٹے ماں باپ کا سہارا بنتے ہیں۔ انہیں پریشان ہونے سے منع کرتے ہیں۔ اپنی گھمبیر شخصیت کو ماں باپ کے سامنے ڈھال بنا کر پیش کرتے ہیں ایسے موقعوں پر تو بیٹے یہ کہتے ہیں۔

"آپ لوگوں کو آخر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہوں جو آخر میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

لیکن یہاں صورت ہی دوسری تھی۔

ہر بات سکندر سے چھپانی پڑتی۔ اگر اس کے کانوں تک کوئی معمولی بات بھی پہنچ جاتی تو قیامت ہی آ جاتی۔ وہ ہر اس چیز کا الٹ کرتا جس میں والدین کی عزت ہوتی۔ خاندان کی عزت پر دھبہ لگانے کی مکمل کوشش کی جاتی۔

حد تو یہ تھی کہ ہر آنے جانے والے کے سامنے وہ اپنے طیش سے باز نہ آتا۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ گالی گلوچ کو اپنا شعار بناتا بلکہ اس کا طریقہ یہ تھا کہ دوسروں کے سامنے ہی اپنے ماں باپ کا بخیہ ادھیڑ دیتا۔ دوسروں کی عزت کرنا تو اس کے خمیر میں ہی نہ تھا۔ بعض لوگ تو اس کا موڈ دیکھتے ہی کھسک جاتے اور رشتالوں اس گھر کا رُخ نہ کرتے آخر پھر صبا کا رشتہ ہوتا تو کیسے۔

فی زمانہ لوگ بھائیوں کو دیکھتے ہوئے بہنوں کے لئے رشتہ دیتے ہیں۔ اور سکندر تو سبھوں کے لئے کھلی کتاب تھا۔ پھر آخر کوئی کیوں اس گھر کی بیری پر پتھر مارتا۔ لوگوں کے لئے تو ہزاروں گھر تھے کہ جن میں بھائی بہنوں کے لئے ہر آنے والے کا پرتپاک خیر مقدم کرتے اور ان کی مکمل کوشش یہی ہوتی کہ ان کی بہنیں بابل کا گھر چھوڑ پیا گھر سدھاریں اور جیون کی راہیں سدا سکھی گزاریں۔

صبا کے لئے سکندر افضل کا رشتہ لایا۔

تو کسی نے بھی کان نہ دھرا۔ اماں ابا خون کے گھونٹ پیتے رہے۔ صبا نے تو سکندر کا سامنا ہی کرنا چھوڑ دیا۔ جب بات آگے بڑھنے لگی تو ماں ابا کے ساتھ اب کی دفعہ صبا نے بھی زبان کھولی۔

"جہاں اماں ابا کہیں گے میری شادی وہیں ہو گی ورنہ میں ہرگز شادی نہ کروں گی!" اس نے اپنی نگاہیں زمین پر گاڑی ہوئی تھیں کہ مبادا وہ سکندر کی غصے سے بھری شکل نہ دیکھ لے۔ اس وقت اس کا پورا بدن تھرتھرا رہا تھا۔

ابا کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ ان کا بس چلتا تو سکندر کو دھکے دے کر باہر نکال دیتے لیکن ہمیشہ ہی اماں آڑے آ جاتیں۔

ادھر شادی کی بات چیت چل رہی تھی۔ ادھر صبا کو کچھ اور ہی سوجھی۔ اس کے کان میں یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ شادی تو توقیر کے آنے کے بعد ہی ہو گی اور وہ کاروباری سلسلے میں مزید ایک سال کے لئے دورے پر چلا گیا ہے۔ اکیلے ابا اتنا بڑا کاج کیسے پورا کریں گے۔ اب اسے بھی کچھ کرنا چاہیئے۔ آخر وہ تعلیم یافتہ ہے پھر کیوں نہ ابا کا سہارا کچھ مدت کے لئے بن جائے۔ وہ آج کل بڑی مصروف تھی۔

اماں نے کئی مرتبہ پوچھا تو اس نے بات ٹال دی۔ وہ سکندر سے چھپتی چھپاتی پھرتی اور موقع ملتے ہی اپنے کام کے سلسلے میں باہر نکل جاتی۔

اب تو اسے ایک خاص قسم کا تحفظ مل چکا تھا۔ اس کا محافظ تو توقیر بن ہی گیا تھا۔ اب بھلا اسے ڈرنے اور گھٹ گھٹ کے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے وہ دن آج شدت سے یاد آ رہا تھا جبکہ وہ شانو کے گھر گئی تو شانو گھر پر نہ تھی۔ وہ شانو کی امی سے مل کر فوراً ہی واپس ہوئی تو کمرے سے نکلتے ہوئے اس کی ٹکر توقیر سے ہو گئی۔

"اُف۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ آپ..."

ابھی صبا نے بات پوری نہ کی تھی کہ توقیر نے اس کا ہاتھ بڑے غیر محسوس طریقے سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"صبا کس سے معافی مانگ رہی ہو۔ غلطی تو میری ہے کہ میں تمہارے راستے میں آ گیا۔ ویسے اب تو اسی راستے پر سدا چلنا ہے۔ میرا تمہارا راستہ تو ایک ہی ہے نا۔ بولو صبا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

صبا اس کی بات سن کر بالکل سرخ پڑ گئی اور جلدی سے اپنا ہاتھ توقیر کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ گھر آ کے بھی وہ ابھی تک توقیر کے کہے گئے جملوں پر لجا رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ توقیر نے اب بھی تھاما ہوا ہے اور وہ نہ جانے کیوں یہ نہیں چاہ رہی کہ توقیر کی گرفت سے اپنے ہاتھوں کو آزاد کرے۔

تمام باتیں سوچتے ہوئے اسے یہ شدید احساس تھا کہ اب وہ اکیلی نہیں ہے اس کا توقیر اس کا پاسبان ہے۔ اس نے ابا کا خیال کرتے ہوئے نوکری کی ٹھانی۔ درخواست تو اس نے کئی جگہ دے رکھی تھی لیکن جب بھی کسی کا جواب آیا تو ابا نے ہی اسکو روک دیا لیکن اس دفعہ جب انٹرویو لیٹر آیا تو اس نے ابا کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور چپکے سے اپنے تمام کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اور آجکل تو کچھ زیادہ

ہی سرگرم عمل تھی۔

صبح وہ جب سو کر اٹھی تو اس نے جلدی جلدی تمام کام نبٹائے اور فوراً ہی تیار ہونے لگی۔ اماں نے پوچھا تو اس نے تمام تفصیل سنا دی۔

"اماں آج فرامیں اپنے کالج کے ٹیچر کے ساتھ تھانے جا رہی ہوں۔" اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

اماں نے تھانے کا نام سنا تو ایک دم چونک اٹھیں۔

"ارے لڑکی دماغ تو ٹھیک ہے تیرا لڑکی ذات ہو کر تھانے کچہریوں کے چکر لگائے گی۔"

اماں کی اس بات پر اس کو ہنسی آگئی لیکن جب بات پوری بتا دی تو اماں کو تسلی ہو گئی۔

اس کو کیریکٹر سرٹیفیکیٹ کے سلسلے میں تھانے کے ایس۔ ایچ۔ او کے پاس جانا تھا۔ اسی لئے اس نے کالج کے ایک ہمدرد ٹیچر کو اپنے ساتھ لیا اور تھانے پہنچی۔

تھانے کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ ہر طرف سنتری ہاتھ میں چھڑی لئے گھوم رہے تھے۔ اس نے دیکھا بعض لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور پولیس کے سپاہی انہیں پکڑے لا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کا دل مسوس گیا۔ وہ پروفیسر شاہد کے ہمراہ اندر آگئی۔ ابھی تک لوگوں کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں اور وہ ان چبھتی نگاہوں کو صاف محسوس کر رہی تھی۔ وہ لوگ لمبی راہداری طے کرتے ہوئے ایک کمرے کے آگے آکر رک گئے سنتری نے انہیں اندر جانے کی اجازت دی اور بیٹھنے کو کہا۔ پروفیسر شاہد اور صبا بڑے کمرے میں کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ اچانک صبا کی نظریں دیوار پر لگی تصویروں کی طرف اٹھ گئیں اور پھر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کو اپنا آپ گھومتا نظر آیا۔ کئی مجرموں کی تصویروں کے درمیان توقیر کی تصویر تمام تصویروں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ وہ شہر کا مشہور ہسٹری شیٹر تھا۔

صبا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ آخر کیا کرے اگر اپنے آپ کو نہیں سنبھالتی ہے تو سب لوگوں کو کیا بتائے گی۔ وہ سخت امتحان سے گزر رہی تھی۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ کتنا مان تھا اسکو اپنے توقیر پر۔ وہ رو دینے کو تھی۔ ادھر ایس ایچ او نہ جانے کب سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ تو کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔ ایک دم سے اسے پروفیسر شاہد کی آواز آئی۔

"صبا بیٹا! تم...... سنتی کیوں نہیں ہو۔ ایس۔ ایچ۔ او صاحب آ گئے ہیں۔ ان سے بات کرو۔"

اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی بات کرے یا نہ کرے یا اٹھے اور واپس چلی جائے۔

کیا گھر میں ساری بات بتا دے؟ "نہیں!" دل کہتا۔ اماں ابا کو ایک اور صدمہ پہنچے گا۔ وہ نہیں بتائے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔

اس نے جلدی سے سرٹیفیکیٹ لیا اور گھر آگئی۔

آج وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ کانوں میں سیٹیاں سی گونج رہی تھیں۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ بھائی تھا تو ایسا۔ زندگی کا ساتھی ملا تو دھوپ کی تمازت اور بڑھ گئی۔ یا الٰہی میری زندگی میں دکھ ہی دکھ ہیں۔ اے میرے مالک ہر طرح کی بدنصیبی میری ہی جھولی میں دینے کو رہ گئی تھی۔ وہ خدا سے شکوہ کر بیٹھی۔ آج اس کو پتہ چلا کہ توقیر چھ چھ ماہ اور سال سال بھر کہاں رہتا تھا۔ اس پر ڈکیتی کا الزام تھا جس کو وہ کاروبار کہتا تھا۔ وہ بالکل مایوس ہو گئی تھی۔ لیکن ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ ڈاکو ہے تو کیا ہوا۔ گھر والوں کا اور میرا تو دل کا چین ہے۔ اس کی ذات سے اس کے گھر والوں کو تکلیف تو نہیں پہنچی جبکہ سکندر تو کسی بھی وقت گھر والوں کو لہولہان بھی کر سکتا تھا۔ توقیر اپنی بہن اور ماں باپ سے نہ جانے کتنا پیار کرتا ہے۔ وہ سکندر اور توقیر کا مقابلہ کرنے لگی۔ آخر میں فیصلہ توقیر کے حق میں ہو گیا۔ وہ اس کو سنبھال لے گی اپنے پیار سے محبت سے۔ اسکو اپنی محبت کا واسطہ دے گی۔ وہ ضرور اس کا کہا مان لے گا۔ وہ ذہنی طور پر بھی تو کتنا خوبصورت ہے۔ بالکل اپنی شکل کی طرح۔ اس نے اپنے آپ کو دلاسہ دیا اور کمرے سے باہر آگئی۔ اماں کے پاس کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ دروازے کے قریب آئی تو سکندر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اماں یہ افضل ہے۔ اسکی شادی پرسوں ہو گئی۔ آج یہ لاہور واپس جا رہا تھا اسلئے مجھ سے ملنے چلا آیا۔ لاہور میں یہ ایئرفورس میں پائلٹ ہے نا۔" سکندر نے اپنی بات پوری کی تو صبا نے پردے کی اوٹ سے جھانکا۔ بالکل سامنے افضل اور اس کی بیوی بیٹھے ہوئے تھے۔ کتنا خوبصورت جوڑا تھا۔ ایک پل کو صبا اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی۔ سکندر کے لائے ہوئے رشتے کو اس نے خود ہی تو انکار کیا تھا۔ کاش۔ کاش وہ کچھ سوچتی تو۔ وہ ذہن پر بڑا بوجھ لئے واپس کمرے میں آگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اک سایہ دار شجر ما

قدسیہ ہما

سچی کہانی

"ممّا" وہ مجھے یوں آوازیں دیتا ہوا پورچ تک آیا جیسے کسی بڑی اذیت میں ہو اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے اور میں نے گردن موڑ کر اپنے جوان سال بیٹے کی طرف دیکھا وہ کسی معصوم بچے کی طرح خوف زدہ نظر آ رہا تھا غیر محسوس قسم کی کپکپی اس کے جسم پر طاری تھی بڑی بڑی آنکھیں کسی اَن دیکھے ڈر سے کچھ پھیلی ہوئی تھیں ویسے بھی وہ دو ڈھائی ماہ سے کچھ چپ چاپ تھا نہ ٹھیک سے کھاتا تھا نہ ہی دلچسپی سے کسی کام میں دلچسپی لیتا تھا گو میں نے اس کا یہ رویّہ محسوس تو کیا مگر زیادہ نوٹس نہیں لیا کیوں کہ جوان لڑکے اپنی اضطرابی کیفیت کے دور میں سے گذرتے ہوئے کچھ یوں ہی ہو جاتے ہیں اور پھر اس گھر میں اس کی کمپنی بھی تو کوئی نہ تھی۔

چھ کنال کی وسیع کشادہ کوٹھی کچھ نوکر چاکر اور ایک میں یعنی اس کی ماں میں نے کئی بار اُسے تفریح کے لئے جانے کو کہا مگر چند دن کے بعد واپس آ گیا پوچھنے پر اُس نے اپنے کچھ دنوں کے بعد ہونے والے سمیسٹر کو وجہ واپسی بتایا۔ پھر نارمل نظر آنے لگا۔ مگر کل رات جب ڈائننگ روم میں حاضر نہ پا کر میں اُس کے کمرے میں گئی تو وہ اوندھے منہ تکیے میں سر پھوڑائے پڑا تھا۔ آنکھیں سُرخ بال بے ترتیب خوبصورت گندمی چہرے پر کرب کے آثار۔ وجہ وہی عام یعنی سر درد۔ میں اپنی نگرانی میں اُسے دوا وغیرہ کھلا کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اور اب ... اب تو اِس کی حالت ہی عجیب تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" میں جلدی سے باہر نکل آئی وہ سلے سلائے سلیپنگ سوٹ میں ننگے پیر کھڑا تھا۔

"آپ ... آپ کہاں جا رہی ہیں؟" وہ اضطرابی کیفیت میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"زمینوں پر بیٹا، پرسوں بھی تمہیں بتایا تھا کہ دھان کی فصل تیار کھڑی ہے۔" میں نے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کب تک لوٹیں گی؟" وہ بے قرار نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"دس پندرہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

"اوہ میرے خدا یہ تو بہت ہیں۔" وہ جیسے خود سے بولا۔

"کیوں ایسی کیا بات ہے تم بہت پریشان اور مضطرب نظر آ رہے ہو کیا ہوا ہے؟" وہ کچھ نہ بولا بس کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا۔

"اندر چلو۔" میں نے اندر کی طرف قدم بڑھائے اور وہ سر جھکائے میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔

"میں کئی دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہی ہوں میں نے اپنے اور تمہارے درمیان نہ تو کبھی فاصلہ رکھا ہے اور نہ ہی جابرانہ بلندی کہ نہ تم فاصلے پاٹ سکو اور نہ تم بلندیاں سر کر سکو ہمارے تمہارے بیچ ہمیشہ ہی ایک دوستانہ فضا قائم رہی ہے میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ ماں کی محبت کے ساتھ پدرانہ شفقت بھی تمہیں دے سکوں اعتماد جو ایک لڑکے کے لئے والدین کے وجود سے پیدا ہوتا ہے تم میں ہو تو پھر آج ایسا کونسا مسئلہ ہے ایسی کون سی بات ہے جو تمہیں بے اعتماد اور شکستہ کئے ہوئے ہے؟"

وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا جیسے کچھ کہنے سے پہلے انکار و اقرار کے جان لیوا چکر میں پھنسا ہو پھر وہ آہستہ سے اٹھا میرے قدموں میں بیٹھ کر میرے گھٹنوں سے سر ٹیک دیا میں نے اسکے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں اُلجھاتے ہوئے اِس کی پشت تھپتھپائی۔

"مما" اِس نے میری طرف دیکھا آنکھوں میں ٹھہرا ہوا کرب اور چہرے پر جما ہوا ازار تھا اچانک ہی انجانے خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ خدا جانے وہ کیا کر آیا تھا کس جرم ... سنگین جرم کا ارتکاب کر آیا تھا جو اس کی یہ حالت تھی الٰہی خیر کرنا۔

"کہتے کیوں نہیں کیا ہوا ہے؟" میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔

اور اِس کیا کے جواب میں اُس نے جو کچھ کہا وہ میری ہستی کی بنیادیں ہلا گیا میں نے تو اسے بڑی احتیاط سے پالا تھا۔ بڑے سلیقے سے اس کی تربیت کی تھی قدم قدم پہ ہر اونچ نیچ بتائی تھی پھر بھی ... پھر بھی کہیں کوئی روزن کہیں کوئی درانزرہ

گئی تھی کوئی چور دروازہ کھلا رہ گیا تھا جس سے اس کے اندر وہ مرد داخل ہو گیا تھا جو معصوم ہستیوں کو محبت کے نام پہ برباد کر دیتے ہیں اور پھر اُن محبت کرنے والیوں سے جنہوں نے اُن کے آگے سب کچھ ہار دیا اس طرح الگ ہو جاتے ہیں جیسے کبھی جانتے نہ تھے یہ بھی... یہ بھی میرا بیٹا بھی اُسی صف میں کھڑا ہوا تھا اُس نے بھی ایک لڑکی کو برباد کر دیا تھا میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

"گناہ کرتے ہو تو یہ بھی یاد رکھو کہ اس کا انجام ایک نہ ایک دن طشت از بام ہو گا۔

ذلیل کمینے اب حوصلہ ہارے تکیے میں منہ دیئے کیوں پڑے ہو تھر تھر کانپ رہے ہو کیوں اس کا سامنا بھی کرو"

میں نے اس کا چہرہ تھپڑوں سے سُرخ کر دیا مکے لاتیں تھپڑ۔ اور وہ خاموشی سے پٹتا رہا وہ بیٹا جس کو میں نے پھول کی چھڑی سے....

بھی کبھی نہیں مارا تھا جس کو میں نے سدا پھولوں کی سیج پہ سلایا تھا۔ آج میں نے مار مار کر فرش پر گرا دیا تھا۔

"بول بول تو نے ایسا کیوں کیا۔ مجھے بتاتا میں تیری شادی اُس سے کرا دیتی میں اس کے والدین کے پاؤں پڑ جاتی تیرے لئے جان پر کھیل جاتی مگر اُسے تیری دلہن بنا کر لاتی مگر تو... تو یہ کالک اپنے ماتھے پر نہ ملتا کیا تو سمجھتا تھا تیری ماں تجھ پر اپنی مرضی لاد دے گی بول نا جواب کیوں نہیں دے رہا تجھے ڈر تھا کہ میں تیرا بیاہ اس سے نہ کروں گی۔"

"یہ بات نہیں ہے مما شادی تو اب بھی میں اُسی سے کرونگا"

وہ دھیرے سے مگر اٹل لہجے میں بولا اور میری چلتی زبان رک گئی اور میں حیرت میں غرق سی ہو گئی۔

"تو.... تو پھر یہ ندامت پشیمانی پریشانی کیوں ہے جاؤ جاؤ اس کا ہاتھ تھام لو برباد ہونے سے بچا لو میں تو یہ ہی جانتی ہوں کہ جو لڑکی مرد کو شادی سے پہلے حاصل ہو جاتی ہے وہ پھر اُس کی دلہن کبھی نہیں بنتی۔"

"وہ بے غیرت ہوتے ہیں مما" وہ اب بھی دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

"تو پھر یہ ساری پریشانی کس بات کی ہے" مجھے اس کی پریشانی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"مما... آپ... آپ کی نظروں سے وہ گری نہیں آپ راضی ہیں۔ آپ مان گئی ہیں مگر میں جانتا ہوں اِس کا باپ نہیں مانے گا۔ کیونکہ وہ خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے۔"

"تو فکر نہ کر۔ مگر وہ کون لڑکی ہے تیرے ساتھ پڑھتی ہے کیا"

میں نے تفصیل جاننے کے لئے پوچھا۔

"ہماری یونیورسٹی کے سامنے والے گرلز کالج میں پڑھتی ہے وہ میرے ایک کلاس فیلو کی بہن کی دوست ہے جو ہم سے دو سال جونیئر ہے اِس سے اکثر ملنے آتی رہتی ہے اِس کلاس فیلو کی معرفت ایک دوبار ملاقات ہوئی اِسی طرح سے میں چار سال سے اُسے جانتا ہوں آخری پیپر کے روز میں شاہی باغ میں بیٹھا تھا میں اور ارشاد اکٹھے پڑھ رہے تھے اُسے کچھ کام تھا وہ چلا گیا مگر میں نوٹس مکمل کر رہا تھا ہوا میں کچھ تیزی سی آ رہی تھی مگر میں چاہ رہا تھا کہ نوٹس مکمل کر لوں کیوں کہ ارشاد کو یہ نوٹس درکار تھے وہ اکثر غیر حاضر رہتا تھا اب امتحان سر پہ آیا تو نوٹس یاد آئے میں نے اُسے مکمل نوٹس نقل کر کے دینے کا وعدہ کر لیا کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ اِس طرح سے میں سارا کچھ لکھ کر دہرا لوں گا بارش کے قطرے پڑے تو میرا اہماک ٹوٹا ابھی پیپر سمیٹے ہی تھے کہ بارش تیز ہو گئی میں نے دیکھا وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی چلی آ رہی تھی وہ کسی سہیلی کے گھر سے آ رہی تھی سواری نہ ملنے کی وجہ سے پیدل چل پڑی اور بارش نے راہ میں آ لیا۔

میں نے اُسے دیکھا تو وہ میری طرف بڑھ آئی تیز بارش کے ساتھ اولے پڑنے شروع ہو گئے ہم بھاگ کر مالی کی کوٹھڑی میں چلے گئے وہاں کوئی نہ تھا بالوں سے پانی پونچھتے پونچھتے ایک دم میری نظر اُس پر پڑی ہلکے گلابی رنگ کی لون کی قمیض بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی شاید وہ میری ناقدانہ نظروں کو سمجھ گئی وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔ اور اِس طوفانِ بلاخیز کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی پھر وہ چلی گئی اُس کی آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں میں بھول نہ سکا۔ اور میں نے سوچ لیا کہ وہ اور میں ایک دوسرے کے آخری ہوں گے۔ نہ کوئی اُسے بیاہے گا اور نہ ہی کوئی اور لڑکی میری سیج سجائے گی چند دنوں میں اُس کے بی۔اے کے امتحان ختم ہو گئے چھٹیاں ہو گئیں وہ گرمیاں گزارنے کہیں چلی گئی جانے سے پہلے وہ مجھے ملی بس روتی رہی۔

مگر میرا ارادہ اٹل ہو گیا کہ آپ کو لے کر چند دنوں میں اُس کے ہاں جاؤں گا۔ لیکن اُس نے بتایا کہ وہ لوگ دوپہر کی گاڑی سے ایک ماہ کے لئے سوات وغیرہ جا رہے ہیں میری تسلیوں میں وہ بہل گئی مما میں نے اُس سے کبھی ملاقاتیں نہیں کیں کبھی محبت کے وعدے نہیں کئے بلکہ اِس سے محبت کرنا تو شاید میرے ذہن میں بھی نہ تھا۔ مگر پتہ نہیں مما میں عام مردوں کی طرح اُسے فراموش نہ کر سکا اُس کی بجائے میں خود اپنی نظروں سے گر گیا یہ احساس مجھے مار ڈالتا کہ ایک لڑکی کی ہستی میری وجہ سے داغدار ہو گئی اور کل وہ مجھے ملی اِس نے بتایا کہ وہ بدنامی کے بجائے موت کو گلے لگانا پسند کرے گی۔

ساری رات سوچ سوچ کے میں نے یہ ہی سوچا کہ آپ کو بتاؤں اگر آپ اپنا دامن وا کر لیں تو بہتر ورنہ دوسری صورت میں اِس گھر میں میرا یہ آخری دِن ہو گا میں کسی طرح بھی اُسے موت کے منہ میں نہیں دھکیلوں گا۔

آج میں اِس سے شادی کروں گا ہر صورت ہر قیمت پر۔ لیکن کتنی اچھی ہیں آپ کتنی عظیم کوئی اور عورت کبھی بھی ایسی لڑکی کو اپنے دل میں تو کیا گھر میں جگہ نہیں دیتی۔" وہ میرا ماتھا چوم کر اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

، کوئی عورت اس کرب سے گزری نہ ہوگی میرے بچے اس لئے ورنہ آج تو بھی میری عظمت کے گن نہ گاتا اور میں بھی اسی صف میں کھڑی ہوتی اور تو آج ناشاد و نامراد رہتا۔ میں عظیم نہیں ہوں تو عظیم ہے تو نے اپنی غلطی مانی اور کالک کی بجائے چاند بنا کر ماتھے پر سجانے کا عہد کیا درد بنا کر دل میں بسا لیا ورنہ تو بھی مکر سکتا تھا ہر ایک مرد کی طرح ہر مرد کی طرح نوید کی طرح نوید.... نوید کا خیال میرے ذہن میں در آیا۔ شکر ہے میرا بیٹا نوید نہیں بنا۔

نوید جو میرے گلشن حیات میں بہار بن کر آیا محبت کی گھٹا بن کر برسا اور باد سموم بن کر میری راہِ حیات کے ہر شجر سایہ دار کو جلا کر رکھ دیا بہت سے لوگوں کی طرح بلکہ بہت سی معصوم لڑکیوں کی طرح میں نے بھی محبت کی ہے کم عمری کی محبت اور جب میں نے اُسے بتایا کہ اب محبت چھپی نہیں رہ سکتی چند لمحے وُہ مجھے دیکھتا رہا اور پھر کہا کہ اُسے والدین کو راضی کرنے میں کچھ وقت لگے گا اور امتحانوں کے دوران وہ جا بھی نہیں سکتا کیونکہ والدین دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور امتحانوں کو ختم ہونے میں ایک ماہ لگے گا۔

امتحان ختم ہو گئے یہ سوچ کر میں خوش تھی کہ اب وہ شادی کی بات پکی کرنے ابھی آئے گا، مگر یہ صرف تصور ہی رہا اور وہ منگنی کروانے مبارک باد لینے ہمارے گھر آ گیا وہ کتنا خوش تھا کوئی ندامت کوئی شرمندگی، کوئی خلش اس کے دامن گیر نہ تھی۔

میں اندر سے ٹوٹ گئی کتنی بڑی چوٹ دے گیا تھا وہ اپنی نظروں سے گر گئی دل کا سکون لٹ گیا تھا وہ... وہ جو میری آنکھوں، میرے بالوں پہ عاشق تھا جاتے جاتے کہہ گیا۔

"اگر میں تم سے شادی کرتا تو پہلے دن بھی تم میرے لئے نئی تو نہ تھیں۔"

پھر وہ چلا گیا جانے کہاں۔ پھر کتنے ہی سال گزر گئے میرے ہاتھوں میں بھی مہندی لگی ہمارے آنگن میں بھی بارات اتری اور ڈولی کاندھے چلتی انجانے دیس میں آ گئی پختہ عمر کے مرد کو شوہر کے روپ میں دیکھ کر آنکھوں کا جلتا ہوا پانی جلتے دل کی آگ پر گرا اور دھواں پھیل گیا جو میری ہستی کا گھیراؤ کر گیا نہ وہ کبھی میرے دل میں جگہ پا سکا۔

نہ میری اس کی کبھی بنی مگر پھر بھی ہم ایک جگہ ایک گھر ایک ہی چھت کے نیچے رہتے رہے اس گھر میں کیا نہیں تھا، زمینیں تھیں جائیداد تھی روپیہ پیسہ تھا مگر سلوک نہ تھا ایک رائے نہ تھی دل میں مہر و محبت نہ تھی ایک سال کے بعد رضا پیدا ہوا اور چھ سال بعد وہ یتیم بھی ہو گیا اور میں تنہا رہ گئی۔ میں نے سارا کاروبار اپنے ہاتھوں میں لے لیا رضا کو میں نے اپنی مرضی سے پالا اور اس کی مرضی سے جو اس نے بننا چاہا بنا دیا اس کی تربیت میں نے اپنی مرضی سے کی اور تعلیم میں اس کے رجحان کا دھیان رکھا وہ بڑا سعادت مند بیٹا غمگسار دوست کی طرح قدم بہ قدم میرے ساتھ رہا اب سے دو ماہ پہلے وہ انجینئرنگ کے امتحان سے فارغ ہوا اب میں چاہ رہی تھی کہ اس کی مرضی پوچھ کر اس گھر میں بہو لے آؤں اور سارا کاروبار اس کو سونپ دوں مگر.....

شاید کوئی آیا ہے، میں نے پورچ میں زور سے کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر خود سے کہا "رضا آیا ہوگا" یہ سوچتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی اگر مناسب فاصلہ نہ ہوتا تو دروازہ جس شدت سے کھلا تھا اس کے پٹ میرے منہ کا حلیہ لگاڑ کے رکھتے

"آپ ہی مسز قاسم ہیں" وہ دونوں بازوؤں کے دروازے کے دونوں اطراف ٹکائے تنہا کھڑا تھا ایک لمحہ ہی تو لگا اور دوسرا لمحہ... دوسرے لمحے آنکھیں اُسے پہچان گئیں دل و دماغ نے آنکھوں کی تائید کی مگر وہ اس قدر بگڑا ہوا کیوں ہے کیا کیا ہے میں نے۔

"جی ہاں" میں نے اطمینان سے کہا اسی طرح اونچا لمبا کافی بال سفید ہو چکے تھے مگر چہرہ کچھ شکستہ اور باوجود غصے کے کندھے کچھ ڈھیلے ڈھالے جھکے ہوئے نظر آ رہے تھے اور آنکھیں اب بھی پہچان سے عاری نظر آ رہی تھیں۔

"کیا رضا آپ کا ہی بیٹا ہے" وہ پھنکارا۔

"جی ہاں خدا اس کی عمر دراز کرے وہ میرا ہی بیٹا ہے"

میرا لہجہ بدستور مطمئن تھا "مگر آپ کو اس سے کیا شکایت ہے تشریف رکھئے اطمینان سے بیٹھ کر بات کیجئے۔"

"شکایت۔ اس نے میرے سینے میں گھاؤ ڈال دیا آپ شکایت کی بات کر رہی ہیں۔ کہاں ہے وہ ناہنجار بد....."

"مسٹر آپ تہذیب کا دائرہ عبور کر رہے ہیں میرے بیٹے کا نام اس طرح مت لیجئے پہلے وجہ بتائیں وہ قصوروار ہوا یقین رکھیں، اس سزا کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے جو میں اُسے دوں گی"

"قصور... قصور آپ اسے قصور کہتی ہیں اس نے جرم کیا ہے ہولناک جرم" اس نے بازو پیچھے کر کے ایک لڑکی میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ اس طرح تنا کھڑا تھا کہ اس کے

پیچھے کسی وجود کا مجھے احساس ہی نہ ہوا سہمی ہوئی زرد چہرہ لئے بڑی بڑی خوف زدہ آنکھوں سے وہ لڑکی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ لمبے لمبے سیاہ بال پشت پہ پھیل گئے تھے ایک خیال یکدم میرے ذہن میں آ گیا۔

"بنیا۔ روبینہ ہو تم؟"

"جی ہاں" وہ مدھم آواز میں بولی۔

"اوہ یہ تمہارے والد ہیں" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور یہ بیٹھو بیٹی ادھر آؤ میرے پاس آؤ" میں نے اٹھ کر اسے اٹھایا۔

"یہ... یہ آپ کیا کر رہی ہیں یہ اس قابل نہیں ہے اسے کو سنگسار کر دینا چاہیئے اس نے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی ہے" وہ ہکلا کر بولا۔

"سنگسار تو میرے بیٹے اور اپنی بیٹی کو سنگسار کرنے کے لئے پہلا پتھر آپ ہی پھینکیں گے نا نوید احمد" میں کچھ تلخ ہو گئی۔ وہ دونوں باپ بیٹی چونک گئے۔ مگر میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔

"بیٹی تم جاؤ سامنے سیڑھیاں چڑھ کر دائیں ہاتھ رضا کا بیڈ روم ہے تم جا کر آرام کرو۔ رضا آتا ہی ہو گا۔" وہ دھیرے سے اٹھی اور باپ کے پاس سے ہوتی ہوئی باہر چلی گئی اور وہ بت بنا مجھے گھورے جا رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے دروازے کے قریب پڑے صوفے پر ٹک گیا۔

"میں نادیہ ہوں نوید۔ میرا خیال ہے میں اس قدر بھی نہیں بدل گئی کہ پہچانی نہ جاؤں" میں ہنس رہی۔ خدا کی قدرت پر مجھے ہنسی آ رہی تھی اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔

"نادیہ! وہ دھیرے سے بولا "تم"۔

مجھے ہنستا دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک گئے۔

"تم جانتی ہو کہ روبینہ اور رضا..." وہ چپ ہو گیا۔

"ہاں"

"تو... یہ سب کچھ تم نے کروایا ہے جان بوجھ کر" وہ پھر غصے سے اکھڑنے لگا۔

"زبان کو لگام دو نوید۔ اتنی عمر گزر گئی مگر تم نہ بدلے نہ تمہارے خیالات کی پرواز بلندی کی طرف مائل ہوئی وہی پنچ اور پست کے پست ہی رہے۔

تمام حالات کا مجھے آج ہی پتہ چلا ہے اور یہ مجھے ابھی معلوم ہوا کہ میں اور میرا قاتل اسی ایک ہی شہر کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور روبینہ کے باپ تم ہو بخدا مجھے ابھی معلوم ہوا ہے ورنہ تم ایک دوسرے کی زندگی سے نکل گئے تھے ہمارے راستے الگ اور منزلیں جدا ہو گئی تھیں یہ تو شاید قسمت پر تشاکر ہو گئی تھی کہ وہ میرا ہی قصور تھا جس کی سزا تمام عمر میں نے پائی مگر تم نشانہ قدرت میں تھے ایک مدت سے کمان کھنچی ہوئی تھی۔ ہاں تیر اب نکلا ہے۔

جو تمہاری ہستی کی بنیادیں کھوکھلی کر گیا ہے انسان کے کام ادھورے ہوتے ہیں مگر قدرت کا عمل مکمل اور جامع ہوتا ہے تم تو مجھے چھوڑ گئے تھے دنیا کے سمندر میں ہیں تمام عمر ناکام اور ناشاد رہی تم میری ہستی چور چور کر گئے تھے اور وہ جو میرا شوہر بنا اسے دولت جمع کرنے سے ہی کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ میرے چور چور دل پہ پیار و محبت کا مرہم لگاتا بھلے بال آ جاتا مگر جڑ تو جاتا تا مات۔ سالہ ازدواجی زندگی کی کتاب صرف آنسوؤں سے رقم ہے خوشی کا لفظ بھی اس میں نہیں لکھا گیا۔

میں نے اپنی ساری محبت ساری چاہت جسم و جان کی ساری امنگیں سارے ولولے تمہاری نذر کر دیئے تھے تم ہی مجھے تہی داماں کر گئے تو میں کسی اور کو کیا دیتی۔ اور پھر زندگی اتنی لمبی ہوتی بھی کہاں ہے کہ بار بار محبتوں کے انمول خزانے مختلف افراد پر لٹائے جائیں" میں رکی اس کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا ملازم چائے لے آیا تھا۔

"وینو۔ گرم دودھ کا گلاس اور کچھ پھل چھوٹے صاحب کے کمرے میں لے جاؤ۔ نذیراں سے کہو کہ وہ بی بی کو کچھ کھلا پلا دے"

"تمہارا ایک ہی بیٹا ہے؟" وہ بولا۔

اب اس کے چہرے کی رنگت بحال ہو رہی تھی۔

"ہاں! وہ میرا قابل فخر بیٹا ہے"

"اس جرم کے باوجود"

"ہاں اس کے باوجود وہ اس لئے کہ وہ تمہاری والی صف میں کھڑا نہیں ہوا اس نے جرم کیا ہے اس کا اقبال کیا اور اس کو اپنانے کا فیصلہ کیا اور اگر وہ تمہاری طرح چشم پوشی کرتا پہلو تہی کرتا تو اس وقت تم اس کی لاش دیکھتے اور میں واحد ماں ہوتی جو اپنے بیٹے کی لاش پہ آنسو بہانے کی بجائے تھوک دیتی کیوں کہ مجھے نفرت ہے ڈر جانے والے بزدل تم جیسے مردوں سے"

"مجھے معاف کر دو۔ نادیہ" وہ منمنایا۔ "تم کتنی بڑی عورت ہو یہ میں اب جان پایا۔"

"اب ہم معافی مانگنے اور معاف کر دینے کی حدود سے بھی پرے ہیں اب وقت گزر چکا ہے پر یہ سوچ لو کہ خدا یاد رکھتا ہے چاہے انسان اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتی بھول بھی جائے وہ ظلم کرنے والے کو یاد رکھتا ہے اور کبھی دن ایک دوسرے کا سامنا کروا ہی دیتا ہے میری بڑائی کا کیا اعتراف کرتے ہو نوید ابھی تم کہہ رہے تھے کہ یہ سب کچھ میں نے ہی کروایا ہے یاد رکھو اگر میں نے رضا کو شہ دی ہوتی تو ابھی بیٹا اوپر کمرے میں نہ ہوتی بلکہ میرے نوکر تم دونوں کو دھکے دے کر باہر نکال دیتے پھر میں سارے زمانے میں تمہارے باعزت نام کے جھنڈے چڑھا دیتی تم کیا کر سکتے تھے. رضا کو گولی مار دیتے بیٹی کا گلہ دبا دیتے مگر عزت تو جا ہی چکی تھی وہ کیسے لاتے؛

تمہاری عزت میں نے سمیٹی ہے.

اپنے سامنے تم کتنے ہی سرنگوں کیوں نہ ہو میں نے آج بھی زمانے کے سامنے تمہیں جھکنے نہیں دیا. اس لئے نہیں نوید کہ تمہاری محبت عود کر آئی بلکہ اس لئے کہ میری طرح ایک اور لڑکی بھی نامراد و ناشاد نہ ہو جائے جو گھاؤ تم نے میرے دل میں ڈال کر مجھے میری ہی ذات میں در بدر کر دیا وہ حال میں کسی اور لڑکی کا نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس لئے میں نے اسے ٹوٹنے سے بچا لیا ریزہ ریزہ ہونے سے پہلے ہی دامن پھیلا کر سمیٹ لیا اور سب سے قابل فخر تو میرا بیٹا ہے جس نے مردانگی کی لاج رکھ لی۔

"تم مجھے معاف کر دو رضا آ جائے تو میں اس سے بھی معافی مانگوں گا اس کے سامنے تم سے معافی مانگوں گا۔"

"نہیں. رضا کے سامنے اس خرافات کی ضرورت نہیں ہے اور رضا کے ذہن میں میری ایک روشن تصویر ہے اور تم اس کا تاریک ترین پہلو میں اسے تاریکیوں سے دور رکھنا چاہتی ہوں اب تم جا سکتے ہو۔"

"خدا حافظ" میں کمرے سے بنا پیچھے دیکھے نکل آئی کچھ دیر کے بعد نوید کی کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی وہ گیٹ سے اس طرح نکلا جیسے میری زندگی سے نہیں اس دنیا سے نکل گیا ہو.

رضا اب تک نہیں آیا جانے کیوں دیر ہو گئی تھی روبینہ سو رہی تھی پرسکون نیند.

"مما" رضا کی آواز سن کر میں جلدی سے کمرے میں آئی.

"مما روبینہ!"

"اوپر ہے" میں نے اس کی بات پوری کر دی،

"کیا" وہ حیرت میں تھا،

"چلو چلو اندر آؤ تفصیل سے تمہیں روبینہ آگاہ کرے گی!"

میں اسے اندر لے آئی.

"روبینہ کہاں ہے"؟

"اوپر تمہارے کمرے میں" وہ اوپر جا گا.

"ادھر پیچھے آؤ اور دیکھو شام کو نکاح کے لئے اپنے کپڑے پریس کیلئے دے دو اور دیکھو یہ سرخ ساڑھی اور یہ سیٹ میں روبینہ کو پہنا رہی ہوں،"

"اوہ مما میری سویٹ مما؛ عقیدت و احترام کے آنسو اس کی آنکھوں میں آ گئے. اور اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر میرا سر چوم لیا.

*

گرفتارِ وفا

پروین کی شریف

قسط (۴)

"ارے ربیطہ آج کل کون شرماتا ہے۔ ذرا سر تو اونچا کرو۔"
"بیگم سلیمان نے اس کا چہرہ اٹھایا۔
"چاند سورج کی جوڑی ہے۔"
"ماشاء اللہ بھی تو کہیں نا۔"
"شیراز چہکا۔ تو سب لوگ ہنس دیئے۔
"بہت لکی ہو ربیطہ جو اتنا شاندار ساتھی ملا ہے۔"
بیگم سلیمان کی لڑکی عائشہ نے کہا۔
تو شیراز ربیطہ کی طرف دیکھنے لگا۔
"کیا یہ سچ کہہ رہی ہے۔" وہ بولا۔
تو عائشہ زور سے ہنس دی۔ اور ربیطہ نے سرخ ہو کر محض نظریں جھکا لینے پر ہی اکتفا کیا۔
"پلیز ربیطہ شرمانا چھوڑو بھی اور یہ بتاؤ کہ رات منہ دکھائی میں کیا ملا؟"
وہ آہستہ آواز میں ربیطہ سے پوچھ رہی تھی۔
"میں بتا دوں؟" وہ موقع اور حالات سے پورا فائدہ اٹھا کر لطف لے رہا تھا۔
"نہیں جی آپ چپ رہیئے۔ ہم تو ربیطہ سے ہی پوچھیں گے۔" عائشہ نے جھک کر کہا۔
"تو پوچھ لو۔ مگر یہ کبھی نہیں بتائیں گی۔" شیراز نے اس کی انگوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔
معلوم نہیں عائشہ نے اس سے کیا پوچھا۔ اور ربیطہ نے کیا کہا تھوڑی دیر بعد جب شیراز واپس آیا تو دونوں مسکرا رہی تھیں۔
"کہو بھئی کچھ بتایا ہماری دلہن نے؟"
شیراز بڑی گہری نظروں سے ربیطہ کی طرف دیکھ کر بولا۔
"ہاں بہت کچھ بتایا۔"
"میں بھی سنوں۔" شیراز اس کے قریب بیٹھا تو ربیطہ بیتاب سی ہو گئی۔ کیونکہ اس نے تو ممی کے کہنے کے مطابق عائشہ کو اپنی سہاگ رات کی ایک من گھڑت داستان سنا دی تھی اور اب وہ شیراز کے سامنے اپنی سبکی ہونے کے خیال سے ڈر گئی۔
"شیراز بھائی ربیطہ نے مجھے سب باتیں بتا دی ہیں۔" اور...!
"اور کیا؟"
شیراز تڑپ کر بولا۔
"اور یہ کہ آپ بڑے...!"

"ارے بھئی چلو۔ تم لوگوں کی باتیں ہی ختم نہیں ہو رہیں اور ادھر کھانا لگ چکا ہے۔ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔"

ماں کی آواز سن کر ربیطہ نے اطمینان کا سانس لیا اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"چلو آؤ۔" ممتاز بیگم کے ساتھ مسکراتی ہوئی عائشہ بھی چلی گئی

"چلیے جناب۔" وہ ہاتھ بڑھا کر بولا تو ربیطہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلنے لگی۔

"مجھے بھی تو ساتھ لیجیے۔ آخر کو میں آپ کا شریک سفر ہوں چاہے وقتی ہی سہی۔"

وہ اس کے قدموں سے قدم ملا کر بولا تو ربیطہ رک کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ شیراز دوسروں کی موجودگی میں کچھ زیادہ ہی شوخیاں کرتا ہے۔

دونوں جب ڈائننگ ہال میں پہنچے تو لوگ کھانا شروع کر چکے تھے۔

"ارے بھئی اب آ بھی چکو۔" بیگم سلیمان نے ان کو دیکھ کر کہا۔

"میرے خیال میں دونوں تنہائی ڈھونڈ رہے ہیں، ان کا کھانا کمرے میں بھجوا دو۔"

کسی نے شوخی کی تو شیراز مسکرا کر ربیطہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اور ربیطہ شرم سے سرخ ہو کر پیچھے دیکھنے لگی۔

بے حد خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا تو مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے لوگوں کو رخصت کر رہے تھے۔ قریب کھڑے بیگ صاحب اور ممتاز بیگم دونوں کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے

سب لوگوں کے جانے کے بعد چند لمحے چاروں ساکت سے رہ گئے جیسے کوئی بات ہی نہ سوجھ رہی ہو۔

"بیگم اب تیاری کرو گھر چلنے کی۔"

بیگ صاحب نے ماحول کے سناٹے کو توڑتے ہوئے کہا تو جیسے سب زمین پر لوٹ آئے۔

"ربیطہ بیٹے تم اپنی ممی کے ساتھ جا کر کمرے سے سامان لے آؤ۔ مجھے شیراز سے کچھ باتیں کرنا ہے۔"

"آؤ شیراز بیٹے۔" وہ بڑی شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہوٹل سے باہر نکل آئے اور پھر دیر تک آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہوئے اسے کچھ سمجھاتے رہے۔ جب ممتاز بیگم کے ساتھ ربیطہ ہوٹل سے نکلی تو ربیطہ نے محسوس کیا کہ پاپا کے پاس کھڑے شیراز کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے والی شگفتگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس نے لاپرواہی سے سر جھٹک کر اپنی سوچوں سے دامن بچایا اور اس کی نظروں سے بچنے کے لئے جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

انسان کتنا بھی بہادر اور جری بن جائے
وہ کائنات کے نظام کو نہیں بدل سکتا
وقت کی رفتار کو نہیں روک سکتا

گزرتی ساعتوں کو نہیں پکڑ سکتا۔ اور یہی انسان کی سب سے بڑی بے بسی ہے۔۔۔ کچھ اسی قسم کی بے بسی سے ربیطہ دو چار تھی۔

.... شادی تو جیسے ہونی تھی ہو گئی۔ مگر اب جو اس کے بعد ہنگامے جاگے تھے انھوں نے اس کی شخصیت کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا ــــ امی کی دوست .... پاپا کے ملنے جلنے والے اسے بلاتے تو اسے جانا ہی پڑتا۔ کبھی کہیں ڈنر ہوتا۔ کبھی کسی کے ہاں پارٹی اور کبھی کوئی شام کسی کے ساتھ منائی جاتی۔ وہ دل پر جبر کر کے سب کچھ کر رہی تھی۔

یونہی کبھی کبھی کسی کے ہاں سے آتے ہوئے جب شیراز اسے لیکر دور نکل جاتا۔ طویل اور سنسان سڑکوں پر تو ربیطہ پر ایک عجیب سی وحشت چھا جاتی اور پھر ایسے میں جب کسی جگہ اچانک گاڑی روک کر سگریٹ سلگانے کے بہانے اپنی سرخ طوفانی آنکھوں سے پوری وارفتگی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا تو اس کا دل اندر ہی اندر کانپ جاتا۔ مگر وہ خاموش رہتی کیونکہ اسے احساس ہو چکا تھا۔۔۔ کہ شیراز کے اندر جذبات کا ایک سمندر سا ابل رہا ہے۔

جو کسی وقت بھی اسے اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے، اس لئے وہ اُسے کچھ کہنے کی بجائے چپ رہنا ہی مناسب سمجھتی۔ کتنے ہی دن ان دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ مگر وہ ان بناوٹی باتوں سے بیزار ہوتی جا رہی تھی۔ دوسروں کو اس طرح فریب دینا اسے انتہائی مشکل لگتا جب دل نہ چاہتے ہوئے بھی لوگوں کے سامنے اُسے مسکرانا پڑتا تو اندر ہی اندر اس کا دل دکھ جاتا اور پھر جب لوگ شیراز کی تعریف کرتے ہوئے اس کی قسمت پر رشک کرتے تو وہ دل میں کٹ کر رہ جاتی۔

مگر پھر بھی اسے مسکرا مسکرا کر سب کے سامنے شیراز کا خیال رکھنا پڑتا۔ کبھی اسے مخاطب کرتی کبھی کوئی ڈش اُٹھا کر دیتی۔ تو وہ بڑی معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔ اور یہ سب ڈرامہ صرف باہر کی دنیا میں ہوتا۔ جونہی وہ گھر کے اندر قدم رکھتے..... تو ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جاتے۔ ممتاز بیگم نے دوسروں کو تاثر دینے کے لئے ربیطہ کے ساتھ والا کمرہ شیراز کو دے دیا تھا،

جس کا اندرونی چھوٹا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ مگر ربیطہ کے لیے یہ سب کچھ اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔
وہ ان بناوٹوں سے گھبرا گئی تھی۔ اور یوں بھی شیراز کی بے تکلفیوں نے اس کے من کو ڈرا دیا تھا..... نہ جانے کیوں نیر ولی سے ماموں کی آمد میں تاخیر ہو رہی تھی۔ وہ تو گن گن کر لمحوں اور دنوں کو گزار رہی تھی.... مگر حالات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ممی اور پاپا بھی ماموں کی آمد کے منتظر تھے مگر ان کا انتظار طویل ہی ہوتا جا رہا تھا اور شیراز کے ساتھ یوں بناوٹی طور پر چلنا پھر نا اب اس کے لئے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اکثر جواد کے آفس فون کر کے اس کا پتہ کرتی رہتی اور اس کی آمد کا یقین کرتے ہوئے اپنے آپ کو پُر سکون کرنے کی کوشش کرتی۔ مگر سب باتوں کے باوجود اس کے دل کے اندر ایک انوکھی سی خلش رہتی جو خود کو لاکھ مطمئن کرنے پر بھی اسے بے قرار کرتی رہتی ... تب وہ بے حد پریشان ہو کر رہ جاتی۔ زندگی ان ہی بے تاب اور دل کو دُکھ دینے والی کیفیتوں میں بسر ہو رہی تھی۔
اس روز موسم کچھ زیادہ ہی خنک ہو رہا تھا۔ اور ہوائیں پھولوں کی مہک لئے ادھر اُدھر جھوم رہی تھیں۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا۔ شام دھیرے دھیرے ماحول کو جکڑ رہی تھی۔ اور ہر طرف ایک خواب ناک سا سنّاٹا بکھر رہا تھا۔
وہ وہیں... برآمدے کی ٹھنڈی سیڑھیوں پر بیٹھ کر آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے لگی.... تب ہی وہ آگیا۔ ہمیشہ کی طرح تر و تازہ اور شاداب سا۔
"ہیلو کیا ہو رہا ہے؟" وہ ایک پاؤں عین اس کے پیروں کے قریب رکھ کر بولا تو وہ بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟" تو وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔
"آپ کو بہت مان ہے اپنے آپ پر" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"ہونا بھی چاہیے.... آخر کو میں ایک خوبصورت ترین لڑکی کا شریک زندگی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں شوخی اُبھر آئی۔

"شیراز۔ مجھے ایسے مذاق قطعی ناپسند ہیں۔" وہ غصّے سے بولی۔

"ارے بھئی میں کب آپ سے مذاق کر رہا ہوں۔ یہ تو ایک حقیقت ہے چاہے تلخ ہی سہی۔"

"آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں، سمجھے۔" وہ اپنے ہاتھوں کو بے تابی سے ملتے ہوئے بولی۔

"اچھا...!" وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ "میں یہ کہنے آیا تھا کہ رات کو میرے دوست نے ڈنر پر بلایا ہے۔ آپ تیار رہیئے میں نو بجے آجاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔

"شیراز۔" ربیطہ کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لیئے۔

"فرمایئے۔" وہ بڑی خوش دلی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"مہربانی فرما کر آپ آج کا ڈنر کینسل کر دیجئے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟" وہ سانس بھر کر بولا۔

"میری مرضی۔" وہ اس کی نظروں کی تپش سے بچتے ہوئے بولی۔

"سنو ربیطہ۔ میں تمہارے ملنے والوں کے ہاں صرف تمہاری عزّت کی خاطر دل پر جبر کر کے جاتا رہا ہوں۔ یہ میری طرف سے پہلی دعوت ہے اور میرا دوست بھی ایسا ہے جسے میں انکار نہیں کر سکتا۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"دیکھئے ربیطہ صاحبہ... میں کوئی مشینی انسان نہیں ہوں جو تم لوگوں کے اشاروں پر ناچتا رہوں۔ میری اپنی بھی کوئی انا ہے، عزّت ہے۔ اور پھر جو معاہدہ ہمارے درمیان طے پا چکا ہے اس کی رو سے تمہیں میرے ساتھ جانا ہی پڑے گا سمجھیں۔ ورنہ..." وہ بات ادھوری چھوڑ کر تیزی سے اندر چلا گیا اور ربیطہ غصّے سے بل کھاتی ہوئی ممتاز بیگم کی طرف چل دی۔

"ممی پلیز مجھے اس سے بچایئے۔ میں آج ہرگز کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"کس کے ساتھ؟" ممتاز بیگم نے پوچھا۔

"اسی آپ کے چہیتے ڈرائیور شیراز کے ساتھ۔"

"کیوں؟ کیا کہہ دیا اس نے تمہیں؟"

"اس کے کسی دوست نے ڈنر پر بلایا ہے اور میں جانا نہیں چاہتی۔"

"مگر کیوں؟"

"بس میرا دل نہیں چاہتا۔ میں ان بناوٹوں سے تنگ آگئی ہوں۔"

"ربیطہ بیٹی... مجھے تمہاری حالت کا احساس ہے... مگر شیراز کے ہم پر اتنے احسانات ہیں جنہیں شمار نہیں کیا جا سکتا... تم خود ہی غور کرو... اس دور میں کون اتنا عظیم ہوا ہے۔ اور پھر تم بھی کئی بار اسے آزما چکی ہو... تنہائیوں میں — ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی اس نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی یا زیادتی نہیں کی۔ اگر ہم اپنے مفاد کے لئے اس کے وجود کو جکڑ سکتے ہیں تو کیا اس کو اتنا بھی حق نہیں کہ وہ اپنے دوست کے ہاں تمہیں لے جا سکے...؟" ممی نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"ممی پلیز میری بات تو سنیئے۔ اس کا دوست کونسا نواب ہے۔ وہ بھی تو کوئی ڈرائیور ہی ہوگا۔ اب مجھ سے ان گھٹیا لوگوں کی محفلوں میں نہیں جایا جاتا۔"

"ربیطہ بیٹی ایسا نہ کہو۔ پہلے ہی خدا نے نہ جانے ہمیں کس جرم کی سزا دی ہے جو یہ دن دیکھ رہے ہیں۔ شاید تمہیں احساس نہیں کہ تمہارے پاپا کا دل کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ شیراز جل ہی انہیں کسی مضبوط ستون کی طرح تحفظ اور سہارا دیئے ہوئے ہے۔ اگر وہ ہمارے لئے اتنی قربانیاں کر سکتا ہے تو کیا تم اس کے لیئے ڈنر پر نہیں جا سکتیں۔"

ماں کے لہجے میں اتنی بے بسی تھی کہ ربیطہ کا دل بجھ گیا۔ وہ تو بڑے خوشگوار موڈ میں ممتاز بیگم کے سامنے التجا کرنے آئی تھی۔ مگر ان کی باتیں سن کر [illegible] ہو گیا۔ وہ چپ چاپ اٹھی اور اپنے کمرے میں آگئی۔

رات کو جب وہ تیار ہو کر ڈرائینگ روم میں آئی تو وہ اپنی پوری وجاہتوں سمیت صوفے پر نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ قدموں کی آواز سن کر اس نے نگاہ اٹھائی اور وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔

ایک تو وہ ویسے ہی بے تحاشا خوبصورت تھی۔ اوپر سے ستمگر نے سیاہ جالی کی ساڑھی باندھ رکھی تھی جس کی درزوں سے اس کے شباب کا رنگ پھوٹ رہا تھا۔

"اوہ گاڈ کتنی خطرناک ہے یہ لڑکی اور کیسے کیسے انداز سے سنوارتی ہے خود کو۔"

شیراز میز سے گاڑی کی چابی اٹھا کر جلدی سے باہر آگیا۔ اس وقت وہ خود کو بے حد اپ سیٹ محسوس کر رہا تھا۔

اس کے اندر جیسے جذبات کا آتش فشاں اُبل رہا تھا۔

وہ ایک جوان آدمی تھا۔ اور ایک لڑکی جو اس کی من پسند محبوبہ ہونے کے ساتھ بیوی بھی تھی۔ یوں اس سے دور تھی کہ وہ اسے چھونے کا حق بھی نہیں رکھتا تھا۔ شیراز اعصابی فرسٹریشن کے ایک ایسے دور سے گزر رہا تھا جس نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا قرار لوٹ لیا تھا۔ ربیطہ باہر آئی

تو وہ گاڑی کے اندر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اور مدھم چاندنی نے ہر طرف خوابناک سا اسرار پھیلا رکھا تھا۔

وہ گھوم کر دوسری طرف آئی اور چپ چاپ دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

شیراز نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ساتھ ہی ایک قاتل سا احساس اسکے اعصاب کو جکڑنے لگا۔ اس نے رُخ موڑ کر ربیطہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے اتنی قریب ہو کر بھی کس قدر دور تھی۔ اس لمحے وہ بے حد بے چین ہو گیا۔ حسن و جمال کا دریا اس کے سامنے موجزن تھا۔ اور وہ پھر بھی پیاسا سا تھا۔

کیا ان گلاب لبوں

شفق رخساروں

اور خوبصورت گیسوؤں پر میرا کوئی حق نہیں۔

اس کا ایمان رہ رہ کر متزلزل ہونے لگتا۔ ربیطہ کی قربت کے ساتھ ساتھ چاندنی رات کی تنہائی اُسے پاگل کر رہی تھی۔ مگر وہ سلطان بیگ سے کئے ہوئے وعدے سے بندھا اپنے مچلتے تڑپتے جذبات کو اندر ہی اندر دبائے تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا ربیطہ اس کی اضطرابی کیفیت کو محسوس کر کے کچھ خائف سی اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر وہ اپنی دھن میں گاڑی کی اسپیڈ بڑھائے ہی جا رہا تھا۔

"گاڑی آہستہ چلاؤ۔" اس نے سہم کر بے اختیاری میں اسٹیرنگ پر رکھے اس کے ہاتھ کو چھو لیا۔

شیراز نے ایک دم بریک لگائے۔ گاڑی اُلٹتے اُلٹتے بچی اور سڑک سے اتر کر سنسان جگہ ٹھہر گئی۔

دونوں نے چند لمحے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شیراز کی آنکھوں کی سُرخی اور ہاتھوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا رہا ہے۔

"اتنی تیز رفتاری خطرناک ہے۔" وہ اپنی منتشر ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ سر جھکا کر بولی۔

"تم سے زیادہ تو کوئی شے بھی خطرناک نہیں۔" شیراز نے بے حد گھری آواز میں کہا۔ تو وہ کچھ کہنے کی بجائے گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

اس نے ربیطہ کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے طویل سانس لیا اور گاڑی چلادی۔

تھوڑی دیر بعد جب ان کی گاڑی شاندار گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو ربیطہ چونک اٹھی۔

گاڑی پورٹیکو میں رکی تو کئی لوگ ان کی جانب بڑھے۔

"اتنی دیر لگادی شیراز۔" کسی نے کہا۔

"بس یار دیر ہو ہی گئی۔ وہ مسکرایا۔

"ایسے موقعوں پر اکثر دیر ہو ہی جایا کرتی ہے۔" کسی خاتون کا قہقہہ بلند ہوا۔ شیراز بڑے خوبصورت انداز میں سب کے ساتھ اسے ملوا رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے سب کو اسمائل دے رہی تھی۔ جب وہ اندر پہنچے تو بے حد لوگ موجود تھے۔ انہیں دیکھتے ہی کچھ لوگ ان کی طرف بڑھے۔

"ارے بھابھی! آپ تو بہت خوش قسمت ہیں جو شیراز ملا ورنہ . . ." وہ ابھی کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ شیراز ربیطہ کو لے کر جلدی

سے آگے بڑھ گیا۔ اور یہ سب کچھ ربیطہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔

"شیراز... ڈرائیور اور یہ محفل" اس کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ عورتیں جیسے شیراز سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھیں اور وہ دوسروں کو مرعوب کرنے والے اپنے دراز قد اور خوبصورت شخصیت کے ساتھ مسکرا مسکرا کر سب کو ہاتھ ہلا رہا تھا۔

"آؤ ربیطہ میں تمہیں اپنے دوست سے تو ملواؤں نہ جانے کہاں چلا گیا" وہ بڑی بے تکلفی سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا۔ تو وہ گھبرا کر رہ گئی۔ اس کے مضبوط ہاتھوں کے لمس میں ایسی سلگتی ہوئی تاثیر تھی کہ اس کے بدن میں شرارے سے اڑنے لگے۔

"اوہ! ہیلو" کسی کی آواز سن کر شیراز پلٹا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

"ارے کہاں چلے گئے تھے حاشر"

"جانا کہاں تھا تمہارا ہی انتظار تھا" وہ مسکرایا۔

"اچھا ان سے ملو... تمہاری بھابھی.... ربیطہ شیراز۔ اور ربیطہ میرا بہترین دوست حاشر علی۔ ان کی بیگم آجکل بنگلہ دیش گئی ہوئی ہیں" شیراز نے آہستہ سے کہا۔

"ارے بھابھی سچ کیا کہوں۔ آپ کو ملنے کے لئے تو ہم بڑے ہی بے تاب تھے۔ "کیسی ہیں آپ؟" وہ بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ تو وہ بے پناہ سُرخ ہو کر رہ گئی۔

"شیراز شکر ہے تمہیں بھی کسی نے اسیر کیا۔ ویسے بھابھی ہیں واقعی لاجواب۔ کہیں نظر نہ لگ جائے" وہ شیراز کی طرف دیکھ کر بولا تو ربیطہ بوکھلا کر شیراز کو دیکھنے لگی۔ جو بڑی دل کشی سے مسکرائے جا رہا تھا۔ ربیطہ جتنی دیر بھی وہاں رہی کھوئی کھوئی سی رہی۔ اور جب رات گئے وہ واپس ہوئے تو ربیطہ کے ذہن میں سوچوں کے انبار جمع ہو چکے تھے۔

"شیراز کون ہے؟"

"شیراز کیا ہے؟" بس ایک ہی صدا اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی.... اور اب تو اسے مکمل یقین ہو گیا تھا کہ شیراز اپنے اندر کچھ چھپائے ہوئے ہے

رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا۔ شیراز گھر جانے کی بجائے اسے لئے خواہ مخواہ سڑکوں کے چکر لگا رہا تھا۔ موسم خنک ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد لطیف ہو رہا تھا۔ ہر طرف روشنیوں کا جال سا بکھرا تھا اور دور آسمان پہ سلگتے ہوئے چاند کے ساتھ ستارے بھی جل رہے تھے۔

"ربیطہ۔ کوئی بات کرو۔ رات کے اس حسن سے میرا دل ڈر رہا ہے" وہ اپنے سرکش جذبات پر قابو پاتے ہوئے بڑی عجیب سی آواز میں بولا۔

ربیطہ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھنک کے تمام رنگ جیسے جم گئے تھے۔ اور وہ اس وقت بڑا ہی اپ سیٹ نظر آ رہا تھا۔

"پلیز ربیطہ کوئی بات کرو۔ کوئی کہانی۔ کوئی قصہ ہی سنا دو" شیراز نے نہ جانے کس موڈ میں سیٹ پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تو۔ وہ اچھل پڑی۔ برقی رو جیسا کوئی احساس روم روم میں اترنے لگا۔ وہ خود کو قابو میں رکھتے ہوئے نارمل ہو کر دروازے کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔ شیراز نے آج اسے بار بار چھو کر نئی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

"ڈر رہی ہو" شیراز کی آواز میں عجیب سی گھبراہٹ تھی۔

"نہیں" وہ دل کڑا کر کے بولی۔ حالانکہ رات تنی اس جذباتی تنہائی میں اس کے قرب کے شدید احساس سے وہ اندر ہی اندر سہم رہی تھی۔

"میرے خیال میں گھر چلنا چاہیئے"

"کیوں؟" وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے" اس نے یوں جلدی سے کہا جیسے اس کی قربت سے بچنا چاہ رہی ہو۔

"گھر ہی جانا ہے نا۔ چلے جائیں گے" وہ جان بوجھ کر بولا۔

"شیراز۔ تمہارا دوست کیا کرتا ہے؟" وہ ایک دم ہی بغیر کسی تُک کے بول اٹھی۔

"کیوں .... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" وہ مسکرایا۔
"ایسے ہی بس .... میرا مطلب ہے .... وہ اور تم۔"
"اچھا تو یہ بات ہے۔ محترمہ کیا ایک ڈرائیور کا دوست امیر نہیں ہو سکتا؟ .... یوں سمجھئے جیسے آپ کے پاپا مہربان ہو کر مجھے ڈرائیور بنا بیٹھے۔ اسی طرح ایک دن وہ بھی میرا دوست بن گیا۔"
"اچھا تھا نا .... وہ گاڑی چلاتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں بولا۔
مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ کیونکہ شیراز دن بدن کچھ زیادہ ہی پُر اسرار ہوتا جا رہا تھا۔
جب وہ گھر پہنچی تب بھی اُلجھی اُلجھی سی تھی۔ شیراز کون ہے ---؟ کیا ہے؟ بس یہی ایک سوال اُسے بار بار ہراساں کر رہا تھا۔
"کیا سوچ رہی ہیں۔ اب اندر چلئے۔" وہ بڑی معنی خیز نظروں سے بولا۔ تو وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔
کمرے کے دروازے کے قریب رُک کر اس نے بے پناہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پریشان سی ہو گئی۔
"سنو ربیطہ کبھی کبھی لوگوں کی محفل میں میں کافی بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں آپ سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ بلکہ اس محفل میں مجھے صرف اتنا احساس ہوتا ہے کہ آپ میری شریکِ حیات ہیں اور بس"
"شب بخیر" وہ شوخ نظروں سے اُسے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا اور وہ وہیں گم صم سی کھڑی رہ گئی۔
پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیئے تھے۔ وہ شخص جس سے وہ ہمیشہ نفرت کرتی آئی تھی اسے قدم قدم پر کیسی ٹھنڈی شکست دے رہا تھا--- شیراز تو چلا گیا مگر اس کے لیئے سوچوں کے کئی باب کھول گیا۔ آج کی دعوت پر وہ کچھ زیادہ ہی کھٹک گئی تھی۔ شک تو اُسے شیراز پر شروع دن ہی سے تھا جو آہستہ آہستہ یقین میں ڈھلتا جا رہا تھا۔
"کہاں ایک ڈرائیور اور اتنی اعلیٰ دعوتیں۔ اور پھر اس مصنوعی شادی پر اس نے جس انداز سے خرچ کیا تھا وہ بھی ربیطہ دیکھ رہی تھی۔ یہ سب چیزیں مل جل کر اس کے من کو مزید الجھنوں کا شکار کر رہی تھیں۔
"یہ یقیناً کوئی اسمگلر ہے جو پولیس کے ڈر سے ڈرائیور کا روپ بدل کر یہاں آگیا ہے اور اب اس کی زندگی کا ساتھی ہے۔" وہ ایک دم ڈر گئی۔
سہم گئی۔ اور ساتھ ہی ایک انجانی سی خلش اس کی دنیا تہہ و بالا کر گئی۔ در و بام چکرا گئے اور نگاہوں میں اندھیرا سا اترنے لگا۔ اگر شیراز نے مجھے آزاد نہ کیا تو ---؟ اس کا دل کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے لرزتے کانپتے وجود کو خود ہی سہارا دیا۔ اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بے کل ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔
شیراز کی شخصیت دن بدن پُر اسرار ہوتی جا رہی تھی۔ اور اب تو اسے مکمل یقین ہو چکا تھا کہ شیراز کے پس منظر میں یقیناً کوئی بڑا فراڈ پوشیدہ ہے۔ یہی سوچ اسے تڑپا رہی تھی۔
جلا رہی تھی۔
رُلا رہی تھی۔
وہ ساری رات بے قراری سے کروٹیں بدلتی رہی۔ مگر بڑھتی ہوئی سوچوں کا کوئی بھی سرا اس کے ہاتھ نہ آسکا۔ ادھر ربیطہ کی بے قراری انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ دوسری طرف شیراز کو بھی چین نصیب نہ تھا۔
اس کے سرکش جذبات طوفان کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے جس کا رُخ موڑنا اب اس کے اختیار سے نکلتا جا رہا تھا۔
"خدایا! ... یہ زندگی کا کیسا موڑ تھا۔ کسی گھڑی قرار نہ تھا۔
اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یوں بھول بھلیوں میں گم ہونے کی بجائے خود کو کسی اور پر نہیں تو ربیطہ پر آشکار کر دے۔ اس ضدی اور خودسر لڑکی کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہے کہ تم
"اتنی بے حس کیوں ہو؟
کیا تمہیں ابھی تک میرے جذبوں کی شدت کا احساس نہیں ہوا۔ یہ جذبہ جو کائنات کا سب سے عظیم جذبہ ہے جو پتھر کو موم بنانے کی تاثیر رکھتا ہے۔"
"پھر تم کیوں بے خبر ہو۔"

کیوں انجان بنی ہو۔ آؤ میرے قریب آؤ۔ مجھے ٹوٹ کر چاہو۔

اتنا چاہو کہ میری پیاس مٹ جائے۔

میرے دل کی بنجر دھرتی کا کونہ کونہ شاداب ہو جائے۔

میری روح کا ہر تار مسرور ہو جائے۔ آؤ اور میرے جذبوں کی شدتوں کو محسوس کرو۔ مجھے اور آزمائش میں مت ڈالو۔ میں کوئی معمولی انسان نہیں ہوں... ریطہ میں اپنی پی پی کا بے حد لاڈلا جگر گوشہ اور ایک ریاست کا مالک ہوں اور صرف تمھاری خاطر اپنی شخصیت کو بدل کر ادھر آ گیا ہوں... مجھے پہچانو ریطہ..." وہ پتہ نہیں کس موڈ میں خود سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ وہ انسان جس کے لیے لڑکیاں دیوانی تھیں جسے لوگ ناقابلِ تسخیر کہا کرتے تھے آج اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کر رہا تھا۔

کیا عشق کا جادو انسان کو اس حد تک کمزور اور بے بس بھی کر سکتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر خود سے مخاطب تھا۔ پھر تمام رات یونہی سوچوں میں گزر گئی اور آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد ہی خود کو سب پر ظاہر کر دے گا۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے وہ دیر تک سوتا رہا اور صبح ناشتے پر بھی نہ آ سکا۔

"بھئی یہ شیراز کدھر ہے۔ اسے بھی تو بلاؤ۔" سلطان بیگ نے رحیم بابا سے کہا۔

"صاحب وہ سو رہے ہیں۔"

"ابھی تک ... کیوں ریطہ شیراز کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" انھوں نے ریطہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے کیا خبر؟" وہ ناگواری سے بولی۔

"کیا بات ہے دونوں میں لڑائی تو نہیں؟"

"لڑائی تو ان میں ہوتی ہے جن کا آپس میں کوئی تعلق ہو۔" وہ اس وقت بے حد پریشان اور رنجور نظر آ رہی تھی اور چہرے پہ حزن و ملال کے رنگ واضح تھے۔

"تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ماں کا رنگ فق ہونے لگا۔

"میری طبیعت کو چھوڑیئے۔ آپ لوگوں نے حالات کی جس صلیب پہ مجھے چڑھا رکھا ہے یا تو اس کا خاتمہ کیجیے۔ یا پھر مجھے زہر دے دیجیے۔ اگر میں اور کچھ دن ان حالات کا شکار رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔"..... بات کرتے کرتے اس کی آواز ڈوب گئی۔ اور وہ وہیں میز پہ سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"ریطہ ... میری چاند اتنی جلدی ہمت ہار گئیں۔ جہاں اتنے دن صبر کیا ہے وہاں چند دن اور سہی۔ ہم تو خود تمھارے ماموں کے نہ آنے کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔" ممتاز بیگم نے دل گرفتگی سے کہا۔

مگر وہ اسی طرح میز پر سر رکھے چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔

"ریطہ بیٹے تمہارا باپ ایک ایسے دوراہے پر آن کھڑا ہے کہ نہ آگے جا سکتا ہے اور نہ ہی پیچھے۔ نہ جانے تقدیر ہمیں کس جرم کی سزا دے رہی ہے۔ اگر ہو سکے تو اپنے بدنصیب باپ کو معاف کر دو۔" سلطان بیگ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر مایوسی سے بولے اور اپنے گرتے وجود کو سنبھالتے ہوئے ٹوٹے سے اٹھ کر اندر کی جانب چل دیئے۔

"بیٹی حوصلہ کرو کچھ دن اور۔ اگر تم نے یوں ہی خود کو ہلکان کیا تو یاد رکھو ہم دونوں جیتے جی مر جائیں گے۔"

"مجھے زہر دے دیجئے ممی۔ گولی مار دیجیے۔ مگر خدا کے لیے ان اذیت ناک حالات سے نکال لیے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر کی کڑواہٹ لفظوں میں ڈھل گئی۔

"ایسے مت کہو بیٹی۔ کیا تمہیں ہم پر ذرا بھی بھروسہ نہیں رہا۔ تم کیا جانو۔ تمہارے پاپا کو صرف تمھارے غم نے دل کا مریض بنا دیا ہے۔" ممتاز بیگم کی ڈوبتی آواز میں شکایت کے ساتھ فریاد بھی تھی۔

"مگر ممی۔" ... ریطہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"بیٹے خود کو سنبھالو ورنہ ہم لوگ جیتے جی مر جائیں گے۔" ممتاز بیگم اپنی آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اٹھیں اور باہر چلی گئیں۔

ریطہ نے سر اٹھا کر جاتی ہوئی ماں کی طرف دیکھا۔ ان کی لڑکھڑاتی چال بتا رہی تھی کہ وہ بمشکل خود کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

"اوہ میرے خدا۔ یہ ہم سب کس مقام پہ آ گئے ہیں۔ کتنی خوشگوار زندگی تھی ہماری۔ ممی پاپا کی زندگی میں کبھی غم کا سایہ بھی نہ پڑا تھا خود میں کتنی مصروف اور آسودہ زندگی گزارتی تھی۔ یہ اچانک کیسی آندھی اٹھی ہے۔ کیسا طوفان بپا ہوا ہے جو خوشیوں اور راحتوں کے تمام چراغ گل کر گیا۔ اب اندھیروں میں کیسے صبح ہو گی۔ کیسے۔" اس نے اپنے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے سوچا اور ساتھ ہی ممی پاپا کے ویران چہرے اس کے سامنے آ گئے۔

جنھوں نے اپنی ہر خوشی کو ربیطہ کی خوشی پر قربان کر دیا تھا۔

جنھوں نے کبھی اسے میلی نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی کوئی سخت بات نہیں کہی تھی۔ کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔

آج صرف میری ذات کی وجہ سے کس قدر دکھی ہو رہے ہیں۔۔۔ کاش میں پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ مجھے آج احساس ہوا ہے کہ بیٹیاں والدین کے لئے مسئلہ کیوں بن جاتی ہیں اور بیٹیوں کی پیدائش پر لوگ غمزدہ کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس کا ذہن و دل عجیب و غریب کیفیتوں سے گزر رہے تھے اور وہ اپنے خیالوں میں اسقدر غرق تھی کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ شیراز کافی دیر سے اس کے سامنے بیٹھا اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا ہے۔ جب بہت دیر تک بھی وہ اس کی موجودگی کو محسوس نہ کر سکی تو شیراز نے آہستہ سے کھانس کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ چونکی۔ اسے اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر اور بھی بے ترتیب سی ہو گئی۔

"چائے ملے گی؟" روشن اور زندگی سے بھرپور وہ آنکھیں اس کے اردگرد احاطہ کرنے لگیں تو وہ نظریں جھکا کر تیز تیز پلکیں جھپکنے لگی جیسے خود کو سنبھال رہی ہو۔

"کچھ پریشان سی نظر آتی ہیں آپ۔" وہ اس کے چہرے کے مایوس تاثرات کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" ربیطہ نے چائے بنا کر اس کے سامنے رکھی اور کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہیں؟" وہ ایک دم سے تم سے آپ پر اتر آیا۔

"کمرے میں۔" اس کی آواز میں ضبطِ گریہ کی کپکپاہٹ شامل تھی۔

"بیٹھ جایئے!" اس نے بڑے عجیب انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی۔" وہ صرف اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ جو کبھی بے حد اپنائیت سے اسے بلاتا اور کبھی ایک دم تکلف پر اتر آتا۔

"بیٹھ جایئے نا۔ میں آپ کو کھا تو نہیں جاؤں گا۔" شیراز نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو وہ اپنی درہم برہم ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"کوئی بات ضرور ہے۔" وہ چائے پیتے ہوئے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے اپنے سینے میں اٹھتی درد کی لہروں کو دبا کر بڑی متانت سے جواب دیا۔

"ربیطہ میں آپ کی نگاہ میں کیسا بھی سہی۔ لیکن پریشان چہروں کی کیفیت کو خوب سمجھتا ہوں۔ کیا آپ کچھ بتانا پسند کریں گی؟"

"کیا بتاؤں۔" اپنی بے بسی کا اظہار وہ اس کے سامنے کسی صورت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر باوجود ضبط کے اس آنکھیں بھیگ گئیں۔ شاید وہ اپنے آنسو روک نہیں ناکام ہو گئی تھی۔ پھر اس سے وہاں بیٹھا نہ گیا۔ وہ بجلی کی تیزی سے اٹھ کر کمرے میں آئی اور نیم جان سی کرسی پر گر گئی۔ پل ہی پل میں جل تھل ہو گیا اور آنسو بند توڑ کر رخساروں پر بہنے لگے۔ اس کی تو ساری زندگی راحتوں اور شفقتوں کی چھاؤں میں گزری تھی۔ اسے ایک کڑی دھوپ کا اندازہ نہیں تھا جو قدم قدم پر اسے جلا اور تڑپا رہی تھی۔

ربیطہ کے اس انداز سے اٹھ کر جانے سے شیراز بھی ناشتہ کئے بغیر اٹھ گیا۔ اس کے دل پر عجیب بوجھ آن گرا تھا۔ اسے اچھی طرح احساس ہو چکا تھا کہ ربیطہ رات والی دعوت سے بری طرح کھٹک چکی ہے اور اب تو شیراز کے لئے سب پر اپنا آپ ظاہر کرنا بھی ایک مسئلہ لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ سلطان بیگ کو اعتماد میں لے کر اپنے متعلق سب کچھ بتا دے مگر پھر ایک خدشہ سا اس کا دامن تھام لیتا کہ کہیں سلطان بیگ کسی بداعتمادی کا شکار نہ ہو جائیں اور ان کے ذہن میں یہ بات نہ سما جائے کہ میں شادی کے بعد ہی ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہر طلوع ہونے والا سویرا اور غروب ہونے والا سورج ان کی بیقراری میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔

"خدایا تو ہی حالات کو کوئی موڑ دے۔ میں تھک گیا ہوں۔" اس نے ایک طویل سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا اور لان کو عبور کرتا ہوا۔ انیکسی کی جانب چلا آیا۔ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں بیٹھ کر اکثر اپنے بارے میں سوچتا کہ وہ یہاں کیوں اور کس لئے آیا تھا۔

دوسروں کو پل ہی پل میں تسخیر کر لیا کرتا تھا۔ آج اپنے دل کے ہاتھوں کتنا بے بس ہو رہا تھا۔
میں تو ربیطہ کو دیکھتے ہی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس کے بے پناہ حسن کے سامنے جھک گیا تھا۔
جیسے جنم جنم کی آشنائی ہو
جیسے وہ دل سے کبھی نکلی ہی نہ ہو۔۔۔ پھر ایسے حالات کیوں ہیں، اسے اپنے جذبوں کی بے ثباتی پر انتہائی افسوس ہو رہا تھا۔
آخر ایسا کیوں ہے۔
میری نیت میں کوئی فتور نہیں۔
کردار میں کوئی جھول نہیں
جذبۂ عشق میں کوئی کمی نہیں۔ پھر ربیطہ مجھ سے اس قدر بدظن اور دور کیوں ہے۔ ہر وقت کھوئی کھوئی اور ویران کیوں رہتی ہے
میرے اتنے کھرے جذبے کو محسوس کیوں نہیں کرتی۔
جبکہ میرا عشق آسمانی وسعتوں کی طرح وسیع
سمندر کی گہرائیوں کی طرح گہرا۔
اور گھنے جنگلوں کی طرح پرسکون ہے۔
وہ آنکھیں موندے خیالوں کی دنیا میں مگن تھا کہ دفعتاً رحیم بابا کی آواز سے چونک گیا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ بڑی ناگوار نظروں سے اس نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ کیوں آئے ہو
"شیراز میاں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" رحیم بابا اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر بولا۔
"ہاں، تم کیسے آئے ہو؟" اس وقت اس کی موجودگی اسے بے حد کھٹک رہی تھی۔
"بڑے صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔" رحیم بابا نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔
"تم چلو میں آتا ہوں۔" شیراز نے سخت بیزاری سے کہا۔ اور کپڑے بدل کر خود کو نارمل کرتا ہوا باہر آ گیا۔

وقت کے ظالم ہاتھوں نے ربیطہ پر ایسی ناگہانی افتاد توڑی تھی جس نے اسے بے حد مایوس کر کے رکھ دیا تھا۔ زندگی کا کٹھن اور آزمائشی دور شروع ہو چکا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا جو وہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی مجبوری اور بناوٹ سے بیزار ہو کر کبھی کبھی وہ ممی پاپا کے ساتھ بھی گستاخی کر جاتی جس کا بعد میں اسے بے حد پچھتاوا ہوتا۔ ممی اور پاپا کے بار بار سمجھانے کے بعد اس نے اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ تو دیا تھا۔ مگر ذہنی طور پر وہ بالکل مفلوج ہوتی جا رہی تھی
شیراز کی موجودگی۔۔۔ اور ہر وقت کے ساتھ نے اسے ایک عجیب سے خلفشار میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ جب سے اس کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی
وہ کچھ اور ہی ہو گیا تھا
بلکہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔۔۔ اعلیٰ لباس، خوبصورت اور پروقار انداز۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتی سنتی آنکھیں۔ جیسے وہ کبھی ڈرائیور تھا ہی نہیں۔ ربیطہ کی قدم قدم پر یہی کوشش ہوتی کہ وہ اسے نظر انداز کرے۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا کرنے کے باوجود بھی اس کا خیال ایک پریشانی کی صورت میں اس کے اعصاب پر سوار رہتا۔
شیراز کی پراسرار شخصیت اس کی سمجھ سے بالاتر تو تھی۔۔۔۔ مگر اسے اتنا احساس ضرور ہو چکا تھا کہ اس نے کسی خاص مقصد، بات یا جذبے کے تحت پاپا کی بات مانی ہے۔ اور وہ مقصد۔ بات۔ یا جذبہ کونسا تھا اس کے متعلق وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ اور یہی بات یہی ایک احساس اسے مارے ڈال رہا تھا۔
اگر شیراز کچھ اور نکلا تو پھر—؟ یہی سوچ اس کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنتی جا رہی تھی
ہر دن۔ بے چین تھا۔
ہر رات سوچوں کے ویران جنگل میں بھٹکتے گزر رہی تھی۔ ممی اور پاپا نے کئی بار اسے یونیورسٹی جانے کے بارے میں کہا بلکہ مجبور بھی کیا کہ وہ بالکل نارمل زندگی گزارے اور اس وقتی شادی کو کوئی اہمیت نہ دے مگر وہ خود کو ذہنی طور پر یونیورسٹی جانے کے لئے تیار

نہ کر سکی اور تمام مصروفیات سے الگ ہو کر سارا دن۔۔ کھوئی کھوئی سی بے مقصد کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح پورے گھر میں گھومتی رہی۔
اس دن وہ ابھی بیڈ پہ ہی گزر جانے والے حالات اور آنے والے حالات اور آنے والے واقعات کے متعلق سوچ رہی تھی کہ بوا ناشتے کے لئے بلانے آگئیں۔

"تم چلو میں آتی ہوں۔" وہ بے دلی سے اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پہ پانی کے چھینٹے مار کر باہر نکلی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر غور سے اپنا جائزہ لینے لگی۔

بکھرے بال۔ سوجی ہوئی آنکھیں۔

کیا یہ ربیعہ سلطان کا چہرہ ہے جو اپنی خوبصورتی، لیاقت، امارت کے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھا کرتی تھی اور ہر بات میں اپنی منوایا کرتی تھی۔ کیا خبر تھی کہ تقدیر کے ایک ہی جھٹکے میں یوں بکھر جائے گی۔ کہ خود کو سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

"اوہ خدایا۔ میں کیا تھی اور کیا ہو گئی ہوں۔"

اس نے اپنے پریشان بالوں کو درست کرتے ہوئے سوچا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔

کوریڈور سے گزرتے ہوئے اس نے فون کی آواز سنی تو رک گئی۔

"ہیلو۔ کون؟"

"ربیعہ۔ میں ہوں ثمی۔"

"ارے ثمی تم کہاں سے بول رہی ہو۔ لندن سے کب لوٹی ہو؟" ربیعہ خوشی سے بولی

"سب کچھ بتا دوں گی مگر فون پر نہیں۔ آج کل احمد کی پوسٹنگ مری میں ہے اور میں ادھر سے ہی بول رہی ہوں۔"

"میرے پاس کیوں نہیں آئی؟"

"تم مجھ سے کوئی گلہ نہ کرو۔ اگر ناشتے سے فارغ ہو گئی ہو تو فوراً اپنے دولہا کے ساتھ مری کا رُخ کرو۔ باقی تمام باتیں ملنے پر ہوں گی"

اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لئے تو ربیعہ پتھر سی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے اپنے متعلق کیا کہے

"بھئی کس سوچ میں کھو گئی ہو۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ مجھے تمہاری شادی کی اطلاع مل چکی ہے۔ بس تم ابھی اور اسی وقت روانہ ہو جاؤ۔ سچ میں تم سے ملنے اور باتیں کرنے کے لئے بہت بے چین ہوں۔ اور ہاں۔ تمہارے وہ کیسے ہیں؟" ثمینہ نے پوچھا۔

تو ربیعہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اس وقت اس کا دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ وہ اسے تمام باتیں بتا دے تاکہ اور کچھ نہیں تو اس کے دل کا بڑھتا ہوا بوجھ ہی کم ہو۔

"ربیعہ کیا بات ہے؟ یہ تم بار بار گم کیوں ہو جاتی ہو۔ جواب تو دو نا۔"

"کیا جواب دوں؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟"

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا؟"

"پلیز ربیعہ جلدی سے آ جاؤ پھر باتیں کریں گے۔ ایمان سے میں خود آتی۔۔۔ مگر ڈاکٹر نے سفر کرنے کا بالکل منع کر رکھا ہے۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔" ربیعہ نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں تو پھر آ رہی ہو نا؟"

"کیسے آؤں ڈیئر؟"

"کیوں گاڑی نہیں ہے۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔" وہ اپنی بات ثمی کو سمجھا نہیں پا رہی تھی۔

"بھئی یہ تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔ میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتی۔ سچ یہاں کا موسم بے حد اچھا ہو رہا ہے۔ برفباری ہو رہی ہے۔ تم دونوں خوب انجوائے کرو گے۔ بے شک شام کو لوٹ جانا مگر خدا کے لئے ابھی آ جاؤ۔"

"ثمی پلیز میری بات تو سنو۔"

"نو۔ ناٹ ابٹ آل۔" ثمینہ نے اپنا مکمل پتہ اسے سمجھا کر جلدی سے فون بند کر دیا۔ اور ربیعہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے حیران پریشان

کھڑی رہ گئی۔
"کیا بات ہے بیٹی۔ کس کا فون تھا؟" ماں کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر وہ خاموش نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔
"کہاں سے فون آیا تھا۔ کیا نیروبی سے کال تھی؟" ممتاز بیگم کا دل ڈوب گیا۔
"نہیں ممی میری دوست ثمن کا فون تھا۔" وہ فون کے قریب بڑی ایزی چیئر پر یوں دراز ہو گئی جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔
"اچھا ثمی کا فون تھا۔ کہاں سے بول رہی تھی؟" ممتاز بیگم نے اطمینان کا سانس لیا۔
"وہ آجکل مری میں ہے۔"
"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم کیوں بور ہو رہی ہو؟"
"ممی ثمینہ میری شادی کی خبر سن چکی ہے۔ اور اس نے ابھی ابھی مجھے شیراز کے ساتھ مری آنے کے لئے کہا ہے۔"
"بس اتنی سی بات پر ہماری بیٹی ہراساں ہو رہی ہے۔ تم تیاری کرو۔ میں شیراز کو جا کر اطلاع کر دیتی ہوں۔"
"جی۔ میں شیراز کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔" وہ اضطراب سے بولی۔
"کیوں؟"
"بس ممی جتنا ہو گیا کافی ہے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"
"مگر ڈرائیور تو تمہارے پاپا کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔"
"کوئی بات نہیں میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔"
"ربطہ آخر بات کیا ہے۔ تم شیراز کے وجود سے اس قدر الرجک کیوں ہو؟ کیا اس نے تم سے کچھ کہا ہے؟"
"کہنے کی بات چھوڑیں ممی۔۔۔ میں بناوٹوں سے تنگ آ چکی ہوں۔ جھوٹ کے سہارے چلتے چلتے تھک چکی ہوں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تم اس موسم میں تنہا کیسے جاؤ گی؟"
"چلی جاؤں گی۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔"
"ربطہ۔ اپنی ممی کے صبر کو اور نہ آزماؤ۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔" ممتاز بیگم نے اتنے درد بھرے لہجے میں کہا کہ ربطہ پشیمان سی ہو گئی۔
"خدارا ممی۔۔۔ آپ یوں نہ کہیئے۔" وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔
"پھر تم میری بات کیوں نہیں مانتیں۔" ممتاز بیگم نے چھلکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"مانوں گی ممی۔۔۔ مگر آپ آج ایک بات تو بتایئے۔" وہ تھوڑا مسکرائی۔
"کیا بات؟"
"شیراز آپ کو بہت اچھا لگتا ہے؟ جو آپ نے بغیر سوچے سمجھے مجھے اس کے سپرد کر رکھا ہے۔"
"پگلی۔۔۔ اچھے بُرے کی بات نہیں۔۔۔۔ اس نے جس نازک اور مشکل مرحلے میں تمہارے پاپا کی بات مانی ہے یہیں تو اس کا پاس ہے۔۔۔۔ ذرا سوچو تو اتنا عظیم کون ہوتا ہے جو اپنی اچھی بھلی آزاد زندگی کو محض چند دنوں کے لئے کسی کی خاطر پابند کرے اور پھر مضبوط قدم بھی رہے۔۔۔ جبکہ وہ ایک بھرپور جوان آدمی بھی ہے۔"
"ممی آپ یقین کریں نہ کریں مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گی کہ اس نے پاپا کی بات کسی خاص مقصد کے تحت مانی ہے۔۔۔ اور وہ مقصد کیا ہے یہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں سمجھ پایا۔"
"تمہیں تو وہم ہو گیا ہے۔۔۔ ہر بات میں اس غریب پر شک کرتی رہتی ہو۔" ممی نے برہم نظروں سے اس کی طرف دیکھا
"اوہ ممی پلیز ناراض نہ ہویئے۔" وہ دل پر جبر کر کے مسکرائی۔
"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔۔۔۔ تم تیاری کرو۔۔۔۔ میں شیراز کی طرف جاتی ہوں۔" ممتاز بیگم اسے پیار کرتے ہوئے مڑ کر چلی گئیں۔
تھوڑی دیر تو ربطہ وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ پھر دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے تیار ہونے کے لئے واپس کمرے میں آ گئی۔
میں ثمی کو تمام حالات بتا کر مدد چاہوں گی۔ شاید وہ کوئی بہتر حل بتا دے۔ اس نے لباس بدلتے ہوئے سوچا۔ "مگر یہ نیروبی والے آخر اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں۔" وہ بڑبڑائی اور اپنا بیگ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ بوا کو چائے کے بارے میں کہہ کر وہ ابھی بیٹھی تھی

کہ ممتاز بیگم بھی آگئیں۔

"تم ناشتہ کر کے جلدی سے جاؤ۔ وہ لاؤنج میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

ممتاز بیگم بے پناہ شفقت سے اس کے سر پہ چپت لگاتے ہوئے دوسری طرف چلی گئیں.... تو ربیطہ سب کچھ بھول بھال کر پھر سوچوں کے سمندر میں اتر گئی۔

نہ جانے کیوں جب سے شیراز کے ساتھ شادی کا ڈھونگ رچایا تھا وہ اس سے کافی جھجک سی محسوس کرنے لگی تھی۔ پہلے تو وہ اسے بے دھڑک ڈانٹ دیا کرتی تھی۔ مگر اب تو اس کے انداز دیکھتے ہی ایک عجیب کیفیت اس پہ طاری ہو جاتی۔ اسلئے اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ وہ اسکے سامنے نہ آئے۔ مگر حالات ہر بار اسے اس کا ساتھ دینے پہ مجبور کرتے اور وہ بڑی کوششوں سے نارمل ہو کر اس کا ساتھ دیتی۔

"ارے بیٹی جائیے نو پڑے پڑے بج ہوگئی اور آپ ابھی تک یونہی بیٹھی ہیں۔ بوا نے کہا۔

"بس بوا طبیعت نہیں چاہ رہی۔ تم برتن اٹھالو۔" وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے لاؤنج کی جانب چلی آئی۔

دروازے پر آکر وہ پھر اسی کیفیت میں مبتلا ہوگئی۔ "ربیطہ تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو۔ یہ تو وہی شیراز ہے جو کبھی تمہارا ڈرا سہما رہتا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سمجھایا۔ سر جھٹک کر آگے بڑھی۔ لاؤنج اور ڈرائننگ روم کے درمیان موتیوں سے آراستہ پردے کو ہٹاتے ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

وہ دیوان پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا۔

قدموں کی آہٹ پر اس نے نظریں اوپر کیں۔ ربیطہ اپنی تمامتر خوبصورتیوں سمیت اس کے سامنے کھڑی تھی۔

شیراز دل تھام کر رہ گیا اور ایک مسحور کر دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ زیادہ ہی گھبراگئی اور اس کی والہانہ نظروں سے بچنے کے لئے جلدی سے میز پر رکھے ہوئے رسالوں پہ جھک گئی۔ شیراز کے لبوں پہ مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

شیراز نے میز سے سگریٹ اٹھا کر سلگایا اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

یہی تو وہ واحد لڑکی تھی

اس کے دل میں جس کی چاہت جاگی تھی۔

جس کے حسن نے ایک لمحے میں ہی اس کی ہستی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا ورنہ وہ تو بڑی مضبوط اور پتھریلی طبیعت کا سرکش انسان تھا۔ کبھی کسی کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا تھا۔ لیکن ربیطہ کے بے انتہا حسن اور اپنے دل کے ہاتھوں کچھ اس انداز سے لٹا کہ کچھ سوچ ہی نہ سکا۔ اور آج حالات اسے ایک ایسی منزل پہ لے آئے تھے کہ وہ خود کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ لگاتار اس کی طرف تکتا جا رہا تھا اور ربیطہ جو بظاہر رسالوں پہ جھکی تھی اس کی طوفانی آنکھوں کی تپش سے پگھلی جا رہی تھی۔ جب کئی لمحوں تک بھی شیراز کچھ نہ بولا تو وہ جھنجلا کر باہر جانے کے لئے مڑی۔

"ارے سنیئے تو کہاں جا رہی ہیں؟" وہ نہایت دلآویزی سے اس کے سامنے آکر رک گیا۔

"بہت دیر ہوگئی ہے میرے خیال میں چلنا چاہیئے۔"

"چلیئے!" وہ اپنی آنکھوں میں شوقِ وابستگی لئے ایک دم ہی اس کی طرف آگیا۔ وہ رسالہ رکھ کر سیدھی ہوئی تو اس کی گرم سانسوں کا لمس ربیطہ کے سینے پر تڑپنے لگا۔

"اوہ... !" وہ تیزی سے مڑ کر باہر نکل گئی۔ تو شیراز بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ وہ گاڑی سے ٹیک لگائے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ ساڑھی کا پلو سینے سے کھسک کر زمین پر جھول رہا تھا اور سنہری دھوپ میں اس کی گلابی رنگت بے حد دمک رہی تھی۔

اور وہ کئی منٹ پورٹیکو کے آخری سرے پر کھڑا بے قراری سے اسے تکتا رہا۔ اس کے سامنے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ بڑی روانی سے بہہ رہا تھا اور وہ کنارے پر تشنگی کا احساس لئے تڑپ رہا تھا۔ میرے خدا... مجھے علم نہیں تھا کہ مجھے ایک بہت بڑے آزمائشی دور سے گزرنا پڑے گا۔" شیراز نے سوچا اور آگے بڑھ آیا۔ چاروں طرف اڑتی ہوئی ہوا کے خنک جھونکے بھی اس کے من میں آگ سی بھڑکا رہے تھے۔

ربیطہ نے رخ موڑ کر ایک نظر شیراز کی طرف دیکھا اور پھر ساڑھی کا پلو برابر کرتی ہوئی اس کی نگاہوں کی زد سے بچنے کے لئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تب وہ بھی دل میں اٹھتے سرکش جذبوں کو سمجھاتا ہوا اس کے برابر آکر بیٹھ گیا۔

ابھی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ ممتاز بیگم باہر آ گئیں

"شیراز... شام کو تم لوگ ضرور آ جانا۔"

"جی بہتر۔" شیراز نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی کو ریورس کیا اور تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ جب کافی راستہ کٹ گیا تو اس نے اپنے آپ کو بے حد اکسا یٹیڈ محسوس کرتے ہوئے نظر اٹھا کر ربیطہ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی یوں جیسے بالکل انجان ہو۔

"ربیطہ..." شیراز نے گاڑی کی رفتار مدھم کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں اسے پکارا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان کتنا بے بس ہے۔ بعض اوقات کچھ نعمتیں اس کی ہو کر بھی اس کے نصیب میں نہیں ہوتیں۔"

معلوم نہیں شیراز کس خیال میں بول اٹھا... مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا... بس چپ چاپ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی۔ اب وہ اتنی بے خبر اور انجان بھی نہیں تھی کہ اس کی نظروں کا جذباتی انداز اور باتوں کا مفہوم نہ سمجھ سکتی۔ مگر چونکہ یہ بات اس کے ذہن میں گھر کر چکی تھی کہ شیراز کا ساتھ محض وقتی ہے اور ویسے بھی شیراز کی شخصیت سے وہ شروع سے کھنک چکی تھی اس لئے اس کی باتوں اور حرکتوں سے اکثر پریشان ہو جایا کرتی اور خود کو بے حد لئے دیئے رکھتی۔ بلکہ کسی معاملے میں بھی اس کی ذات کو اہمیت نہ دیتی تاکہ وہ بھی اس کے متعلق کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو سکے۔ مگر وہ بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ موقع ملتے ہی ایسی ایسی باتیں اور حرکتیں کر جاتا کہ ربیطہ کچھ کہہ ہی سکتی اور خود پر جبر کئے اندر ہی اندر کھولتی رہتی۔

اسلام آباد ختم ہوتے ہی چھوٹے چھوٹے پہاڑی علاقوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ موسم خنک ہونے کے باوجود نظروں کو بے حد اپیل کر رہا تھا۔

شیراز کو ایکدم لندن کا موسم یاد آ گیا

سہانے دن

دوستوں کی جاندار محفلیں۔ بابا جان کی شفقت اور بی بی گل کی یادیں۔ انسان... کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کہاں کہاں جاتا ہے اور کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سوچوں کے سمندر میں ڈوب اور ابھر رہا تھا

وہ کھڑکی سے باہر اڑتے ہوئے سرمئی بادلوں اور زمین پر بچھی ہوئی سفید برف کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ ان دو رنگوں کے امتزاج نے ہر طرف تازگی سی پھیلا رکھی تھی۔ سٹی بینک کے قریب جا کر گاڑی رک گئی۔ پچھلی رات کافی برفباری ہوئی تھی اس لئے آگے جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

"آگے راستہ بلاک ہے۔ پیدل جانا پڑے گا۔" شیراز نے گاڑی کو ایک طرف پارک کر کے ربیطہ کی طرف دیکھا۔

"ابھی تو کافی راستہ ہے اتنی دور پیدل کیسے جائیں گے۔" ربیطہ قدرے پریشان ہو کر بولی

"جانا کہاں ہے؟"

"کشمیر پوائنٹ۔"

"اوہ مائی گاڈ! یہ تو واقعی بہت دور ہے۔ خیر اگر لگن سچی ہو تو انسان منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔" شیراز نے ہول سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

گاڑیاں۔ بسیں ایک طرف روک دی گئی تھیں۔ برف باری کے شوقین لوگ گرم کپڑوں اور رنگ برنگی ٹوپیوں میں ملبوس سفید برف پر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر اسٹوڈنٹ تھے یا پھر نوبیاہتا جوڑے۔ شیراز نے سگریٹ سلگایا اور اپنے قریب سے گزرتے ہوئے ایک کپل کو دیکھنے لگا۔ گوٹے کناری سے بھرا ہوا اس کا لباس برف کو چھو رہا تھا مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز اپنے ساتھی کی باہوں کا سہارا لئے چلتی جا رہی تھی۔ مرد کے چہرے پر جذبات کے رنگ تھے اور عورت حیا کی سرخیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔

"بہت خوب۔" وہ مسکرایا اور گھوم کر ربیطہ کی کھڑکی کی طرف آ گیا۔

"اب کیا سوچا جا رہا ہے۔ باہر نکل کر دنیا کے رنگ دیکھو۔" اس نے بے تکلفی سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"کافی سردی ہے۔ آپ اپنی شال لے لیں۔" اس نے سیٹ پر پڑی اس کی شال اٹھائی اور بڑی اپنائیت سے اسکے کندھوں پر ڈال دی۔

"میرا خیال ہے ہمیں واپس چلے جانا چاہیئے۔ ایک تو موسم بہت خراب ہو رہا ہے اور پھر شمی کا گھر بھی یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ اگر ہم پہنچ بھی گئے تو شام تک واپسی نہ ہو سکے گی۔" ربیطہ نے کہا۔

"منزل پر پہنچے بغیر واپس جانا راہی کی توہین ہے۔" وہ مسکرایا۔

"فضول ضد کرنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھتے نہیں کتنے بادل آ رہے ہیں۔" وہ تھوڑا تلخ ہو گئی۔

"تو کیا ہوا۔

بادلوں کا تو کام ہی آنا ہے۔ آئیں گے، برسیں گے، گزر جائیں گے۔" شیراز نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور گاڑی روک دی۔ لوگ برف کی پروا کیے بغیر ٹولیوں کی صورت میں ہنستے مسکراتے اوپر کی جانب جا رہے تھے۔

"آپ چلیں بھی۔ سب لوگ جا رہے ہیں۔ آخر آپ کو اس قدر گھبراہٹ کیوں ہے؟"

"اوہ۔ بہت ضدی ہیں آپ۔" وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"آج پتہ چلا۔" وہ ربیطہ کی آنکھوں میں اپنے مخصوص انداز میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ اس لمحے اس کی نگاہوں کے رنگ اتنے تیز اور واضح تھے کہ ربیطہ کی نظریں لڑکھڑا کر جھک گئیں۔

دونوں آہستہ آہستہ قدموں سے اوپر کی جانب جا رہے تھے۔

"اُف خدایا... اس شمی کی بچی نے تو مروا دیا۔" وہ ریلنگ سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ سردی کی شدت سے اس کے رخسار بے حد سرخ ہو رہے تھے۔ اور... دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہر سو بکھری برف میں ربیطہ کا گلابی ساڑھی میں لپٹا سراپا نظروں کو بہت بھا رہا تھا۔

"شیراز۔ اب بھی واپس چلے چلتے ہیں۔" وہ پلکیں دبا کر بولی۔

"جی نہیں۔ راستوں سے واپس جانا میرا منشور نہیں۔ میں تو منزل پر پہنچ کر ہی دم لوں گا۔"

"وہ میری دوست کا گھر ہے آپ کی منزل نہیں۔"

"میں بھی آپ کی دوست کے گھر کی بات نہیں کر رہا۔ اپنی منزل کے متعلق کہہ رہا ہوں۔"

"فضول باتیں مت کریں۔ یہاں کدھر ہے آپ کی منزل؟" وہ بولی۔

"میری منزل تو ہمیشہ سے ہی میرے ساتھ رہی ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ تقدیر نے کچھ فاصلے پیدا کر دیئے۔"

"شیراز۔" وہ ایکدم غصے میں آ گئی۔

"جی حکم..." وہی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں کی ناقابل برداشت چمک۔ اس کا دل اندر ہی اندر کسی نامعلوم اندیشے سے لرزنے لگا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ بس خود کو سنبھالتی ہوئی دو قدم آگے بڑھ گئی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی شیراز سے بحث کرنا آسان نہیں۔

ابھی وہ مال تک ہی پہنچے تھے کہ برف کی پھوار سی پڑنے لگی۔ ایکدم بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مال پر بکھرے تمام لوگ غائب ہو گئے۔ وہ بھی ربیطہ کو لے کر تقریباً بھاگتا ہوا قریبی ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔

اندر مہکتے ہنگامے اور معطر خوشبوؤں کے ساتھ احساس کو بالیدگی بخشنے والی نرم نرم گرمی کے جھونکے بڑے دل فروز لگ رہے تھے۔

"حنا" کی مدیرہ رضیہ جمیل کا

نیا ناول

آنگن کا چاند

چھپ کر تیار ہے

قیمت: ۲۴ روپے

خیام پبلشرز
چوک اردو بازار لاہور

وہ دونوں کونے والی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ ربیطہ نے بیگ کو میز پر رکھ کر کندھوں سے شال اتاری اور برف کے ننھے منے ذرے جھاڑ کر اسے کرسی کی پشت پر پھیلا دیا۔ پھر اپنے بھیگے پاؤں کو دیکھا۔ نیچے جھک کر سینڈل کے اسٹریپ کھولے اور میز سے ٹشو پیپر اٹھا کر انہیں صاف کرنے لگی۔ شیراز نے اس کی کمر کے خوبصورت خم کو دیکھتے ہوئے نیچے نگاہ کی۔ اس کے مرمریں پاؤں پر سجی گلابی نیل پالش بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سرتاپا جیسے خوبصورتی اس پر ٹوٹ پڑی تھی۔ جو اس جیسے حسن پرست کو پاگل کر دینے کے لئے کافی تھی۔ اس کا ایمان رہ رہ کر ڈولتا۔ ربیطہ جب سنبھل کر سیدھی ہوئی تو شیراز کو یوں اپنی طرف متوجہ پا کر ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ گرم ہو گیا اور لویں جلنے لگیں۔ اس نے رُخ بدل کر شیشوں کے پار دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر طرف برف کے ننھے منے گالے جیسے مستی میں رقص کر رہے تھے اور تمام فضا دھندلی دھندلی سی ہو رہی تھی ـــــ وہ بظاہر تو باہر دیکھ رہی تھی مگر اسکے اندر ایک عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔

موسم۔ تنہائی اور شیراز کی بے باک نظریں اسے خاصا ڈسٹرب کر رہی تھیں۔

وہ باہر دیکھ رہی تھی۔

اور وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہی ایک ناقابلِ بیان کیفیت سے دوچار تھے۔ اور پھر قدرت نے بھی تو مرد اور عورت کے درمیان ایک زبردست فطری کشش رکھی ہوئی ہے۔ اور اس کشش کو ابھارنے کے لئے بعض اوقات قدرت کے دلفریب نظارے بڑا اثر کرتے ہیں بلکہ انسان کو دیوانہ سا کر دیتے ہیں۔ بس یہی کچھ حال اس وقت شیراز کا ہو رہا تھا۔ اس کے دل کی موجوں میں اتنا شدید طوفان اٹھ رہا تھا کہ خدا کی پناہ۔ اسنے اپنے بپھرے ہوئے جذبات کو دباتے ہوئے اپنے دل کی سرکشی پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

جب تھوڑی دیر بعد وہ کافی پی کر فارغ ہوئے تو باہر کی فضا کافی بہتر ہو چکی تھی۔ بادل پھٹ چکے تھے۔ اور ہلکی ہلکی سنہری دھوپ برفانی پہاڑوں پر سونا پگھلانے لگی تھی۔

"چلیں" وہ میز سے لائٹر اٹھا کر ایکدم اٹھا تو ربیطہ کندھوں پر شال اوڑھتی ہوئی اسکے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

سڑک کے ارد گرد برف کے ڈھیر تھے۔ تاہم درمیانی حصّہ صاف کر دیا گیا تھا۔ لوگ جوق در جوق پھر مال پر نکل آئے تھے۔ رنگین ملبوسات خوبصورت مسکراہٹیں۔ ایک دوسرے کی چھیڑ چھاڑ۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تمام رنگ اور ساری خوشیاں ادھر ہی رک گئیں۔ مال سے ہوتے ہوئے جب وہ کشمیر پوائنٹ کی طرف گئے تو سرکش دنوں نے سورج کو پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا اور خنک ہوائیں بدن کے اندر اترنے لگیں۔

"ابھی اور کتنی دور جانا ہے؟"

"وہ سامنے" ربیطہ نے ہاتھ اٹھا کر قدرے بلندی پر واقع ایک کاٹج کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ۔ اتنی اوپر" اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور اپنی پتلون کو اونچا کرتے ہوئے بلندی کی طرف جانے لگا۔ کیونکہ ننھی منی سیڑھیوں پر برف کی ایک تہہ سی جمی ہوئی تھی۔ ربیطہ بھی اپنی ساڑھی کو سنبھالتی ہوئی اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ابھی تھوڑا راستہ ہی طے ہوا تھا کہ ربیطہ کی ہلکی سی چیخ نے شیراز کے پاؤں روک لیے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ربیطہ ڈھلوان کی طرف گر رہی تھی۔

وہ بجلی کی تیزی سے پلٹا۔۔۔ اور پیشتر اس کے کہ اسے اِس واقعے کی اہمیت کا احساس ہو وہ اسکے مضبوط بازوؤں میں تھی۔۔۔۔۔۔

وقت تھم گیا تھا

کہ وہ پھر سانس لینا بھول گئی تھی۔۔۔ ربیطہ کے حواس جب قابو میں آئے تو وہ اسکے بازوؤں کے حصار سے فوراً الگ ہو گئی۔۔۔۔۔

کسی مرد سے اتنا قریب ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ اپنی بے قابو ہوتی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بے چینی سے ہاتھوں کو مسل رہی تھی۔ احساسات کی دنیا میں زلزلہ سا آ رہا تھا اور اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔۔۔ جبکہ شیراز کو کچھ کہنا تو ایک طرف وہ اس کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں پا رہی تھی۔

"معاف کرنا ربیطہ۔۔۔۔ ایسا ہو جانے میں میری نیت کا کوئی دخل نہ تھا"

مگر اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خود کو سنبھالا اور ایک ساتھ کئی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر جا کر غائب ہو گئی۔

(ناول "گرفتارِ وفا" جاری ہے۔ پانچویں قسط اپریل کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

میں کبھی نہ بھولوں گی

لاپرواہی

پچھلے دنوں کا واقعہ ہے کہ ہمارے پڑوس میں ایک لڑکی کے پیٹ میں درد ہوا ماں باپ بہت غریب تھے مگر پھر بھی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گئے ڈاکٹر نے یہ کہہ دیا کہ وقت ختم ہوگیا کل آنا لیکن لڑکی کے باپ نے ڈاکٹر کی بہت منت کی کہ بہت دور سے آتے ہیں لڑکی کی حالت بہت خراب ہے ماں بھی رونے لگی تو ڈاکٹر نے مجبوراً چیک اپ کیا اور کہا کہ اسے خوب سوڈے کی بوتلیں پلائیں اور ایک..... EXTRA دیا کہ دو گھنٹے بعد دیں۔ والدین نے خوب سوڈے کی بوتلیں پلائیں اور EXTRA دو گھنٹے کی بجائے دو چمچے پلا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی کا پیٹ اور انتڑیاں تیز دوائی اور بوتلوں سے کٹ گیا پیٹ میں خون ہی خون ہوگیا وہ لوگ اپنی جوان لڑکی کو فوراً ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

لیکن خدمت خلق کرنے والے ڈاکٹروں کا رویہ تو دیکھیں۔ کہنے لگے پہلے تم دو ہزار دو تو لڑکی کو داخل کرکے آپریشن کریں گے وہ غریب لوگ تھے جوان اور اکلوتی لڑکی کی جان کی خاطر قرض مانگ مانگ کر پیسے اکٹھے کئے اور ڈاکٹر کو دے دیتے ڈاکٹروں نے لاپرواہی سے لڑکی کا پیٹ کاٹ ڈالا اور ٹھیک علاج بھی نہ کیا کھانے پینے پر سخت پابندی لگا دی لڑکی بھوکی پیاسی پڑی رہی اور بہت تکلیف کی وجہ سے لڑکی نے تڑپ تڑپ کے جان... دے دی مرتے وقت وہ پانی پانی کہتی رہی مگر ڈاکٹر نے پانی نہ دیا یہ واقعہ میں تا زندگی فراموش نہیں کرسکتی اور یہ سوچتی ہوں کہ قوم و ملک کی خدمت اسی کو کہتے ہیں کیا انسانیت کا تقاضہ یہی ہے۔

نزہت نفیس

بدحواسی میں

فیصل آباد کے ایک گھرانے میں ایک خاتون کے لڑکا پیدا ہوا لڑکا دس دن کا تھا زندگی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ ہمسایوں کے ہاں شادی ہوئی ایک بچے کو شہ بالا بنایا گیا ننھا معصوم بچہ دولہا بنا بہت خوبصورت لگ رہا تھا نجانے کس کی نظر لگی کہ بچہ کھیلنے نکلا اور واپس نہ آسکا ایک آئیل ٹینکر نے اس کا مغز سڑک پر بکھیر دیا شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا ہر طرف سے آہ و زاری کی آوازیں آ رہی تھیں اور زچہ سے برداشت نہ ہوسکا آخر ہمسایہ کا بچہ تھا اور بچہ بھی ایسا کہ جو دیکھے پیار کرے چلے کے تمام اصول توڑ کر ان کے گھر جا پہنچی۔ زیست کے ایک غمناک منظر کا نظارہ کرنے آہوں کا دھواں دیکھنے آنسوؤں کی جلتی تپش کی آنچ محسوس کرنے۔

زچگی کے ایام کے لئے اس نے بھانجی بلائی ہوئی تھی وہ تمام گھر کے کام خود کرتی تھی آج بھی اس نے تمام کپڑے جو دھونے والے تھے ایک چارپائی پر اکٹھے کر دیئے تھے۔ گھر کے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر وہ باہر برآمدے میں آئی خالہ ہمسائے کے بچے کو دیکھنے چلی گئی تھیں وہ سمجھی شاید بچے کو اپنے ہمراہ لے گئی ہیں اور چارپائی پر پڑے تمام کپڑے اٹھا کر واشنگ مشین میں ڈال دیئے تھوڑی ہی دیر میں اس کی خالہ آگئیں اور وہاں کی باتیں بتانے لگیں کچھ دیر بعد بچے کا خیال آیا مگر بچہ کہیں نہ ملا۔ الٰہی بچہ کہاں گیا ابھی تو یہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ نجانے جانور لے گیا یا آسمان نگل گیا یا زمین کھا گئی دس دن کا بچہ کہاں جا سکتا ہے گھر میں کسی کو داخل ہوتے بھی تو نہیں دیکھا سب ہی ذرا سی دیر میں پریشان ہوگئے۔

تب اس نے واشنگ مشین سے کپڑے نکالنے کے ارادے سے اسے کھولا تو پوری جان سے کانپ گئی۔

واشنگ مشین میں کپڑوں کے ساتھ گوشت اور ہڈیوں کا قیمہ موجود تھا۔

دس دن کا بچہ جس چارپائی پر پڑا تھا اس پر کپڑے پھینک پھینک کر اس نے بچے کو ڈھانپ دیا اور اسے جانے بغیر بچے سمیت تمام کپڑے واشنگ مشین میں ڈال دیئے۔

یہ واقعہ جب بھی یاد کرتی ہوں دل میں درد کی ایک لہر اٹھتی ہے اور گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔

فریدہ گوہر، ملتان

ہنسے اور پھنسے

گزرے ہوئے لمحات کا ایک ایسا ناقابل فراموش واقعہ ہے جو میں سنانے جا رہی ہوں ایک بار خوب مزا آیا ہوا یوں کہ ہم اپنے ایک عزیز کے ہاں چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے

بہت چھوٹی سی جگہ تھی۔ اُن کی لڑکیاں بھی ہم بہنوں کی ہم عمر ہی نہیں بلکہ ہم سب لوگوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا لہٰذا گاڑھی چھنتی تھی جب کبھی ہم سب مل کر بیٹھتے تو خوب محفلیں جما کرتیں رات گئے تک خوش گپیاں ہوتی رہتیں پرانی یادیں تازہ کی جاتیں خوب پروگرام بنتے سیر و تفریح کے اور پھر ایسے میں کچھ حماقتیں بھی سرزد ہوا کرتی تھیں اَب کے جو گئے تو شام کو انہوں نے کہا کہ چلو ہمارے ایک ملنے والی ہیں آج اُن کے یہاں چلتے ہیں چنانچہ صاحب ہم سب اپنی اپنی امیّوں کی زیرِ قیادت وہاں پہنچے مگر وہ کہتے ہیں ناکہ بعض لوگ میزبانی کے اصولوں سے سرے ہی سے ناواقف ہوتے ہیں دراصل اُن میں اس بات کا شاید کچھ پیدائشی ہی فقدان ہوتا ہوگا۔ ہم نے تو یہ ہی سُنا ہے۔ کہ پہلا تاثر آخری تاثر ہوتا ہے یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا گھر کے مکین خاصے آدم بیزار ٹائپ نکلے کسی نے رسمًا بھی بیٹھنے کو نہیں کہا خیر ہم لوگ خود ہی ایک مسہری پر جا بیٹھے اُن کی اَمّی اور ہماری امی دوسری مسہری پر تشریف فرما تھیں ہم سے کوئی بات کہنے والا نظر نہ آتا تھا لہٰذا خود ہی ہم لوگوں نے آپس میں باتیں شروع کر دیں نجانے کس بات پہ ہنسی آئی ہم میں سے کسی ایک نے زوردار قہقہہ لگایا غضب ہی تو ہو گیا اُس کے ساتھ ہی مسہری زوردار دھماکے سے پہلے تو چرچرائی اور پھر ہم سب سمیت زمین بوس ہوگئی۔ اِس اچانک افتاد سے ہم سب بوکھلا گئے پہلے تو کچھ پلے نہ پڑا پھر جب ذرا ہوش ٹھکانے آتے تو معلوم ہوا کہ مسہری تو داغِ مفارقت دے چکی ہے ایک ایک کر کے اپنے کپڑے جھاڑتے اور چوٹیں سہلاتے ہوئے نکلے دھماکہ کی آواز چرچراہٹے مکینوں پر بجلی بن کر گری تھی یا تو یہ حال تھا کہ کوئی پاس آکر پھٹکتا نہ تھا یا اب سب مسہری کو گھیرے سوگوار کھڑے تھے۔

گھر کی منتظمہ نے پہلے عتابی نظروں سے ہمیں گھورا پھر مسہری کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری اور پھر تیوری پہ بل ڈال کر گویا ہوئیں۔

"یہاں تو بڑھئی بھی مہنگا ہے بالکل نئی مسہری تھی۔" وغیرہ وغیرہ ہم سب مجرموں کی طرح سر جھکائے جائے واردات پر کھڑے تھے اِدھر اُن کی بڑبڑاہٹیں اُدھر ہماری ماؤں کی صلواتیں مزید شرمندہ کر رہی تھیں جب تک وہاں رہے وہ سب خواتین ہمیں کھا جانے والی نظروں سے مسلسل گھورتی رہیں اُن کے اس طرح گھورنے پر نجانے کیوں ہم سب کو ہنسی ضبط کرنا محال ہو رہی تھی قصّہ مختصر جیسے تیسے ملاقات کا وقت کٹا جل تو جلال تو کہا ورد کرتے ہوئے گھر کا رخ کیا گھر پہنچتے ہی سب نے خوب لتاڑا خیر جو ہوا سو ہوا اِس تلخ تجربہ کے بعد ہم سب لوگوں نے آئندہ کے لئے کان پکڑ لئے کہ پھر کبھی ایسے گھروں کا رُخ نہیں کریں گے آج بھی جب ہم سب لوگ جمع ہوتے ہیں تو اِس ناخوشگوار واقع کو یاد کر کے خوب ہنستے ہیں۔

ساجدہ جبیں وارثی، جھڈو

مجرم کون!

میں اور ماجدہ اپنی بڑی بہن خالدہ کے ساتھ اُن کے گھر جا رہے تھے ہم کھڑکی کے پاس بیٹھے کراچی کی عالی شان عمارتوں کو دیکھ کے محظوظ ہو رہے تھے۔ اور فخر کر رہے تھے کہ ہمارا ملک اور شہر کتنا خوبصورت ہے بس جب ناظم آباد سے گزری تو ایک حادثہ یاد آکر ہمارا فخر سے تنا ہوا سر ندامت سے جھک گیا جی ہاں اِس حسین شہر کے شہریوں پہ ندامت جیسے مجرم وہ نہیں میں ہوں۔

حادثہ کچھ یوں ہے کہ ہماری چچی اپنے گھر جا رہی تھیں بس جب ناظم آباد سے گزری تو اُن کا لڑکا پرویز جو ڈرائیور کی طرف بیٹھا تھا ڈرائیور کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے نیچے گر گیا پرویز کا نیچے گرنا تھا کہ چچی کے اوسان خطا ہو گئے وہ ڈرائیور سے چیخ چیخ کر بس رکواتی رہیں لیکن کیا مجال جو ڈرائیور بس کو روکے آخر کافی آگے جا کر اسٹاپ پہ بس رکی اب وہاں آنے کے لئے وہ کوئی سواری تلاش کر رہی تھیں لیکن کوئی سواری نہیں ملی آخر ایک رکشہ والا بڑی مشکل سے راضی ہوا اِدھر بچہ گرنے کی وجہ سے زخمی ہو گیا تھا اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور گاڑیاں گزر رہی تھیں لیکن کوئی ایسا نہ تھا جو اس کو اُٹھاتا آخر اِس میں ہی عقل آئی وہ چل تو نہیں سکتا تھا اس لئے کہ نیم بے ہوش تھا وہ بچہ سرکتا سرکتا فٹ پاتھ پہ آکر لیٹ گیا پورے کپڑے خون میں لت پت ہو گئے تھے آخر چچی رکشہ میں بیٹھ کر وہاں پہنچیں جہاں بچہ گرا تھا وہاں سے بچہ کو اُٹھایا اور ہسپتال لے کر گئیں وہاں پہ علاج ہوا بچہ تو ٹھیک ہو گیا لیکن دماغ کمزور ہے سر میں درد رہتا ہے کام کرتے کھیلتے کودتے وقت سر چکرا جاتا ہے۔ یہ حادثہ میں کبھی نہ بھول سکی۔

شاہدہ شبنم، کراچی

ترتیب: شگفتہ محمود

رنگا رنگ

کچھ شعر، لطیفے، واقعات، اقتباسات

کون کیا ہے

بس کنڈکٹر	آپ میرے ضبط کا لیں گے کہاں تک امتحان
میٹرنٹی ہوم	تیرے جہاں کی رونق بڑھا رہے ہیں ہم۔
سیاستدان	وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا۔
کے ایم سی	میرے جہاں کی یہ حالت کبھی ایسی تو نہ تھی۔
طالب علم	ایک لمحے کو ٹھہر میں تجھے پتھر لا دوں
جمعدار	جو کبھی نہ مل سکا اس کی شکایت کیسی
اورنگی ٹاؤن	اس راستے میں ایک سمندر بھی آئے گا۔
محبوبہ کا بھائی	دولتِ حُسن پہ دربان بٹھا رکھا ہے۔
رکشا ڈرائیور	اُن سے آیا نہ گیا ہم سے بلایا نہ گیا۔

رخشندہ اینڈ نجمہ محبوب، کراچی

خامیاں

نسیم اختر، کراچی

اِن کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی اور وہ ہنی مون منانے مری آئے ہوئے تھے وہ دِن بھر گھڑسواری کرتے ہوٹل میں کھانا کھاتے اور شام کو لمبی سیر پر نکل جاتے ...... اس دِن موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی اور وہ سیر پر نہ جا سکے جب سلمیٰ چائے کی ایک گرم پیالی لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو ارشد اخبار پڑھ رہا تھا اِس نے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی اور دوسرے میں دلہن کی کلائی تھامتے ہوئے کہا۔

" اِس وقت جب ہماری ازدواجی زندگی کا پہلا مہینہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں میں تمہیں تمہاری چند خامیوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم بُرا نہ مانو" سلمیٰ مسکرائی اور چارپائی کی پائنتی پر بیٹھتے ہوئے بولی "ہائے اِس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے میں اپنی خامیوں سے خوب واقف ہوں انہی کی وجہ سے تو مجھے ایک اچھا اور مثالی خاوند نہ مل سکا۔"

شعر

شہناز فاطمہ، کراچی

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

ضرورت رشتہ

ایک ماڈرن لڑکے کے لیئے فوری رشتہ درکار ہے لڑکا گزشتہ نصف صدی سے کالج میں تعلیم حاصل کر رہا ہے امید ہے چند سالوں تک گریجویٹ ہو جائے گا نصاب کی کتب سے بے حد متنفر ہے۔

جاسوسی اور رومانی ناولوں میں کافی دلچسپی رکھتا ہے اپنے اساتذہ کرام سے زیادہ انگریزی اداکاروں اور فلم ایکٹرسوں کو سمجھتا ہے خطرناک حد تک ماہرِ نفسیات ہے۔ اور دنیا و مافیہا کے ہر مسئلے پر اپنی مخصوص "تھیوری" رکھتا ہے مذہب کو خوب سمجھتا ہے یہاں تک کہ عربی تحریر کو دیکھ کر فوراً پہچان لیتا ہے کہ واقعی یہ عربی زبان ہے گھر یا کالج کی بجائے ہوٹل میں وقت گزارنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک بیوی "بچے پیدا کرنے کی مشین" باورچن یا دھوبن یا آیا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے جسے ہر بات پر تین طلاق دی جا سکتی ہے لڑکا خود کریہہ صورت ہے مگر لڑکی ضرور جنت کی حور ہو۔ سرکاری ملازمت میں سے صرف گورنری قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے مگر وہ میسر نہیں آ رہی رہا کاروبار تو اس کے لئے سرمایہ نہیں اِس لئے اُس کا پروگرام یہ ہے کہ ملکی سیاست میں حصہ لے کر جھٹ پٹ وزیر بن جائے۔

صرف ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو کہ والدین

کی واحد اولاد ہو اور والدین لاکھوں کروڑوں کی جائیداد چھوڑ کر عنقریب داغ مفارقت دینے والے ہوں۔
نوٹ۔ گو لڑکا مذہبی فرائض سے کتراتا ہے مگر چار شادیوں والے فلسفہ پر عمل درآمد کرے گا۔
معظم خان، ملتان

غیر معمولی بات

ایک شکاری رات کاٹنے کی غرض سے ایک ڈاک بنگلے میں داخل ہوا تو بنگلے کی ویرانی اور چوکیدار کے پراسرار وجود کو دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے چوکیدار سے پوچھا "جب کرے میں تم مجھے ٹھہرا رہے ہو وہاں کبھی کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہوئی؟" چوکیدار نے کہا۔
"تیس برس سے تو نہیں ہوئی" شکاری نے کہا "اور تیس برس پہلے کیا ہوا تھا؟" چوکیدار نے جواب دیا۔
"صرف یہ کہ جو صاحب رات کو اس کمرے میں سوئے تھے وہ صبح ناشتے کے لئے زندہ سلامت باہر آگئے تھے۔"
شمامہ مشکبار، کراچی

شعر

وہ سے کے متاع تیرگی ایسی سحر نہ لوں
گردن پہ جس کے لاکھ ستاروں کا خون ہے

چوپایہ

روسو کے نام ایک خط میں والٹیئر نے لکھا۔ "نوع انسان کے خلاف جو نئی کتاب تم نے لکھی ہے مجھے مل گئی شکریہ ہم سب کو احمق بنانے کے لئے آج تک کسی شخص نے ایسی ذہانت سے کام نہیں لیا ہو گا تمہاری کتاب پڑھنے کے بعد بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چاروں ٹانگوں کے بل چلنا شروع کر دوں لیکن افسوس ساٹھ برس سے مجھے اس کی عادت نہیں رہی۔"
فائقہ اسلم منڈی بہاؤ الدین

چرچل اور تقریر

ایک بار برطانوی وزیراعظم چرچل جلدی میں ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے انہوں نے ڈرائیور سے "برٹش براڈ کاسٹنگ ہاؤس" چلنے کو کہا ڈرائیور نے ان کی طرف دیکھا اور لاپرواہی سے کہا "مجھے افسوس ہے جناب میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا ٹھیک آدھ گھنٹے بعد مسٹر چرچل کی تقریر ہونے والی ہے اور میں کسی قیمت پر بھی اس سے محروم رہنا پسند نہ کروں گا۔" مسٹر چرچل یہ سن کر باغ باغ ہو گئے اور انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں ایک پونڈ تھما دیا ڈرائیور نے گھوم کر انہیں بڑے تعجب سے دیکھا اور کہا۔
"آپ نہایت ہی نیک انسان معلوم ہوتے ہیں مسٹر چرچل اور ان کی تقریر جہنم میں جائے چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"
ناہید فاطمہ، کراچی

التماد

گلاب کا ایک زرد پتا!
خزاں کے جھونکوں سے کہہ رہا تھا
کہ تم نے ان نرم نرم شاخوں!
سے مجھ کو اکثر جدا کیا ہے
مگر میں ہر بار آ گیا ہوں۔
ذکیہ سلطانہ، کراچی

ادھار

ایک ہندوستانی فوجی کمانڈر نے اپنے افسروں کو اکٹھا کیا اور سابقہ لڑائی کی کارکردگی پوچھنے لگا پہلے مسلمان افسر سے پوچھا "سناؤ تمہاری کارکردگی کیسی رہی۔" افسر نے جواب دیا۔

"سر میری یونٹ میں ایک ہزار جوان تھے صرف سو جوان مارے گئے اور باقی واپس لے آیا۔"

دوسرا سوال ایک ہندو افسر سے کیا گیا اُس نے جواباً عرض کی

"مہاراج ہزار کی نفری میں ۹۰۰ سو مارے گئے اور سو واپس لے آیا ہوں۔"

تیسرا سوال ایک سکھ افسر سے کیا گیا سردار جی نے عرض کی،

"سر جی ہزار نفری تھی ساری ہی ماری گئی پچاس ادھار لے آیا ہوں۔"

نسرین نصر، ڈیرہ اسماعیل خان۔

قطعہ

نہ کوئی خواب ہمارے ہیں نہ تعبیریں ہیں
ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں
کیا خبر کب کسی انسان پہ چھت آن گرے
قریہ سنگ ہے اور کانچ کی تعمیریں ہیں

ثمینہ خلیل شفیق بہاولپور

حیا اور وقار

حیا اور وقار ہی عورت کا اصل زیور اور اُس کی پر سحر شخصیت کا راز ہے اِن دونوں چیزوں سے نہ صرف اُس کے احترام بلکہ حُسن میں بھی اضافہ ہوتا ہے اگر عورت حیا اور وقار سے احترام حاصل کر کے دیوی کا روپ اختیار کر سکتی ہے تو بے باکی کا ذریعہ بن کر محض مٹی کا کھلونا بھی بن جاتی ہے ... جس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی

طیبہ آرزو، فیصل آباد

اقتباس

وہ زخم وہ غم جو مشیت ایزدی سے انسان کو ملتے ہیں۔ اور جن سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی غموں کا ایک نار بن جائے گی وقت اِن زخموں کے لئے ایک مرہم بن جاتا ہے اور وہ محبوب انسان جو دلوں پر حکومت کرتے ہیں جن کی رفاقت کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا وقت خود بخود ان کے بغیر جینا سکھا دیتا ہے۔

"عذرا شاہین"

رخشندہ اینڈ نجمہ مجید

کانفرنس	اپنے فکر و غم میں دوسروں کو شریک کرنا
راز	جسے ہم ہر ایک سے الگ الگ کہہ سکتے ہیں
قسم	جتنی بھی کھالو بدہضمی نہیں ہوتی۔
ماڈرن تعلیم	جو انسان کو بغیر عقل کے جینا سکھاتی ہے
فرائی فش	ماہی بے آب۔
ایمانداری	پکڑے جانے کا خوف۔
اخبار	اشتہار، اغوا، حادثہ، تقریر اس کے سوا کچھ نہیں۔
تجربہ	ماضی کی غلطیاں۔
امن	دو جنگوں کے درمیان خوف کا زمانہ۔
پرس	سنگھار میز کا پاکٹ ایڈیشن۔

یادداشت

زمانہ قدیم میں یونانی طالب علم امتحان کی غرض سے جب مطالعے میں مصروف ہوتے تو وہ اِس دوران اپنے سر کے بالوں میں گلاب کے پھول کی قسم کا ایک پودا ٹانک لیا کرتے اِن کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ اِس طرح کرنے سے کمرہ امتحان میں اِن کی یادداشت بالکل تازہ رہتی ہے۔

اعتراف

مِس گل نسرین سیال، داودی کا خان

مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو کہ میں نے انہیں چاہا ہی نہیں
اور وہ مست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
میں نے اُن مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں

"ساحر لدھیانوی"

خاتون کا دسترخوان

تلی ہوئی چانپ

آیئے آج ہم آپ کو سالگرہ اور دعوت کے موقع پر ایک ایسے کھانے کی ترکیب بتاتے ہیں جو لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ کم خرچ اور بالانشین بھی ہوگا۔

اور پھر پکار پکار کر آپ کی سلیقہ مندی کی گواہی بھی دے گا۔

تو آیئے ہم "تلی ہوئی چانپ" پکاتے ہیں۔

چیزیں حسب ذیل ہیں اس میں ضرورت کے مطابق کمی بیشی بھی کی جاسکتی ہے۔

گوشت چانپ کا ہڈی سمیت ایک کلو

پیاز	آدھ کلو
گھی	پاؤ بھر
چاندی کے ورق	چانپ کی مقدار کے مطابق
گرم مصالحہ پسا ہوا	آدھ چھٹانک
نمک مرچ	حسب ذائقہ
ڈبل روٹی کے توس	بارہ عدد
ادرک	حسب ذائقہ
بادام کی گریاں	دو درجن
ناریل	۵۰ گرام
لہسن کی گٹھل	ایک عدد

ترکیب:۔

ڈبل روٹی کے توسوں کو تھوڑی دیر قبل دھوپ میں سکھائیں اس کے بعد ناریل بادام اور ڈبل روٹی کو اچھی طرح باریک کر کے گرم مصالحہ ملا کر سفوف تیار کرلیں۔ اس اثنا میں آپ پیاز لہسن نمک مرچ اور گوشت کو آدھ کلو پانی میں چولہے پر رکھ دیں۔

سبز مرچ اور ادرک کو باریک باریک کاٹ لیں گوشت معمولی سا گل جائے تو تقریباً ۵۰ گرام گھی ڈال کر خوب بھونیں۔ اتنا بھونیں کہ مصالحہ سارا چانپوں کے ساتھ لگ جائے اب ان چانپوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے بڑے اور کھلے برتن میں رکھ دیں جب ذرا ٹھنڈی ہو جائے تو اب ڈبل روٹی کے ٹکڑوں میں ملے ہوئے باقی اشیاء کے ساتھ ادرک اور ناریل کاٹا ہوا ملالیں۔

اب ہڈی سے پکڑ کر چانپ کو اس سفوف میں خوب اچھی طرح ادھر ادھر پلٹیں تاکہ یہ سفوف اچھی طرح چانپ کے ساتھ مل جائے جب ساری چانپیں اس طرح تیار ہو جائیں تو کڑاہی میں بقیہ گھی ڈال کر آہستہ آہستہ آنچ پر تلتی رہیں ایک ایک کر کے جب سرخ ہو جائیں تو نکالتی جائیں۔

اب آپ چاندی کے ورق لگا کر ڈش میں نکالتی جائیں تاکہ لوگوں کی نظروں کو بھلی لگے۔

ہاں گوشت کو زیادہ گلنے نہ دیں۔

لیجئے یہ بہترین ڈش تیار ہے جو نہایت خستہ اور لذیذ چانپوں پر مشتمل ہے۔

اب آپ لوگوں سے اپنی سلیقہ مندی کی تعریف کروایئے۔ "کم خرچ بالانشین" کی مصداق کے تحت یہ بہترین ڈش آپ ہر تقریب کی زینت بنا سکتی ہیں۔

مس تطہیر صادق سبزواری
لاہور کینٹ

مچھلی کے پکوڑے

اشیاء

مچھلی	ایک کلو (جن میں کانٹے کم سے کم ہوں)
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالہ	حسب ذائقہ
انار دانہ	حسب ذائقہ
بیسن وغیرہ	حسب ذائقہ

ترکیب:۔ مچھلی کے چھوٹے چھوٹے قتلے کر کے انہیں خوب اچھی طرح صاف کرلیں تاکہ بساند دور ہو جائے پھر ایک دیگچی میں پانی چولہے پر چڑھا دیں۔ اور دیگچی کے منہ پر پتلا سا کپڑا باندھ دیں اور اس پر مچھلی کے قتلے رکھ دیں تھوڑی دیر بعد مچھلی کے قتلے ذرا نرم ہو جائیں گے اور کانٹے نکالنے میں آسانی ہوگی۔ آہستہ آہستہ سے مچھلی کے کانٹے نکال لیں تمام مصالحے پیس کر یک جان کرلیں اور مچھلی کے ٹکڑوں کو لگا کر تھوڑی دیر کے لئے رکھ چھوڑیں پھر مصالحہ بیسن میں گھول کر مچھلی کے ٹکڑوں کو لت پت کر کے تلیں۔ نہایت لذیذ اور چٹ پٹے پکوڑے تیار ہیں شام کی چائے پر بہت لطف رہے گا۔

فرحانہ ممتاز، کراچی

سنو

ساحر لدھیانوی

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم
مایوسیِ مآلِ محبت نہ پوچھیے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم
لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گِلہ نہ کریں گے کسی سے ہم
ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم
گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم
اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

ادا جعفری

جان!

تم کو خبر تک نہیں
لوگ اکثر بُرا مانتے ہیں
کہ میری کہانی کسی موڑ پر بھی
اندھیری گلی سے گزرتی نہیں
کہ تم نے شعاعوں سے ہر رنگ لیکر
مرے ہر نشانِ قدم کو دھنک سونپ دی
نہ گم گشتہ خوابوں کی پرچھائیاں ہیں
نہ بے آس لمحوں کی سرگوشیاں ہیں
کہ نازک ہری بیل کو
اِک توانا شجر اَن گنت اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے
کوئی نارسائی کا آسیب اِس رہگذر میں نہیں
یہ کیسا سفر ہے کہ روداد جس کی غبارِ سفر میں نہیں

میری بیاض سے

بلقیس بھٹی

نسرین نصر ——— بنوں
ہوئے ہم اپنے لئے اتنے اجنبی کہ ہمیں
ہمارے قرب کا لمحہ عذاب جیسا تھا

نسیم زہرہ ——— اسلام آباد
شام فراق آئی تو دل ڈوبنے لگا
ہم کو بھی اپنے آپ پہ کتنا غرور تھا

ماہ پارہ یاسمین ——— کراچی
بے کشش مکانوں میں جیسے چاند راتیں تھیں
اسکے سرو چہرے پر خوشگوار آنکھیں تھیں

بتی ——— جھنگ شہر
تتلیاں اُڑتی ہیں اور اُن کو پکڑنے والے
سعیٔ ناکام میں اپنوں سے بچھڑ جاتے ہیں

بشریٰ یاسمین ——— بہاول نگر
تو عکس ہے تو کبھی میری چشم تر میں اُتر
میں تیرے لئے کہاں آئینے تلاش کروں

سیدہ نورین مشتاق ——— ہارون آباد
تری نگاہ میں اک رنگ اجنبیت تھا
ہم کس اعتبار پر کھل کے گفتگو کرتے

ممتاز فوزیہ ——— جہلم
کبھی جو بھول کے برسا نہیں وہی بادل
میرے مکان کے اوپر دکھائی دیتا ہے
بھلا تو دوں تمہیں لیکن میرے خیالوں میں
تمہارا عکس برابر دکھائی دیتا ہے۔

ذکیہ سلطانہ ——— کراچی
مدتوں سے یہی عالم ہے نہ توقع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں
دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو افسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

زہرہ نسیم ——— کراچی
سارے شہر میں صرف یہی تو سچے لگتے ہیں
چھوٹے چھوٹے بچے مجھ کو اچھے لگتے ہیں
میرے چاہنے والے مجھ کو بھول گئے تو کیا
موسم ہو تبدیل تو پتے جھڑنے لگتے ہیں

ایس۔ ایم ——— ڈھڈیال
ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

سعیدہ گل راجپوت ———
اب جو ہونے تھے فتنے سبھی ہو چکے تم ہمیں کھو چکے ہم تمہیں کھو چکے
آگے دل کی نہ باتوں میں آنا سجن کہ یہ دل ہے سدا کا دو رنگی

اسما شعیب ——— کراچی
تیری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
میرا تن مور بن کر ناچتا ہے۔

زاہدہ صبا ——— ڈیرہ اسماعیل خان
ہر اک موڑ پہ ہم ٹوٹتے بکھرتے رہے۔
ہماری روح میں پنہاں قیامتیں تھیں بہت

سیرت افروز ظفری ——— خیرپور میرس
کئی رتوں سے مرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے تیرے انتظار کا موسم

ناہید فاطمہ ——— کراچی
وصال و ہجر سے وابستہ تہمتیں بھی گئیں
وہ فاصلے بھی گئے وہ قربتیں بھی گئیں

کامنی جاوید ——— کراچی
میں جب بھی چاہوں اُسے چھو کے دیکھ سکتی ہوں!
مگر وہ شخص کہ لگتا ہے اب بھی خواب جیسا

فرحانہ ممتاز ——— کراچی
جو میرا نام بھی لیتا تھا دعاؤں کی طرح
سوچتی ہوں اس نے مجھے کس طور بھلایا ہوگا

چمن سلطانہ ——— کراچی
ہم تنگ نائے ہجر سے باہر نہیں گئے
تجھ سے بچھڑ کے زندہ رہے مر نہیں گئے

فوزی رضی فاروقی ——— حافظ
یہ جدائیوں کے رستے بڑی دور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ لوٹا میری بات مان جاؤ

فوزیہ ربی ——— ڈیرہ اسماعیل خان
میری تنہائی بتاتی ہے مجھے
وہ بھی محفل میں اکیلا ہوگا!

تنویر عالم ——— کراچی
کبھی کبھار اُسے دیکھ لیں کہیں مل جائیں
یہ کب کہا تھا کہ وہ خوش بدن ہمارا ہو

FOR US THE ONLY FEATHER IN OUR CAP IS YOUR APPROVAL..

thanks for liking the PEPSI taste

We take our caps off to you
for your good taste.
It's admiration such as
yours that's made **PEPSI** the
world's most popular cola drink.

STAY WITH YOUR GOOD TASTE –

PEPSI

HAVE A PEPSI DAY

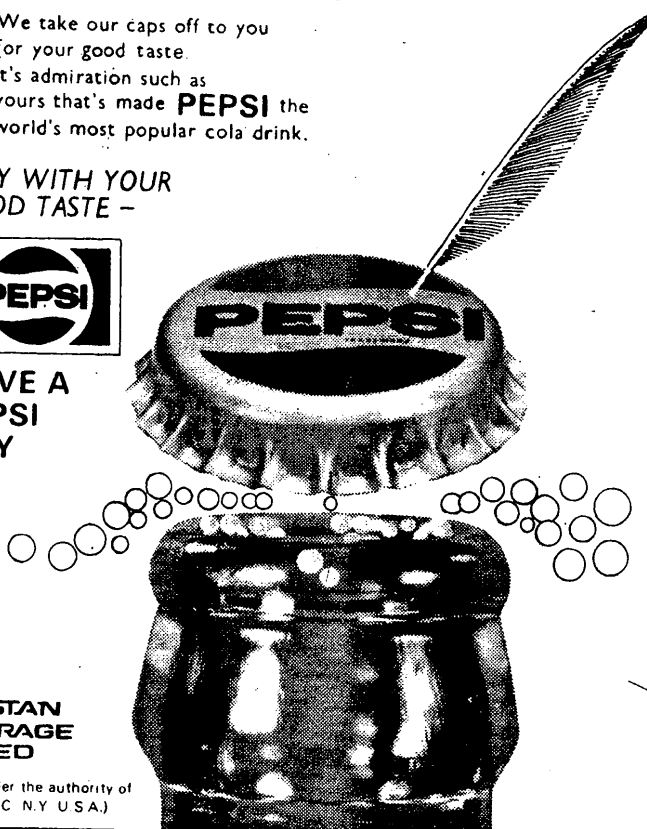

PAKISTAN
BEVERAGE
LIMITED
KARACHI)
Bottled under the authority of
PEPSICO INC N.Y U.S.A.)

آپ کا نٹنگ کمپیوٹر

گرمیوں میں بھی بہار کا سماں پیدا کر سکتا ہے

پاکستان میں بہت سی بہنوں کا عام خیال یہ ہے کہ نٹنگ مشینوں پر صرف سردیوں میں اونی سوئٹر یا لباس تیار کیے جاتے ہیں اس لیے اکثر دیکھا گیا ہے کہ سردیوں کے رخصت ہوتے ہی ان مشینوں کو غلاف چڑھا کر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے علاقے جیسے کراچی، حیدرآباد وغیرہ جہاں سردی کا موسم صرف ۲ یا ۳ ماہ ہوتا ہے یا زیادہ سخت سردی نہیں پڑتی وہاں نٹنگ مشین خریدنا ایک غیر ضروری خرچ سمجھا جاتا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ نٹنگ مشینیں اور خاص طور پر نئے دور کے نٹنگ کمپیوٹر جن میں سنگر کے میمومیٹک نٹنگ کمپیوٹر سرِ فہرست ہیں، نئے دور کی انقلاب آفریں مشینیں ہیں جن پر سارا سال نت نئے لباس بُنے جا سکتے ہیں اور پاکستان جیسے ملک میں جہاں گرمیوں کا موسم نسبتاً بہت طویل ہوتا ہے، نٹنگ کمپیوٹر کے ذریعے سوتی، ریشمی اور نائلون کے دھاگوں کے امتزاج سے بے شمار لباس اور دیگر گھریلو ضروریات کی چیزیں بہت کم وقت اور کم خرچ میں تیار ہو سکتی ہیں اور اس طرح اگر گرمیوں کے طویل اور اکتا دینے والے دنوں میں آپ تھوڑا وقت بھی اپنے نٹنگ کمپیوٹر کے ساتھ گزاریں تو نئے نئے فیشن، رنگ برنگے ڈیزائن کی اتنی چیزیں بُنی جا سکتی ہیں کہ سارے گھر میں واقعی بہار کا سماں ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ ریشمی، سوتی یا نائلون کے دیدہ زیب لباس

۲۔ بچوں کے لباس ۳۔ پردے

۴۔ صوفے کے کوَر ۵۔ بیڈ کوَر

۶۔ ٹرالی کوَر، ٹیبل میٹس ۷۔ اسکول کے ہینڈ بیگ

۸۔ ذاتی استعمال کے لیے ہینڈ بیگ ۹۔ موزے یا بوٹی (Booties)

اور یہ تمام چیزیں نہ صرف یہ کہ بالکفایت تیار ہوتی ہیں بلکہ میمومیٹک نٹنگ کمپیوٹر کی تیز رفتار کارکردگی کی بدولت نہایت کم وقت میں تیار کی جا سکتی ہیں۔ جن بہنوں کے ہاں میمومیٹک نٹنگ کمپیوٹر موجود ہے ان کی دلچسپی کے لیے ذیل میں چند آسان ہدایات پیش کی جاتی ہیں۔ اب کے گرمیوں میں اپنی سنگر میمومیٹک نٹنگ کمپیوٹر کے لیے تھوڑا وقت نکالیے اور اس کے کمال دیکھیے۔

Automatic Cast on

اس نئے طریقے سے پھندے نیچے سے بند ہوتے ہیں۔ اس طرح نہ تو پھندے ہاتھ سے ڈالنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی دھاگے کی مدد سے پھندے روکنے کی ضرورت ہے۔

لہٰذا میں اپنی بہنوں کی سہولت کے لیے ذیل میں اس طریقے کو بتاتی ہوں:

۱۔ کیرج کو دائیں طرف رکھیں۔

۲۔ ویونگ برش کو کیرج کے ساتھ نصب کریں۔

۳۔ کیم لیور کو Stochinite پر رکھیں۔

۴۔ دونوں سامنے والے لیور Russel Leaver 11 پر رکھیں۔

۵۔ سلائڈ میں جو لیور ہیں، وہ دائیں طرف کے 0 نشان پر اور بائیں کے 0 نشان پر رکھیں۔

۶۔ ٹینشن کو اون کے حساب سے رکھیں۔

۷۔ جتنی سوئیوں پر بُننا مقصود ہو، ان سب کو بُنائی والی پوزیشن یعنی B پر نکال لیں۔

اس کے بعد ایک چھوڑ کر ہر دوسری سوئی کو ڈی پر نکال لیں B IIIIIII B
D IIIII D

پنچ لیس (Punch Lace) جالی دار نمونہ

یہ ایک ایسا نمونہ ہے جو سنگر نٹنگ کمپیوٹر پر بہ آسانی ایک ہی کیرج کے استعمال سے بُنا جاتا ہے۔ اس کی بُنائی میں ایک سوتی لیکن قدرے موٹا دھاگا جو کہ کیرج آرم کے یارن فیڈر نمبر ۱ میں رکھا جاتا ہے اور دوسرا باریک نائلون کا دھاگا یارن فیڈر نمبر ۲ میں رکھا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بُنائی ہے جس میں کارڈ کے ڈیزائن کے اعتبار سے خود بہ خود جالی دار بُنائی ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کو شروع کرنے کے لیے صرف آپ کو ابتدا میں ایک دفعہ تیاری کرنا ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ صرف کیرج کو دائیں اور بائیں چلاتے رہیں جب تک آپ کو بُنائی کرنا مقصود ہو۔

ٹک بُنائی (Tuck Knitting)

گرمیوں کے لیے ایک اور نمونہ جس کو ہم ٹک بُنائی کہتے ہیں۔ یہ بھی سوتی، ریشمی دھاگوں کے مختلف رنگوں کو استعمال کرتے ہوئے بُنا جاتا ہے۔ اس نمونے کو بھی دونوں طرف سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس بُنائی میں مختلف رنگوں کے استعمال سے دونوں طرف بہت واضح اور خوشنما ڈیزائن بنتے ہیں۔ اس بُنائی کو شروع کرنے کے لیے صرف ایک دفعہ کی ترتیب (سیٹنگ) کے بعد آپ جب تک چاہیں بُنائی کر سکتی ہیں۔

لیس بُنائی (Lace Knitting)

یہ بھی گرمیوں کے لیے ایک انتہائی خوبصورت نمونہ ہے جو کہ سوتی، ریشمی دھاگا استعمال کرتے ہوئے بُنا جا سکتا ہے۔ یہ بُنائی کے بعد بہت نرم و ملائم رہتا ہے۔ اس بُنائی میں ایک وقت میں ایک ہی دھاگے سے بُنا جاتا ہے۔ اس بُنائی کو شروع کرنے کے لیے ایک دفعہ سوئیوں کا چناؤ کیا جاتا ہے جس کو ہم اصطلاحی زبان میں نیڈل سیٹنگ ڈائیگرام کہتے ہیں۔ اس کے بعد بغیر کسی تبدیلی کے جب تک آپ چاہیں بُن سکتی ہیں۔ اس بُنائی کے نمونے کو آپ دونوں طرف سے استعمال کر سکتی ہیں۔

نٹ ان (Knitt in)

اس نمونے کی بُنائی میں دو دھاگے مختلف رنگوں میں، جو سوتی ہو یا ریشمی بہ یک وقت استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک دھاگا فیڈر نمبر ۱ میں اور دوسرا دھاگا فیڈر نمبر ۲ میں رکھا جاتا ہے۔ دونوں دھاگوں کی موٹائی قدرے مناسب ہونا چاہیے۔ اس طرح آپ دو رنگوں کے حسین امتزاج سے خوبصورت نمونے بُن سکتی ہیں۔ اسی بُنائی میں اگر آپ چاہیں تو خاص پُرزے (میجک کیم میجک پوائنٹ اسپریٹرز) استعمال کرتے ہوئے آپ موٹف بنا سکتی ہیں جو بچوں کے لباس کے لیے نہایت موزوں ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا تمام بُنائی میں سب سے دیدہ زیب اور کارآمد پنچ لیس (جالی دار) بُنائی صرف سنگر کے میمومیٹک نٹنگ کمپیوٹر پر بغیر کسی فالتو پُرزے کے لگائے کی جا سکتی ہے۔ جن بہنوں کو میمومیٹک پر مہارت حاصل ہے، وہ تھوڑی لگن سے یہ ساری بُنائی بہ آسانی کر سکتی ہیں بلکہ خود بھی نت نئے تجربے کر سکتی ہیں اور جنہوں نے پہلے کبھی نٹنگ مشین نہیں استعمال کی ان کی سہولت کے لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ سنگر کے ایجوکیشن سینٹرز سے جو کراچی، فیصل آباد، لاہور اور راولپنڈی میں ماہر خواتین کے زیرِ نگرانی تربیت دے رہے ہیں، صرف تین ماہ کا کورس کر کے اس حیرت انگیز مشین سے مستفید اور لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔

manhattan PAKISTAN SSMC-1/81

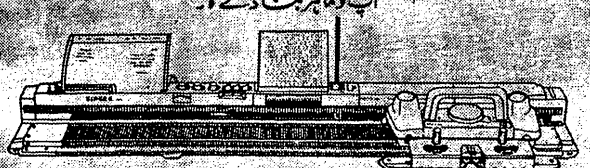

انجم امین — کراچی

س۔ اگر آپ کو خواتین کی محفل سے نکال دیا جائے تو آپ فقیری کا پیشہ اختیار کرینگے یا جوگی کا؟

ج۔ جوگی بننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ہما رحمٰن — بلوچستان

س۔ آپ اتنے خوبصورت جوابات کیسے دیتے ہیں؟

ج۔ قلم کے ذریعے۔

رخسانہ امتیاز — جہلم

س سب سے بڑا سکھ

ج اگر ضمیر ملامت نہ کرے۔

نویدہ روحی — ملتان

س دل اور شیشے میں کیا فرق ہے؟

ج۔ دونوں ہی ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

انیلا شاہین — کراچی

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ دنیا مصیبتوں کا گھر ہے؟

ج سب کے لئے نہیں کچھ لوگوں نے تو اپنی جنت دنیا میں ہی بنا ڈالی ہے۔

اے۔ زیڈ قریشی — مٹھن کوٹ

س۔ شیشہ ٹوٹ جائے تو جڑ سکتا ہے دل ٹوٹ جائے تو؟

ج۔ تو وہ جڑ نہیں سکتا دل کے لئے ابھی کوئی میجک اسٹون دریافت نہیں ہوا۔

س۔ سنا ہے آپ کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے؟

ج۔ یقیناً میری ایکسرے رپورٹ آپ کے پاس ہوگی۔

بشریٰ شاہین — لاہور

س۔ مجھ کو بس اتنا بتا دے اے دوست شناس روٹھ جاتے جو مقدر تو مناؤں کیسے؟

ج۔ پہلے تو اپنے مقدر کا ماتم کروں کہ تم نے اچھے بھلے انسان کو دوست شناس بنا دیا۔

مسرت جبیں قادری — ملتان

س۔ زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے؟

ج۔ وقت کے ذریعے جو سب سے بڑا مرہم ہے۔

ثریا سحر — کراچی

س۔ نین بھیا آپ اپنے آپ کو اتنا حسین کیوں سمجھتے ہیں؟

ج۔ سمجھنے کی کیا بات ہم ہیں ہی حسین۔ ویسے مجھے تمہارے سرٹیفکیٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔

ثمینہ پٹھان — جیکب آباد

س۔ دوست کی شادی ہو تو خوشی کے باجے بجائے جاتے ہیں لیکن اگر محبوب کی شادی ہو تو۔؟

ج اَٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ جاتے ہیں۔

افشاں پروین — کراچی

س سنا ہے گزشتہ دنوں محفل موسیقی میں لوگ تمہاری آواز سن کر نیند سے بیدار ہو گئے اور ادھر اُدھر بھاگنے کا راستہ تلاش کرنے لگے اور وہ افراتفری مچی کہ خدا کی پناہ؟

ج ہم ہمیشہ سے اس اصول پر عمل کرتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔

سعیدہ نورین مشتاق — ہارون آباد

س۔ بھیا جی آپ آخر مجھے اس بزم میں شامل کیوں نہیں کرتے؟

ج ہمارے سامنے مہمان اور بھی ہیں۔

فرحانہ ممتاز — کراچی

س اگر پوسٹ مین کے بجائے پوسٹ گرل ہو تو۔؟

ج کوشش کروں گا کہ یہ عہدہ تمہیں مل سکے۔

س پہلی مرتبہ آپ کے دروازہ محفل پہ دستک دے رہی ہوں خوش آمدید کہیں گے نا؟

ج تم نے مجھے کھٹکھٹایا تو مجھے یاد آیا۔۔۔ خوش آمدید۔۔۔

فریدہ آرائیں — خیرپور

س پھول کی حفاظت کیلئے کانٹے اور کانٹوں کی حفاظت کیلئے؟

ج جو دوسروں کو تحفظ دینا جانتے ہوں انہیں اپنے تحفظ کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

فوزیہ روبی — ڈیرہ اسماعیل خان

س وفا پسند لوگ وفا شعار کیوں نہیں ہوتے۔؟

ج ایک وقت میں ایک کام اچھا ہوتا ہے۔

عارفہ بٹ — سیالکوٹ

س ماضی اتنا حسین کیوں لگتا ہے؟

ج کسے مجھے یا تمہیں،؟

زاہدہ صبا — ڈیرہ اسماعیل خان

س اُف خدائی مین جی آ۔۔ آپ۔۔۔ آپ یہاں بھی۔۔۔ مگر کب۔۔۔ کیسے۔؟

ج ہم نہ کہتے تھے ہمیں دیکھو گی تو یونہی بھونچکی سی رہ جاؤ گی۔ آگیا یقین؟

طلعت آرا — سیالکوٹ

س ویراں دل کی آرزو؟

ج چپکے سے بہار آجائے۔

ناصرہ گل — کراچی

س لڑکیوں کی دیکھا دیکھی لڑکوں نے اُونچی ایڑی کے جوتے پہننے شروع کر دیئے۔

ج اس لئے کہ لڑکیوں نے اس ہتھیار کو صرف اپنی میراث سمجھ لیا تھا۔

رقیہ رحیم — جہلم

س آپ نے کبھی کوئی نیک کام بھی کیا ہے؟

ج تمہارے سوالوں کے جوابات دے کر تم لوگوں کا دل رکھ لینا کیا نیکی نہیں۔

شفیقہ ناز — کراچی

س مین جی خواتین کی محفل کی رانی اگر میں ہوتی تو آپ کیا کرتے؟

ج بی بی اب آنکھیں کھول دو صبح ہو گئی۔

فریدہ آرائیں — خیرپور

س اگر زندگی میں خطرات اور حادثات نہ ہوتی تو۔؟

ج تو زندگی میں کوئی چارم ہی نہ رہے۔

نئی نسل کی مقبول قلمکار، خوبصورت اور دل گداز افسانوں کی خالق ناہید سلطانہ اختر کی چنیدہ تحریروں کا

اوّلین مجموعہ

پھول سے کھلتے ہیں

شائع ہو گیا ہے

سفید کاغذ، خوبصورت سرورق، قیمت: ۵۰ روپے

منگوانے کا پتا

بوستان پبلیکیشنز A ۲۴۷، بلاک ۳ گلشن اقبال، کراچی ۴۷

نفسیاتی اور ازدواجی الجھنیں

عدنان کے مشورے

ا۔ب

میں نے معلومات کرنے کے لیے کچھ لوگوں کی ڈیوٹی تو لگا دی ہے اگر کوئی اطلاع مل گئی تو اگلے ماہ کے خواتین میں لکھ دوں گا۔ لیکن مجھے اس معاملے میں جان نظر نہیں آتی اور نہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان صاحب کو اس معاملے سے کوئی دلچسپی ہے یونہی سرِ راہ خط لکھ دیا بعد میں خاموش ہوگئے میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کی تلاش کے بجائے نئے سرے سے کوئی بات بن جائے تو اچھا ہے اور اس کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

F. A

میرے نزدیک تو بلا وجہ کی بات ہے جس سے آپ نے اپنا ذہن پریشان کر رکھا ہے جس کی وجہ سے آپ سینے میں درد محسوس کرتی ہیں اب تو منگنی ہو چکی ہے اب سوچنے کا وقت گزر گیا ہے اگر وہ کم تعلیم یافتہ ہے تو بھی حرج نہیں انسان کا اخلاق سب سے بڑی چیز ہے دوستوں اور رشتے داروں کے منگیتروں سے موازنہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے آنے والے وقت کو حالات پر چھوڑ دیں۔ اسی میں بہتری بھی ہے اور عافیت بھی۔

مومی

اگر صورتِ حال ایسی ہی ہے تو اس میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میرے نزدیک تو یہ خوشی کی بات ہے اس تبدیلی کو آنے والے وقت پر چھوڑ دیں اور پڑھائی کی طرف توجہ دیں کیونکہ تعلیم اور علم تو ہر صورت میں آپ کا اپنا ہے اس میں کوئی حصہ نہیں بٹا سکتا۔

طاہرہ

طاہرہ بہن! مجھے تو یہ معاملہ کچھ فلمی سا لگتا ہے میں اس قسم کی پسند یا محبت کا قائل نہیں ہوں آپ کے سامنے ایک مستقبل ہے انشاء اللہ ایک روشن مستقبل ابھی آپ اس جھمیلے میں نہ پڑیں اس معاملے میں نہ سوچیں ورنہ آپ کا ذہن تعلیم متاثر ہوگی اور کچھ عجب نہیں کچھ باتیں یا رسوائیاں بھی جھیلنے میں آجائیں۔ ہاں اگر معاملہ واقعی سیریس ہے تو پھر اسے کہیں کہ وہ آپ کی والدہ سے ملے ورنہ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس معاملے کو خدا حافظ کہہ دیں۔

ع۔خ

س۔ پریشانی یہ ہے کہ میں بری عادت میں مبتلا ہوگئی ہوں تھی۔ میں اپنے آپ کو اس سے بچنے یا بچانے کی کوشش کرتی تھی لیکن میں اپنے نفس سے ہار چکی تھی اور وہی حرکت دوبارہ کرتی تھی لیکن اب دو سال سے مجھے قبض کی شکایت ہوگئی ہے میں سمجھتی ہوں کہ یہ اسی وجہ سے ہوا ہے کیونکہ مجھے بیٹھنے کی جگہ پر کوئی موٹی سی گٹھلی محسوس ہوتی ہے اور جب میں بھاگتی یا چلتی ہوں تو تکلیف بھی ہوتی ہے لیکن یہ بواسیر نہیں ہے۔ برائے مہربانی آپ مجھے اس بیماری کے بارے میں بتائیں کیونکہ میرا پیٹ بھی بڑا ہو گیا ہے اور میرے دماغ

بائر جرمنی کی جدید تحقیق کے مطابق تیار کیا ہوا خوشگوار مہک والا
اوٹان لوشن مچھروں سے نجات حاصل کرنے کا ایک آسان اور مؤثر ذریعہ ہے۔
جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر اوٹان کے چند قطرے لگانے سے مچھر ۶ سے
۸ گھنٹے تک جلد کے قریب نہیں آتے اور آپ سکون کی نیند سو سکتے ہیں۔
یہ آپ کی جلد کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور بچوں کی نرم و نازک جلد پر بھی
بلاخوف خطر استعمال کیا جا سکتا ہے۔
ایک مرتبہ اوٹان کو آزمائیے - اور مچھروں سے نجات پائیے

BAYER

کیمڈائز پاکستان لمیٹڈ

CPL.3/81

Atelier BM

میں یہ ہی آتا ہے کہ کچھ خرابی ہو گئی ہے جسے میں ڈاکٹر کے سامنے بتا نہیں سکتی اور میرا دماغ یا سوچ یہ کہتی ہے کہ میں یہاں نہیں بن سکوں گی۔ پلیز آپ میری مدد کریں اور اس کا جواب جہاں تک ممکن ہو مارچ کے شمارے میں ضرور دیں کیوں کہ سرکار درد اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کبھی دل بہت زور سے ہوتا ہے اور تقریباً ہر وقت تھوڑا بہت رہتا ہے۔

میری عمر ۱۹ سال ہے اور میں ایک بی۔اے کی طالبہ ہوں اس کی وجہ سے میری تعلیم کا بہت حرج ہو رہا ہے جبکہ میں ایک اچھی طالب علم ہوں میں چاہتی ہوں جلد از جلد اس کا علاج کروں تاکہ امتحانوں میں مجھے پریشانی نہ ہو کیوں کہ انٹر کے امتحانوں میں مجھے کافی پریشانی ہوئی تھی۔ رات رات بھر مجھے نیند نہیں آتی تھی لہذا اب میں چاہتی ہوں آپ میرا علاج کر دیں میں آپ کی بہت بہت مشکور رہوں گی۔

اس کے علاوہ میرا ہاتھ دیکھ کر ایک نے بتایا تھا کہ میری ایک خواہش پوری نہیں ہو گی میرے دماغ میں یہی آتا ہے کہ شاید وہ خواہش اولاد ہو میں نے آپ کو سب باتیں لکھ دی ہیں کیونکہ سنا ہے بتا دینے سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بوجھ تو میرے دماغ میں گزشتہ دو سال سے ہے اللہ میاں میرے اس بوجھ کو یا بیماری کو جلد از جلد ختم کرے "آمین" تو پھر میں وہی لاپروا لڑکی بن جاؤں گی۔ اُمید ہے آپ جواب ضرور دیں گے۔

ج۔ اگر یہ بواسیر نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے بواسیر کی علامت ایسی ہوتی بھی نہیں۔

۱۔ اس عادت کی وجہ سے یہ تکلیف نہیں ہوتی۔

۲۔ جس شخص نے آپ کا ہاتھ دیکھا تھا کہ آپ کی ایک خواہش پوری نہیں ہو سکتی تو وہ پامسٹری کی ابجد سے بھی واقف نہیں میں بغیر ہاتھ دیکھے کہہ سکتا ہوں کہ زندگی میں آپ کی ایک سو خواہشیں پوری نہیں ہوں گی... انسان خواہشوں کا پتلا ہے اور پھر..... ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے اب آپ اپنی سو خواہشوں کا حساب لگانے بیٹھ جائیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ آپ نے اس بات کو اس بات سے جوڑ لیا۔

۳۔ کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں بعض دفعہ گلٹیاں نکل آتی ہیں جو معمولی دواؤں سے دب جاتی ہیں اُمید ہے کہ اب آپ کے سر کا درد بھی چلا گیا ہو گا۔ اور پڑھائی پر بھی کوئی برا اثر نہ پڑے گا۔

۴۔ قبض کے لئے اسپغول یا انجیر ڈز کو بکس یا اگر دل استعمال کریں پپیتہ بہت مفید ہے۔

۵۔ جس بات کی طرف آپ کا دھیان، ذہن گیا ہے وہ ممکنات میں سے نہیں ہے۔

ضرورت رشتہ

یو۔پی کے معزز سید سنی خاندان کی ۲۴ سالہ مشرقی ماحول میں پروردہ خوبصورت خوش اخلاق لڑکی کا رشتہ درکار ہے انجینئر باہر جانے والے قابلِ ترجیح۔ صرف لڑکے کے سرپرست رابطہ قائم کریں۔
بکس نمبر ۲۷۷، معرفت خواتین ڈائجسٹ اردو بازار کراچی نمبر ۱۔

بیوٹی بکس

قیصر لودھی

مسز نور جہاں ———

س:۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میری عمر ۲۲ سال ہے۔ باجی میرے ہاتھ پیر کافی سانولے ہیں۔ حالانکہ میں دن میں پانچ چھ مرتبہ ہاتھ پیر دھوتی ہوں۔ پہلے میرے چہرے کا رنگ صاف تھا اب وہ بھی سانولا ہوتا جارہا ہے۔ باجی مجھے فل میک اپ کا سامان لکھ دیں۔

ج ہاتھ پیر دھونے سے رنگ صاف نہیں ہوتا ہے۔ آپ گلیسرین اور لیموں کا عرق اور اس میں تھوڑا سا گلاب کا پانی ملاکر ایک بوتل میں رکھ لیں اور کام کرنے سے پہلے ہاتھ پیر اور چہرے پر لگا لیا کریں اور جب سب کام سے نپٹ جائیں تو ہلکے گرم پانی سے ہاتھ منہ دھو کر STILL MANS بلیچ کریم لگا لیا کریں۔ اگر اس سے فائدہ نہ ہو تو نیویا کی کریم استعمال کریں۔ میک اپ کی تفصیل کے لئے آپ کو فیس بیس روپے منی آرڈر کرنے ہوں گے جس میں میک اپ کی چیزوں کے نام اور طریقہ استعمال سب کچھ درج کیا ہوا ملے گا۔

شازیہ ——— پشاور

س:۔ باجی میرے ہونٹ بہت موٹے ہیں اور ان میں لکیریں پڑ گئی ہیں۔ میرے ہاتھ پیروں پر جھریاں سی پڑ گئی ہیں۔ مجھے تھریڈنگ کی ترکیب بتا دیں یا پھر WAX بنانے کی ترکیب بتا دیں۔ رنگ کے لئے بھی کوئی نسخہ تحریر کریں۔

ج:۔ آپ رات کو سوتے وقت دودھ کی بالائی لے کر اس میں چند قطرے لیموں کے ڈال کر ہونٹوں پر ہلکے ہاتھوں سے ملیں اور سو جائیں۔ صبح اٹھ کر گرم پانی سے ہونٹوں کو صاف کریں پھر بالائی کی چکنائی برائے نام لے کر ہونٹوں پر مل لیں۔ ہونٹ سارا دن نرم اور ملائم رہیں گے اور آہستہ آہستہ لکیریں بھی ختم ہو جائیں۔ رنگ کے لئے مندرجہ بالا نسخہ آزمائیں۔ تھریڈنگ اتنی دور سے ہم آپ بتا نہیں سکتے۔ WAX بنانے کی ترکیب کے لئے آپ کو فیس روانہ کرنی ہوگی۔

مسز راجہ ——— اسلام آباد

س:۔ میں ایک بچے کی ماں ہوں اور اس کی پیدائش کے بعد میں کافی کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ میں چندن منگانا چاہتی ہوں۔ کیا اسے کنواری بچیاں بھی استعمال کر سکتی ہیں؟

ج:۔ آپ سب سے پہلے اپنی غذا پر توجہ دیں۔ کھانے میں سب سے پہلے آپ سبزی، سلاد، فروٹ پر توجہ دیں۔ گوشت زیادہ کھانے سے صحت نہیں بنتی ہے۔ آپ سبزی میں شلجم، پالک، چقندر اور سلاد، مولی کھانے میں رکھیں پھلوں میں روزانہ ایک سیب، ایک کچا ٹماٹر، کینو، انگور اور آڑو استعمال کریں۔ رہا دوا کا تو اسے کنواری بچیاں بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ ہم اب دوا انہیں ہی روانہ کرتے ہیں جن کا منی آرڈر خوشخط پتے کے ساتھ ملتا ہے۔ وی پی ہم نے بند کر دیا ہے۔

محترمہ عذرا ناہید ——— لاہور

س:۔ میں بہت موٹی ہو رہی ہوں۔ اور باجی ناک پتلی کرنے کا طریقہ بھی لکھ دیجئے۔

ج:۔ آپ اپنی غذا پر توجہ دیجئے۔ گھر کے کام کاج کریں جس سے پسینے کا اخراج ہو۔ اور آلو، چاول، گھی اور اچاروں سے پرہیز کریں۔ دو نوالے بھوک سے کم کھائیں۔ ناک کے لئے آپ کو پلاسٹک سرجری کروانا پڑے گی۔

اخلاص بانو ——— کوئٹہ

س:۔ باجی میرے بال نہیں بڑھتے ہیں۔ میری عمر ۱۴ سال ہے میرے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں اور وہ سفید رنگ پر برے لگتے ہیں۔ براہ مہربانی اچھا سا نسخہ تحریر کر دیں۔

ج:۔ آپ ہفتے میں تین دن سونے سے پہلے ناریل کے تیل کی سر میں مالش کروایا کریں اور صبح اٹھ کر نہا لیا کریں اور سوتے وقت سو دفعہ سر میں برش پھیرا کریں اور چوٹی باندھ کر نہ سوئیں بلکہ بال کھول کر دوپٹے سے سر لپیٹ کر سویا کریں۔ چہرے کے لئے آپ اس طرح کریں کہ ایک پاؤ

بلسن یعنی چنے کا آٹا لیں اور اس میں خشخاش کا پوڈر بنا کر ملالیں اور برائے نام ہلدی۔ ان سب میں تین لیموں کا عرق نچوڑ کر ملالیں پھر سوکھنے دیں۔ جب یہ پاؤڈر سوکھ جائے تو سونے سے پہلے ایک چمچہ کھانے کا یہ پوڈر لے کر اس میں ذراسی بالائی اور عرق گلاب ملا کر چہرے پر مساج کریں۔ جب وہ خشک ہو کر جھڑ جائے تو ململ کے کپڑے سے صاف کر کے سو جائیں۔ صبح اٹھ کر گرم پانی سے منہ دھو کر STILL'S MAN BLEACH کریم لگایا کریں۔

عائشہ اسلم۔ صابرہ ملک ___ سکھر

س: باجی میرے پسینے میں بہت بو ہے۔ اس کا علاج بتادیں۔

ج: محترمہ پھٹکری چند دن بغلوں میں رکھنے سے بدبو دور ہو جاتی ہے۔ دوسری بات کچی پیاز یا پیاز کا اچار بالکل بند کر دیں۔ کچی پیاز کھانے سے بھی پسینے میں بدبو پیدا ہوتی ہے اور پھٹکری نہیں رکھ سکتیں تو OLD SPICE کا آفٹر شیو لوشن نہانے کے بعد بغلوں میں اور جہاں مناسب سمجھیں SPRAY کر لیا کریں۔ کافی فرق پڑے گا۔

محترمہ رضیہ شفیع گوجرانوالہ۔ آسیہ شیخ رہڑی سندھ

س: میرے سر میں خشکی بہت زیادہ پیدا ہوگئی ہے۔ میں نے کافی علاج کیے مگر فائدہ نہیں ہوا۔ برائے مہربانی کوئی معقول علاج بتادیں۔

ج: آپ HEAD & SHOULDER شیمپو استعمال کریں اور نہانے سے دو تین گھنٹے پہلے جو بھی تیل آپ استعمال کرتی ہوں اس میں ایک لیموں کا عرق ڈال کر مالش کروائیں اور پھر نہا لیں۔ خشکی ختم ہو جائے گی۔ بال جب بالکل خشک ہو جایا کریں تو کنگھا کیا کریں۔

محترمہ رفعت نورین ___ لاہور

ن۔م۔ گوجرانوالہ ___ نادرہ اختر

ج: مندرجہ بالا پتے پر بیس روپے منی آرڈر کر کے براہ راست اپنے مسئلوں کے حل منگوالیں۔ کیونکہ آپ لوگوں کے مسئلے ناقابل اشاعت ہیں اور ان کا جواب آپ کو براہ راست ہی دیا جا سکتا ہے۔ ہم ان سوالوں کے جواب بھی نہیں دے سکتے جن پر نہ نام ہوتا ہے اور نہ شہر کا نام۔ براہ مہربانی ایسی خواتین ہم سے رجوع نہ کریں۔